السرور
لائبریری
Acc. No. 21192

244.1
اصل-ت

تدبّرِ حدیث

شرحِ موطا امام مالکؒ

(منتخبؒ ابوابؒ)

جلد اوّل

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

ترتیب و تدوین

خالد مسعود ۔ سعید احمد

ادارہ تدبّرِ قرآن وحدیث لاہور

جملہ حقوق بحق ادارہ تدبر قرآن وحدیث محفوظ ہیں

نام کتاب : تدبر حدیث (جلد اول)
شرح مؤطا امام مالکؒ۔ منتخب ابواب
دروس : مولانا امین احسن اصلاحیؒ
ترتیب و تدوین : خالد مسعود۔ سعید احمد
اشاعت : بار اول ۲۰۰۰ء
تعداد : ۱۰۰۰
ناشر : ادارہ تدبر قرآن وحدیث، لاہور
کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد اکرام الحق
پریس: شرکت پرنٹنگ پریس
43- نسبت روڈ۔ لاہور
ہدیہ: 350 روپے

ملنے کا پتہ

۱۔ ادارہ تدبر قرآن وحدیث، رحمان سٹریٹ، مسلم روڈ سمن آباد لاہور
۲۔ دار التذکیر، رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

فہرست

پیش لفظ 9
امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ 13
تذکرہ مولانا امین احسن اصلاحی 17

کتاب الزکوۃ

زکوۃ کس مقدار پر واجب ہوتی ہے؟ 23
سونے اور چاندی کی نقدی میں زکوۃ 26
معدنیات میں زکوۃ 30
سونے، چاندی، زیور اور عنبر میں سے کن چیزوں میں زکوۃ نہیں؟ 32
یتیموں کے مال کی زکوۃ اور ان کے لیے اس میں تجارت 34
ترکہ کی زکوۃ 35
قرض کی زکوۃ 36
سامان تجارت میں زکوۃ 38
کنز کے بارے میں روایات 41
جانوروں کی زکوۃ 43
گایوں کی زکوۃ کے بارے میں 47
زکوۃ میں میمنوں کو شمار کرنے کے بارے میں روایات 49
وصولی زکوۃ میں لوگوں کو تنگ کرنے کی ممانعت 51
صدقہ لینے والے کے لیے کیا لینا جائز ہے؟ 52
صدقے کی وصولی اور اس میں سختی کے بارے میں روایات 54
کھجوروں اور انگوروں کے تخمینے سے زکوۃ 57
غلام، گھوڑے اور شہد کی زکوۃ کے بارے میں روایات 63
اہل کتاب اور مجوسیوں کا جزیہ 65

کتاب البیوع

بیع کا مفہوم 71
بیعانہ کے معاملے میں روایت 71
غلام کے بارے میں حکم 73
گارنٹی کے بارے میں روایت 74
غلام کا عیب دار ہونا 76
اس لونڈی کے متعلق حکم جو شرط کے ساتھ بیچی جائے 77
جو درخت بیچ دیے گئے ہوں ان کے پھل کے بارے میں 78
صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے پھل فروخت کرنے کی ممانعت 79
عریہ کی فروخت کے بارے میں حکم 83

پھلوں اور کھیتی کی بیع میں آفت سے نقصان 84

باغ کے پھل مستثنیٰ کرنے کے باب میں 86

کھجور کی فروخت کی مکروہ شکل 87

مزابنہ اور محاقلہ کے بارے میں حکم 91

سونے کی بیع چاندی سے، خواہ ٹکڑوں کی شکل میں ہو یا نقدی کی صورت میں 93

نقدی کے مبادلے کے بارے میں 99

مسکوک اور غیر مسکوک کا تبادلہ 101

ادھار پر خرید اور نقد پر فروخت جیسے سودوں کے بارے میں 102

غلے کو ادھار بیچنے کی کراہت کی ایک شکل 107

غلے کی خرید میں پیشگی رقم کی ادائیگی 108

تفاضل کے بغیر غلے کے بدلے غلے کی فروخت 109

ذخیرہ اندوزی اور احتکار 110

ایک جانور کی دوسرے جانور کے بدلے میں خرید و فروخت اور اس میں ادھار کرنے کا جواز 112

کن جانوروں کی بیع کا جواز نہیں ہے 113

جانور کو گوشت کے بدلے فروخت کرنا 114

کتے کی قیمت کے بارے میں روایت 115

پیشگی ادائیگی کے ساتھ سامان کی بیع 116

سامان کے ضمن میں پیشگی 117

ایک بیع کے اندر دو بیع کی ممانعت 118

دھوکا بازی کی بیع 119

ہاتھ لگا کر اور چیز پھینک کر سودا کرنا 120

منافع پر بیچنا 121

فہرست کے مطابق بیع 122

بیع جس میں مال واپس کرنے کا اختیار ہو 122

قرضے میں ربا کے بارے میں 124

قرض اور حوالہ کے بارے میں جامع باب 126

خریدار کے دیوالیہ ہو جانے کے بارے میں 127

پیشگی دینے کی جائز شکلیں 128

پیشگی دینے کی ناجائز شکلیں 130

مول بھاؤ کرنے کے معاملے میں جن چیزوں سے روکا گیا ہے 133

معاملات پر جامع باب 135

کتاب القراض

قراض کے بارے میں روایات 139

کتاب المساقاۃ

بٹائی پر زراعت کے بارے میں روایات 142

کتاب کراء الارض

زرعی زمین کرایہ پر دینا 145

کتاب الشفعہ

وہ چیزیں جن میں شفعہ ہو سکتا ہے 146

وہ چیزیں جن میں شفعہ نہیں ہو سکتا 148

کتاب الاقضیہ

حق کے مطابق فیصلہ کرنے کی ترغیب 151

گواہوں کے بارے میں روایات 153
جس پر حد جاری ہو چکی ہو اس کی گواہی کے
بارے میں فیصلہ 156
گواہ کے ساتھ قسم کو ملا کر فیصلہ 158
دعویٰ میں فیصلہ کا اصول 160
جوں کی شہادت کے متعلق فیصلہ 161
منبر رسولؐ پر جھوٹی قسم کھانے کے
متعلق روایات 161
منبر پر قسم کے بارے میں جامع باب 163
رہن کے ضبط کا جواز نہ ہونے کے بارے میں 164
اس عورت کے بارے میں فیصلہ جس کے ساتھ
بالجبر برائی کی گئی ہو 166
اسلام سے مرتد کے متعلق فیصلہ 167
اس شخص کے بارے میں جو اپنی بیوی کو
دوسرے آدمی کے ساتھ دیکھ لے 170
پھینکے ہوئے بچے کے متعلق فیصلہ 173
بیٹے کو باپ کی طرف منسوب کرنے کے بارے
میں فیصلہ 174
ماں بننے والی لونڈیوں کے بارے میں فیصلہ 179
مردہ زمینوں کو آباد کرنے کے بارے میں فیصلہ 180
پانی کے بارے میں فیصلے 181
فوائد کے متعلق فیصلہ 183
مالوں کی تقسیم کے بارے میں فیصلہ 187
کون سا عطیہ جائز نہیں 188
ہبہ کے بارے میں فیصلہ 189
حین حیات کے لیے دی ہوئی چیز کے
متعلق فیصلہ 190
گرے پڑے مال کے بارے میں فیصلہ 192
گمشدہ یا آوارہ جانوروں کے متعلق فیصلہ 194
زندہ کا مردہ کی طرف سے صدقہ 196
وصیت کے متعلق حکم 199
بچے، کمزور دماغ اور نادان کی وصیت کے جواز کے
بارے میں 199
ایک ثلث سے زیادہ میں وصیت نہیں کر سکتے 200
حاملہ، مریض اور محاذ جنگ پر سپاہی کے
مالی معاملات 203
وارث کو وصیت کرنے اور قبضہ کے بارے میں 204
منصب قضا اور اس کے مکروہ ہونے کے
بارے میں 205

کتاب الحدود

رجم کے بارے میں روایات 211
اس شخص کے بارے میں جس نے اپنے متعلق
زنا کا اعتراف کر لیا 226
زنا کی سزا کے بارے میں جامع باب 230
تہمت لگانے، باپ کا بیٹا ہونے کی نفی کرنے اور
ایسا جملہ بولنے پر جس سے تہمت کا
مفہوم پیدا ہوتا ہو، کیا حد جاری ہو گی 234
جس صورت میں حد نافذ نہیں ہو گی 238

کتنی مقدار کی چوری پر ہاتھ کاٹا جائے گا 239
مفرور غلام، جو چور ہو، کے ہاتھ کاٹنے سے متعلق روایات 243
معاملہ صاحب امر تک پہنچ جائے تو چور کے حق میں سفارش نہیں کی جا سکتی 245
ہاتھ کاٹنے سے متعلق جامع باب 247
جس میں قطع ید کا جواز نہیں 249

کتاب الاشربہ

شراب خوری کی حد 255
کن برتنوں میں نبیذ بنانا ممنوع ہے 259
کن چیزوں کو ملا کر نبیذ بنانی مکروہ ہے 260
شراب کی حرمت 261
شراب کی حرمت سے متعلق جامع باب 263

کتاب العقول

دیت کا بیان 269
دیت پر عمل کس طریقے سے ہوگا 270
قتل عمد کی دیت جب ورثا اس کا دیت قبول کر لیں، اور مجنون کی سزا 272
غلطی سے قتل ہو جائے تو اس کی دیت 273
عورت کی دیت 275
حمل کے بچے کی دیت 277
جس میں کامل دیت ہوگی 279
آنکھ کی دیت جب اس کی بینائی جاتی رہے 280
سر اور چہرہ پر زخم کی دیت کیا ہوگی 280
انگلیوں کی دیت کیا ہوگی 281
دانتوں کی دیت کے بارے میں جامع باب 283
دانتوں کی دیت کے بارے میں عمل 284
غلاموں کے زخموں کی دیت 285
ذمیوں کی دیت 285
ایسی صورتیں جن میں آدمی کی دیت خاص اسی کے مال سے دی جائے گی 287
دیت کی میراث اور اس میں سختی کے بارے میں 288
دیت کے بارے میں جامع باب 291
دھوکے سے قتل کرنے اور جادو کرنے کے بارے میں 293
قتل عمد کے بارے میں حکم 295
قتل کے قصاص کے بارے میں 297

کتاب القسامہ

قسامہ کا آغاز مدعیوں سے کیا جائے گا 301

کتاب الجامع

مدینہ اور اس کے لوگوں کے لیے دعا 307
مدینہ کی رہائش اور اس سے نکلنے کے بارے میں 308
مدینہ کی حرمت کے بارے میں 316
مدینہ کی وبا کے بارے میں 318
یہود کے مدینہ سے جلا وطن کرنے کی روایات 321
مدینہ کے بارے میں جامع باب 323
طاعون کے بارے میں روایات 325
تقدیر پر کلام کی ممانعت 331

عمل قدر کے بارے میں جامع باب	340
حسن اخلاق کے بارے میں روایات	343
حیا کے بارے میں روایات	351
غصے کے بارے میں روایات	353
… … چھوڑنے کے بارے میں	355
زینت کے لیے لباس پہننے کے بارے میں	360
نقش دار کپڑے اور سونا پہننے کے بارے میں	364
ریشم پہننے کے بارے میں	365
عورتوں کے لیے کون سا کپڑا پہننا مکروہ ہے	366
مرد کے اپنی تہمد لٹکانے کے بارے میں	368
عورت کے کپڑا لٹکانے کے بارے میں	370
موزہ پہننے کے بارے میں	371
جوتوں کے پہننے کے بارے میں	372
نبی ﷺ کے حلیہ کے بارے میں	375
حضرت عیسیٰ بن مریم اور دجال کے حلیہ کے بارے میں	376
فطرت کی سنت کے بارے میں	378
بائیں ہاتھ سے کھانے کی ممانعت کے بارے میں	381
مساکین کے بارے میں	382
کافر کی آنتوں کے بارے میں	383
چاندی کے برتن میں پینے اور پینے کی چیز میں پھونک مارنے کی ممانعت	385
کھڑے کھڑے پانی پینے کے بارے میں روایات	387
پینے اور داہنے سے پکڑانے کے بارے میں سنت	388
کھانے اور پینے کے بارے میں جامع باب	389
گوشت کھانے کے بارے میں	408
انگوٹھی پہننے کے بارے میں روایات	409
نظر بد سے بچنے کے لیے پٹے اور گھنٹیاں اتارنے کے بارے میں	410
نظر بد کے سبب سے وضو کا حکم	411
نظر بد کے لیے جھاڑ پھونک کرنا	414
بیمار کے اجر کے بارے میں	416
مرض سے پناہ مانگنا اور جھاڑ پھونک کرنا	418
مریض کے علاج کے بارے میں	421
بخار میں پانی سے غسل کے بارے میں	422
مریض کی عیادت اور شگون کے بارے میں	425
بالوں کے بارے میں سنت	427
بالوں کو سنوارنے کے بارے میں	431
بال رنگنے کے بارے میں	432
تعوذ کے بارے میں کیا حکم ہے؟	434
ان لوگوں کے بارے میں جو اللہ کے لیے محبت کرتے ہیں	438
خواب کے بارے میں روایات	445
نرد کے بارے میں روایات	449
سلام کرنے کا طریقہ	452
کسی یہودی اور نصرانی کو سلام کرنے کے بارے میں	454
سلام کے بارے میں جامع باب	455

اجازت لینے کے بارے میں باب 459

چھینک آنے پر دعائیہ کلمات کہنے کے بارے میں 462

تصویروں اور مورتیوں کے بارے میں روایات 463

گوہ کھانے کے بارے میں 466

کتوں کے بارے میں روایات 470

بکریوں کے بارے میں روایات 472

چوہیا کے گھی میں گر جانے اور نماز سے پہلے کھانا شروع کرنے کے بارے میں 476

نحوست سے بچنے کے لیے کیا کیا جائے 477

ایسے نام جن میں ناگواری ہوتی ہے 478

پچھنا لگانے اور پچھنا لگانے والے کی اجرت سے متعلق روایات 481

مشرق کے بارے میں روایات 483

سانپوں کے مارنے کے بارے میں کیا احکام اور اقوال ہیں 484

سفر میں کلام کے بارے میں احکام 489

مردوں اور عورتوں کے اکیلے سفر کرنے کے بارے میں روایات 491

سفر میں کیا کرنے کا حکم ہے 492

غلام کے ساتھ نرم رویہ کا حکم 495

غلام اور اس کی بیعت کے بارے میں روایات 497

بیعت کے بارے میں روایات 498

کیا باتیں ہیں جو مکروہ ہیں 501

بات کرنے میں احتیاط کے بارے میں حکم 503

اللہ کے ذکر کے بغیر کی ہوئی بات کا ناپسندیدہ ہونا 505

غیبت کے بارے میں حکم 507

زبان کے فتنے سے اندیشہ کے بارے میں روایات 508

تیسرے ساتھی کو چھوڑ کر دو آدمیوں کے سرگوشی کرنے کے بارے میں روایات 510

جھوٹ اور سچ کے بارے میں روایات 511

مال کے ضائع کرنے اور دوہرا چہرہ رکھنے کے بارے میں 516

خاص لوگوں کے گناہوں کے باعث عام عذاب نازل ہونے کے بارے میں روایات 518

خدا ترسی اور خشیت الٰہی کے بارے میں روایات 520

کڑکا سننے پر کیا کہنا چاہیے 521

نبی ﷺ کے ترکہ کے بارے میں 521

جہنم کی خصوصیات کے بارے میں روایات 524

صدقہ کے بارے میں ترغیب 525

سوال سے احتراز کے بارے میں روایات 531

صدقہ میں کیا چیز مکروہ ہے 537

طلب علم کے بارے میں 540

مظلوم کی بددعا سے بچنے کے بارے میں 541

نبی ﷺ کے اسماء 543

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

موطا امام مالک کی یہ شرح مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کے ان دروس پر مبنی ہے جو انہوں نے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں اپنے قائم کردہ ادارہ ـــــ ادارہ تدبر قرآن و حدیث ـــــ میں دیے۔ یہ ادارہ ان کی تفسیر تدبر قرآن کی تکمیل کے بعد خاص اس مقصد سے قائم کیا گیا کہ جب تک مولانا کے قویٰ اجازت دیں، وہ حدیث کا درس دیں گے اور اس پر جو تحقیق انہوں نے کی ہے اس کے نتائج منظر عام پر لائیں گے۔ چنانچہ مولانا نے پہلے اصول حدیث پر متعدد لیکچر دیے جن میں وہ اصول و مبادی بیان کیے جو فہم حدیث اور روایات کے صحت و سقم کا فیصلہ کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اس کے بعد تعلیم حدیث کے لیے موطا امام مالکؒ کا انتخاب کیا کیونکہ یہ ایک مختصر مجموعہ حدیث ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فقہی مسلک کی نمائندہ کتاب بھی ہے، نیز یہ متعدد دینی درس گاہوں کے نصاب میں شامل ہے۔ ولی اللٰہی مکتب فکر میں اس کی اہمیت اس حقیقت سے واضح ہو جاتی ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے عربی اور فارسی دو زبانوں میں اس کی شرحیں لکھیں۔

مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے حدیث پر کام کا آغاز کرتے ہوئے لکھا:

> "قرآن پر غور کرنے کا جو صحیح طریقہ ہے وہ میں نے تفسیر تدبر قرآن میں واضح کر دیا ہے اور پورے قرآن کی تفسیر کر کے یہ دکھا بھی دیا ہے کہ اگر یہ راہ اختیار کی جائے تو وہ تمام اختلافات آپ سے آپ رفع ہو جاتے ہیں جو محض قرآن کا صحیح علم نہ ہونے کے سبب سے پیدا ہو گئے ہیں۔ میرے نزدیک حدیث پر غور کرنے کے طریقے میں بھی بنیادی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس وقت حدیث کی تعلیم ہر مکتب فکر کے علماء اپنے اپنے تقیدات کے تحت دے رہے ہیں۔ کلام و عقائد اور فقہیات میں جس گروہ کا جو مسلک ہے وہ کوشش کرتا ہے کہ قرآن و حدیث دونوں سے وہ اپنی تائید حاصل کرے، اگرچہ اس کے لیے اسے کتنا ہی ظلم کرنا پڑے۔ حالانکہ صحیح علمی طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی طرح پورے ذخیرۂ حدیث پر بھی براہ راست ان کے الفاظ، ان کے موقع و محل، ان کے سیاق و سباق، ان کے نظائر و شواہد اور قرآن کے

ساتھ ان کی موافقت یا عدم موافقت کے پہلو سے غور کیا جائے اور بغیر کسی گروہی تعصب کے وہ حدیثیں اختیار کی جائیں جو مذکورہ کسوٹی پر پوری اترتی ہوں، اگرچہ وہ ہماری خواہشوں کے خلاف ہوں۔ ہمیں اتباع بہر حال رسول اللہ ﷺ کی کرنی ہے نہ کہ اپنی خواہشوں کی یا کسی خاص فقہ و کلام کی"۔

مولانا کے مذکورہ لیکچر جن میں انھوں نے حدیث پر غور و فکر کے اصول کی وضاحت کی مرتب ہو کر کتابی صورت میں "مبادی تدبر حدیث" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ "ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس میں کوئی مجھے منفرد قرار دے سکے۔ یہ ساری باتیں ہمارے ائمہ حدیث کی مستند کتابوں سے ماخوذ ہیں اور یہ ایسی معقول اور فطری ہیں کہ کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کر سکتا"۔

محدثین کے ہاں کسی حدیث کو پرکھنے کے لیے سند کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے۔ اگر سند کے رجال میں کوئی خرابی نظر نہ آتی ہو تو روایت کو حدیث رسول مان لیا جاتا ہے اور متن میں بھی اعتراضات پیدا ہوتے ہوں جب بھی روایت کے خلاف کچھ کہنا گویا کفر قرار پاتا ہے۔ مولانا اصلاحی کے نزدیک یہ رویہ غلو پر مبنی ہے کیونکہ سند کے تمام محاسن، لطائف، عظمت، اہمیت اور اس کے مطابق معیار ہونے کے باوجود اس میں کئی فطری خلا موجود رہتے ہیں۔ لہذا مولانا مجرد سند کو کسی روایت کی تحقیق کا صرف ایک ذریعہ سمجھتے ہیں جبکہ متن حدیث کو پرکھنے کے لیے درایت کے اصولوں کو کام میں لاتے ہیں۔ چونکہ سند کے اعتبار سے امت نے موطا، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا بلند درجہ تسلیم کیا ہے، لہذا مولانا فی الجملہ ان کی تحقیق رجال کو کافی سمجھتے لیکن متن حدیث کو محل تدبر قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذخیرۂ حدیث کے غالب حصہ میں روایت بالمعنیٰ ہوئی ہے جس میں نبی ﷺ کے اقوال کو نقل کرنے میں غلطی کا احتمال ہو سکتا ہے۔

متن حدیث کو پرکھنے کے لیے مولانا نے جو طریق کار تجویز کیا اور اپنایا ہے وہ حسب ذیل نکات پر مشتمل ہے:-

(۱) حق و باطل میں امتیاز اور دین و شریعت کی ہر چیز کی جانچ کے لیے کسوٹی قرآن مجید ہے۔ لہذا متن حدیث میں تردد ہونے کی صورت میں روایت قرآن مجید ہی کی ترازو میں تولی جائے گی۔ اس کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول کی ہوئی روایت میں یہ امکان موجود ہوتا ہے کہ آدمی اس چیز کو دین بنالے جو دین نہیں ہے۔

(ب) جس طرح قرآن کی تمام دعوت عقل و فطرت پر مبنی ہے اور اپنے دعاوی پر شہادت انہی سے پیش کرتی ہے اسی طرح صحیح حدیث کی کوئی بات عقل و فطرت کے منافی نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی روایت اس کے منافی نظر آئے تو اس پر اچھی طرح غور کرنا ہوگا یہاں تک کہ اپنی عقل کی کوتاہی واضح ہو جائے یا روایت کا ضعف سمجھ میں آجائے۔

(ج) حدیث کی اصل زبان ٹکسالی عربی ہے۔ لہذا ہر باب میں ان احادیث کو مقدم رکھا جائے گا جن کی زبان عہد نبوت و عہد صحابہؓ کی زبان سے ہم آہنگ ہو۔

(د) راوی حضرات اپنے ذوق کے مطابق واقعہ کے کسی حصہ کی روایت کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں بعض اہم اور ضروری حصے چھوٹ جاتے ہیں۔ لہذا کسی نامکمل روایت کی تاویل اس قسم کی دوسری روایات کے ساتھ ملا کر کرنی ہوگی۔ اس طرح جو مضمون متعین ہوگا وہ اصل ہوگا۔

(ہ) متن میں کلام کے عموم و خصوص، موقع و محل اور خطاب کا فہم حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ اس سے صرف نظر کرنے سے بعض روایات کی توجیہ اس قدر غلط ہوگی کہ اسلام کو مطعون کرنے کی راہ کھل گئی۔

مولانا کی رائے میں جو لوگ صرف اپنے فقہی مسلک ہی کی حدیثیں پڑھنے پڑھانے پر قانع ہیں ان کا کام آسان ہے۔ ممکن ہے وہ ان اصولوں کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ کر سکیں بلکہ اندیشہ ہے کہ وہ ان سے متوحش ہوں۔ لیکن جن لوگوں کو پورے ذخیرۂ حدیث کی چھان بین کرنا اور اس کو دین کے ماخذ کی حیثیت سے تمام خلق کے سامنے پیش بھی کرنا ہو ان کے ہاتھوں میں ایک کسوٹی کا ہونا ضروری ہے جس کو ایک کسوٹی تسلیم کرنے سے کوئی صاحب انصاف انکار نہ کر سکے۔ مولانا نے عملاً ان اصولوں کی روشنی میں مؤطا کے متون حدیث کا مطالعہ کیا اور ان کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے جو قارئین کو اس کتاب میں ملے گی۔ سند پر مولانا نے بہت کم کام کیا ہے البتہ اس میں بھی کہیں کہیں بعض اسقام کی نشاندہی کی ہے۔

مؤطا چونکہ اصلاً مالکی فقہ کی کتاب ہے اس لیے مولانا نے امام مالک رحمہ اللہ کے فتاویٰ اور آراء کا محاکمہ بھی کیا ہے۔ چنانچہ متون کی وضاحتوں میں فقہی مسالک کا تقابلی مطالعہ بھی ہو گیا ہے۔

مولانا نے مؤطا کے یہ دروس پیرانہ سالی میں دیے جب ان کی عمر اسی سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اس وقت ان کے لیے احادیث و روایات کی شرح خود لکھنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ دروس کو ٹیپ کر لیا گیا۔ بعد ازاں ان کو ٹیپ سے اتار کر تحریر کے اسلوب میں مرتب کرنے کا کام کیا گیا۔ ان دروس کا معتد بہ حصہ مولانا کی حیات میں ادارہ تدبر

قرآن و حدیث کے ترجمان رسالہ 'تدبر' میں چھپا اور برابر ان کی نظر سے گزرتا رہا۔ مولانا نے اس کوشش پر ہمیشہ اطمینان کا اظہار کیا۔ گویا اس کتاب میں دی گئی وضاحتیں مولانا کے اپنے قلم سے نہیں نکلیں بلکہ ٹیپ کی مدد سے مرتب کر کے اور تحریر کے اسلوب میں ان کو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے اور یہ کام برادرم سعید احمد صاحب نے بڑے شوق اور انہماک کے ساتھ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس سعی کو مشکور فرمائے۔ یہ کتاب پوری مؤطا پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس کو منتخب ابواب پر مشتمل کہا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا کی پیرانہ سالی اور گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر بعض ایسے ابواب کو چھوڑ دیا گیا جن میں صرف امام مالکؒ کے فتاویٰ بیان ہوئے ہیں (اور ایسے ابواب کی تعداد مؤطا میں کم نہیں ہے) یا جن کا موضوع اب عملی زندگی سے تقریباً ختم ہو چکا ہے، جیسے غلامی کا مسئلہ۔ لہٰذا ایسے عنوانات پر وقت صرف کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ عبادات سے متعلق ابواب نامکمل رہ گئے تھے اس لیے ان کو بھی اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا گیا۔ بعد میں اگر محسوس ہوا کہ ان کے دروس میں سے کوئی مفید مجموعہ مرتب کیا جا سکتا ہے تو اس کو بھی ان شاء اللہ افادہ عام کے لیے شائع کر دیا جائے گا۔

امید ہے کہ مؤطا امام مالک کے منتخب ابواب کی یہ شرح حدیث پر غور کرنے والوں کے لیے بے حد مفید ثابت ہو گی۔ یہ ان کو مطالعہ حدیث کے ایک نئے نہج سے آشنا کرے گی جو بالکل فطری ہونے کے باعث ان کو اطمینان کی دولت سے مالا مال کرے گا۔ رب کریم مولانا رحمہ اللہ کی پیرانہ سالی کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور یہ شرح فہم حدیث کے لیے مشعل راہ ثابت ہو۔ اللہ تعالیٰ ان کارکنان ادارہ کی محنت کا بھی اجر عطا فرمائے جنھوں نے اس کو منظر عام پر لانے میں کسی طرح کا تعاون کیا ہے۔

خالد مسعود

ناظم ادارہ تدبر قرآن و حدیث

لاہور

۵۔ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ

امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ

مؤطا امام دار الہجرہ ابو عبد اللہ مالکؒ بن انسؒ بن مالکؒ بن ابی عامر انسؓ کی تصنیف ہے جو ۹۳ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ بزرگوں کا وطن یمن تھا اور وہ حمیر کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ امام صاحب کے پردادا ابو عامر انسؓ مشرف بہ اسلام ہو کر مدینہ آگئے۔ بعض محدثین کے نزدیک انہوں نے نبی ﷺ کے ہمراہ غزوات میں شرکت کی لیکن دوسرے محدثین آنحضرتؐ سے ان کی ملاقات کی نفی کرتے ہیں۔ امام صاحب کے دادا مالکؒ تابعی تھے اور وہ ان چند لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی تدفین میں شرکت کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں دار الخلافہ کوفہ منتقل ہو گیا اور ان کے بعد اموی خلفاء نے دمشق کو دار الحکومت قرار دیا۔ سیاست و حکومت کے مراکز بڑی تعداد میں لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، لہٰذا دار الخلافہ کی تبدیلی نے مدینہ منورہ کی مرکزیت کو بھی متاثر کیا اور علم کے مراکز دوسرے شہروں میں منتقل ہو گئے۔ تاہم امام صاحب کے زمانہ تک مدینہ میں ابھی اہل علم بھی موجود تھے اور علم کا چرچا بھی تھا۔ امام مالکؒ نافع رحمہ اللہ کے درس میں شامل رہے اور مدنی علماء و فقہاء سے استفادہ کیا لیکن تحصیل علم کے لیے مدینہ منورہ سے باہر نہیں نکلے۔ اسی لیے ان کے شیوخ میں غیر مدنی شیوخ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ نافع کے بعد ان کی مسند امام مالکؒ نے سنبھالی اور باسٹھ سال تک حدیث کا درس دیتے رہے۔ چھیاسی برس کی عمر میں ۱۷۹ھ میں انتقال ہوا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

<u>مؤطا کی تالیف :</u>

امام صاحب کی تالیفات میں مؤطا کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس کتاب کو انہوں نے فقہی عنوانات کے تحت مرتب فرمایا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ مؤطا کی ترتیب امام ابو حنیفہؒ کی کتاب الآثار کی طرز پر ہے

جو اس سے قبل تصنیف ہو چکی تھی البتہ نوعیت اس کی بالکل مختلف ہے۔ کتاب الآثار میں صرف روایات ہیں لیکن موطا فقہ مالکی کی کتاب ہے جو احادیث کے علاوہ آثار صحابہ اور اہل مدینہ کے علم و عمل کی خبر پر مشتمل ہے۔ چونکہ امام صاحب ہمیشہ مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہے اس لیے ان کو فقہی امور میں خلفائے راشدینؓ کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ اور فقہائے مدینہ سعید بن المسیبؒ، عبید اللہ بن عتبہ بن مسعودؒ، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمدؒ، ابوبکر بن عبدالرحمنؒ، سلیمان بن یسارؒ اور خارجہ بن زیدؒ کے فیصلوں سے رہنمائی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ امام مالک کی فقہ کی بنیاد انہی فقہاء کے علم اور اہل مدینہ کے عمل پر ہے اور انہی کے آثار و فتاویٰ موطا میں جمع کیے گئے ہیں۔

مملکت اسلامیہ میں جب تیزی سے وسعت ہوئی تو ایک طرف فیصلہ طلب مسائل کی کثرت ہوئی اور دوسری طرف مفتیوں اور قاضیوں کا محض اپنے علم کی مدد سے مقدمات کے فیصلے صادر کرنا مشکل ہو گیا۔ ان کے سامنے مجتہدین کی آراء کسی مرتب صورت میں موجود نہ تھیں۔ عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کو فقہ اسلامی مرتب کرانے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ۱۴۳ھ میں جب وہ حج کے لیے گیا تو اس نے امام مالکؒ سے ملاقات میں یہ خواہش کی کہ وہ اپنی فقہ اگر مرتب کر دیں تو وہ اس کو پوری مملکت اسلامیہ میں نافذ کرنے کو تیار ہے۔ اس نے تدوین فقہ سے متعلق اپنا نقطہ نظر امام صاحب کے سامنے ان الفاظ میں رکھا:۔

> "اے ابو عبداللہ! آپ علم فقہ کو اپنے ہاتھ میں لیجیے اور اس کو الگ الگ ابواب کی صورت میں مدون کر ڈالیے۔ عبداللہ بن عمرؓ کے تشددات، عبداللہ بن عباسؓ کی رخصتوں اور عبداللہ بن مسعودؓ کی انفرادیات سے بچتے ہوئے ایک ایسا ضابطہ مدون کیجیے جو خیر الامور اوسطھا کے اصول پر مبنی ہو اور جو ائمہ اور صحابہ رضی اللہ عنھم کے فتووں اور مسائل کا مجموعہ ہو۔ اگر آپ نے یہ خدمت انجام دے دی تو ان شاء اللہ آپ کی فقہ پر ہم

مسلمانوں کو مجتمع کر دیں گے اور اپنی تمام مملکت میں اس کو جاری کر کے اعلان کر دیں گے کہ کسی صورت میں اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے"۔

عام خیال یہ ہے کہ امام مالکؒ نے ابو جعفر منصور کی تجویز کو پسند کیا اور اس کی خواہش کے مطابق موطا مرتب کر دی لیکن کتاب کی تکمیل سے قبل ہی خلیفہ کا انتقال ہو گیا لہذا یہ کتاب پوری مملکت کے لیے مرتب قانون کی جگہ نہ لے سکی۔ یوں بھی امام صاحب اپنی فقہ کو سرکاری حکم نامہ کے ذریعہ سے نافذ کرنے کے حق میں نہ تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ بلاد اسلامیہ میں ہر گروہ کے لوگ الگ الگ فقیہوں پر اعتماد کرتے ہیں اس وجہ سے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا ہی بہتر ہو گا۔

موطا کا سبب تالیف خود اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ کتاب محض ایک مجموعہ احادیث نہیں بلکہ فقہ کی کتاب ہے جس میں امام صاحب نے اپنے مذہب کو احادیث، آثار صحابہؓ، فقہائے مدینہ کے فتاویٰ اور تابعین کے اقوال کی مدد سے ثابت کیا ہے۔ چنانچہ ابو بکر ابہری کے نزدیک موطا کی روایات کی کل تعداد ۱۷۲۰ ہے جن میں احادیث صرف چھ سو ہیں۔ تا تمام اسناد کے ساتھ ۸۳۵ روایات آئی ہیں جن میں ۲۲۲ مرسل اور ۶۱۳ موقوف ہیں۔ تابعین کے اقوال و فتاویٰ کی تعداد ۲۸۵ ہے۔ چونکہ امام صاحب عمل اہل مدینہ کو اجتہاد کی ایک بنیاد مانتے ہیں اس لیے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے اتنی کثرت سے آثار صحابہ و تابعین سے استدلال کیوں کیا ہے۔ روایات نقل کرنے کے بعد وہ خود اپنے فتوے بیان کرتے ہیں اور کتاب کے بے شمار ابواب تو ایسے ہیں جن میں امام صاحب کو نہ کوئی حدیث ملی اور نہ آثار صحابہ میں کوئی رہنمائی ملی چنانچہ انہوں نے اپنے اجتہاد سے مسائل بیان کیے ہیں۔

موطا میں چونکہ مرسل، منقطع اور معضل روایات جمع کر دی گئی تھیں اس لیے بعد میں محدثین نے ان پر تحقیق کر کے روایات کو متصل اور مرفوع کرنے کی سعی بلیغ کی۔ کتاب کو حسن قبول عطا ہوا اور امام مالکؒ سے اس کتاب کو بکثرت لوگوں نے روایت کیا۔ چنانچہ کتاب کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر اور کمی و زیادتی واقع

ہو گئی ہے۔ سب سے مشہور و متداول نسخہ یحییٰ بن یحییٰ مصمودی اندلسی کا نسخہ ہے جس کی شرحیں امام سیوطیؒ، زرقانی اور شاہ ولی اللہ نے لکھیں۔ جہاں تک موطا کی کل شرحوں کا تعلق ہے تو ان کی تعداد ایک سو سے متجاوز بیان کی جاتی ہے۔ دور حاضر کی نہایت جامع شرح مولانا محمد زکریا کی اوجز المسالک الی موطا امام مالک ہے۔

امام مالکؒ کا قول نقل ہوا ہے کہ اس کتاب کو لکھ کر میں نے مدینہ کے ستر فقہاء کے سامنے پیش کیا اور ان سب نے مجھ سے اتفاق کیا۔ اس لیے میں نے کتاب کا نام مؤطا رکھا۔ گویا مؤطا وہ راہنمائی فراہم کرتی ہے جس پر علماء و فقہاء چلے ہوں اور اس سے اتفاق کرتے ہوں۔ مؤطا کے لفظی معنی روندی ہوئی چیز کے ہیں جس پر لوگ چلے ہوں۔

امام صاحب کے شاگردوں میں ہزاروں لوگ ہیں۔ ان میں بڑے نام امام شافعیؒ، امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کے ہیں۔ امام محمدؒ نے بھی مؤطا کی الگ روایت کی ہے اور اس میں امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور دیگر حضرات سے بھی روایات نقل کی ہیں۔ اس لیے اس میں روایات کی تعداد زیادہ ہے۔

خالد مسعود

تذکرہ مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ ہندوستان کے ضلع اعظم گڑھ (یو۔پی) کے ایک گاؤں بمہور کے ایک متوسط زمیندار گھرانے میں ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حافظ محمد مرتضیٰ ایک دیندار، متبع سنت اور تہجد گزار شخص تھے جنہوں نے بیٹے کو ابتدائی دینی تعلیم اپنے گاؤں کے مکتب میں دلوائی۔ مولانا دس برس کے ہوئے تو انہیں ضلع اعظم گڑھ کی مشہور دینی درس گاہ۔۔مدرسۃ الاصلاح سرائے میر۔۔ کے تیسرے درجہ میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ مدرسہ مولانا شبلی نعمانی کی نگرانی میں رہا تھا اور اس وقت اس کے مہتمم علامہ شبلیؒ کے عزیز شاگرد مولانا شبلی متکلم ندوی تھے۔ مدرسہ میں مولانا کو جو ماحول ملا وہ ان کے لیے بے حد سازگار ثابت ہوا۔ اس نے مولانا کے علم و عمل کو جلا بخشی اور ان کی تحریر و تقریر کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کیا۔ مولانا مدرسہ کا تعلیمی کورس آٹھ برس میں مکمل کر کے ۱۹۲۲ء میں فارغ ہوئے۔ عملی زندگی میں اپنے استاذ و مربی مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کے مشورہ سے انہوں نے اخبار 'مدینہ' بجنور کے عملہ ادارت میں شمولیت اختیار کی اور اڑھائی تین سال صحافت کے پیشہ میں رہے۔ ۱۹۲۵ء میں مدرسۃ الاصلاح کا انتظام مولانا حمید الدین فراہیؒ نے سنبھالا تو مدرسہ کے کورس میں کئی بنیادی تبدیلیاں کیں اور قرآن مجید کی تحقیقی تعلیم کو خاص اہمیت دی۔ انہوں نے قرآن کو سمجھنے پر پوری زندگی صرف کی تھی اور فہم قرآن کے لیے نصوص پر مبنی اصول تفسیر قائم کرنے کے علاوہ متعدد سورتوں کی منفرد تفسیر لکھی تھی۔ ان کے ایماء پر مولانا اصلاحی اخبار نویسی کا لاطائل مشغلہ چھوڑ کر بطور مدرس مدرسۃ الاصلاح میں آ گئے۔ مولانا فراہیؒ نے مدرسہ کے اساتذہ کو قرآن فہمی کی تربیت دینے کے لیے درس کا سلسلہ شروع کیا جو ۱۹۳۰ء میں ان کی وفات تک جاری رہا۔ اس درس سے خاص طور پر جن دو اساتذہ نے تحقیقی فائدہ اٹھایا ان میں مولانا اختر احسن اور مولانا امین

احسن کے نام آتے ہیں۔ ان دونوں کے ذریعے استاذ کا فکر خوب پھیلا لیکن اس فکر کو ترقی دینے اور علمی دنیا کو اس سے متعارف کرانے میں مولانا امین احسنؒ کی جو شاندار خدمات ہیں ان کی بدولت وہ بجا طور پر مولانا فراہیؒ کے جانشین سمجھے جاتے ہیں۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ کے انتقال کے بعد مولانا اصلاحیؒ کی خواہش ہوئی کہ جس پایہ کے استاذ سے انھوں نے قرآن فہمی کے رموز سیکھے اسی پایہ کے کسی شیخ الحدیث سے حدیث کی تعلیم حاصل کریں۔ وہ اپنی کتاب 'مبادی تدبر حدیث' میں لکھتے ہیں :-

> "اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ مجھے ابتدا ہی سے قرآن شریف کی طرح حدیث شریف سے بھی کبھی انکار نہیں رہا ہے۔ چنانچہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد میرے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک امام فن سے قرآن مجید سیکھنے اور سمجھنے کی توفیق بخشی اسی طرح کسی صاحب فن سے حدیث کے سیکھنے اور سمجھنے کا بھی انتظام فرما دے"۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا اصلاحیؒ کی یہ آرزو پوری کی۔ وہ ۱۹۳۱ء میں اپنے دیار کے جید شیخ الحدیث اور جامع ترمذی کے شارح مولانا محمد عبد الرحمٰن بن عبد الرحیم مبارکپوریؒ کی خدمت میں شرف تلمذ کے لیے حاضر ہوئے۔ مولانا مبارک پوری نہایت عالی سند رکھتے تھے۔ وہ سید محمد نذیر حسینؒ محدث دہلوی کے شاگرد تھے جن کا سلسلہ سند مولانا محمد اسحاق دہلویؒ اور شاہ عبد العزیزؒ محدث دہلوی کے واسطے سے شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے، جنھوں نے شیخ ابو الطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی سے اجازت حدیث لی تھی۔ مولانا مبارک پوریؒ کو جب معلوم ہوا کہ ان سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے خواہشمند نوجوان مدرسۃ الاصلاح کے فارغ التحصیل ہیں تو انھوں نے تبرکاً ایک سبق پڑھا کر ان کو اجازت حدیث مرحمت فرمانا چاہی لیکن مولانا اصلاحیؒ نے درخواست کی کہ محض اجازت کے حصول کے لیے میں آپ کے پاس نہیں آیا بلکہ چاہتا ہوں کہ سبقاً سبقاً آپ سے علم حدیث حاصل کروں۔ چونکہ آپ جامع ترمذی میں اختصاص رکھتے ہیں اس لیے یہی کتاب پڑھا دیجیے۔ اس پر مولانا مبارک پوری نے پوری جامع ترمذی کا درس دیا اور

اصول میں شرح نخبۃ الفکر پڑھائی، نیز رجال کی تحقیق کا طریقہ بتایا۔ آخر میں بطور سند جامع ترمذی کا ایک نسخہ اپنے دستخط سے مزین فرما کر شاگرد کو عنایت کیا۔ مولانا اصلاحی بیان کرتے تھے کہ مولانا مبارک پوری سے شرف تلمذ حاصل ہونے کے بعد میرے اندر یہ شوق پیدا ہوا کہ صحیحین میں سے کسی ایک کتاب کی شرح تمام صحاح کو سامنے رکھ کر معمول جو احادیث پر غور و تدبر اور ان کی تحقیق و تنقید کی قابل اعتماد راہ کھولے لیکن عملاً اس منصوبے پر کام کرنا جلد ممکن نہ ہو سکا۔

مولانا اصلاحیؒ نے مدرسہ میں قیام کے دوران ۱۹۳۵ء میں دائرہ حمیدیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کا کام مولانا فراہیؒ کی عربی تفسیر کا اردو میں ترجمہ کرنا، ان کی غیر مطبوعہ تصانیف کی ترتیب و تہذیب و اشاعت اور ان کے فکر کی ترویج کے لیے ایک ماہنامہ کا اجرا تھا۔ 'الاصلاح' کے نام سے شائع ہونے والا یہ ماہنامہ چار سال بڑی کامیابی سے شائع ہوتا رہا۔ مدرسہ میں قیام کے دوران میں مولانا نے حقیقت شرک، حقیقت توحید، حقیقت تقویٰ اور حقیقت نماز کے نام سے کتب تحریر کیں۔ ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی قائم ہوئی تو مولانا اصلاحی اس میں شامل ہوئے اور اپنے علمی مرتبہ و مقام کی بدولت اس کے صف اول کے عمائدین میں شمار ہونے لگے۔ ۱۹۴۳ء کے اوائل میں مولانا مودودیؒ کی ہدایت پر مرکز جماعت میں خدمات سرانجام دینے کے لیے وہ مدرسہ کو خیرباد کہہ کر پٹھانکوٹ منتقل ہو گئے۔ پاکستان وجود میں آیا تو جماعت اسلامی کے دفاتر لاہور میں قائم کیے گئے اور مولانا بھی لاہور میں مقیم ہو گئے۔ وہ نائب امیر جماعت اور رکن مجلس شوریٰ کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔ سولہ سترہ سال کی جماعتی وابستگی کے بعد بعض اصولی اختلافات کی بنا پر جنوری ۱۹۵۸ء میں جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے۔ اس دوران میں انھوں نے نئی اسلامی مملکت کی ضروریات کے پیش نظر 'اسلامی ریاست' کے نام سے ایک سلسلہ کتب لکھا جس میں شہریت کے حقوق و فرائض، غیر مسلموں کے حقوق، کارکنوں کی ذمہ داریاں اور ان کے اوصاف، فقہی اختلافات کا حل، اور اطاعت کے شرائط اور حدود اہم عنوان تھے۔ اس کے علاوہ اسلامی قانون کی تدوین، اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام، عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ اور قرآن میں پردہ کے احکام کے ناموں سے ان کی تصانیف

سامنے آئیں۔ جماعتی ضرورت کے تحت مولانا نے دعوت دین اور اس کا طریق کار اور تزکیہ نفس کے موضوعات پر کتابیں لکھیں۔

جماعت اسلامی کو خیر باد کہنے کے بعد مولانا اصلاحی قرآن مجید کی تفسیر لکھنے میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ اس کے علاوہ اپنے افکار کی اشاعت کے لیے انھوں نے ماہنامہ میثاق جاری کیا، نیز علمی و دینی تربیت کے لیے حلقہ ہائے درس قائم کیے جن سے بیسیوں نوجوانوں نے فائدہ اٹھایا۔ مولانا کی عظیم تفسیر 'تدبر قرآن' نو جلدوں میں تیار ہوئی۔ یہ تفسیر ان کی غیر معمولی محنت اور فکر و تدبر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس میں مولانا کی تحقیق کا رنگ، اسلوب نگارش، طرز استدلال ہر چیز ایسی ہے جو اس کارنامہ کو منفرد بنا دیتی ہے۔ مولانا قرآن مجید کو ایک مربوط و منظم کلام مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر سورہ ایک اکائی ہے جس کا ایک ہی مرکزی مضمون ہوتا ہے اور سورہ کی تمام آیات اسی مضمون سے متعلق اور مربوط ہوتی ہیں۔ اس طرح ہر آیت اپنے سیاق و سباق میں ایک ہی معنی کی حامل ہوتی ہے۔ یہ تفسیر دین میں وحدت فکر پیدا کرنے کا اہم ذریعہ بن گئی ہے۔

مولانا نے جو حلقہ ہائے درس قائم کیے ان میں قرآن مجید اور حدیث شریف کا باقاعدہ درس ہوتا رہا۔ حدیث میں مولانا نے مؤطا امام مالکؒ، صحیح مسلم اور صحیح بخاری کا درس دیا۔ قرآن و حدیث کی تفہیم کا یہ سلسلہ ۱۹۹۳ء تک جاری رہا جس کے بعد مولانا کی پیرانہ سالی اور جسمانی کمزوری اور نقاہت کے باعث اس کو منقطع کرنا پڑا۔ آخری دس سالوں میں مولانا کی کتابیں۔۔ مبادی تدبر قرآن، مبادی تدبر حدیث، فلسفہ کے بنیادی مسائل قرآن کی روشنی میں، مقالات اصلاحی، تفہیم دین، اصول فہم قرآن۔۔ منظر عام پر آئیں۔ قرآن و حدیث کا یہ عظیم شارح و خادم ۱۵ دسمبر ۱۹۹۷ کو اپنے رب سے جا ملا۔ دعا ہے کہ رب کریم مولانا اصلاحی کی علمی و دینی خدمات اور صدقات جاریہ کو شرف قبولیت عطا فرمائے، ان کے درجات کو بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں ان کو مقام نصیب فرمائے۔

خالد مسعود

کتاب الزکوٰۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مَا تَجِبُ فِيهِ الزَّكَاةُ

زکوٰۃ کس مقدار پر واجب ہوتی ہے

۱ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى الْمَازِنِيِّ عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِيَّ يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: لَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسِ ذَوْدٍ صَدَقَةٌ" وَلَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسِ أَوَاقٍ صَدَقَةٌ" وَلَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ صَدَقَةٌ"۔

﴿حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پانچ اونٹوں سے کم پر صدقہ نہیں، پانچ اوقیہ سے کم میں صدقہ نہیں اور پانچ وسق سے کم میں صدقہ نہیں﴾

وضاحت:

یہ حدیث امام بخاریؒ نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے مختلف واسطوں سے نقل کی ہے۔اس میں جملوں کی ترتیب بدلی ہوئی ہے اور خمس اواق کا ذکر پہلے ہے۔امام مسلم نے یہی حدیث حضرت ابو سعید خدریؓ سے مختلف واسطوں سے نقل کی ہے۔جملوں کی ترتیب بخاری کی طرح ہے۔(صحیح مسلم :کتاب الزکوٰۃ،باب ۱)

"صدقۃ" اس روایت میں زکوٰۃ کے معنی میں آیا ہے۔

"ذود" اصل میں تین سال سے لے کر دس سال کے اونٹوں کو کہتے ہیں۔اس لفظ کا واحد نہیں۔یہاں اس لفظ سے اونٹ اور اونٹنیاں دونوں مراد لی گئی ہیں۔

"اواق" اوقیہ کی جمع ہے اور یہ چاندی کی مقدار بیان ہوئی ہے، جیسا کہ اگلی روایت میں وضاحت ہے۔ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ڈاکٹر یوسف قرضاوی کی تحقیق کے مطابق دس درہم سات مثقال سونے کے ہم وزن ہوتے تھے۔اس طرح درہم دینار کا ۱۰/۷ ہوا۔دینار کا وزن ۴۰۲۵ گرام کے برابر تھا۔اس طرح درہم کا وزن ۲۰۹۷ گرام ہوا۔اس تحقیق کی رو سے چاندی کا نصاب ۵۹۵ گرام ہے۔یہ ہمارے ہاں معروف نصاب ساڑھے ۵۲ تولے سے تقریباً ڈیڑھ تولہ کم ہے۔

"اوسق" وسق کی جمع ہے- وسق ساٹھ صاع کا ہوتا تھا- ڈاکٹر یوسف قرضاوی کی تحقیق کے مطابق صاع ۴ء۲۸ رطل گیہوں کے برابر تھا- اور یہ مقدار ۲۱۷۶ گرام کے برابر ہوتی ہے- لہذا مصری رطل کے مطابق نصاب ۱۳۳۰ رطل اور کلوگرام کے حساب سے ۳۰۰×۲ء۱۷۶ یعنی ۶۵۲ء۸ یا ۶۵۳ کلوگرام ہوگا- اس طرح پانچ وسق ۱۷ء۵ من ہوتے ہیں-

یہ روایت اونٹوں، غلہ اور چاندی پر زکوۃ عائد کرنے کے لیے ایک نصاب کا تعین کرتی ہے- اس سے کم مقدار میں زکوۃ عائد نہیں ہوگی- زکوۃ کے نصاب کے بارے میں صرف یہی ایک مرفوع حدیث ہے- باقی سب آثار صحابہ یا فتوے ہیں- نصاب مقرر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ معمولی آمدنی والوں پر کسی قسم کا بوجھ نہ ہو کیونکہ زکوۃ کا مقصد امراء سے مال وصول کرکے غرباء میں تقسیم کرنا ہے تاکہ دولت صرف اغنیاء میں مرتکز ہو کر نہ رہ جائے-

اس روایت میں صرف اونٹ کا نصاب بیان ہوا ہے، دوسرے جانوروں کا نہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات کسی خاص موقع پر کسی سوال کے جواب میں کہی گئی ہے- ویسے ہر قسم کے جانوروں میں زکوۃ ہے بشرطیکہ وہ معین مقدار سے زائد ہوں اور ان کی حیثیت گلے کی ہو- ہل چلانے والے، گڈا کھینچنے والے یا رہٹ چلانے والے اونٹ یا دوسرے جانور شمار نہ ہوں گے- بھیڑ بکریوں اور گایوں کا نصاب بعض دوسری روایات میں بیان ہوا ہے-

زکوۃ انفاق سے الگ چیز ہے- اس کی نوعیت فرض کی ہے جس کو حکومت ہر حال میں وصول کرے گی اور مستحقین زکوۃ میں تقسیم کرے گی- اس کی نوعیت اس ٹیکس کی نہیں جو حکومت اپنے مصارف کے لیے لگاتی ہے-

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِی صَعْصَعَةَ الْاَنْصَارِی ثُمَّ الْمَازِنِی عَنْ اَبِیهِ عَنْ اَبِی سَعِیدِ الْخُدْرِی اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَیْسَ فِیْمَا دُوْنَ خَمْسَةِ اَوْسُقٍ مِنَ التَّمْرِ صَدَقَةٌ" وَ لَیْسَ فِیْمَا دُوْنَ خَمْسِ اَوَاقٍ مِنَ الْوَرِقِ صَدَقَةٌ" وَ لَیْسَ فِیْمَا دُوْنَ خَمْسِ ذَوْدٍ مِنَ الْاِبِلِ صَدَقَةٌ"-

﴿حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پانچ وسق سے کم کھجور میں زکوۃ نہیں اور پانچ اوقیہ سے کم چاندی میں زکوۃ نہیں اور پانچ عدد اونٹ سے کم میں زکوۃ نہیں﴾

وضاحت :

اس روایت میں چند الفاظ کا اضافہ ہے۔ اس میں کھجور کا ذکر ہے۔ مدینہ میں اصل فصل کھجور کی ہی تھی باقی فصلیں ضمنی تھیں۔ وہاں اس کی حیثیت غلے کی تھی۔ اس کے لیے بھی نصاب پانچ وسق ہی رکھا گیا۔

ورق سے مراد چاندی ہے۔ چاندی کا نصاب پانچ اوقیہ ہے۔ اوقیہ کی شرح پہلی حدیث میں گزر چکی ہے۔

٦ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِیْزِ كَتَبَ اِلٰی عَامِلِهِ عَلٰی دِمَشْقَ فِی الصَّدَقَةِ اِنَّمَا الصَّدَقَةُ فِی الْحَرْثِ وَالْعَیْنِ وَالْمَاشِیَةِ۔

﴿امام مالک روایت کرتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنے دمشق کے عامل کو زکوٰۃ کے بارے میں لکھا کہ زکوٰۃ کھیتی، نقدی اور مویشیوں میں ہے﴾

وضاحت :

"حرث" کا معنی کھیتی ہے۔ ایک تو اصل فصل (MAIN CROP) ہوتی ہے جیسے گیہوں، جو وغیرہ اور دوسری ضمنی فصلیں ہوتی ہیں جیسے سبزی، دالیں وغیرہ۔ تو اصل فصل کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ اگر کسی نے ایک کیاری پیاز، لہسن، سونف وغیرہ اپنی ضرورت کے لیے لگائی ہو تو وہ شمار نہ ہوگی۔ جو فصلیں ایک جنس اور ایک نوعیت کی ہوں اور ان کا مقصد غلے کا ہو تو وہ یکجا شمار ہوں گی۔ مثلاً اگر گندم پانچ وسق نہیں اور کچھ جو مل کر پانچ وسق سے زیادہ ہو جاتے ہیں تو زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ دالیں مونگ، ماش، مسور وغیرہ اگر پانچ وسق سے کم ہوں تو شمار میں نہیں آئیں گی۔ لیکن اگر سب مل کر پانچ وسق سے زائد ہو جائیں تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اسی طرح دھان کی فصل اصل ہے۔ مختلف قسم کے دھان یکجا شمار ہوں گے لیکن گندم کی فصل دھان کے ساتھ شمار نہ ہوگی۔ خربوزہ، تربوز اور سبزیوں کی فصلیں اور باغوں کی پیداوار میرے نزدیک "حرث" کے مفہوم میں شامل ہے اور ان پر زکوٰۃ عائد ہوگی بشرطیکہ وہ نصاب سے زائد ہوں۔ حنفیہ نے کھیتی کے بارے میں قوت (غذا بننے کی صلاحیت) اور ذخیرہ کرنے کی شرط لگائی ہے۔ اس زمانہ میں غلوں کے علاوہ دوسری اجناس مثلاً پیاز، لہسن، سردہ، گرما وغیرہ غلے سے بھی زیادہ نقد آور ہو گئی ہیں۔ زکوٰۃ اسلام چونکہ اموال پر عائد ہوتی ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی حکومت گنے پر، تمباکو پر، سبزیوں اور پھلوں اور ایسی تمام اجناس پر زکوٰۃ وصول نہ کرے جو آج آمدنی کا اہم ذریعہ ہیں۔ میرے نزدیک اصول یہ ہے کہ کھیتی میں جو کچھ

بھی ہے اس پر زکوۃ ہے بشرطیکہ مقدار اتنی ہو کہ صدقہ لینے والا اس میں مداخلت کر سکے۔

"عین" کا مطلب ہے نقدی۔ جس میں چاندی، سونا اور رائج الوقت کرنسی شامل ہے۔ یعنی درہم، دینار اور اس زمانہ میں روپیہ، پونڈ، ڈالر وغیرہ۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں رائج الوقت سکے چاندی اور سونے کے تھے۔ درہم چاندی کا اور دینار سونے کا ہوتا تھا۔ اب سکے کی جگہ نوٹوں نے لے لی ہے لیکن یہ نوٹ حکومت کی ضمانت سے جاری ہوتے ہیں اور سونے اور چاندی کے ہی قائم مقام ہیں لہذا چاندی اور سونے کے نصاب کے برابر اگر کسی کے پاس نوٹوں کی نقدی ہوگی تو اس پر زکوۃ ادا کرنی ہوگی یا اگر چاندی، سونا اور نوٹوں کی نقدی مل کر نصاب سے زائد ہوگی تو زکوۃ واجب ہوگی۔

"ماشیۃ" سے مراد وہ سب جانور ہیں جو گلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم جنس جانوروں کی ایک فہرست ہوگی۔ مثلاً بھیڑ بکری ایک قسم اور دودھ دینے والے جانور بھینس گائے وغیرہ ایک قسم شمار ہوں گے۔ اس زمانہ میں ان معروف مویشیوں کے علاوہ کئی جانوروں کو تجارتی پیمانہ پر نشوونما دی جاتی ہے۔ مثلاً پولٹری فارم جگہ جگہ قائم ہو گئے ہیں۔ گھوڑوں کی نسل کشی کا وسیع کاروبار ہے۔ میرے نزدیک پولٹری کے جانور، گھوڑے اور خچر، طرح طرح کے پرندے مثلاً کبوتر، طوطے اور بٹیر غرضیکہ جو جانور بھی تجارت کے لیے پالے جاتے ہیں ان پر مقررہ مقدار کو چھوڑ کر زکوۃ ہوگی اور یہ ماشیہ کے مفہوم میں سمجھے جائیں گے۔

اَلزَّكَاةُ فِي الْعَيْنِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْوَرِقِ

سونے اور چاندی کی نقدی میں زکوۃ

☐ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عُقْبَةَ مَوْلَى الزُّبَيْرِ اَنَّهُ سَاَلَ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ عَنْ مُكَاتَبٍ لَهُ قَاطَعَهُ بِمَالٍ عَظِيمٍ هَلْ عَلَيْهِ فِيهِ زَكٰوةٌ"؟ فَقَالَ الْقَاسِمُ: اِنَّ اَبَابَكْرٍ الصِّدِّيقَ لَمْ يَكُنْ يَاْخُذُ مِنْ مَالٍ زَكٰوةً حَتّٰى يَحُولَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ۔ قَالَ الْقَاسِمُ بْنُ مُحَمَّدٍ وَكَانَ اَبُوبَكْرٍ اِذَا اَعْطَى النَّاسَ اَعْطِيَاتِهِمْ يَسْاَلُ الرَّجُلَ هَلْ عِنْدَكَ مِنْ مَالٍ وَجَبَتْ عَلَيْكَ فِيهِ الزَّكٰوةُ؟ فَاِذَا قَالَ: نَعَمْ اَخَذَ مِنْ عَطَائِهِ زَكٰوةَ ذٰلِكَ الْمَالِ۔ وَاِنْ قَالَ: لَا۔ اَسْلَمَ اِلَيْهِ

عطاءَهُ وَلَمْ يَاخُذْ مِنْهُ شَيْئًا-

﴿زبیر کے آزاد کردہ غلام محمد بن عقبہ سے روایت ہے کہ انہوں نے قاسم بن محمد سے پوچھا کہ ان کے مکاتب نے ان کو ایک بڑی رقم پیشگی ادا کر دی ہے- کیا ان پر اس میں زکوۃ واجب ہو گی تو قاسم نے کہا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کسی مال سے زکوۃ نہ لیتے جب تک کہ اس پر ایک سال نہ گزر جاتا- جب وہ لوگوں کو وظائف دینے لگتے تو پوچھتے: تمہارے پاس کوئی ایسا مال تو نہیں جس پر زکوۃ واجب ہو؟ اگر کوئی شخص اثبات میں جواب دیتا تو وظیفہ میں سے زکوۃ وضع کر لیتے- اگر نفی میں جواب دیتا تو پورا وظیفہ اس کے حوالے کر دیتے اور اس میں سے کچھ نہ کاٹتے﴾

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عُمَرَ بْنِ حُسَيْنٍ عَنْ عَائِشَةَ بِنْتِ قُدَامَةَ عَنْ اَبِيْهَا اَنَّهُ قَالَ: كُنْتُ اِذَا جِئْتُ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ اَقْبِضُ عَطَائِي سَأَلَنِي: هَلْ عِنْدَكَ مِنْ مَالٍ وَجَبَتْ عَلَيْكَ فِيهِ الزَّكوٰةُ؟ قَالَ: فَاِنْ قُلْتُ: نَعَمْ اَخَذَ مِنْ عَطَائِي زَكوٰةَ ذٰلِكَ الْمَالِ: وَاِنْ قُلْتُ: لَا دَفَعَ اِلَيَّ عَطَائِي-

﴿عائشہ بنت قدامہ اپنے باپ سے روایت کرتی ہیں کہ انہوں نے کہا کہ جب میں حضرت عثمان بن عفانؓ کے پاس اپنا وظیفہ لینے جاتا تو وہ مجھ سے پوچھتے کہ تیرے پاس کوئی ایسا مال تو نہیں جس پر زکوۃ واجب ہو چکی ہے- اگر میں کہتا ہاں تو وہ میرے وظیفے میں سے زکوۃ کاٹ لیتے اور اگر کہتا نہیں تو میرا وظیفہ مجھے دے دیتے﴾

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ كَانَ يَقُولُ: لَا تَجِبُ فِى مَالٍ زَكوٰةٌ حَتّٰى يَحُوْلَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ-

﴿نافع روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فتویٰ دیتے تھے کہ کسی مال میں زکوۃ نہیں جب تک کہ اس پر ایک سال نہ گزر جائے﴾

وضاحت :

ان تمام روایتوں میں حولان حول کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔ اسلام میں مجرد آمدنی پر زکوۃ نہیں بلکہ زکوۃ اس مال پر ہے جو کسی مسلمان کے قبضہ میں ایک سال تک رہے، نشیب و فراز سے گزرے، سرد گرم چکھے، نفع حاصل کرنے میں اس کو لگایا جا سکے۔ اسے نقصان سے دوچار ہونا ہو تو ہو جائے۔ تمام مراحل سے گزرنے کے بعد جو مال بچے اس پر زکوۃ ہو گی۔ اصول یہ ہے کہ جو رقم آئے اس پر فوری طور پر صدق نہ چڑھ دوڑے، جیسا کہ انکم ٹیکس کا معاملہ ہے۔ سال کا گزرنا ضروری ہے۔ زکوۃ بچت پر ہے آمدنی پر نہیں۔ موجودہ ٹیکسوں کے نظام اور اسلام کے نظام میں یہ بنیادی فرق ہے۔

روایت میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا فتویٰ ہے جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عمل کے مطابق ہے۔ اس فتوے کا تعلق صرف مال سے ہے۔ زرعی پیداوار سے نہیں کیونکہ فصل سے متعلق تو حکم ہے کہ اس پر زکوۃ ادا کرو جن دنوں میں اس کو کاٹو۔ (اٰتوا حقّہٗ یوم حصادہٖ) گویا فصل کی برداشت کے بعد اس پر زکوۃ واجب ہو جاتی ہے۔

وظیفہ سے زکوۃ کا کاٹ لینا سہولت کے لحاظ سے ہے۔ یہ عمل حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمان بن عفانؓ کا رہا ہے۔ یہ زکوۃ پچھلے مال پر لی جاتی تھی تاکہ دینے والے اور لینے والے کو سہولت رہے۔ خلفائے راشدین کا یہ عمل وضع زکوۃ میں مجرد زکوۃ دینے والے کے بیان پر اعتماد کرنے کی اعلیٰ مثال ہے۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ ابْنِ شِهَابٍ اَنَّهٗ قَالَ: اَوَّلُ مَنْ اَخَذَ مِنَ الْاَعْطِيَةِ الزَّكٰوةَ مُعَاوِيَةُ بْنُ اَبِیْ سُفْيَانَ۔

﴿ابن شہاب سے روایت ہے کہ سب سے پہلے جس خلیفہ نے وظائف میں سے زکوۃ وصول کی وہ معاویہ بن ابی سفیانؓ ہیں۔﴾

وضاحت :

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ کا عمل اوپر کی روایات میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ وظیفہ عطا کرنے سے پہلے وصول کنندہ سے یہ معلوم کرتے کہ اس کے ذمہ زکوۃ تو باقی نہیں۔ اگر وہ بتاتا کہ زکوۃ واجب الادا ہے تو وہ وظیفہ کی رقم میں سے کاٹ لیتے ورنہ عطیہ پورا دے دیتے۔ ابن شہاب کی اس روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کا

عمل اس سے مختلف تھا- وہ جب وظیفہ عطا کرتے تو اس پر جتنی زکوٰۃ بنتی وہ اسی میں سے وصول کر لیا کرتے- ان کی دلیل یہ تھی کہ وظیفہ ایک مشترک کھاتے کی حیثیت رکھتا ہے اور پہلے سے معلوم آمدنی ہے اس لیے اس کا حکم ایک مشترک کھاتے کا ہونا چاہیے اور اس پر حولانِ حول کی شرط نہیں ہونی چاہیے-

حضرت معاویہؓ کا اختیار کردہ راستہ آسان ہے- وقفوں کے ساتھ حاصل ہونے والی رقموں پر حولانِ حول کا حساب رکھنا نہایت پیچیدہ ہو جاتا ہے- اگر ہر رقم پر سال گزرنے کی مدت کا الگ الگ حساب رکھا جائے تو حساب کی ایسی مشکلیں پیش آئیں گی کہ عام آدمی ان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا- لیکن حضرت معاویہؓ کے اس عمل پر فقہاء نے فتویٰ نہیں دیا-

امام مالکؒ کے فتوے :

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سنت، جس کے بارے میں ہمارے ہاں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا، یہ ہے کہ جس طرح دو سو درہم چاندی میں زکوٰۃ ہو گی اسی طرح بیس دینار میں بھی زکوٰۃ ہو گی- ڈاکٹر قرضاوی کی تحقیق کے مطابق دینار سونے کا ہوتا تھا اور اس کا وزن ۴٫۲۵ گرام تھا- اس طرح سونے کا نصاب ۸۵ گرام ہوا جو تقریباً ساڑھے سات تولے کے برابر ہے-

امام مالکؒ کے زمانہ میں دینار و درہم مسکوک بھی ہوتے تھے اور غیر مسکوک بھی- اس لیے ان کے وزن میں معیاری وزن کے لحاظ سے فرق ہوتا تھا- امام صاحب کا فتویٰ یہ تھا کہ اگر بیس دینار اور دو سو درہم تعداد صحیح ہونے کے باوجود وزن میں پورے نہ اتریں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہو گی- گویا اصل معیار سونا یا چاندی کی مقدار ہے، سکوں کی تعداد نہیں-

اس زمانہ میں دینار و درہم کا مبادلہ بھی ہر جگہ ایک جیسا نہ ہوتا تھا- امام مالکؒ کا فتویٰ یہ تھا کہ اگر کسی مقام پر بیس دینار ایک سو ساٹھ درہم کے برابر ہوتے ہوں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہو گی- گویا امام صاحب چاندی کو سٹینڈرڈ مانتے تھے- کاغذ کرنسی کے اس دور میں اب یہ مسائل پیدا نہیں ہوتے-

امام مالکؒ کے نزدیک اگر کسی کے پاس فائدہ کی رقم ہو یعنی ایسا مال جو تجارت سے حاصل نہیں ہوا مثلاً غلاموں کی اجرت یا مکانوں کا کرایہ وغیرہ، یہ رقم نصاب سے کم ہو اور وہ شخص اس سے تجارت شروع کر دے تو سال

پورا ہونے سے پہلے اگر وہ بڑھ کر نصاب کے برابر ہو جائے تو اسی روز اس پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی اور اس دن سے حولان حول کا حساب رکھا جائے گا۔ اگر یہ رقم نصاب سے زیادہ ہے تو زکوٰۃ ایک سال گزرنے کے بعد واجب ہو گی۔ گویا امام صاحب تجارتی منافع پر فوری زکوٰۃ عائد کرنے کے حق میں ہیں۔

امام صاحب کئی آدمیوں کے مشترک کھاتے کے بارے میں یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ ان اشخاص میں سے جس شخص کا حصہ بیس دینار یا دو سو درہم ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو گی اور جس کا حصہ اس سے کم رہ جائے گا اس پر زکوٰۃ نہ ہو گی۔ امام شافعیؒ مشترک کھاتے میں مجموعہ پر زکوٰۃ مانتے ہیں۔ میرے نزدیک جب ملک متعین نہ ہو تو مجموعہ پر زکوٰۃ عائد ہونی چاہیے اور جب حصص معلوم ہوں تو ہر حصہ کو دیکھا جائے گا کہ وہ بقدر نصاب ہے یا نہیں۔

امام صاحب کے نزدیک جب کسی شخص کا سونا چاندی مختلف لوگوں کے پاس رکھا ہوا ہو تو وہ ان کو اکٹھا شمار کر کے زکوٰۃ ادا کرے گا۔ میرے نزدیک یہ فتویٰ اس صورت میں ہے جب اس کا مال دوسروں کے پاس بطور امانت جمع ہو۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ ہر امانت نصاب کی مقدار سے کم ہے اس لیے اس پر زکوٰۃ نہیں۔

میرے نزدیک مال اگر قرض دیا ہوا ہے تو قرض کی وصولی تک وہ معاشرہ کی خدمت کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے اس دوران میں اس پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی۔ جب قرض وصول ہو گا تو اس کی حیثیت 'فائدہ' کی ہو گی۔ وصولی کے دن سے اس پر حولان حول کا اطلاق ہو گا اور ایک سال کا عرصہ گزرنے پر زکوٰۃ دی جائے گی۔

اَلزَّكَاةُ فِى الْمَعَادِنِ

معدنیات میں زکوٰۃ

☐ حَدَّثَنِى يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ اَبِى عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ غَيْرِ وَاحِدٍ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَطَعَ لِبِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ الْمُزَنِى مَعَادِنَ الْقَبَلِيَّةِ وَ هِىَ مِنْ نَاحِيَةِ الْفُرْعِ فَتِلْكَ الْمَعَادِنُ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا اِلَى الْيَوْمِ اِلَّا الزَّكٰوةُ۔

﴿ ابو عبدالرحمٰن ایک سے زائد راویوں سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بلال بن حارث مزنی کو قبلیہ میں، جو فرع کے جوار میں ہے، اس کی کانیں جاگیر میں دے دیں۔ ان کانوں میں سے آج

تک زکوٰۃ کے سوا کوئی چیز نہیں لی گئی ہے۔

وضاحت :

قبلیہ مکہ اور مدینہ کے درمیان کسی مقام کا نام ہے۔ اکثر فقہاء کے نزدیک معادن میں صرف سونے اور چاندی کی کانیں شمار ہوں گی۔ یہ بات عقل کے خلاف ہے۔ نقدین کے علاوہ دوسری بہت سی چیزیں مثلاً لوہا، کوئلہ، تانبا، گیس، تیل، سنگ مرمر اور دوسرے قیمتی پتھر اور اس زمانہ میں یورینیم اور دوسری معدنیات جو ایٹم بم بنانے کے کام آتی ہیں، سب معادن میں شامل ہونی چاہئیں۔

امام مالکؒ کی رائے میں معادن میں سے کچھ نہیں لیا جائے گا جب تک کہ جو معادن میں سے نکلے وہ بیس دینار یا دو سو درہم کے بقدر نہ ہو جائے۔ جب وہ اس مقدار کو پہنچ جائے تو اس میں سے اسی وقت زکوٰۃ کاٹ لی جائے گی اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اس میں یافت ہوتی رہے۔ جب یافت ختم ہو جائے تو زکوٰۃ کی کٹوتی بند کر دی جائے گی۔ اگر دوبارہ یافت شروع ہو جائے تو پھر نئے سرے سے اسی اصول پر زکوٰۃ کاٹی جائے گی۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ معدن بھی بمنزلہ زرعی زمین کے ہے۔ جس طرح زمینی پیداوار پر فصل کٹتے ہی زکوٰۃ لی جاتی ہے اسی طرح جب معدن سے کچھ نکلے گا تو اس میں سے زکوٰۃ لی جائے گی اور سال گزرنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

حنفیہ کی رائے مالکیہ سے مختلف ہے۔ وہ معدن کو زرعی زمین کے بجائے دفینہ کے حکم میں رکھتے ہیں اور جو یافت ہو اس میں سے پانچواں حصہ لیتے ہیں۔ وہ نہ تو نصاب کی شرط مانتے ہیں اور نہ سال گزرنے کی۔ میرے نزدیک دفینہ جنگ کے مال غنیمت کی طرح ایک اتفاقی دولت ہے۔ اس کے برعکس معدن کی تعمیر پر سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ معدنیات نکالنے کے لیے مزدوروں اور کاریگروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح خاصی مشقت اور سرمائے کے صرف کے بعد یافت ہوتی ہے۔ شریعت کے اصولوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جن چیزوں کے حاصل کرنے پر بڑی لاگت آتی ہو تو اس میں زکوٰۃ کی مقدار کم ہوتی ہے اور جس میں لاگت نہ آتی ہو تو اس میں زکوٰۃ کی شرح زیادہ ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ میں حنفیہ کی رائے مجھے صائب نہیں معلوم ہوتی۔

☐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اِبْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ وَعَنْ اَبِی سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ فِی الرِّکَازِ الْخُمُسُ

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دفینے میں پانچواں حصہ زکوۃ ہے﴾

وضاحت :

یہ روایت امام بخاری نے باب الرکاۃ الرکاز الخمس میں لی ہے۔

اس روایت کو نقل کر کے امام مالکؒ رکاز کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس بات میں اہل مدینہ میں کوئی اختلاف نہیں اور میں نے اہل علم سے سنا ہے کہ دفینہ وہ ہے جو جاہلیت کے دفینوں میں سے پایا جائے، جس کو پانے کے لیے نہ مال خرچ کرنا پڑے، نہ کوئی بڑی جدوجہد کرنی پڑے اور نہ کوئی ذمہ داری اٹھانی پڑے۔ رہی وہ چیز جس پر مال خرچ کرنا پڑے، بڑی محنت کرنی پڑے اور وہ کبھی مل جائے اور کبھی نہ ملے تو وہ رکاز نہیں۔

میرے نزدیک امام مالکؒ نے یہ فرق جو بیان کیا ہے درست ہے۔ مثال کے طور پر تیل کا کنواں کھودا جا رہا ہے۔ ممکن ہے تیل مل جائے لیکن اس کا بھی قوی امکان ہے کہ تیل نہ ملے تو یہ رکاز کے حکم میں نہ ہو گا بلکہ معادن میں شامل ہو گا۔ اس کے برعکس اگر دیوار کے لیے کھدائی کی جا رہی ہو اور زمین میں سے اشرفیوں کا صندوق نکل آئے جو بغیر اہتمام کے مل جائے تو یہ دفینہ کے حکم میں ہو گا۔ اس میں سے پانچواں حصہ زکوۃ کی مد میں لے لیا جائے گا۔

مَالَا زَكٰوةَ فِيهِ مِنَ التِّبْرِ وَ الْحُلِيِّ وَالْعَنْبَرِ

سونے چاندی، زیور اور عنبر میں سے کن چیزوں میں زکوۃ نہیں

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ الْقَاسِمِ عَنْ اَبِيهِ اَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ كَانَتْ تَلِي بَنَاتَ اَخِيهَا يَتَامَى فِي حَجْرِهَا لَهُنَّ الْحُلِيُّ فَلَا تُخْرِجُ مِنْ حُلِيِّهِنَّ الزَّكَاةَ

﴿عبدالرحمٰن بن قاسم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ، حضرت عائشہؓ، اپنے بھائی کی لڑکیوں کی متولیہ تھیں۔ وہ لڑکیاں یتیم اور ان کے زیر تولیت تھیں، حضرت عائشہؓ ان کے زیورات سے زکوۃ نہیں نکالتی تھیں﴾

وضاحت :

اس روایت کی رو سے مالکیہ پہننے کے زیورات میں زکوٰۃ نہیں مانتے- لیکن حنفیہ پہننے یا نہ پہننے کے زیورات میں فرق کے قائل نہیں- حنفیہ کا استدلال یہ ہے کہ یتیموں کے مال میں سے متولی کو زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے، کیونکہ حضرت عائشہؓ خود یتیموں کے مال میں سے زکوٰۃ ادا کیا کرتی تھیں- ان کا انحصار ابو داؤد کی اس روایت پر ہے جس کی حضرت عائشہؓ خود ہی راوی ہیں کہ ایک عورت نبی ﷺ کی خدمت میں آئی- اس نے اپنی بچی کو سونے کے کنگن پہنا رکھے تھے- آنحضرت ﷺ نے پوچھا تم اس کی زکوٰۃ دیتی ہو، اس نے کہا نہیں- اس پر آپؐ نے فرمایا، کیا تم چاہتی ہو کہ قیامت کے دن تم کو آگ کے کنگن پہنائے جائیں- اس پر اس خاتون نے کنگن بچی کے ہاتھ سے اتار کر پھینک دیئے کہ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے ہیں- اس روایت کی رو سے حنفیہ زیورات پر زکوٰۃ واجب قرار دیتے ہیں- میرے نزدیک یہ قیاس کے خلاف ہے- استعمال کی جتنی چیزیں ہیں شریعت نے ان کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے- سواری اور بار برداری کے گھوڑے، خچر، اونٹ، دودھ کے لیے پالی ہوئی بکری اور گائے پر زکوٰۃ نہیں تو آخر سونے اور چاندی میں کیا خاص بات ہے جب کہ بطور زینت یہ عورت کی ضروریات میں سے ہے- اسی بنا پر موتی، خوشبو اور عنبر وغیرہ میں زکوٰۃ نہیں-

مالکیہ استعمال کے زیورات کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ سمجھتے ہیں- میرے نزدیک صحیح مذہب یہی ہے- زیور پر زکوٰۃ اس وقت عائد ہوگی جب اس کا مقصد دولت کو ذخیرہ کرنا ہو- عید، بقر عید یا تقریبات پر پہننے کے زیورات سے زکوٰۃ نہیں لی جائے گی-

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ أَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ يُحَلِّي بَنَاتَهُ وَ جَوَارِيَهُ الذَّهَبَ ثُمَّ لَا يُخْرِجُ مِنْ حُلِيِّهِنَّ الزَّكَاةَ

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی بیٹیوں اور لونڈیوں کو سونے کے زیورات پہناتے تھے لیکن ان کے زیورات سے زکوٰۃ نہیں نکالتے تھے﴾

وضاحت :

اس اثر سے بھی مالکیہ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے اور حنفیہ کا مسلک درست معلوم نہیں ہوتا-

امام مالکؒ کا فتویٰ ہے کہ اگر کسی کے پاس کوئی ٹکڑا سونے یا چاندی کا ہو اور اس سے پہننے کا کام نہ لیا جاتا ہو تو اس پر زکوٰۃ عائد ہو گی، الا آنکہ وہ نصاب سے کم ہو۔ امام مالک کے نزدیک اگر کوئی ٹوٹا ہوا زیور ایسا ہو جس کی مالک اصلاح کرانا چاہتا ہو تو اس پر بھی زکوٰۃ نہیں کیونکہ یہ بمنزلہ اس مال کے ہے جس پر زکوٰۃ نہیں ہوتی۔ اسی طرح امام مالک کہتے ہیں کہ موتی، خوشبو اور عنبر میں بھی زکوٰۃ نہیں کیونکہ یہ عورتوں کے استعمال کی چیزیں ہیں۔ اس معاملہ میں امام مالکؒ کا فتویٰ احناف کے خلاف ہے لیکن میرے نزدیک یہ صحیح ہے۔

زَكٰوةُ أَمْوَالِ الْيَتَامٰى وَ التِّجَارَةُ لَهُمْ فِيْهَا

یتیموں کے مال کی زکوٰۃ اور ان کے لیے اس میں تجارت

□ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ اتَّجِرُوا فِي اَمْوَالِ الْيَتَامٰى لَا تَاكُلُهَا الزَّكَاةُ۔

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے اعلان فرمایا کہ یتیموں کے مال میں تجارت کرو تاکہ زکوٰۃ ان کو ختم نہ کر دے﴾

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ الْقَاسِمِ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهُ قَالَ كَانَتْ عَائِشَةُ تَلِيْنِي وَ اَخًا لِي يَتِيْمَيْنِ فِي حَجْرِهَا فَكَانَتْ تُخْرِجُ مِنْ اَمْوَالِنَا الزَّكَاةَ

﴿عبدالرحمٰن بن قاسم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ میری اور میرے بھائی کی متولیہ تھیں اور ہم ان کی گود میں پل رہے تھے۔ وہ ہمارے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرتی تھیں۔﴾

اس اثر سے بھی اوپر والی روایت کی تائید ہو جاتی ہے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ كَانَتْ تُعْطِي اَمْوَالَ الْيَتَامٰى الَّذِيْنَ فِي حَجْرِهَا مَنْ يَّتَّجِرُ لَهُمْ فِيْهَا

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عائشہؓ ان یتیموں کا مال جو ان کی تولیت میں تھے ایسے لوگوں کو

دیتی تھیں جو ان کے لیے ان اموال میں تجارت کریں-

وضاحت :

یہ بات قرآن سے بھی ثابت ہے اور عقلی طور پر بھی صحیح ہے کہ یتیموں کے ولی ان کا مال بڑھانے کی کوشش کریں- امام مالکؒ کہتے ہیں کہ یتیم کا ولی ازروئے شریعت مجاز ہے کہ تجارت کرے اور وہ نقصان کا ذمہ دار نہ ہو گا-

یہ بات احناف کے مسلک کے خلاف ہے- وہ یتیم اور صغیر کے مال میں تجارت روا نہیں رکھتے- وہ زکوۃ کا مطلب مصرف لیتے ہیں جبکہ مصرف کے لیے زکوۃ کا لفظ درست نہیں- میرے نزدیک یتامیٰ کے مال میں سے زکوۃ دینی چاہیے اور مال کو کاروبار میں لگا کر پروان چڑھانا چاہیے- یتامیٰ کے باغ یا کھیتی میں سے بھی زکوۃ دی جائے گی-

زکوٰۃُ المیراثِ

ترکہ کی زکوۃ

ترکہ کی زکوۃ کے باب میں کوئی مرفوع حدیث یا اثرِ صحابہؓ نہیں- صرف امام مالکؒ کے فتوے ہیں-

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص کی موت واقع ہو جائے اور اس نے اپنے مال کی زکوۃ ادا نہ کی ہو تو زکوۃ اس کے ثلث مال میں سے لے لی جائے، اس لیے کہ میت کے صرف ثلث مال میں ہی تصرف کیا جا سکتا ہے- باقی مال وارثوں کا حق ہے-

میرے نزدیک میت کی دوسری وصیتیں اور قرض زکوۃ پر مقدم ہیں- زکوۃ کی ادائیگی کی وصیت اگر مرنے والے نے کی ہے تو وارثوں کو زکوۃ ادا کرنی ہو گی- لیکن اگر میت نے وصیت نہیں کی تو یہ ورثاء کے اوپر ہے- اگر وہ زکوۃ ادا کریں تو بہتر ہے اور اگر وہ ادا نہ کریں تو ان پر زکوۃ کی ادائیگی لازم نہیں کی جا سکتی- حکومت ان کی ملکیت وراثت میں تصرف نہیں کر سکتی-

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ وارث کو جو مال ترکہ میں ملے تو اس پر زکوۃ اس وقت عائد ہو گی جب اس کی ملکیت پر ایک سال گزر جائے- اگر ترکہ میں اس کو زمین یا باغ یا فصل ملی ہے، تب فصل کٹنے پر اس سے عشر لیا جائے گا- میرے نزدیک یہ فتویٰ صحیح ہے-

اَلزَّكَاةُ فِي الدَّيْنِ

قرض میں زکوٰۃ

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ ابْنِ شِهَابٍ عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ اَنَّ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ كَانَ يَقُولُ: هٰذَا شَهْرُ زَكَاتِكُمْ فَمَنْ كَانَ عَلَيْهِ دَيْنٌ" فَلْيُؤَدِّ دَيْنَهُ حَتّٰى تَحْصُلَ اَمْوَالُكُمْ فَتُؤَدُّوْنَ عَنْهُ الزَّكٰوةَ۔

﴿سائب بن یزید کہتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفانؓ اعلان کیا کرتے تھے کہ ماہ زکوٰۃ آگیا ہے۔جس کے ذمہ قرض ہو وہ ادا کر دے تاکہ اس کا مال قرض سے آزاد ہو جائے اور تم اس میں زکوٰۃ ادا کر سکو﴾

وضاحت:

اس اثر کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تحصیل زکوٰۃ کے لیے ایک مہینہ مقرر تھا۔اس عمل سے اصولی طور پر حولان حول کے مسائل بڑی حد تک حل ہو جاتے اور ضابطہ بندی ممکن ہو جاتی ہے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَيُّوبَ بْنِ اَبِي تَمِيْمَةَ السَّخْتِيَانِي اَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِالْعَزِيْزِ كَتَبَ فِي مَالٍ قَبَضَهُ بَعْضُ الْوُلَاةِ ظُلْمًا يَاْمُرُ بِرَدِّهِ اِلٰى اَهْلِهِ وَ يُؤْخَذُ زَكَاتُهُ لِمَا مَضٰى مِنَ السِّنِيْنَ ثُمَّ عَقَّبَ بَعْدَ ذٰلِكَ اَنْ لَّا يُؤْخَذُ مِنْهُ اِلَّا زَكٰوةٌ" وَاحِدَةٌ" فَاِنَّهُ كَانَ ضِمَارًا۔

﴿ایوب بن ابی تمیمہ سختیانی کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کچھ مال کے بارے میں، جس پر ان کے تحصیلداروں نے زیادتی سے قبضہ کر لیا تھا، حکم دیا کہ مال ان کے مالکوں کو واپس کر دیا جائے اور اس میں سے پچھلے تمام سالوں کی زکوٰۃ کاٹ لی جائے۔پھر فوراً ہی دوسرا حکم بھیجا کہ اس میں سے صرف ایک سال کی زکوٰۃ لی جائے کیوں کہ مال ضمار تھا یعنی ان کے قبضہ میں نہ تھا۔﴾

وضاحت:

ضمار اس مال کو کہتے ہیں جس کی وصولی مشتبہ ہو۔مالک یہ نہ جانتا ہو کہ وہ وصول ہو گا یا نہیں۔ایسے مال کے

بارے میں تین رائیں ہیں-ایک یہ کہ وصولی پر اس میں سے تمام سالوں کی زکوۃ لی جائے گی-دوسری یہ کہ صرف ایک سال کی زکوۃ لی جائے گی، جیسا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے رجوع کے بعد کیا- تیسری رائے یہ ہے کہ ایک سال کی زکوۃ بھی نہیں لی جائے گی بلکہ وصولی کے بعد ایک سال گزرنے پر زکوۃ ہو گی- کیونکہ یہ مال دراصل قرضے کے حکم میں ہے جس پر وصولی کے بعد ایک سال گزرنا ضروری ہے- میری رائے میں تیسری صورت صحیح ہے اور یہی جمہور کی رائے بھی ہے- امام مالکؒ کی رائے میں ایک سال کی زکوۃ لی جائے گی- ان کا فتویٰ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے فتوے پر ہے-

امام مالک کے فتوے :

امام مالکؒ سلیمان بن یسارؒ کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ وہ اس شخص پر زکوۃ عائد کرنے کا فتویٰ نہیں دیتے تھے جس کے پاس مال ہو لیکن اس کی مانند اس پر قرض بھی ہو- میرے نزدیک یہ فتویٰ درست ہے-

امام مالکؒ صاحبِ قرض کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ شخص اس وقت تک زکوۃ ادا نہ کرے جب تک کہ قرض اس کو وصول نہ ہو جائے، خواہ اس پر کئی سال گزر جائیں- لیکن جب بھی قرض وصول ہو گا تو اس کے اوپر فوراً زکوۃ عائد ہو گی- میرے نزدیک اس صورت میں زکوۃ اس وقت تک نہ ہو گی جب تک کہ اس مال پر ایک سال نہ گزر جائے-

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر قرض میں سے کچھ مال وصول ہو گیا لیکن وہ اتنا نہیں کہ اس پر زکوۃ واجب ہو تو اگر صاحب مال کے پاس اور مال بھی ہو جس پر زکوۃ واجب ہوتی ہے تو وہ اس مال کے ساتھ اس کی بھی زکوۃ ادا کرے گا- میرے نزدیک یہ ایک واضح بات ہے-

امام مالکؒ کے نزدیک اس بات کی دلیل کہ کئی سالوں کے بعد وصول ہونے والے قرض پر صرف ایک ہی زکوۃ ہو گی، یہ ہے کہ جس مال کی زکوۃ واجب ہو وہ صرف اسی مال ہی میں سے نکالی جائے گی، دوسرے مال میں سے نہیں نکالی جائے گی، جس طرح تجارتی سامان کسی کے پاس کئی سال رہتا ہے لیکن جب وہ اس کو بیچتا ہے تو اس پر صرف ایک ہی زکوۃ واجب ہے- میرے نزدیک یہ دلیل صحیح نہیں- یہ ضروری نہیں کہ مال کی زکوۃ صرف اسی مال ہی میں سے نکالی جائے- عملاً یہ کلیہ نہیں چل سکتا- زکوۃ جنس کا خیال رکھتے ہوئے دوسرے مال سے بھی نکالی جا سکتی ہے- گندم یا

جو دونوں ہوں تو گندم کی زکوٰۃ جو سے بھی پوری کر لی جائے گی۔ اسی طرح بھیڑوں کی زکوٰۃ بکریوں سے لی جا سکتی ہے۔

اس سامان تجارت کے متعلق جو کئی سال تک بکا نہیں گیا، امام مالکؒ بکنے پر ایک زکوٰۃ کے قائل ہیں۔ امام مالکؒ کا یہ فتویٰ بھی محل نظر ہے۔ اس سے احتکار کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک اس صورت میں مال کے مالک کو ثابت کرنا ہوگا کہ باوجود کوشش کے مال بک نہیں سکا۔ اگر وہ ثابت نہ کر سکے تو ہر سال کی زکوٰۃ جمع کی جائے گی۔ جمہور کا مذہب بھی یہی ہے۔

زَكَاةُ الْعُرُوضِ

سامان تجارت میں زکوٰۃ

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ زُرَيْقِ بْنِ حَيَّانَ وَ كَانَ زُرَيْقٌ عَلَى جَوَازِ مِصْرَ فِي زَمَانِ الْوَلِيدِ بْنِ عَبْدِالْمَلِكِ وَ سُلَيْمَانَ وَ عُمَرَ بْنِ عَبْدِالْعَزِيزِ فَذَكَرَ أَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِالْعَزِيزِ كَتَبَ إِلَيْهِ أَنِ انْظُرْ مَنْ مَرَّ بِكَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَخُذْ مِمَّا ظَهَرَ مِنْ أَمْوَالِهِمْ مِمَّا يُدِيرُونَ مِنَ التِّجَارَاتِ مِنْ كُلِّ أَرْبَعِينَ دِينَارًا دِينَارًا فَمَا نَقَصَ فَبِحِسَابِ ذَلِكَ حَتَّى يَبْلُغَ عِشْرِينَ دِينَارًا، فَإِنْ نَقَصَتْ ثُلُثَ دِينَارٍ فَدَعْهَا وَلَا تَأْخُذْ مِنْهَا شَيْئًا، وَ مَنْ مَرَّ بِكَ مِنْ أَهْلِ الذِّمَّةِ فَخُذْ مِمَّا يُدِيرُونَ مِنَ التِّجَارَاتِ مِنْ كُلِّ عِشْرِينَ دِينَارًا دِينَارًا فَمَا نَقَصَ فَبِحِسَابِ ذَلِكَ حَتَّى يَبْلُغَ عَشَرَةَ دَنَانِيرَ، فَإِنْ نَقَصَتْ ثُلُثَ دِينَارٍ فَدَعْهَا وَلَا تَأْخُذْ مِنْهَا شَيْئًا وَاكْتُبْ لَهُمْ بِمَا تَأْخُذُ مِنْهُمْ كِتَابًا إِلَى مِثْلِهِ مِنَ الْحَوْلِ۔

﴿زریق بن حیان سے روایت ہے۔ اور یہ زریق مصر کے محصولات کے ناکے پر ولید بن عبدالملک، سلیمان اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں تعینات تھے۔ وہ ذکر کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کو ہدایت کی کہ جو مسلمان تمہارے پاس سے گزرے تو ان کے ظاہر اموال میں سے جو وہ تجارت کے لیے لے کر نکلے ہیں، ہر چالیس دینار کے بدلے ایک دینار وصول کرو اور اگر کم ہو تو

اسی حساب سے کم کردو، یہاں تک کہ بیس دینار رہ جائیں۔ جب وصولی کم ہو کر ایک تہائی دینار رہ جائے تو چھوڑ دو اور کچھ نہ لو۔ اور اہل ذمہ میں سے جو شخص مال تجارت لے کر گزرے تو ان سے بیس دینار میں سے ایک دینار لو۔ اور اگر کم ہو تو اسی حساب سے کم لو یہاں تک کہ دس دینار رہ جائیں اور جب وصولی کم ہو کر ایک تہائی دینار تک رہ جائے تو چھوڑ دو اور کچھ نہ لو، اور جو کچھ ان سے وصول کرو اس کی رسید لکھ دو۔﴾

وضاحت :

عروض - ما یعرض للبیع - یعنی وہ چیز جو فروخت کے لیے پیش کی جائے۔ یہ ان اموال سے متعلق ہے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائے جاتے ہیں۔ مقامی دکانوں کے اموال اس سے الگ ہیں۔

جواز- اس اڈے کو کہتے ہیں جہاں محصول وغیرہ وصول کیا جاتا ہے، جیسے ہمارے ہاں محصول چونگی کا انظام ہے یا دوسرے ٹیکس وصول کرنے کے لیے دفاتر ہوتے ہیں۔

اگر یہ روایت صرف ولید بن عبدالملک اور سلیمان کے زمانے کے متعلق ہوتی تو امام مالکؒ غالباً اس کو یہاں نہ لاتے لیکن چونکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی حیثیت خلیفہ راشد کی ہے اس لیے ان کا یہ اثر یہاں لائے ہیں۔ روایت کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ البتہ اس میں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا حل ضروری ہے۔ میرے نزدیک تجارتی مال پر بھی زکوٰۃ کے دو ضابطے مقدم ہوں گے۔ پہلا یہ کہ مال تجارت نصاب سے زائد ہو۔ دوسرا یہ کہ اس پر ایک سال گزر چکا ہو۔ اگر یہ دونوں شرائط موجود نہ ہوں تو زکوٰۃ کی مد میں تاجر سے کچھ وصول نہیں کیا جائے گا۔

مال کے بقدر نصاب ہونے کا اندازہ کرنا تو کچھ مشکل نہیں البتہ حولان حول کے بارے میں آسانی اسی میں ہے کہ مال کے مالک کی تصدیق معتبر مانی جائے الا یہ کہ مصدق ثابت کر دے کہ یہ شخص جھوٹا ہے۔ آج کل یہ مسئلہ خریداری کی رسید دیکھنے سے حل ہو سکتا ہے۔ اہل ذمہ کے لیے رسید جاری کرنے کا حکم اس روایت میں بھی دیا گیا ہے۔ ایسی رسید مسلمانوں کو بھی جاری کی جا سکتی ہے تاکہ حولان حول کا جھگڑا نہ پیدا ہو۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم میں اہل ذمہ کے بارے میں فرق ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ان کے لیے نصاب نصف ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں ان

کو زکوۃ سے دوگنا دینا پڑے گا۔ یہ مسئلہ آج کل مشکلات پیدا کر سکتا ہے کیونکہ اقلیتوں کے لیے مالیات اور محصولات کا الگ نظام قائم کرنا پڑے گا۔ فقہا کہتے ہیں کہ امیر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اہل ذمہ پر بھی زکوۃ عائد کر دے لیکن وہ دوگنی ہوگی۔ اس کی دلیل صرف یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس کا امیر کو اختیار ہے۔ میرے نزدیک یہ امر صرف امیر کی صوابدید پر ہونے کے لیے کوئی نص موجود نہیں، لہذا وہ زکوۃ کے برابر جزیہ بھی لگا سکتا ہے تاکہ تمام لوگوں کے لیے ایک ہی نظام ہو لیکن وہ زکوۃ سے کم نہیں لگا سکتا کیونکہ اس سے بیت المال کو نقصان ہوتا ہے۔

اہل ذمہ دو قسم کے ہیں۔ ایک مفتوح دوسرے معاہد۔ ہمارے ہاں کے اہل ذمہ معاہد ہیں کیونکہ ملک کی تقسیم ایک معاہدے کے تحت ہوئی ہے۔ صرف پرسنل لاء میں وہ آزاد ہیں۔ مالی معاملات میں جو ٹیکس بھی نافذ ہوں گے وہ ان کو ادا کریں گے۔ زکوۃ کے بقدر ان سے جو کچھ وصول کیا جائے وہ جزیہ ہے اور مسلمانوں سے جو وصول کیا جائے وہ زکوۃ ہوگی۔ دونوں کے مصارف ایک ہو سکتے ہیں۔ زکوۃ کے مصارف میں ایک حصہ مؤلفۃ القلوب کا بھی ہے۔ یہ خاص طور پر غیر مسلموں کے لیے ہے۔ جب ان کو اپنے ساتھ ہموار رکھنے کے لیے اور ان کی دشمنی سے بچنے کے لیے ہم زکوۃ میں سے خرچ کر سکتے ہیں تو دوسرے مصارف پر بدرجہ اولی کر سکتے ہیں۔ لہذا تمام ملک میں سب کے لیے ایک ہی نظام رائج کیا جا سکتا ہے۔

امام مالک کے فتوے :

اس باب کے آخر میں امام مالکؒ نے اپنے بعض فتوے نقل کیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ :

اموال تجارت میں سے اگر مالک نے زکوۃ ادا کر دی، پھر اس مال کو فروخت کر کے اس سے کپڑے، غلام یا دوسرا مال خرید لیا تو اگر وہ اس مال کو فروخت کر دے گا تو اس پر زکوۃ واجب نہ ہوگی، جب تک کہ اس پر ایک سال نہ گزر جائے۔ اگر وہ کئی سال تک سامان نہ بیچ پائے تو اس پر زکوۃ نہ ہوگی اگرچہ زمانہ بہت طویل ہو جائے۔ جب بھی وہ فروخت کرے گا اس پر ایک ہی زکوۃ ہوگی۔ میرے نزدیک امام مالکؒ کی رائے کا آخری حصہ اس اجمال کے ساتھ درست نہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس سے احتکار کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ تاجر مال کو روک کر بازار کے بھاؤ کو اتار چڑھا سکتا ہے، مال کے ساتھ بازی کھیل سکتا ہے اور لوگوں کو مصیبت میں ڈال سکتا ہے۔ تاجر اگر واقعی مال فروخت نہ کر پائے تو اس کو یہ بات تحصیلدار کے سامنے ثابت کرنی ہوگی۔ بیرونی تجارت میں تو سب کو معلوم ہوتا

ہے کہ فلاں کمپنی نے مال نہیں اٹھایا یا جہاز والوں سے معاملہ طے نہ ہو سکا۔ غرض جتنی مشکلیں ہیں وہ راز نہیں ہوتیں۔ لیکن اندرون ملک تجارت میں ایسے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں جن میں احتکار کر کے اشیائے صرف کی مصنوعی قلت پیدا کی جاسکتی ہے۔ تاجروں کے اس عمل کا تدارک حکومت کو کرنا ہوگا۔

اگر ایک شخص سونے اور چاندی سے غلہ یا کھجور یا دوسرا سامان خریدتا ہے، پھر اس کو روک لیتا ہے یہاں تک کہ اس پر ایک سال گزر جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کو فروخت کرتا ہے تو اس پر زکوٰۃ اس وقت عائد ہوگی جب وہ مال فروخت کرے گا، بشرطیکہ اس کی قیمت بقدر نصاب ہو۔

اگر کسی تاجر کے پاس مال تجارت ہو یا دکان میں مال ہو لیکن اس کی فروخت سے یک وقت اس قدر نقد نہیں ملتا جس پر زکوٰۃ واجب ہو تو وہ سال میں ایک ماہ مقرر کرے گا جس میں وہ مال تجارت کی قیمت لگائے گا اور جو نقد اور سونا چاندی اس کے پاس ہوگا ان سب کو ملا کر اگر اتنا ہو جائے کہ جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

یہ عام دکانداروں کا معاملہ ہے جن کی مختلف آمدنی تو ہوتی ہے لیکن اتنی نہیں کہ زکوٰۃ واجب ہو۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ کمپنیوں کے حساب میں سے تمام حاصل شدہ، قوم اور مال کا حساب لگا کر زکوٰۃ کاٹی جاسکتی ہے۔

مَاجَاءَ فِی الْكَنْزِ

کنز کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِینَارٍ أَنَّهُ قَالَ: سَمِعْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ وَهُوَ یُسْأَلُ عَنِ الْكَنْزِ مَا هُوَ، فَقَالَ هُوَ الْمَالُ الَّذِی لَا تُؤَدّٰی مِنْهُ الزَّكَاةُ۔

﴿ عبد اللہ بن دینار سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کو فرماتے سنا۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ کنز کیا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ کنز وہ مال ہے جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو۔ ﴾

وضاحت :

"کنز" کا مطلب ہے مال جمع کرنا، خواہ گھر میں جمع کریں یا بنک میں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ سوال سورہ توبہ میں وارد کنز کے لفظ کی تفسیر کے بارے میں کیا گیا تھا۔ انھوں نے اس کی وضاحت یوں کی کہ کنز وہ مال ہے جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو یعنی اگر کسی نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دی تو اب اس کو وہ جہاں چاہے رکھے، سرکاری حق اس سے ادا ہو گیا۔ اب مال جمع کرنے پر اس سے کوئی بازپرس نہ ہو گی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا جواب صرف ایک پہلو کو بیان کرتا ہے یعنی یہ کہ زکوٰۃ دینے والا سرکاری حق سے بری ہو جائے گا۔ اس طرح وہ قانون کی گرفت سے چھوٹ جائے گا۔ اس جواب میں یہ پہلو بیان ہونے سے رہ گیا ہے کہ اس کے بعد اگر وہ مال کو بنک میں جمع کر دے تو انفاق کی ذمہ داریوں سے بری نہیں ہو جائے گا اور اس کے ثواب اور اجر سے محروم رہے گا۔ متعدد اکابر صحابہ کا یہی مسلک رہا ہے۔ حضرت علیؓ اور ابوذر غفاریؓ اس مسلک کے قائل ہونے میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔

میرے نزدیک قرآن مجید کی سورہ توبہ آیت ۳۴ کی یہ تفسیر صحیح نہیں۔ آیت میں ہے وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے) الفاظ یہ نہیں ہیں کہ لَا يُؤَدُّوْنَ الزَّكٰوةَ (زکوٰۃ ادا نہیں کرتے) جہاں تک انفاق کا تعلق ہے وہ انہی شرائط کے ساتھ مطلوب ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ یعنی یہ ضروری ہے کہ آدمی مال کفایت شعاری سے خرچ کرے۔ کسی فضول کام میں خرچ نہ کرے۔ اس میں مددوں کے حقوق ادا کرے۔ ان کو دینے کے بعد احسان نہ جتائے اور اس کے بدلے میں جزا یا شکریہ کی بھی تمنا نہ کرے۔ مزید براں اس مال کو صحیح جگہوں پر خرچ کرے۔ اس کو جمع نہ کرے۔ مال کو جمع کیا جائے تو یہ فاسد خون ہے جس سے فساد ہی پیدا ہو گا۔ ان شرائط کے ساتھ انفاق کرنے والے لوگوں کے بارے میں ہے کہ ان کو حکمت عطا کی جاتی ہے اور ان کا صلہ جنت ہے۔

□ حَدَّثَنِيْ عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ اَبِيْ صَالِحِ السَّمَّانِ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ مَنْ كَانَ عِنْدَهُ مَالٌ لَمْ يُؤَدِّ زَكَاتَهُ مُثِّلَ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعًا اَقْرَعَ لَهُ زَبِيْبَتَانِ يَطْلُبُهُ حَتّٰى يُمْكِنَهُ يَقُوْلُ لَهُ اَنَا كَنْزُكَ۔

﴿ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے تھے کہ جس کے پاس مال رہا ہو اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی ہو تو اس کا

مال قیامت کے روز ایک گنجے زہریلے سانپ کی مانند ہوگا جس کی آنکھوں کے پاس متھے کی طرح نشان ابھرے ہوں گے۔ وہ اس کو طلب کرے گا یہاں تک کہ وہ اس کو قابو میں کرلے گا اور کہے گا میں ہوں جناب کا مال۔ ؂

وضاحت:

حضرت ابوہریرہؓ کی رائے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی رائے کی مانند ہے۔ میری رائے میں مال کی ساری برکتیں انفاق سے ہیں۔ سورہ مزمل میں ہے کہ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ اَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا۔ (اور نماز کا اہتمام رکھو، زکوۃ دیتے رہو اور اللہ کو قرض دو قرض اچھا) اگر زکوۃ ادا کرنے پر مال کا حق ادا ہو جاتا تو اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کے بعد اَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا کہنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ یہ بات درست ہے کہ مال کی زکوۃ ادا ہو جانے کے بعد حکومت اس میں مداخلت نہیں کرسکتی لیکن اللہ تعالی کے حقوق اس میں ختم نہیں ہوتے۔

میرے نزدیک مال کو جمع کرکے رکھنا ناجائز ہے۔ کاروباری دولت جائز ہے اس لیے کہ وہ معاشرے کا حق ادا کرتی ہے۔ وہ ہر وقت خطرے میں ہوتی ہے۔ مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ کا مقابلہ کرتی ہے اور لوگوں کو ضرورت کی چیزیں مہیا کر رہی ہوتی ہے۔ جو دولت بنک میں یا تجوریوں میں جمع ہے یا زمین میں گاڑی ہوئی ہے وہ سب کنز کے تحت آتی ہے۔ تمام صحابہ کرام کا یہی مذہب ہے اور قرآن کے مطابق ہے۔

صَدَقَةُ الْمَاشِيَةِ

جانوروں کی زکوۃ

٦ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ قَالَ: قَرَأْتُ كِتَابَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فِي الصَّدَقَةِ۔ قَالَ فَوَجَدْتُ فِيهِ:

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ كِتَابُ الصَّدَقَةِ: فِي أَرْبَعٍ وَّ عِشْرِيْنَ مِنَ الْإِبِلِ فَدُوْنَهَا الْغَنَمُ فِي كُلِّ خَمْسٍ شَاةٌ وَ فِيْمَا فَوْقَ ذٰلِكَ إِلٰى خَمْسٍ وَّ ثَلَاثِيْنَ ابْنَةُ مَخَاضٍ، فَإِنْ لَّمْ تَكُنِ ابْنَةُ

مَخَاضٍ فَابْنُ لَبُوْنٍ ذَكَرٌ، وَ فِيْمَا فَوْقَ ذٰلِكَ اِلٰى خَمْسٍ وَّ اَرْبَعِيْنَ بِنْتُ لَبُوْنٍ، وَ فِيْمَا فَوْقَ ذٰلِكَ اِلٰى سِتِّيْنَ حِقَّةٌ طَرُوْقَةُ الْفَحْلِ، وَ فِيْمَا فَوْقَ ذٰلِكَ اِلٰى خَمْسٍ وَّسَبْعِيْنَ جَذَعَةٌ وَ فِيْمَا فَوْقَ ذٰلِكَ اِلٰى تِسْعِيْنَ ابْنَتَا لَبُوْنٍ، وَ فِيْمَا فَوْقَ ذٰلِكَ اِلٰى عِشْرِيْنَ وَ مِائَةٍ حِقَّتَانِ طَرُوْقَتَا الْفَحْلِ فَمَا زَادَ عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الْاِبِلِ فَفِيْ كُلِّ اَرْبَعِيْنَ بِنْتُ لَبُوْنٍ، وَ فِيْ كُلِّ خَمْسِيْنَ حِقَّةٌ وَ فِيْ سَائِمَةِ الْغَنَمِ اِذَا بَلَغَتْ اَرْبَعِيْنَ اِلٰى عِشْرِيْنَ وَ مِائَةٍ شَاةٌ وَ فِيْمَا فَوْقَ ذٰلِكَ اِلٰى مِائَتَيْنِ شَاتَانِ وَ فِيْمَا فَوْقَ ذٰلِكَ اِلٰى ثَلَاثِمِائَةٍ ثَلَاثُ شِيَاهٍ فَمَا زَادَ عَلٰى ذٰلِكَ فَفِيْ كُلِّ مِائَةٍ شَاةٌ، وَلَا يُخْرَجُ فِي الصَّدَقَةِ تَيْسٌ وَلَا هَرِمَةٌ، وَلَا ذَاتُ عَوَارٍ اِلَّا مَاشَاءَ الْمُصَّدِّقُ، وَلَا يُجْمَعُ بَيْنَ مُفْتَرِقٍ وَلَا يُفَرَّقُ بَيْنَ مُجْتَمِعٍ خَشْيَةَ الصَّدَقَةِ وَمَا كَانَ مِنْ خَلِيْطَيْنِ فَاِنَّهُمَا يَتَرَاجَعَانِ بَيْنَهُمَا بِالسَّوِيَّةِ وَ فِي الرِّقَةِ اِذَا بَلَغَتْ خَمْسَ اَوَاقٍ رُبُعُ الْعُشْرِ۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ میں نے صدقہ کے بارے میں حضرت عمر بن خطابؓ کا خط پڑھا تو وہ یوں تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ کتاب الصدقہ۔ چوبیس یا اس سے کم اونٹوں پر ہر پانچ اونٹ کے لیے ایک بکری اور اس کے اوپر ۳۵ اونٹوں تک اونٹنی کا وہ مادہ بچہ جو دوسرے سال میں ہو یا کچھ زیادہ۔ اور اگر ایسا بچہ نہ ہو تو وہ بچہ جو تیسرے سال میں ہو اور نر ہو۔ اور اس سے اوپر ۴۵ تک تین سال کا مادہ بچہ۔ اور اس سے اوپر ساٹھ تک جوان اونٹنی جو حاملہ ہونے کے قابل ہو اور اس سے اوپر ۷۵ تک جوان اونٹ اور اس سے اوپر ۹۰ تک تین سال کے دو مادہ بچے۔ اور اس سے اوپر ۱۲۰ تک دو جوان اونٹنیاں حاملہ ہونے کے قابل۔ اور اس کے اوپر جو اونٹ زیادہ ہوں تو ہر چالیس پر ایک تین سال کا مادہ بچہ اور ہر پچاس پر ایک جوان اونٹنی۔ اور بکریوں میں جب ان کی تعداد چالیس تک پہنچ جائے تو ۱۲۰ تک ایک بکری اور اس سے اوپر ۲۰۰ تک دو بکریاں اور اس سے اوپر ۳۰۰ تک تین بکریاں اور اس سے اوپر ہر ایک سو پر

ایک بکری- اور صدقے میں سانڈ بکرا، بوڑھی اور عیب دار بکری یا اونٹنی نہیں لی جائے گی مگر یہ کہ تحصیل دار چاہے اور زکوۃ کے ڈر سے نہ الگ الگ گلوں کو یکجا کیا جائے گا اور نہ مجتمع گلوں کو الگ الگ کیا جائے گا اور جو خلیطین کے درمیان ہو گی تو وہ آپس میں برابر تقسیم کر لیں گے اور چاندی جب پانچ اوقیہ ہو تو اس پر چالیسواں حصہ زکوۃ ہو گی-

وضاحت:

"ابنۃ مخاض" اونٹ کا مادہ بچہ جو دوسرے سال میں ہو لیکن ابھی تیسرے میں داخل نہ ہوا ہو-

"ابن لبون" اونٹ کا نر بچہ جو تیسرے سال میں ہو-

"حقۃ" جوان اونٹنی

"طروقۃ الفحل" وہ اونٹنی جو حاملہ ہونے کی صلاحیت کو پہنچ جائے-

"جذعۃ" جوان اونٹ

"تیس" سانڈ جو تناسل کے لیے پالا جاتا ہے-

"ھرمۃ" بوڑھی اونٹنی یا بکری

"ذات عوار" عیب دار یعنی جس کی ایک آنکھ یا کان یا سینگ یا ٹانگ خراب ہو وغیرہ-

"خلیطین" جب دو یا زیادہ مالکوں کا مال ممیز ہو لیکن گھاٹ، گلہ، سانڈ، ڈیرہ اور چرواہا ایک ہی ہو تو وہ خلیط کے حکم میں ہیں- مال ممیز نہ ہو تو شریک ہوں گے-

"رقۃ" چاندی کو کہتے ہیں-

یہ روایت اگرچہ موقوف کے درجے میں ہے لیکن نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کی رو سے کہ علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین (میری سنت اور خلفائے راشدین کے طریقے کو لازم پکڑنا) اس کو سنت کا درجہ حاصل ہے- کیونکہ یہ حضرت عمر بن خطابؓ کے خط کے مندرجات ہیں اور اس لحاظ سے یہ ہدایات اسلامی نظام کا جزو ہیں-

اونٹوں کا نصاب پانچ اونٹ ہے جس کی زکوۃ ایک بکری ہے۔ جوں جوں اونٹوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا زکوۃ کے جانور کی نوعیت بدلتی جائے گی جو روایت میں بالکل واضح ہے۔ اونٹوں یا بکریوں کے شمار میں ان کا بڑا یا چھوٹا ہونا خارج از بحث ہے۔

مالکیہ کے نزدیک اگر زکوۃ دینے والے کے پاس مطلوبہ قسم کی اونٹنی گلے میں موجود نہ ہو تو اس کو خرید کر دینی پڑے گی۔ دوسرے فقہاء کا بھی یہی مسلک ہے۔ میرے نزدیک یہ درست نہیں۔ مطلوبہ قسم کی اونٹنی کی نایابی کی صورت میں اس کی بازاری قیمت زکوۃ میں ادا کی جا سکتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذؓ کو جو ہدایت فرمائی تھی کہ غلے میں سے غلہ اور جانوروں میں سے جانور لو تو وہ در حقیقت لوگوں کی سہولت کے پیش نظر فرمائی تھی کیونکہ صحرائی زندگی میں نقد ادائیگی مشکل تھی۔ اب اگر سہولت نقد ادائیگی میں ہے تو واجبی دام زکوۃ میں لیں گے اور زکوۃ دینے والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ غلے اور مواشی کی بجائے ان کی نقد قیمت زکوۃ میں ادا کر دیں۔ قیمت کا تعین تحصیلدار کرے گا۔ اگر زیادتی کرے گا تو اوپر شکایت کی جا سکتی ہے۔

الا ماشاء المصدق کا تعلق صرف "ذات عوار" سے ہے۔ تیس اور هرمة سے نہیں۔ عیب اگر معمولی قسم کا ہو اور جانور کی قیمت پر کچھ زیادہ اثر انداز نہ ہوتا ہو تو ایسا جانور صدقہ میں لے لیا جائے گا۔ یہ تحصیلدار کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ سانڈ کو اس لئے نہیں لیا جائے گا کہ گلے کی نشوونما کا انحصار اس کے اوپر ہے۔

میرے نزدیک تحصیلدار چھانٹ کر اچھے جانور نہیں لے سکتا۔ جس نسل یا قسم کے جانور زیادہ تعداد میں ہوں گے ان ہی میں سے لے گا۔

اگر زکوۃ دینے والے کے کئی گلے الگ الگ ہوں تو وہ زکوۃ کی ادائیگی کے لیے ایک جگہ شمار نہ ہوں گے اور نہ ہی ایک جگہ کے اکٹھے گلوں کو زکوۃ کے لیے الگ کیا جائے گا۔

امام مالک کے فتوے :

امام مالکؒ کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس دو الگ الگ چرواہوں کی نگرانی میں بکریاں ہوں یا الگ الگ چرواہوں کی نگرانی میں الگ مقامات یا شہروں میں ہوں تو مالک کے سامنے جمع کی جائیں گی اور وہ ان کی زکوۃ دے گا۔ میرے نزدیک اگر ایک تحصیلدار کے حلقے میں ایسا ہو تو جمع کی جا سکتی ہیں لیکن اگر تحصیلدار الگ ہوں تو ایسا کرنا

باعث زحمت ہے۔اس لیے ان کو الگ الگ رکھنا چاہیے۔

خلیط ہونے کی صورت میں ہر مالک پر زکوۃ اس وقت عائد ہوگی جب اس کے گلے کی تعداد بقدر نصاب ہوگی۔ اگر کسی ایک خلیط کے گلے کی تعداد نصاب سے کم ہوگی تو اس پر زکوۃ نہیں ہوگی لیکن اگر گلے میں کئی شخص شریک ہوں تو جانوروں کی کل تعداد پر زکوۃلی جائے گی جس کو شریک آپس میں شراکت کے تناسب سے تقسیم کرلیں گے۔

احناف کا مسلک بھی یہی ہے لیکن اہل حدیث اور شوافع کہتے ہیں کہ کل گلے کی تعداد پر زکوۃ عائد ہوگی، چاہے خلیط ہوں یا شریک۔میرے نزدیک احناف اور مالکیہ کا مسلک صحیح ہے۔جب مال معین ہو تو اس کی تعداد کے لحاظ سے نصاب کا تعین ہوگا۔جب مال معین نہ ہو تو شراکت کے اصول کے تحت زکوۃ عائد ہوگی۔شوافع کا مسلک کہ ہر شکل میں کل مال کے حساب سے زکوۃلی جائے گی درست نہیں۔

امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر بھیڑیں بکریوں سے زیادہ ہوں اور صاحب مال پر ایک بکری سے زیادہ زکوۃ واجب نہ ہوتی ہو تو تحصیلدار ان بھیڑوں میں سے ایک بھیڑ لے لے گا۔اور اگر بکریاں بھیڑوں سے تعداد میں زیادہ ہوں تو وہ ایک بکری لے گا اور اگر بھیڑ بکریاں تعداد میں برابر ہوں تو یہ تحصیلدار کی صوابدید پر ہوگا کہ بکری لے یا بھیڑ۔یہی معاملہ اونٹوں کی مختلف اقسام جمع ہونے کی صورت میں ہوگا۔میرے نزدیک یہ فتویٰ نہایت معقول ہے اور ہر نوع کے جانوروں کی زکوۃ میں اسی کو مد نظر رکھنا چاہیے۔

حضرت عمرؓ کا فرمان انہی جانوروں کے بارے میں ہے جو اس زمانے میں عربوں کے ہاں پالے جاتے تھے۔اب صورت حال میں یہ فرق واقع ہو گیا ہے کہ ان کے علاوہ کئی انواع کے جانوروں کے فارم اور اصطبل قائم ہو چکے ہیں۔ان جانوروں کا کاروبار نہایت منافع بخش ہے۔میرے نزدیک ایک اسلامی حکومت ان تمام جانوروں پر جو تجارت کے لیے پالے جاتے ہیں زکوۃ عائد کرے گی۔

مَا جَاءَ فِي صَدَقَةِ الْبَقَرِ

گایوں کی زکوۃ کے بارے میں

٦ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ قَيْسٍ الْمَكِّيِّ عَنْ طَاوُسٍ الْيَمَانِيِّ أَنَّ مُعَاذَ بْنَ

جَبَلٍ الْاَنْصَارِیَ اَخَذَ مِنْ ثَلَاثِیْنَ بَقَرَۃً تَبِیْعًا وَمِنْ اَرْبَعِیْنَ بَقَرَۃً مُسِنَّۃً وَاُتِیَ بِمَا دُوْنَ ذٰلِکَ فَاَبٰی اَنْ یَّاْخُذَ مِنْہُ شَیْئًا – وَ قَالَ لَمْ اَسْمَعْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فِیْہِ شَیْئًا حَتّٰی اَلْقَاہُ فَاَسْئَلَہٗ فَتُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ قَبْلَ اَنْ یَّقْدَمَ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ –

﴿طاؤس الیمانی روایت کرتے ہیں کہ معاذ بن جبل انصاریؓ نے تیس گائے بیل میں سے ایک بچہ لیا جس نے دودھ پینا ابھی چھوڑا تھا- اور چالیس گائے بیل میں ایک دو سالہ بچھڑی بطور زکوۃ وصول کی- اس تعداد سے کم گائے بیل لائے گئے تو انہوں نے کچھ لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے رسول اللہ سے اس بارے میں کچھ نہیں سنا- اس لیے میں اس وقت تک کچھ نہیں لوں گا جب تک کہ میں رسول اللہ ﷺ سے نہ ملوں اور ان سے پوچھ نہ لوں- معاذ بن جبلؓ کے رسول اکرم کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے حضور کا انتقال ہو گیا-﴾

وضاحت :

"تبیع" اس بچے کو کہتے ہیں جس نے دودھ پینا چھوڑ دیا ہو-

"مُسِنَّۃ" اس دو سالہ بچھڑی کو کہتے ہیں جو بلوغ میں داخل ہو رہی ہو-

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ گائے بیل کا نصاب تیس گائے بیل ہے اور بھیڑ بکری کا چالیس ہے- آج کل گائے بیل کی ترقی یافتہ نسلیں ہالینڈ اور آسٹریلیا سے درآمد کی جاتی ہیں- ساہیوال کی بھینسیں اور بعض علاقوں کی گائے بیل خاصی شہرت رکھتے ہیں- ان کی زکوۃ لیتے وقت تحصیلدار خیال رکھے گا کہ جس نسل کی تعداد زیادہ ہو گی اسی میں سے زکوۃ دے گا، جیسا کہ اوپر کی روایت میں بیان ہو چکا ہے-

امام مالکؒ کے فتوے :

امام مالک کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے پاس بھیڑیں بھی ہوں اور بکریاں بھی تو دونوں کو جمع کر کے زکوۃ لی جائے گی کیونکہ وہ سب غنم کے حکم میں ہیں- میرے نزدیک یہ درست ہے-

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے گلے میں اضافہ کرے، خواہ خرید کر یا جانوروں کی افزائش سے یا میراث ملنے سے، تو ان پر سال گزرنے سے پہلے زکوٰۃ نہ ہوگی- لیکن اگر وہ شخص پہلے ہی صاحب نصاب ہے تو وہ اضافہ شدہ جانوروں کی زکوٰۃ پہلے جانوروں کے ساتھ دے گا اگرچہ اس کے یہ جانور زکوٰۃ دینے کے ایک ہی روز پہلے پیدا ہوئے ہوں یا خریدے گئے ہوں-

امام مالکؒ کے نزدیک اونٹ جو رہٹ چلاتے ہوں اور بیل جن پر پانی کی مشکیں لاد کر لائی جاتی ہوں اور جو کھیتی کے کام میں آتے ہوں اگر وہ نصاب کی تعداد میں ہوں تو ان پر زکوٰۃ لی جائے گی- مثلاً اگر ایک اونٹ رہٹ چلاتا ہے اور دوسرے پالے ہوئے ہیں اگر یہ مل کر پانچ ہو جائیں تو زکوٰۃ لی جائے گی- ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے اونٹ کے ساتھ سائمہ کا ذکر نہیں کیا- صرف بکری کے ساتھ کیا ہے- میرے نزدیک زیادہ قرین صواب یہ ہے کہ بکری پر دوسرے جانوروں کو قیاس کیا جائے- نیز زکوٰۃ میں ایک اصول یہ مد نظر رکھا گیا ہے کہ استعمال کی جتنی چیزیں ہیں وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں- پہننے کے کپڑوں اور استعمال کے زیوروں پر زکوٰۃ نہیں- مزید براں زکوٰۃ ان چیزوں پر ہے جن میں نشوونما ہوتی ہو- وہ اونٹ یا بیل جو رہٹ چلاتا ہو یا بار برداری کے کام آتا ہو وہ نشوونما کے مقصد کے لیے بیکار ہو جاتا ہے اور اس کی مدد سے جس چیز کی نشوونما ہو رہی ہے اس میں سے زکوٰۃ الگ لی جا رہی ہے- اگر اونٹ رہٹ چلاتا ہے تو فصل میں اس کی محنت جذب ہو رہی ہے اور فصل میں سے زکوٰۃ لی جا رہی ہے- اس لیے جو جانور استعمال کے ہیں وہ زکوٰۃ کے اموال میں نہیں آتے- جیسے استعمال کے زیورات کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کرتے ہیں تو استعمال کے جانور بھی اسی اصول کے تحت زکوٰۃ کے اموال سے الگ ہونے چاہئیں-

مَا جَاءَ فِيمَا يَعْتَدُّ بِهِ مِنَ السَّخْلِ فِي الصَّدَقَةِ

زکوٰۃ میں میمنوں کو شمار کرنے کے بارے میں روایت

٦ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ ثَوْرِ بْنِ زَيْدٍ الدِّيلِيِّ عَنِ ابْنٍ لِعَبْدِاللّٰهِ بْنِ سُفْيَانَ الثَّقَفِي عَنْ جَدِّهِ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ بَعَثَهُ مُصَدِّقًا فَكَانَ يَعُدُّ عَلَى النَّاسِ بِالسَّخْلِ، فَقَالُوا أَتَعُدُّ عَلَيْنَا بِالسَّخْلِ وَلَا تَأْخُذُ مِنْهُ شَيْئًا ، فَلَمَّا قَدِمَ عَلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ ذَكَرَ لَهُ

ذٰلِكَ، فَقَالَ عُمَرُ نَعَمْ تَعُدُّ عَلَيْهِمْ بِالسَّخْلَةِ يَحْمِلُهَا الرَّاعِيْ، وَلَا تَأْخُذُهَا، وَلَا تَأْخُذُ الْاَكُوْلَةَ، وَلَا الرُّبّٰى، وَلَا الْمَاخِضَ وَلَا فَحْلَ الْغَنَمِ، وَتَأْخُذُ الْجَذَعَةَ وَالثَّنِيَّةَ- وَذٰلِكَ عَدْلٌ بَيْنَ غِذَاءِ الْغَنَمِ وَخِيَارِهٖ-

﴿سفیان بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ان کو تحصیلدار بنا کر بھیجا- وہ زکوٰۃ کے لیے بکریوں کے بچوں کو بھی شمار کرتے تھے- لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ بکریوں کے بچوں کو شمار کر لیتے ہیں لیکن زکوٰۃ کے طور پر ان کو قبول نہیں کرتے- جب سفیان حضرت عمرؓ کے پاس آئے تو ان سے اس بات کا ذکر کیا- اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہاں تم بکری کے بچوں کو شمار کیا کرو بشمول ان کے جن کو چرواہا اپنے کندھے پر اٹھائے ہو (یعنی جو ابھی بکری کے ساتھ چل بھی نہ سکتا ہو) لیکن ان کو زکوٰۃ میں نہ لو- اور نہ ہی اس بکری کو لو جو گوشت کھانے کے لیے تیار کی جا رہی ہو، نہ اس کو جو بچے کی پرورش کرتی ہو، نہ وہ جو گابھن ہو اور نہ ہی سانڈ زکوٰۃ میں لیا جائے گا- البتہ ایک سالہ اور دو سالہ بچے لیے جائیں گے اور یہی انصاف کا تقاضا ہے عام بکریوں اور اعلیٰ بکریوں کے درمیان﴾

وضاحت:

"السخلۃ" بکری کے چھوٹے بچے کو کہتے ہیں-

"الاکولۃ" اس بکری کو کہتے ہیں جس کا گوشت کھانے کے لیے اس کو موٹا کیا جا رہا ہو-

"الرُبّٰی" وہ بکری جو بچہ جن چکی ہو اور اب اس کی پرورش کر رہی ہو-

"الماخض" وہ گابھن بکری جو بچہ جننے والی ہو-

"الفحل الغنم" وہ سانڈ جو افزائش نسل کی غرض سے پالا جا رہا ہو-

اس روایت کا مفہوم واضح ہے- اس کی رو سے اصول یہ ہے کہ بچے نصاب پورا کرنے کے لیے تو شمار کیے جائیں گے لیکن ان کو زکوٰۃ میں وصول نہیں کیا جائے گا- اسی طرح سے وہ بکریاں جو کسی خاص مقصد کے لیے پالی جا رہی

دوں زکوۃ میں وصول نہیں کی جائیں گی۔ غذاء الغنم سے عام بکریاں مراد ہیں اور خیارہ سے خاص اعلیٰ قسم کی بکریاں۔ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے دونوں کے ایک سال اور دو سال کے بچے لیے جائیں گے۔

اَلنَّهْيُ عَنِ التَّضْيِيقِ عَلَى النَّاسِ فِي الصَّدَقَةِ

وصولیٔ زکوۃ میں لوگوں کو تنگ کرنے کی ممانعت

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيَى بْنِ حَبَّانَ عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهَا قَالَتْ: مُرَّ عَلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ بِغَنَمٍ مِنَ الصَّدَقَةِ فَرَأَى فِيهَا شَاةً حَافِلًا ذَاتَ ضَرْعٍ عَظِيمٍ، فَقَالَ عُمَرُ مَا هٰذِهِ الشَّاةُ؟ فَقَالُوا شَاةٌ مِنَ الصَّدَقَةِ فَقَالَ عُمَرُ مَا أَعْطَى هٰذِهِ أَهْلُهَا وَهُمْ طَائِعُونَ لَا تَفْتِنُوا النَّاسَ لَا تَأْخُذُوا حَزَرَاتِ الْمُسْلِمِينَ، نَكِّبُوا عَنِ الطَّعَامِ۔

﴿حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ حضرت عمرؓ کے سامنے صدقہ کی بکریوں کا گزر ہوا تو انہوں نے ایک بکری دیکھی جو بڑے تھن والی دودھ سے لبریز تھی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا یہ بکری کیسی ہے؟ لوگوں نے کہا یہ بھی صدقہ کی بکری ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس کے مالکوں نے خوشی سے تو نہیں دی ہو گی۔ لوگوں کو فتنہ میں نہ ڈالو اور مسلمانوں کے عزیز مال نہ لو۔ لوگوں کی غذائی ضروریات لینے سے اجتناب کرو۔﴾

وضاحت:

حضرت عمرؓ کا مطلب یہ تھا کہ غذائی ضروریات مثلاً دودھ وغیرہ کے لیے جو بکریاں پالی جاتی ہیں، زکوۃ کی وصولی میں ان کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ عمدہ اور منتخب مال زکوۃ میں نہیں لیا جائے گا۔ کوئی مالک اپنی خوشی سے دیدے تو الگ بات ہے۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ محمد بن مسلمہ انصاریؓ جب تحصیلدار کی حیثیت سے زکوۃ وصول کرنے جاتے تو صاحب

مال سے کہتے کہ اپنے مال کی زکوٰۃ نکالو۔ جو کچھ وہ پیش کرتا تو جس مقدار میں وہ سمجھتے کہ زکوٰۃ کا حق ادا ہو گیا تو اس کو قبول کر لیتے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں پسندیدہ طریقہ یہی ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ کے بارے میں تشدد نہیں کرنا چاہیے اور جو مال وہ خوشی سے ادا کریں اس کو قبول کر لینا چاہیے، بشرطیکہ زکوٰۃ کا حق اس سے ادا ہو جاتا ہو۔

آخِذُ الصَّدَقَةِ وَمَا يَجُوْزُلَهٗ اَخْذُهَا

صدقہ لینے والے کے لیے کیا لینا جائز ہے

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ اِلَّا لِخَمْسَةٍ لِغَازٍ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ، اَوْ لِعَامِلٍ عَلَيْهَا اَوْ لِغَارِمٍ اَوْ لِرَجُلٍ اِشْتَرَاهَا بِمَالِهٖ اَوْ لِرَجُلٍ لَهٗ جَارٌ مِسْكِيْنٌ فَتُصُدِّقَ عَلَى الْمِسْكِيْنِ فَاَهْدَى الْمِسْكِيْنُ لِلْغَنِيِّ۔

﴿عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پانچ قسم کے آدمیوں کے سوا کسی غنی کے لیے صدقہ قبول کرنا جائز نہیں۔ پہلا وہ جو اللہ کی راہ میں جہاد کر رہا ہو، دوسرا تحصیل دار، تیسرا مقروض، چوتھا وہ جس نے اپنے مال کے عوض صدقہ کے جانور خرید لیے، پانچواں وہ شخص جس کا پڑوسی مسکین ہو اور مسکین کو جو کچھ صدقہ میں ملا ہو تو اس میں سے وہ غنی کو ہدیۃً دے دے۔﴾

وضاحت :

اس روایت میں دو صورتیں بیان ہوئی ہیں جن میں کوئی غنی آدمی بھی صدقہ کا مال حاصل کر سکتا ہے۔ اول اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے پر صدقہ کی رقم خرچ کی جا سکتی ہے۔ مثلاً صدقہ کی رقم سے کسی مجاہد کو گھوڑا خچر وغیرہ لے کر دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اب زمانہ سٹینڈنگ آرمی رکھنے کا ہے اس لیے یہ انفرادی مصرف ختم ہو چکا ہے۔ دوسرے تحصیل زکوٰۃ پر مقرر عملہ کی تنخواہ اموال صدقہ میں سے دی جا سکتی ہے، بشرطیکہ تحصیل زکوٰۃ کا کام حکومت کرتی ہو۔ تیسرے کسی مقروض کو قرض سے نجات دلانے کے لیے صدقہ کی رقم دے سکتے ہیں۔ چوتھے کوئی مالدار آدمی صدقے کے جانور خرید کر اپنے لیے پال سکتا ہے۔ پانچویں کسی شخص کے پڑوسی مسکین کو صدقے کے جانور ملیں اور

وہ اپنے پڑوسی مالدار کو یہ جانور ہدیہ میں دے دے تو اس کا ہدیہ قبول کرنا غنی کے لیے جائز ہوگا۔

آخر الذکر صورت کے جواز کا حکم حضرت بریرہؓ کی روایت سے بھی نکلتا ہے۔ وہ حضرت عائشہؓ کی لونڈی تھیں۔ ان کو صدقہ کا گوشت ملا تو انھوں نے حضرت عائشہؓ کے پاس ہدیۃً بھیج دیا۔ رسول اللہ ﷺ اس کو کھانے لگے۔ حضرت عائشہؓ نے آپ کو روکا کہ گوشت تو بریرہ کو صدقے میں ملا ہوگا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ لہا صدقۃ ولنا ھدیۃ (یہ اس کے لیے صدقہ ہے لیکن ہمارے لیے ہدیہ ہے)۔

یہ روایت کہ کسی سید کے لیے صدقہ لینا جائز نہیں تحقیق طلب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مصلحت کی بناء پر نبی ﷺ نے اس کو ناجائز قرار دیا ہو کیونکہ اس کی ایک علت موجود تھی۔ یہود میں غرباء و مساکین کے بجائے حضرت موسیٰ کا خاندان بنی لاوی ہی تمام صدقات کا مرجع بن گیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس صورت کو دوبارہ پیدا ہونے سے روکنے کے لیے آنحضرت ﷺ نے اپنی اولاد کے لیے صدقہ کو ممنوع قرار دے دیا ہو۔ یہ گویا سد ذریعہ کی مصلحت پیش نظر تھی۔ میرے نزدیک صدقہ کو ھی من اوساخ الناس (یہ لوگوں کا میل کچیل ہے) کی علت پر ممنوع قرار دینا درست نہیں معلوم ہوتا۔ اگر سید غریب ہوں تو ان کی مدد کی کیا صورت ہوگی؟ وہ کس بناء پر صدقات سے محروم رکھے جائیں گے؟

شوافع صدقات کو قرآن مجید کے بیان کردہ آٹھوں مصارف پر برابر خرچ کرنے کے قائل ہیں۔ ان کا یہ مسلک عزیمت کے بھی خلاف ہے اور اس سوال کا جواب بھی نہیں دیتا کہ اگر کوئی مصرف معدوم ہو گیا ہو تو اس صورت میں کیا کیا جائے گا۔ جیسے کہ موجودہ زمانے میں غلامی کا نظام ختم ہو چکا ہے تو زکوٰۃ کا آٹھواں حصہ جو غلاموں کی آزادی کی مد کا ہے اس کو کہاں خرچ کیا جائے گا۔ میرے نزدیک جمع شدہ مال زکوٰۃ کو قرآن مجید کے بیان کردہ ہر مصرف پر بھی خرچ کیا جا سکتا ہے اور ایک مصرف کو دوسرے مصرف پر ترجیح بھی دی جا سکتی ہے۔ نیز جو مصرف معدوم ہو چکے ان پر اصرار کی کوئی وجہ نہیں۔ مالکیہ یہ کہتے ہیں کہ امیر کو اختیار ہے کہ وہ جس مد میں جتنا خرچ کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ موقف درست ہے۔ حکومت اگر مناسب خیال کرے تو فقراء اور مساکین پر صدقات کا کل کا کل کئی سال تک خرچ کر سکتی ہے جب کہ دوسری اصناف پر کچھ بھی خرچ نہ کرے۔ احناف اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ کو صرف ایک ہی مصرف پر بھی خرچ کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بھی ٹھیک ہے۔

مَاجَاءَ فِي أَخْذِ الصَّدَقَاتِ وَ التَّشْدِيْدِ فِيْهَا

صدقے کی وصولی اور اس میں سختی کے بارے میں روایات

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ اَبَابَكْرٍ الصِّدِّيْقَ قَالَ لَوْ مَنَعُوْنِيْ عِقَالًا لَجَاهَدْتُهُمْ عَلَيْهِ-

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا کہ لوگ اگر ایک راس جانور بھی مجھ سے روکیں گے تو میں اس پر ان سے جہاد کروں گا-﴾

وضاحت:

"عقال کے معنی اس رسی کے ہیں جس سے اونٹ باندھا جاتا ہے-اس لیے عام طور پر سیدنا ابو بکرؓ کے قول کے یہ معنی بیان کیے جاتے ہیں کہ اگر لوگ اونٹ باندھنے کی وہ رسی بھی جو وہ زکوٰۃ میں دیا کرتے تھے روکیں گے تو میں اس پر ان سے جہاد کروں گا- حقیقت یہ ہے کہ بعض الفاظ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور ان کا یہ استعمال نہایت معروف ہو جاتا ہے- یہی حال لفظ 'عقال' کا ہے- مجازی معنی میں اس کا اطلاق اس جنس پر ہوتا ہے جو اموال میں سے بطور زکوٰۃ وصول کر لی جاتی ہے اور اس کے بجائے نقد مال نہیں لیا جاتا-"المبرد" نے الکامل باب فی الخطاب فی اقوال عمر بن الخطابؓ میں لکھا ہے کہ مصدق اگر زکوٰۃ میں نقدی وصول نہ کرے بلکہ اسی مال میں سے جو اس کے سامنے پیش کیا جائے جنس وصول کرے تو کہا جاتا ہے کہ "اخذ عقالا"۔ اس نے کسی شاعر کا ایک شعر نظیر میں پیش کیا ہے-

اتانا ابو الخطاب يضرب طبله

فرد ولم ياخذ عقالا ولا نقدا

(ابو الخطاب جب ہمارے پاس ڈھول پیٹتا ہوا آیا تو اس کو لوٹا دیا گیا حالانکہ اس نے نہ کوئی جنس وصول کی تھی نہ نقدی)

میرے نزدیک یہ تحقیق صحیح ہے اور عقال سے مراد وہ جانور ہے جو صدقہ میں قبول کیا جائے- خواہ وہ اونٹ ہو یا گائے، بھیڑ ہو یا بکری- ہماری زبان میں بھی بعض الفاظ کا مجازی معنی میں استعمال معروف ہے-

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے اس ارشاد کا مفہوم سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کا یہ قول کس موقع کا ہے- حضرت ابو بکرؓ کے خلافت پر متمکن ہونے کے بعد جب بعض قبائل نے اسلامی ریاست کو زکوٰۃ ادا کرنے سے

انکار کر دیا تو آپ نے ان کو بزور شمشیر مطیع کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے یہ رائے دی کہ مانعین وہ اس قسم کے لوگ نہیں جن کے ساتھ ہمیں جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے تمام آیات سے استدلال کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کو قائل کیا کہ میں نماز اور زکوٰۃ میں تفریق نہیں کرنے دوں گا۔ جس طرح ایک منکر نماز اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اسی طرح زکوٰۃ کا منکر بھی اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اسی موقع پر آپ نے فرمایا کہ اگر ایک رسی جانور بھی کسی کے ذمہ ہو گا تو میں اس سے نکلوا کر رہوں گا۔

ہمارے یہاں نظام زکوٰۃ کے نفاذ کے بعد حکومت نے بعض فرقوں کی اس بات کو معلوم نہیں کیسے گوارا کر لیا ہے کہ ہم اپنے مسلک فقہی کی رو سے حکومت کو زکوٰۃ دینا ضروری نہیں سمجھتے۔ شریعت کی رو سے ایسا کرنا درست نہیں۔ اس بارے میں صحیح موقف یہ ہے کہ یا تو یہ لوگ اسلامی ریاست کے حقوق بے کم و کاست ادا کریں ورنہ اقلیت کی حیثیت سے اپنے حقوق محفوظ کرا لیں۔ اقلیت کے حقوق میں بھی صرف پرسنل لا کی چیزیں ہوتی ہیں جس کے تحت ایک فرقے کے شخصی اور ذاتی معاملات آتے ہیں۔ سٹیٹ سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ تعزیرات، حدود، مالیات وغیرہ ایسے معاملات ہیں جن میں اقلیت کو یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ حکومت پر اپنی مرضی ٹھونسے۔ ان میں ریاست کا مذہب چلتا ہے۔ جہاں تک اقلیت کا تعلق ہے یہ دوسرے درجے کے شہری ہوتے ہیں۔ اول درجے کے نہیں ہو سکتے۔ اگر کسی فرقے کے لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو وہ یہ کہنے کا حق نہیں رکھتے کہ ہم اپنی فقہ کے مطابق حکومت کو زکوٰۃ دینے کے پابند نہیں ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کا عزم تو یہ تھا کہ اگر لوگوں نے ایک جانور بھی روکا تو میں ان کے خلاف جہاد کروں گا۔ نفاذ دین میں یہی عزم رکھنا ہر حکومت کے فرائض میں سے ہے۔

اس بارے میں امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے فرائض میں سے کسی فریضہ کی ادائیگی کو روکے اور مسلمان اس کا مطالبہ کرنے پر بھی اس کو حاصل نہ کر سکیں تو اس کے حصول کے لیے جہاد ان پر فرض ہو گا جب تک کہ وہ اس سے فریضہ کا حساب نہ چکا لیں۔ اسی فتویٰ پر امت کا اجماع ہے۔ اس صورت میں حکومت جہاد سے کی اور طاقت کے ذریعے اپنا حق وصول کرے گی۔

ہمارے ملک میں حکومت نے زکوٰۃ کے معاملہ میں جو کمزوری دکھائی ہے وہ بہت افسوسناک ہے۔

٦ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ أَنَّهُ قَالَ: شَرِبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لَبَنًا فَأَعْجَبَهُ فَسَأَلَ الَّذِي سَقَاهُ مِنْ أَيْنَ هٰذَا اللَّبَنُ فَأَخْبَرَهُ أَنَّهُ وَرَدَ عَلَى مَاءٍ قَدْ سَمَّاهُ فَإِذَا نَعَمٌ

مِنْ نَعَمِ الصَّدَقَةِ وَهُمْ يَسْقُوْنَ فَحَلَبُوْا لِیْ مِنْ اَلْبَانِهَا فَجَعَلْتُهٗ فِیْ سِقَائِیْ فَهُوَ هٰذَا- فَاَدْخَلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَدَهٗ فَاسْتَقَائَهٗ-

﴿زید بن اسلمؒ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دودھ پیا تو ان کو بہت پسند آیا- جس شخص نے دودھ پلایا تھا آپ نے اس سے پوچھا کہ یہ دودھ کہاں سے ملا- اس نے بتایا کہ فلاں چشمے پر مجھے جانا ہوا تو وہاں کچھ صدقے کے مویشی تھے جن کو لوگ پانی پلا رہے تھے- انہوں نے میرے لیے دودھ دوہا تو میں نے اس کو اپنے مشکیزہ میں ڈال لیا- یہ وہی دودھ ہے- حضرت عمرؓ نے اپنا ہاتھ منہ میں ڈال کر قے کرنا چاہی-﴾

وضاحت:

یہ غلبہ حال کی اسی طرح کی ایک مثال ہے جس طرح حضرت سلیمانؑ نے گھوڑوں کے معائنے کے دوران نماز عصر قضا ہونے پر گھوڑوں پر تلوار چلانی شروع کر دی تھی- اس سے حضرت سلیمانؑ اور حضرت عمرؓ جیسے لوگوں کے مزاج کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شدید التاثر لوگ تھے- اس روایت سے ان کی شدت احتیاط ظاہر ہوتی ہے کہ وہ خلیفہ کی حیثیت سے بیت المال کی امانت کے بارے میں کس قدر محتاط تھے-

□ حَدَّثَنِیْ عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ عَامِلًا لِعُمَرَ بْنِ عَبْدِالْعَزِيْزِ كَتَبَ اِلَيْهِ يَذْكُرُ اَنَّ رَجُلًا مَنَعَ زَكٰوةَ مَالِهٖ، فَكَتَبَ اِلَيْهِ عُمَرُ اَنْ دَعْهُ وَلَا تَاْخُذْ مِنْهُ زَكٰوةً مَعَ الْمُسْلِمِيْنَ- قَالَ فَبَلَغَ ذٰلِكَ الرَّجُلَ فَاشْتَدَّ عَلَيْهِ وَ اَدّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ زَكَاةَ مَالِهٖ فَكَتَبَ عَامِلُ عُمَرَ اِلَيْهِ يَذْكُرُ لَهٗ ذٰلِكَ فَكَتَبَ اِلَيْهِ عُمَرُ اَنْ خُذْهَا مِنْهُ-

﴿حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایک عامل نے ان کو یہ واقعہ لکھا کہ ایک شخص نے اپنے مال کی زکوٰۃ روک دی ہے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کو لکھا کہ اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو اور مسلمانوں کے ساتھ اس سے زکوٰۃ وصول نہ کرو- جب اس شخص کو یہ بات پہنچی تو اس پر سخت گراں گزری اور اس نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دی- عامل نے خلیفہ کو یہ صورت واقعہ لکھی تو حضرت عمر بن

عبدالعزیز نے عامل کو ہدایت کی کہ اس سے زکوٰۃ وصول کرلو﴾

وضاحت :

میرے نزدیک حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بہترین طرز عمل اختیار کیا۔وہ یہ حکم بھی دے سکتے تھے کہ اس بدبخت شخص سے زبردستی زکوٰۃ وصول کرو لیکن انہوں نے اس کو سبق دینا پسند کیا۔انہوں نے کہا کہ اس شخص کو مسلمانوں کے ساتھ شامل نہ کرو۔اس حکم کا مطلب یہ تھا کہ جب اس شخص کے کسی حق کا معاملہ آئے گا تو اس سے غیر مسلموں جیسا سلوک کیا جائے گا کیونکہ ایک شخص اگر حکومت کا حق ادا نہیں کرتا تو حکومت اس کی جان، مال، ناموس یا کسی اور چیز کی ذمہ دار نہیں ہوتی، جب تک وہ حکومت کا حق ادا نہ کرے۔وہ آدمی جلد ہی سمجھ گیا کہ نشتر کی زد کہاں تک جاتی ہے۔اس نے زکوٰۃ خود جا کر جمع کرائی۔اس طرح حضرت عمر ثانیؒ نے شدید ترین طرز عمل اختیار کیا اور ساتھ ہی تعلیم بھی دے دی تاکہ لوگ سمجھیں کہ ان کی ذمہ داریاں اور حقوق کیا ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عامل کا طرز عمل بھی لائق تحسین ہے کہ اس نے جب تک خلیفہ سے اجازت نہیں لے لی اس وقت تک زکوٰۃ قبول نہیں کی۔

زَكَاةُ مَا يُخْرَصُ مِنْ ثِمَارِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ

کھجوروں اور انگوروں کے تخمینہ سے زکوٰۃ

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ الثِّقَةِ عِنْدَهُ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ وَعَنْ بُسْرِ بْنِ سَعِيدٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالْعُيُونُ وَالْبَعْلِ الْعُشْرُ، وَفِيمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ۔

﴿امام مالکؒ اس شخص سے روایت کرتے ہیں جو ان کے نزدیک ثقہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو چیزیں بارش سے، قدرتی چشموں سے یا اپنے طور پر نشوونما پائیں تو ان کا دسواں حصہ زکوٰۃ ہے اور جن کو نہر یا کنویں سے پانی دیا جائے تو ان میں بیسواں حصہ زکوٰۃ ہوگی۔﴾

وضاحت :

قدرتی طور پر سیراب ہونے والی فصلوں اور مصنوعی آبپاشی سے سیراب ہونے والی فصلوں میں فرق کیا گیا ہے۔ آبپاشی پر اٹھنے والے مصارف کو مد نظر رکھتے ہوئے نہر وغیرہ سے سیراب ہونے والی فصلوں کی زکوٰۃ کی مقدار بارانی زمینوں کی فصلوں کی زکوٰۃ کا نصف رکھی گئی ہے۔

امام مالک کے فتوے :

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ کسی شخص کے پاس مختلف اقسام کی کھجوریں ہوں تو ردی قسم کی کھجوریں اگرچہ نصاب کے لیے شمار ہوں گی لیکن صدقہ میں وہ نہیں لی جائیں گی۔ اس کی دلیل ان کے نزدیک یہ ہے کہ ریوڑ میں موجود بکری کے بچے نصاب کی تعداد میں تو شمار کیے جاتے ہیں لیکن صدقے میں قبول نہیں کیے جاتے۔

میرے نزدیک صدقہ اس مال میں سے لیا جانا چاہیے جس کی مقدار زیادہ ہو۔ مویشیوں کے بارے میں مالکیہ کا اپنا فتویٰ یہ ہے کہ جس قسم کے مویشیوں کی تعداد زیادہ ہو گی ان میں سے صدقہ لیں گے اور جن کی تعداد کم ہو گی اس میں سے نہیں لیں گے۔ وہی اصول فصلوں کے بارے میں بھی قرین صواب ہے۔ میرے نزدیک اقسام کے تناسب سے بھی صدقہ لیا جا سکتا ہے۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں یہ بات متفق علیہ ہے کہ زکوٰۃ کی وصولی کے لیے کھجوروں اور انگور کے سوا باقی پھلوں کا تخمینہ نہیں لگایا جائے گا۔ حنفیہ نے تخمینہ کو ختم ہی کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ منسوخ ہو چکا ہے۔

میرے نزدیک روایات میں کھجور اور انگور کا ذکر اس لیے ہوا ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں یہی دو مشہور پھل تھے۔ باقی آم، سنگترہ، سیب وغیرہ عرب میں نہیں تھے۔ دوسرے خرص یعنی درخت پر پھل کا تخمینہ لگانا عام زندگی میں اس طرح ضروری ہوتا ہے جس طرح اشیاء کا ناپ اور وزن کرنا۔ پھلوں میں پیداوار کے اندازہ کے لیے سوائے خرص کے اور کوئی صورت ممکن نہیں۔ زیتون کے بارے میں مالکیہ خرص کے قائل نہیں بلکہ جب پھل اتار کر تیل نکالا جائے اور وہ تیل ۵ وسق سے زائد ہو تو عشر یا نصف عشر لیا جائے گا۔ میرے نزدیک یہ درست نہیں۔ زیتون بھی کھجور، آم، سنگترہ وغیرہ کے حکم میں ہو گا۔

پھل کچے اور نیم پختہ حالت میں بھی استعمال ہوتے ہیں اور روزانہ درختوں سے گرتے بھی ہیں۔ اس لیے جائے روز روز کا حساب کرنے کے سہولت اس میں ہے کہ درخت پر پھل کا تخمینہ کر لیا جائے۔ البتہ تخمینہ کرنے کے لیے

یہ ضروری ہے کہ پھلوں کی صلاحیت ظاہر ہو گئی ہو اور ان کی بیع جائز ہو۔ تخمینہ کرنے میں جو اصول معروف ہو گا اسی پر عمل ہو گا۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ پھلدار درختوں کی زکوۃ میں پھل وصول کریں گے۔ یہ درست نہیں۔ آنحضرتؐ نے مالکوں کی سہولت کے پیش نظر یہ فرمایا تھا کہ وہ پھل میں سے دیں۔ آج لوگوں کی سہولت اگر اس میں ہے کہ اس کی قیمت دیں تو یہ طریقہ بھی حدیث کے منشا کے مطابق ہو گا۔

امام مالک کی رائے یہ ہے کہ جو چیزیں تر حالت میں نہیں کھائی جاتیں بلکہ کٹائی اور صفائی کے بعد دانے نکلنے پر کھائی جاتی ہیں تو ان کا تخمینہ نہیں ہو گا۔ میرے نزدیک یہ رائے درست ہے۔

امام مالک کے نزدیک کھجور کے درخت پر کھجور کا تخمینہ اس وقت کیا جائے گا جب پھل کی صلاحیت ظاہر ہو جائے۔ لیکن اگر تخمینہ یا کٹائی اور پکنے کے بعد اس پر کوئی آفت آجائے جو تمام پھل کو برباد کر دے تو زکوۃ نہیں ہو گی۔ ہاں اگر ۵ وسق سے زیادہ بچ رہے تو اس پر زکوۃ ہو گی۔ میرے نزدیک یہ اصول درست ہے اور یہی اصول تمام فصلوں میں بھی ملحوظ رہے گا۔

امام مالک کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے بہت سے قطعات مختلف مقامات پر واقع ہوں یا مختلف مالوں میں اس کی شراکت ہو اور شراکت کا مال یا قطعات کی مالیت الگ الگ اس مقدار کو نہیں پہنچتے جس میں زکوۃ واجب ہوتی ہو لیکن یہ جمع کرنے پر نصاب کو پہنچ جاتے ہوں تو جمع کر کے ان پر زکوۃ عائد کی جائے گی۔ میرے نزدیک اس صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ جائداد میں دوسرے ساتھیوں کی نوعیت شریک کی ہے یا خلیط کی۔ اگر وہ مال میں شریک ہیں تو تمام مال جمع کر کے زکوۃ ادا کی جائے گی لیکن اگر وہ خلیط ہیں تو زکوۃ اس وقت عائد ہو گی جب ہر خلیط کا مال بقدر نصاب ہو۔ ورنہ نہیں، اور مختلف جگہ کے قطعات یا مال جمع کرنے میں تحصیل کا لحاظ رکھنا ہو گا۔ ایک تحصیلدار کے علاقے کے قطعات اور اموال جمع کیے جائیں گے لیکن مختلف تحصیلداروں کے علاقے کے نہیں۔

امام مالک کہتے ہیں کہ زیتون میں سے تیل نکالنے کے بعد عشر لیا جائے گا بشرطیکہ تیل ۵ وسق تک ہو۔ اس سے کم میں عشر نہیں ہو گا۔ ان کے نزدیک زیتون کھجور کے حکم میں ہے یعنی ایسی پیداوار کہ اگر آسمانی بارش اور قدرتی نالوں یا از خود زمین سے سیراب ہو تو اس میں عشر ہوتا ہے اور جس فصل کو پانی دیا جاتا ہو اس میں نصف عشر۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک زکوۃ زیتون کے تیل سے نہیں بلکہ زیتون کے پھل سے وضع کی جائے گی۔ قاضی ابو یوسف کے

نزدیک اس فصل میں زکوۃ نہیں ہے- یہ تو ایک تیل ہے-

احناف کے نزدیک ہر زمینی پیداوار میں زکوۃ ہے- خواہ پیداوار کی مقدار کثیر ہو یا قلیل- یعنی اس میں نصاب کی شرط نہیں- مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک مناط حکم یہ ہے کہ اس میں قوت اور ادخار (غذا بننے اور ذخیرہ کرنے کی صلاحیت) پایا جائے- میرے نزدیک احناف کا مسلک اس حد تک درست ہے کہ تمام پیداوار میں جو تجارتی مقاصد لیے ہوئے ہو زکوۃ ہو گی بشرطیکہ اس کی مقدار نصاب تک پہنچتی ہو لیکن قلیل مقدار مستثنیٰ ہو گی- مالکیہ اور شوافع کا مسلک کہ فصل میں قوت اور ادخار کی خصوصیت پائی جائے، درست نہیں- یہ علت فقہاء کی اپنی بنائی ہوئی ہے، یہ کسی نص یا مرفوع حدیث پر مبنی نہیں- یہ ضابطہ بندی کی غرض سے متعین کی گئی ہے- ضابطہ بندی اگرچہ ناگزیر ہے لیکن ضابطہ ایسا ہونا چاہیے جس میں تمام پیداوار جو تجارتی مقاصد کے لیے ہوئے ہوں وہ سب اس میں آجائیں- اس ضابطہ سے تمام پھل، سبزیاں اور ترکاریاں وغیرہ زکوۃ کے دائرے سے نکل جاتی ہیں- حالانکہ ان پھلوں اور سبزیوں کی آج بڑے پیمانے پر کاشت اور تجارت ہو رہی ہے- احناف نے بھی اس ضابطہ کو نہیں مانا-

امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ زیتون میں عشر یا نصف عشر زکوۃ خرچ نکالنے سے پہلے وضع کی جائے گی یا بعد میں، تو انہوں نے کہا کہ خرچ کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ مالک پر اعتماد کیا جائے گا- امام مالک کا یہ فتویٰ مبہم ہے- انہوں نے خرچ کی بات ٹال دی ہے- اگر زکوۃ تیل کے حساب سے لیتے ہیں تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ خرچ کاٹنا پڑے گا- احناف پھل میں سے زکوۃ لینے کے قائل ہیں- اس صورت میں خرچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا- میرے نزدیک اس بارے میں احناف کا مسلک درست ہے-

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم اتوا حقه يوم حصاده (فصل کا حق ادا کرو اس کے کاٹنے کے دن) سے مراد اس کی زکوۃ ادا کرنے کا حکم ہے- عبداللہ بن عمرؓ کے نزدیک اس سے مراد ان لوگوں کو دینا ہے جو کٹائی کے وقت مٹھی دو مٹھی مانگنے کے لیے آجاتے ہیں- میرے نزدیک امام مالک کی بات درست ہے لیکن چونکہ حکم عام ہے اس سے مراد سب حقوق ہوں گے- پہلا حق تو سرکاری زکوۃ ہے، دوسرے حقوق لوگوں کے ہیں جو انفاق فی سبیل اللہ کے ضمن میں آتے ہیں- روحانی ترقی کے لیے اس طرح کا انفاق نہایت ضروری ہے- امام مالک اگر آیت کو صرف زکوۃ سے خاص کر دیتے ہیں تو یہ ٹھیک نہیں-

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ جس نے اپنا باغ یا زمین بیچ دی جس میں کھیتی یا پھل ہو لیکن جس کی صلاحیت ابھی ظاہر نہ

ہوئی ہو تو اس کی زکوٰۃ خریدنے والے کے ذمہ ہو گی کیونکہ بیع کے وقت اس پر زکوٰۃ واجب ہی نہیں ہوئی تھی- اور اگر فصل تیار ہو اور اس کی بیع جائز ہو تو زکوٰۃ بیچنے والے کے ذمہ ہو گی، الا آنکہ وہ یہ شرط لگا دے کہ اس کی زکوٰۃ خریدار ادا کرے گا- میرے نزدیک یہ فتویٰ درست ہے-

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چار وسق کھجور اتارے، چار وسق منقے چنے، چار وسق گندم کاٹے اور چار وسق دالیں کاٹے تو ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر نصاب پورا نہیں کیا جائے گا اور اس پر زکوٰۃ نہیں ہو گی- ہاں اگر کھجور کی مختلف اقسام یا دوسری اصناف کی مختلف قسمیں مل کر بقدر نصاب ہو جائیں تو تمام اقسام کو یک جان کر کے ان پر زکوٰۃ عائد کی جائے گی- یعنی اگر گندم کی اقسام بے شمار ہیں تو ان سب کو جمع کر کے دیکھا جائے گا کہ وہ بقدر نصاب ہیں یا نہیں، اگر وہ بقدر نصاب ہو جائیں تو ان پر زکوٰۃ ہو گی- گندم کے رنگ یا مزا یا نام کا لحاظ نہ ہو گا- یہی معاملہ دوسری تمام اجناس مثلاً منقے، دالوں اور دھان میں ہو گا- ہر قسم کی دالیں اور دھان ایک جنس مانے جائیں گے-

شوافع کا مسلک مالکیہ سے مختلف ہے- وہ کہتے ہیں کہ اگر رنگ، نام اور مزے میں فرق ہے تو کسی جنس کی اقسام جمع نہیں کیا جائے گا- بلکہ ہر ایک کا نصاب الگ ہو گا-

میرے نزدیک مالکیہ کا مسلک درست ہے- شوافع کا مسلک درست نہیں- مالکیہ کا مسلک حضرت عمرؓ کے خط میں دیے گئے فتوے پر مبنی ہے- جس طرح ہر نوع کی بھیڑ بکریاں یا مختلف قسم کے اونٹ یا گائے بھینس جمع کر کے ان پر زکوٰۃ لی جاتی ہے اسی طرح مختلف قسم کی گندم اگرچہ اس کے رنگ، مزا اور نام میں فرق ہو زکوٰۃ کے لیے جمع کی جائے گی- علی ھذا القیاس دھان اور دالیں اور دوسری اجناس- میرے نزدیک جس طرح بھیڑ بکریوں میں سے جمع کرنے کے بعد زکوٰۃ اس قسم سے لینی چاہیے جس کی تعداد زیادہ ہو تو اسی اصول پر اجناس میں بھی جس نوع کی مقدار زیادہ ہو اسی نوع میں سے زکوٰۃ لینی چاہیے-

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے دالوں اور گندم میں فرق کیا تھا- انہوں نے عیسائی تاجروں سے دالوں میں عشر لیا اور منقے سے نصف عشر- ان کی رائے میں دالیں سب ایک قسم ہیں-

میرے نزدیک عیسائی تاجروں سے زکوٰۃ لینے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا- اس عشر یا نصف عشر کی نوعیت ایک اصول یا سیلز ٹیکس کی تھی- جب عیسائی تاجر اشیاء فروخت کرنے کے لیے مدینہ آنے لگے تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ عیسائی رعایا کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ جزیہ کا ہے، تجارت کے بارے میں ان پر کوئی ذمہ داری نہیں- لہٰذا انہوں

نے بطور تجارتی محصول یا ٹیکس عشر اور نصف عشر ان پر عائد کر دیا۔ عشر اور نصف عشر کا فرق تجارتی غرض سے رکھا گیا یعنی جس چیز کی مدینہ والوں کو زیادہ ضرورت تھی اس پر نصف عشر کے برابر ٹیکس لگایا گیا۔

امام مالک کہتے ہیں کہ اگر دو شخصوں کے درمیان کھجور کے باغ مشترک ہوں اور وہ اس سے آٹھ وسق کھجور حاصل کریں تو ان پر زکوۃ نہیں ہوگی اور اگر ان میں سے ایک کے حصے میں پانچ وسق آئیں اور دوسرے کے حصے میں چار وسق یا اس سے کم تو پانچ وسق کے مالک پر زکوۃ ہوگی اور دوسرے پر زکوۃ نہ ہوگی۔ اور یہی طریقہ تمام شریکوں کے لیے ہوگا۔ چاہے گندم کاٹیں یا انگور چنیں یا منقے۔ جب ہر ایک کا حصہ پانچ وسق ہوگا تو زکوۃ ہوگی، اگر حصہ پانچ وسق سے کم ہوگا تو زکوۃ نہیں ہوگی۔

احناف کے نزدیک مقدار کا سوال نہیں، مال قلیل ہو یا کثیر وہ اس پر زکوۃ مانتے ہیں۔ شوافع کہتے ہیں کہ شریک ایک ساتھ زکوۃ دیں۔

میرے نزدیک شریک اور خلیط میں فرق ہے۔ جہاں شریک ہوں تو مال کی زکوۃ ایک ہی جگہ کاٹی جائے گی۔ اگر خلیط ہوں تو مالکیہ کے مسلک کے مطابق زکوۃ ہوگی۔ شریکوں کے معاملے میں شوافع کی رائے صحیح ہے، خلیطوں کے بارے میں نہیں۔

امام مالک کہتے ہیں کہ ایسی تمام اصناف از قسم گندم، کھجور، منقے اور غلہ جن کی زکوۃ ادا کر دی گئی ہو، اگر طویل مدت تک روک لی گئی ہوں اور کئی سال روکے رکھنے کے بعد مالک ان کو بیچے تو ان کی قیمت پر زکوۃ نہیں ہوگی جب تک اس قیمت پر ایک سال نہ گزر جائے۔ بشرطیکہ یہ اقسام تجارت کے لیے نہ روکی گئی ہوں بلکہ ان کی حیثیت گھریلو سامان کی ہو۔ ہاں اگر یہ بطور سامان تجارت ہوں تو مالک پر اس وقت زکوۃ ہوگی جب وہ مال فروخت کرے گا اور ایک سال اس روز سے شمار ہوگا جس روز اس شخص نے ان کی زکوۃ دی تھی جس سے اس نے مال خریدا تھا۔

میرے نزدیک یہ فتویٰ درست ہے۔ مالکیہ احتکار کی اجازت نہیں دیتے۔ تاجر مال کو روک نہیں سکتا۔ اس کو سال پورا ہونے پر زکوۃ دینی ہوگی۔

پھلوں، ککڑیوں اور سبزیوں کی زکوۃ کے باب میں بھی کوئی مرفوع حدیث یا اثر صحابہ نہیں، امام مالکؒ کے فتوے ہیں۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ کسی بھی قسم کے پھل مثلاً انار، فرسک، انجیر یا ان جیسے دوسرے پھلوں پر زکوۃ نہیں اور نہ

ان ککڑیوں اور سبزیوں پر زکوۃ ہے۔ان کی پیداوار کو اگر فروخت کر دیا جائے تو قیمت میں سے بھی زکوۃ وضع نہیں کی جائے گی جب تک اس پر پورا سال نہ گزر جائے اور وہ نصاب سے زائد نہ ہو۔

اس فتوے کی علت یا مناط حکم اجناس میں قوت اور ادخار کا پایا جانا ہے۔میرے نزدیک یہ علت درست نہیں۔ یہ اللہ اور رسول کی بتائی ہوئی علت نہیں۔اس کی بنا کسی نص پر نہیں اور نہ ہی کسی حدیث پر ہے۔اس معاملے میں احناف کا مسلک درست ہے کہ زمین میں جو چیز پیدا ہو گی اس پر زکوۃ ہو گی۔اس میں نصاب کی قید ضروری ہے جو حضور ﷺ نے لگائی ہے۔اگر کوئی شخص اپنے گھریلو استعمال کے لیے کوئی جنس پیدا کرتا ہے تو وہ زکوۃ سے مستثنیٰ ہو گی لیکن تجارتی مقاصد کے لیے ہر زمینی پیداوار پر زکوۃ ہو گی۔

مَا جَاءَ فِي صَدَقَةِ الرَّقِيقِ وَ الْخَيْلِ وَالْعَسَلِ

غلام، گھوڑے اور شہد کی زکوۃ کے بارے میں روایات

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ سُلَيْمٰنَ بْنِ يَسَارٍ عَنْ عِرَاكِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَيْسَ عَلَى الْمُسْلِمِ فِي عَبْدِهِ وَلَا فِي فَرَسِهِ صَدَقَةٌ

﴿حضرت ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان پر اس کے غلام اور گھوڑے میں زکوۃ نہیں﴾

وضاحت:

غلامی کا مسئلہ تو اب ختم ہو چکا اس لیے غلاموں کی زکوۃ کا معاملہ صرف علمی حد تک رہ گیا ہے۔گھوڑے کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے جو حکم دیا ہے وہ ایسے گھوڑوں کے بارے میں ہے جو ضرورت اور استعمال کے لیے رکھے جائیں۔ان پر زکوۃ نہیں ہو گی۔ہمارے زمانے میں گھوڑے تجارت کے لیے پالے جاتے ہیں اور ان کی خاص نسلوں کی افزائش کے لیے بڑے بڑے فارم وجود میں آ گئے ہیں۔یہ تجارت نہایت منافع بخش ہے۔ان گھوڑوں کا حکم مال تجارت کا ہو گا۔ان پر زکوۃ لگنی چاہیے۔دوسرے مویشیوں کی طرح صرف ایک مقررہ مقدار زکوۃ سے مستثنیٰ ہو گی۔

اس بارے میں احناف کا مسلک یہ ہے کہ گھوڑی پر زکوۃ لی جائے گی لیکن گھوڑے پر نہیں۔میرے نزدیک

مسلک کے نقل کرنے میں کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ تجارت کے لیے پالے گئے گھوڑے اور گھوڑیاں زکوٰۃ کے لیے یکساں متصور ہوں گے۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سُلَيْمٰنَ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ اَهْلَ الشَّامِ قَالُوا لِاَبِی عُبَيْدَةَ ابْنِ الْجَرَّاحِ خُذْ مِنْ خَيْلِنَا وَ رَقِيقِنَا صَدَقَةً فَاَبٰی ثُمَّ كَتَبَ اِلٰی عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَاَبٰی عُمَرُ، ثُمَّ كَلَّمُوهُ اَيْضًا فَكَتَبَ اِلٰی عُمَرَ فَكَتَبَ اِلَيْهِ عُمَرُ اِنْ اَحَبُّوْا فَخُذْهَا مِنْهُمْ وَارْدُدْهَا عَلَيْهِمْ وَارْزُقْ رَقِيقَهُمْ۔ قَالَ مَالِكٌ مَعْنٰی قَوْلِهٖ رَحِمَهُ اللّٰهُ وَارْدُدْهَا عَلَيْهِمْ يَقُوْلُ عَلٰی فُقَرَاءِهِمْ

﴿سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ اہل شام نے ابو عبیدہ بن جراحؓ سے کہا کہ ان کے گھوڑوں اور غلاموں سے زکوٰۃ لی جائے تو انہوں نے انکار کیا۔ اس بارے میں حضرت عمرؓ کو لکھا تو انہوں نے بھی انکار کیا۔ لوگوں نے دوبارہ اس معاملہ میں بات کی تو ابو عبیدہ نے دوبارہ حضرت عمرؓ کو لکھا۔ اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے لکھا کہ اگر وہ زکوٰۃ دینا پسند کرتے ہیں تو لے لو اور ان ہی کو لوٹا دو اور ان کے غلاموں کو کھلاؤ۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ان ہی کو لوٹانے کا مطلب یہ تھا کہ ان کے فقرا میں تقسیم کر دو۔﴾

وضاحت:

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل شام کے پاس غلام اور گھوڑے وافر مقدار میں بطور مال غنیمت جمع ہو گئے ہوں گے چنانچہ انہوں نے زکوٰۃ دینے پر اصرار کیا تو حضرت عمرؓ نے اجازت دے دی۔ مال کو فقراء میں تقسیم کرنے کا امام مالک کا نکتہ زکوٰۃ کے اس بنیادی اصول سے ماخوذ ہے کہ تؤخذ من اغنیائہم و ترد الی فقراء ھم (مال کو امیروں سے وصول کر کے ان کے غریبوں میں لوٹا دیا جائے)

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِی بَكْرِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ اَنَّهٗ قَالَ: جَاءَ كِتَابٌ مِنْ عُمَرَ بْنِ عَبْدِالْعَزِيْزِ اِلٰی اَبِی وَهُوَ بِمِنًی اَنْ لَا يَاْخُذَ مِنَ الْعَسَلِ وَلَا مِنَ الْخَيْلِ صَدَقَةً

﴿عبداللہ بن ابی بکر بن عمرو بن حزم روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا خط ان کے والد کو منیٰ میں ملا کہ وہ شہد اور گھوڑے میں سے زکوٰۃ نہ لیں﴾

وضاحت :

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی یہ ہدایت بھی عام قسم کے شہد کے چھتوں کے بارے میں ہے جو درختوں یا پہاڑوں میں لگتے ہیں۔ گھوڑے بھی وہی مراد ہیں جو لوگ ضرورت سے یا شان و شوکت کے اظہار کے لیے رکھتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں شہد کی پیداوار بھی ایک صنعت بن چکی ہے اور گھوڑوں کی افزائش بین الاقوامی تجارت کا ایک حصہ ہے۔ اب ایک اسلامی ریاست شہد اور گھوڑوں کو مال تجارت کی حیثیت دے گی اور اس پر زکوٰۃ عائد کرے گی۔

جِزْيَةُ اَهْلِ الْكُتُبِ وَالْمَجُوْسِ

اہل کتاب اور مجوسیوں کا جزیہ

6 حدثني يحيى عن مالك عن ابن شهاب قال: بلغني ان رسول الله ﷺ اخذ الجزية من مجوس البحرين و ان عمر ابن الخطاب اخذها من مجوس فارس و ان عثمان بن عفان من البربر۔

ابن شہاب سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ یہ بات مجھے پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بحرین کے مجوس سے جزیہ لیا، حضرت عمر بن خطابؓ نے فارس کے مجوس سے جزیہ لیا اور حضرت عثمان بن عفانؓ نے بربر سے جزیہ لیا۔

وضاحت :

قرآن میں یہود اور نصاریٰ سے جزیہ لینے کا حکم ہے۔ جب فتوحات کا دائرہ ایران، مصر اور بلاد مغرب تک وسیع ہو گیا تو دوسرے مذاہب کے لوگ مسلمانوں کے زیر اثر آ گئے۔ اب سوال پیدا ہوا کہ مجوسیوں کے ساتھ معاملہ کس طرح کیا جائے۔ اس معاملہ میں صحابہ کرام کی رائے یہ ہوئی کہ مجوس کے ساتھ اہل کتاب کا سا سلوک کرو۔ یہ سلوک صرف جزیہ کے بارے میں ہے، ذبیحہ یا نکاح کے معاملات کے لئے نہیں۔ اور مجوس ہی نہیں، تمام غیر مسلموں کے ساتھ یہی سلوک ہوگا اور وہ شبہ اہل کتاب سمجھے جائیں گے۔ صرف مشرکین اہل عرب کا معاملہ مختلف تھا۔ ان کے لیے اسلام تھا یا تلوار، کیونکہ ان کے اوپر رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ حجت تمام ہو چکی تھی۔ نہ ان کو غلام

مارا جا سکتا تھا اور نہ ان سے جزیہ لیا جا سکتا تھا۔ غیر مسلموں میں مفتوح اور معاہد اہل ذمہ کے درمیان فرق کیا جائے گا۔ مفتوح اہل ذمہ کے بارے میں حکومت کی صوابدید پر معاملہ ہو گا جب کہ معاہد اہل ذمہ کے ساتھ معاملہ ان شرائط کے مطابق ہو گا جو معاہدہ میں طے پا جائیں گی۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ ذَكَرَ الْمَجُوسَ فَقَالَ: مَا أَدْرِي كَيْفَ أَصْنَعُ فِي أَمْرِهِمْ. فَقَالَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ أَشْهَدُ لَسَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: سُنُّوا بِهِمْ سُنَّةَ أَهْلِ الْكِتٰبِ

﴿محمد بن علی روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے مجوس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان کے ساتھ کیا معاملہ کروں تو عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان کے ساتھ اہل کتاب کا معاملہ کرو﴾

وضاحت:

یہ روایت ترتیب میں مذکورہ بالا روایت سے پہلے آنی چاہیے تھی۔ اصل میں یہ مسئلہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں پیش آیا۔ انہوں نے لوگوں سے اس کے متعلق پوچھا تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث اس بارے میں پیش کر دی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بڑے بلند پایہ صحابی ہیں۔ ان کی خبر واحد کی بڑی اہمیت ہے اور اسی کے مطابق خلفائے راشدین نے عمل کیا، جیسا کہ اوپر کی روایت میں حضرت عمرؓ کے علاوہ حضرت عثمانؓ کے فیصلے کا حوالہ دیا گیا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ أَسْلَمَ مَوْلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ ضَرَبَ الْجِزْيَةَ عَلَى أَهْلِ الذَّهَبِ أَرْبَعَةَ دَنَانِيرَ وَ عَلَى أَهْلِ الْوَرِقِ أَرْبَعِينَ دِرْهَمًا مَعَ ذٰلِكَ أَرْزَاقُ الْمُسْلِمِينَ وَضِيَافَةُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ

﴿حضرت عمر بن خطابؓ کے آزاد کردہ غلام اسلمؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ذمیوں کے اوپر سونے پر چار دینار اور چاندی پر چالیس درہم جزیہ مقرر کیا اور مزید یہ کہ مسلمانوں کو کھانا کھلائیں اور

تین روز تک مہمان نوازی کریں۔☆

وضاحت:

یہ اہل ذمہ کے اوپر جزیہ کی شرح ہے۔جس دینار کے اوپر چار دینار جزیہ ہوگا اور دو صد درہم کے اوپر چالیس درہم جزیہ یعنی دونوں صورتوں میں پانچواں حصہ اور اس پر مزید یہ کہ مسلمانوں کو کھانا کھلائیں اور تین روز تک مہمانوں کی ضیافت کریں۔ اسلامی حکومت کو حق ہے کہ اہل ذمہ سے ان کی حفاظت کے بدلے میں جزیہ مقرر کرے۔اسی حق کے تحت حضرت عمرؓ نے یہ شرح مقرر کی۔اصولی طور پر یہ شرح زکوٰۃ کی شرح سے کم نہیں ہونی چاہیے۔زیادہ میں کوئی مضائقہ نہیں۔اس کی مقدار اسلامی حکومت کی صوابدید پر ہے۔

☐ حدثنی عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهُ قَالَ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اِنَّ فِى الظَّهْرِ نَاقَةً عَمْيَاءَ فَقَالَ عُمَرُ ادْفَعْهَا اِلٰى اَهْلِ بَيْتٍ يَنْتَفِعُوْنَ بِهَا۔ قَالَ فَقُلْتُ وَ هِىَ عَمْيَاءُ فَقَالَ عُمَرُ يَقْطُرُوْنَهَا بِالْاِبِلِ۔ قَالَ فَقُلْتُ كَيْفَ تَاْكُلُ مِنَ الْاَرْضِ؟ قَالَ فَقَالَ عُمَرُ اَمِنْ نَعَمِ الْجِزْيَةِ هِىَ اَمْ مِنْ نَعَمِ الصَّدَقَةِ؟ فَقُلْتُ بَلْ مِنْ نَعَمِ الْجِزْيَةِ فَقَالَ عُمَرُ اَرَدْتُمْ وَاللّٰهِ اَكْلَهَا۔ فَقُلْتُ اِنَّ عَلَيْهَا وَسْمَ الْجِزْيَةِ فَاَمَرَ بِهَا عُمَرُ فَنُحِرَتْ وَ كَانَ عِنْدَهُ صِحَافٌ تِسْعٌ فَلَا تَكُوْنُ فَاكِهَةٌ وَلَا طُرَيْفَةٌ اِلَّا جَعَلَ مِنْهَا فِىْ تِلْكَ الصِّحَافِ فَبَعَثَ بِهَا اِلٰى اَزْوَاجِ النَّبِىِّ ﷺ وَ يَكُوْنُ الَّذِىْ يَبْعَثُ بِهِ اِلٰى حَفْصَةَ ابْنَتِهِ مِنْ آخِرِ ذٰلِكَ فَاِنْ كَانَ فِيْهِ نُقْصَانٌ كَانَ فِىْ حَظِّ حَفْصَةَ قَالَ فَجَعَلَ فِىْ تِلْكَ الصِّحَافِ مِنْ لَحْمِ تِلْكَ الْجَزُوْرِ فَبَعَثَ بِهِ اِلٰى اَزْوَاجِ النَّبِىِّ ﷺ وَ اَمَرَ بِمَا بَقِىَ مِنْ لَحْمِ تِلْكَ الْجَزُوْرِ فَصُنِعَ فَدَعَا عَلَيْهِ الْمُهَاجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارَ۔ قَالَ مَالِكٌ لَا اَرٰى اَنْ تُؤْخَذَ النَّعَمُ مِنْ اَهْلِ الْجِزْيَةِ اِلَّا فِىْ جِزْيَتِهِمْ۔

☆زید بن اسلم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمرؓ بن خطاب کو بتایا کہ شتر خانے میں ایک اندھی اونٹنی ہے۔حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس کو کسی گھر والے کے پاس بھیج دو تاکہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔کہتے ہیں کہ اس پر میں نے کہا وہ تو اندھی ہے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ اس

کو اونٹوں کی قطار میں لگا لیں گے۔ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ وہ زمین سے کیسے کھائے گی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ آیا وہ جزیہ کے جانوروں میں سے ہے یا صدقے کے جانوروں میں سے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ جزیہ کے جانوروں میں سے ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تمہارا ارادہ، اللہ کی قسم، اس کو کھانے کا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اس کے اوپر تو جزیہ کا نشان ہے۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس کو ذبح کیا جائے۔ حضرت عمرؓ کے پاس نو طشتریاں تھیں اور ان کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی بھی پھل یا اچھی چیز ہوتی تو وہ ان طشتریوں میں حصے کر کے حضور کی ازواج کو بھیجتے اور جو کچھ بھیجتے اس کا آخری حصہ حضرت حفصہ کا ہوتا۔ تاکہ جو کمی بھی ہو وہ حضرت حفصہ کے حصے میں آئے۔ اسلم کہتے ہیں کہ اس اونٹنی کے گوشت کے حصے ہو کر ازواج مطہرات کو بھیجے گئے اور جو گوشت باقی بچا اس کو پکا کر تیار کرنے کا حکم دیا گیا اور اس پر مہاجرین اور انصار کی دعوت کی گئی۔ امام مالک کہتے ہیں کہ میری رائے میں اہل ذمہ سے سوائے جزیہ کے جانور نہیں لیے جا سکتے۔

وضاحت :

اس روایت سے کئی باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ جزیہ میں جانور بھی لیے جا سکتے ہیں۔ رہا اونٹنی کے اندھے ہونے کا سوال تو ہو سکتا ہے کہ دینے والے نے دھوکے سے دی ہو یا اگر پوری اونٹنی جزیہ میں نہ بنتی ہو تو اندھی قبول کر لی گئی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وصولی کے بعد اندھی ہو گئی ہو۔ دوسری یہ کہ جزیہ کے جانور بیت المال کا حصہ ہوتے تھے اور حضور کی ازواج مطہرات کی کفالت بیت المال سے ہوتی تھی۔ تیسری یہ کہ حضرت عمرؓ کا طریقہ یہ تھا کہ جو کچھ بھی ازواج مطہرات کو بھجواتے تو سب کے حصے کر کے بھجواتے اور اپنی بیٹی حضرت حفصہ کا حصہ آخر میں نکالتے تاکہ جو کمی بھی ہو وہ حضرت حفصہ کے حصے میں آئے تاکہ خلیفہ پر بیٹی کے معاملہ میں طعن نہ ہو۔ چوتھی یہ کہ ازواج مطہرات کو بھجوانے کے بعد جو بچ جاتا وہ پکا کر مہاجرین و انصار کی دعوت کر دی گئی تاکہ وہ ضائع نہ ہو اور کسی کو اس کے استعمال پر اعتراض بھی نہ ہو۔

كتاب البيوع

بیع کا مفہوم

بیع کا لفظ اشتراء اور بیع یعنی خرید اور فروخت دونوں کے لیے آتا ہے۔ اس کے معنی کا یہ اشتراک قدیم زمانے کے نظام تجارت کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس زمانے میں دنیا میں بارٹر سسٹم رائج تھا یعنی تجارت میں اشیاء کا تبادلہ کر لیا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے میں بھی بعض صورتوں میں بین الاقوامی تجارت بارٹر سسٹم ہی کے تحت ہوتی ہے۔ مبادلے میں ایک ہی چیز ثمن بھی ہوتی ہے اور مبیع بھی۔ اس لیے میرے نزدیک بیوع کا صحیح ترجمہ معاملات ہے۔ معاملات کے بارے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دو معاملات ایسے ہیں جن پر عالمی تمدن کی بنیاد ہے۔ ایک وہ جو میاں بیوی کے درمیان شادی کا معاہدہ ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو اشیاء کی لین دین کا معاملہ ہوتا ہے۔ یہ دونوں بنیادی چیزیں ہیں۔ یہ نہ ہوں تو معاشرہ وجود میں نہیں آتا اور زندگی نہیں گزر سکتی۔ سب سے زیادہ اہم یہی معاملات ہیں۔ اسی لیے ان دونوں کے متعلق خصوصیت کے ساتھ شریعت میں بحث آئی ہے تاکہ محکم تمدن وجود میں آ سکے۔ کتاب البیوع اشیاء کی لین دین کے معاملات پر بحث کرتی ہے۔

مَا جَاءَ فِي بَيْعِ الْعُرْبَانِ

بیعانہ کے معاملہ میں روایت

۱ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ الثِّقَةِ عِنْدَهُ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْعُرْبَانِ۔

﴿امام مالک اس شخص سے روایت کرتے ہیں جو ان کے نزدیک قابل اعتماد ہے کہ عمرو بن شعیب کے دادا نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع عربان سے منع فرمایا۔﴾

وضاحت:

بیع عربان یا عربون کے لیے اردو میں ایک جامع لفظ نہیں مل سکا۔ امام مالک نے اس کی نوعیت کی تشریح یوں کی ہے کہ ایک شخص کوئی غلام یا لونڈی خریدے یا کرائے پر سواری لے، پھر اس شخص سے جس سے اس نے معاملہ کیا ہے یہ کہے کہ میں تمہیں ایک دینار یا ایک درہم یا اس سے زیادہ یا کم رقم دیتا ہوں اس شرط پر کہ اگر میں نے یہ مال خریدا

یا سواری کی تو میں نے جو رقم تم کو دے دی ہے وہ اس کی قیمت میں شمار ہوگی اور اگر میں نے خریدنے کا ارادہ فسخ کر دیا یا سواری کو کرایہ پر استعمال کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تو جو کچھ میں نے دیا ہے وہ ضبط ہوگا۔ میں اس کا مطالبہ نہ کروں گا۔ گویا یہ وہ چیز ہوئی جسے آج بیعانہ کا نام دیا جاتا ہے۔ لغت کے لحاظ سے بیع عربان کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک چیز کے خریدنے کے متعلق اپنا ارادہ ظاہر کر دیتا ہے اور کچھ رقم پیشگی دے کر اس چیز کو اس وقت تک کے لیے محفوظ کرا لیتا ہے جب تک وہ یہ طے نہ کرے کہ خریدوں یا نہ خریدوں، تاکہ وہ چیز اس دوران ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ قدیم زمانے میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔ مال باہر سے آتا تھا اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتا تھا۔ کسی شخص کے لیے اس کا امکان بہت کم ہوتا تھا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے اس کو اپنے لیے محفوظ کرا سکے۔ تو اس کو محفوظ کرانے کا ایک طریقہ یہ نکالا گیا کہ کچھ رقم بطور بیعانہ دے دی جاتی۔ اسی کو روایت میں بیع عربان کا نام دیا گیا ہے۔

بیع عربان اس روایت کی رو سے ناجائز ہے۔ لیکن جو مذاہب نقل ہوئے ہیں ان کی رو سے ایسی بیع کو عبداللہ بن عمرؓ جیسا محتاط آدمی جائز قرار دیتا ہے اور امام احمد بن حنبل بھی اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس لیے معلوم کرنا پڑے گا کہ صحیح صورت معاملہ کیا ہے۔ فقہا معاملات میں فساد کی بنیاد یہ بتاتے ہیں کہ ایسے معاملات، جن میں کسی ایک فریق کو ضرر یا غرر یعنی نقصان یا دھوکہ ہو، باطل ہیں۔

میرے خیال میں بیع عربان کے ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ایک شرط پائی جاتی ہے جس میں کراہت ہے، نیز اس میں ضرر پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بیع کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بیع کو چند دنوں کے لیے روکا جائے۔ خریدنے کا معاملہ مشتبہ ہوتا ہے اور روکنے کا معاوضہ وہ رقم ہے جو متوقع خریدار نے پیشگی دے دی۔ میرے نزدیک معاملہ صاف صاف ہونا چاہیے اور خریدار کو یہ کہنا چاہیے کہ اگر تم مال کو روک سکتے ہو تو روکو۔ پابند ہونے کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ بائع کو اپنا مال اچھی قیمت پر فروخت کرنے کا موقع ملے لیکن وہ بیع عربان کے باعث اس فائدے سے محروم رہے۔ اسی طرح مال روکنے کا معاوضہ اگرچہ عین ربا تو نہیں لیکن اس کا شائبہ تو ہے۔ بائع آخر کس چیز کا معاوضہ لے رہا ہے۔ ظاہر ہے صرف اس چیز کا کہ اس نے مبیع کو روکے رکھا ہے۔ لہٰذا اس بیع میں ضرر اور غرر دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہوگا۔

یہی صورت جانور کرایہ پر لینے میں ہے۔ آپ جانور لے لیتے ہیں پھر اس کو دوڑاتے ہیں یا نہیں۔ اس طرح آپ نے بائع کو پابند کر کے اس کو دوسرے مواقع سے فائدہ اٹھانے سے محروم کر دیا۔ اب آپ کی دی ہوئی ضمانت کی

قم اس کا کافی بدل ہوتی ہے یا نہیں؟ یہ ایک مشتبہ معاملہ ہے۔ معاملہ کی یہ ساری شکل ضرر و غرر کے پہلوؤں کی حامل ہے۔ اس لیے ایسے معاملہ سے پرہیز ہونا چاہیے۔

اس روایت کی سند میں عن مالك عن الثقة عنده کے الفاظ بھی قابل غور ہیں۔ امام مالکؒ نے موطا میں جو روایات لی ہیں ان میں کثیر روایات کی سند میں عمن اثق به (اس شخص سے جس پر مجھے اعتماد ہے) یا عن الثقة عندنا (اس شخص سے جو ہمارے نزدیک قابل اعتماد ہے) کے الفاظ آتے ہیں۔ عام حالات میں اگر کوئی محدث سند کے کسی راوی کو چھپائے تو اس کی روایت مجروح قرار دی جاتی ہے لیکن امام مالک چونکہ بڑے عالی مقام محدث ہیں اس لیے ان کی زیادتی برداشت کر لی جاتی ہے کہ وہ اپنے راوی کی شخصیت کا اظہار نہ کریں۔ پہلے تو میں بھی اس چیز کو نظر انداز کرتا تھا لیکن بعض روایات پڑھنے سے میرا اعتماد سخت مجروح ہوا۔

شارحین کی رائے یہ ہے کہ اکثر مواقع پر الثقة عندنا سے امام مالک کی مراد ابن شہاب زہری ہوتے ہیں جن کے بارے میں معلوم ہوتا ہے اسی زمانے میں دو رائیں پائی جاتی تھیں۔ بعض لوگ ان پر اعتماد کرتے تھے لیکن دوسرے ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ امام مالکؒ چونکہ جرح و تعدیل میں بھی اپنی رائے رکھتے ہیں اس لیے بڑے طنطنے سے کہتے ہیں کہ میں ان پر اعتماد کرتا ہوں، دوسرا کوئی نہیں کرتا تو نہ کرے۔ ایک متنازعہ فیہ شخصیت کے حق میں اس طرح کا اصرار امام صاحب کی بڑی زیادتی ہے۔ زہری کا تشیع اور مرسل روایت کا ان کے ہاں ایراد ان کو اس قابل نہیں چھوڑتا کہ امام صاحب ان کے حق میں وحوش سے کام لیں۔ آپ آگے دیکھیں گے کہ زہری نے نہایت خطرناک روایتیں بیان کی ہیں اور امام صاحب نے ان کو قبول کر لیا ہے۔

مَا جَاءَ فِي الْمَمْلُوْكِ

غلام کے بارے میں حکم

٦ حدثنی یحیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ مَنْ بَاعَ عَبْدًا وَ لَهٗ مَالٌ فَمَالُهٗ لِلْبَائِعِ اِلَّا اَنْ يَشْتَرِطَهُ الْمُبْتَاعُ۔

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ جس شخص نے اپنا ایسا غلام بیچا جس کا اپنا مال بھی ہے تو وہ مال فروخت کرنے والے کا ہوگا، الا آنکہ خریدنے والا شرط لگاوے کہ وہ مال

میرا ہوگا۔﴾

وضاحت:

اس اثر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غلاموں کے پاس اپنا مال ہوتا تھا اور وہ اس کے مالک بھی ہوتے تھے۔ غلام کی فروخت کی صورت میں وہ مال مشتری کو اسی صورت میں مل سکتا تھا جب وہ اس کے متعلق شرط کر لیتا۔

احناف کہتے ہیں کہ غلام کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا اور اس روایت میں مال کی ضمیر جو غلام کی طرف لوٹتی ہے تو وہ محض اختصاص کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ جس طرح کہہ دیا جائے گھوڑے کی زین، گھوڑے کی لگام۔ حقیقت میں گھوڑے کا تو کچھ بھی نہیں ہوتا صرف اس کی طرف نسبت ہوتی ہے۔ ہر چیز گھوڑے کے مالک کی ہوتی ہے۔ میرے نزدیک احناف کا یہ مسلک درست نہیں اور مال کی ضمیر غلام کی طرف حقیقی ہے۔ محض شاعرانہ نہیں ورنہ غلام کے پہننے کے اگر کپڑے ہو سکتے ہیں، اس کا جوتا ہو سکتا ہے، اس کی کوٹھڑی میں جو سامان ہے وہ اس کا ہو سکتا ہے تو مال کیوں نہیں ہو سکتا۔ مالکیہ کا مذہب جو اس روایت سے ظاہر ہو رہا ہے میرے خیال میں درست ہے اور شوافع کا مذہب بھی یہی ہے۔ انہوں نے بہت سی مثالیں اس موقف کے حق میں دی ہیں جیسے کہ "ان عتق العبد او كاتب تبعه ماله و ان افلس اخذ الغرماء ماله و لم يتبع سيده بشي من دينه۔" "اگر غلام آزاد ہو جائے یا مکاتبت کرے تو اس کا مال اس کے ساتھ جائے گا اور اگر مفلس ہو جائے تو اس کے قرض خواہ اس کا مال لے لیں گے اور غلام کا آقا اس کے قرضے کا ذمہ دار نہ ہوگا"۔

مَا جَاءَ فِي الْعُهْدَةِ

گارنٹی کے بارے میں روایت

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ اَنَّ اَبَانَ بْنَ عُثْمَانَ وَ هِشَامَ بْنَ اِسْمٰعِيْلَ كَانَا يَذْكُرَانِ فِي خُطَبِهِمَا عُهْدَةَ الرَّقِيْقِ فِي الْاَيَّامِ الثَّلٰثَةِ مِنْ حِيْنَ يُشْتَرَى الْعَبْدُ اَوِ الْوَلِيْدَةُ وَ عُهْدَةَ السَّنَةِ۔

﴿عبداللہ بن ابی بکر سے روایت ہے کہ ابان بن عثمان اور ہشام بن اسماعیل دونوں اپنے خطبات میں غلام

ی گارنٹی کا ذکر کرتے تھے، تین دن اس دن سے جس دن سے غلام یا لونڈی خریدی جائے اور ایک سال کا بھی ذکر کرتے تھے-

وضاحت :

جو چیز فروخت کے لیے پیش کی جائے اس کی گارنٹی تو ہونی چاہیے- جیسے کسی نے گائے یا بکری بیچی ہے تو خریدار کو کم از کم دو تین دن ملنے چاہئیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ کتنا دودھ دیتی ہے- یا گھوڑا ہے تو معلوم ہو جائے کہ اصیل ہے یا رذیل ہے کہ چلنے کا نام ہی نہیں لیتا- اس زمانے میں بجلی کے آلات مثلاً ریفریجریٹر، ٹی وی وغیرہ میں گارنٹی کا رواج عام ہو چکا ہے- عام استعمال کی اشیاء میں بھی کئی دکاندار اس بات کا موقع دیتے ہیں کہ خریدار ان کی چیز کو برت کر تسلی کر لے-

غلاموں کے بارے میں تین دن کی گارنٹی اور ایک سال کی گارنٹی کا ذکر ابان بن عثمان اور ہشام بن اسماعیل اپنے خطبات میں کرتے تھے- اصل روایت میں یہ ابہام ہے کہ تین دن کون سے لونڈی یا غلام کے لئے ہوتے تھے اور ایک سال کن کے لیے- امام مالک نے آگے اپنی وضاحت سے اس ابہام کو دور کیا ہے کہ اگر لونڈی اور غلام کو تین دن میں کوئی بیماری لگ جائے تو وہ فروخت کرنے والے کے ذمہ ہو گی، یعنی بیع رد کی جا سکتی ہے اور جنون، برص اور جذام کی صورت میں ایک سال کی گارنٹی ہو گی- ایسی بیماری اگر ایک سال میں بھی لاحق ہو گئی تو فروخت کنندہ ذمہ دار ہو گا-

اسی طرح امام مالک کا فتویٰ ہے کہ اگر کسی نے غلام یا لونڈی جو میراث میں سے تھی یا کسی اور طرح سے اس کے پاس آئی تھی تندرستی کی گارنٹی کے ساتھ بیچی تو بائع پر اس کی ذمہ داری نہیں ہو گی- ہاں اگر غلام یا لونڈی میں عیب تھا جس کا بائع کو علم تھا تو گارنٹی اس کو فائدہ نہیں دے گی- ایسی بیع رد ہو گی-

احناف کہتے ہیں کہ صرف تین دن کی گارنٹی ہو گی، سال بھر کی نہیں- تین دن کے بعد رد کرنے کا حق نہیں ہو گا- اب لونڈی اور غلاموں کا معاملہ ختم ہونے کے بعد ان فتووں کی اب صرف تاریخی حیثیت رہ گئی ہے-

اَلْعَيْبُ فِی الرَّقِیْقِ

غلام کا عیب دار ہونا

☐ حدثنی یحیی عن مالك عن یحیی بن سعید عن سالم بن عبداللہ ان عبداللہ بن عمر باع غلاما لہ بثمانمائۃ درھم وباعہ بالبراءۃ فقال الذی ابتاعہ لعبداللہ بن عمر بالغلام داء" لم تسمہ لی فاختصما الی عثمان بن عفان فقال الرجل باعنی عبدا وبہ داء" لم یسمہ و قال عبداللہ بعتہ بالبراءۃ فقضی عثمان بن عفان علی عبداللہ بن عمر ان یحلف لہ لقد باعہ العبد وما بہ داء" یعلمہ فابی عبداللہ ان یحلف و ارتجع العبد فصح عندہ فباعہ عبداللہ بعد ذلك بالف و خمسمائۃ درھم-

٭ سالم بن عبداللہ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے ایک غلام آٹھ سو درہم میں اس کی تندرستی کی گارنٹی کے ساتھ بیچا، خریدار نے آکر عبداللہ بن عمرؓ سے کہا کہ غلام میں ایک عیب ہے جس کا انہوں نے ذکر نہیں کیا تھا-دونوں مقدمہ عثمان بن عفانؓ کے پاس لے گئے- خریدنے والے کا بیان یہ تھا کہ عبداللہ بن عمرؓ نے غلام بیماری کی حالت میں بیچا لیکن اس بیماری کا ذکر نہیں کیا- عبداللہ بن عمرؓ کا بیان تھا کہ میں نے اس کو تندرستی کی حالت میں بیچا تھا- اس پر حضرت عثمان بن عفانؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہا کہ آپ قسم کھایئے کہ آپ نے جس وقت غلام بیچا تھا تو اس وقت اس کو کوئی ایسی بیماری نہیں تھی جس کا آپ کو علم ہو- حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے قسم کھانے سے انکار کر دیا اور غلام واپس لے لیا-وہ ان کے پاس آکر ٹھیک ہو گیا تو عبداللہ بن عمرؓ نے اس کو پندرہ سو درہم میں بیچ دیا-

وضاحت:

روایت کا مفہوم واضح ہے- معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے بھی اس بات کو ملحوظ رکھا کہ خریدار کو اس بات کا موقع ملنا چاہیے کہ اگر غلام میں کوئی عیب ہے تو آگاہ ہونے پر وہ بیع کو فسخ کرنے کے لیے ہے-

مَا يُفْعَلُ بِالْوَلِيْدَةِ اِذَا بِيْعَتْ وَالشَّرْطُ فِيْهَا

اس لونڈی کے متعلق حکم جو شرط کے ساتھ بیچی جائے

حدثنی یحیٰی عَنْ مالکٍ عَنْ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِاللّٰهِ بْنِ عَبدِاللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَخبرهُ اَنَّ عَبدَاللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ ابْتَاعَ جَارِيَةً مِنِ امْرَأَتِهِ زَيْنَبَ الثَّقَفِيَّةِ وَاشْتَرَطَتْ عَلَيْهِ اَنَّكَ اِنْ بِعْتَهَا فَهِيَ لِيْ بِالثَّمَنِ الَّذِيْ تَبِيْعُهَا بِهِ فَسَاَلَ عَبدُاللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ عَنْ ذٰلِكَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لَا تَقْرَبْهَا وَفِيْهَا شَرْطٌ لِاَحَدٍ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک لونڈی اپنی بیوی حضرت زینب ثقفیہ سے خریدی تو انھوں نے شرط لگا دی کہ اگر آپ اس کو کبھی بیچنے والے ہوں تو اسی قیمت پر جس پر خرید رہے ہیں مجھے بیچ دیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حضرت عمر بن خطابؓ سے فتویٰ پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ اس سے قربت نہ کرنا کیونکہ اس میں کسی کے لیے شرط ہے۔

وضاحت :

اگر بیع میں یا نکاح میں کوئی شرط ایسی ہو جو مقصد بیع یا مقصد نکاح کے منافی ہو تو اس شرط کے باعث اس میں حرمت پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس معاملہ میں کوئی ایسی شرط عائد نہیں کی گئی جو عبداللہ بن مسعودؓ کو لونڈی ہبہ کرنے، آزاد کرنے یا مکاتبت کرنے سے روکتی ہو۔ لونڈی کی مالکہ نے صرف یہ کہا ہے کہ اگر اسے بیچنا ہو تو اسی قیمت پر ان کو واپس انہی کے پاس بیچ دیں۔ یہ شرط مقصد بیع کے خلاف نہیں۔ اس لیے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس میں لونڈی کی حرمت کی وجہ کیا ہے۔ البتہ حضرت عمرؓ کا فتویٰ یہی ہے۔

حدثنی عَنْ مالكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ لَا يَطَأُ الرَّجُلُ وَلِيْدَةً اِلَّا وَلِيْدَةً اِنْ شَاءَ بَاعَهَا وَ اِنْ شَاءَ وَهَبَهَا وَ اِنْ شَاءَ اَمْسَكَهَا وَ اِنْ شَاءَ صَنَعَ بِهَا مَا شَاءَ۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا فتویٰ یہ ہے کہ آدمی لونڈی سے قربت نہیں کر سکتا مگر اس صورت میں جب کہ اس کو اختیار ہو کہ وہ چاہے تو اس کو بیچ دے، چاہے تو ہبہ کر دے، چاہے تو روک رکھے اور اس

سے جو معاملہ کرنا چاہے کر سکے۔

وضاحت:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ فتویٰ حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا فتویٰ سے مختلف ہے اور میرے نزدیک صحیح ہے۔ مگر حضرت عمرؓ کے فتویٰ کی علت سمجھ میں نہیں آئی۔ واپس بائع کو بیچنے کی شرط کسی طرح مکمل حق ملکیت کو متاثر نہیں کرتی کہ جس سے بیع فاسد ہوتی ہو۔

مَا جَاءَ فِي ثَمَرِ الْمَالِ يُبَاعُ اَصْلُهُ

جو درخت بیچ دیے گئے ہوں ان کے پھل کے بارے میں

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ بَاعَ نَخْلًا قَدْ اُبِّرَتْ فَثَمَرُهَا لِلْبَائِعِ اِلَّا اَنْ يَشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ۔

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کھجوروں کا ایسا باغ بیچا جس میں گابھا لگایا جا چکا تھا تو اس کا پھل بیچنے والے کا ہوگا الا یہ کہ خریدنے والا شرط ٹھہرائے۔﴾

وضاحت:

عربوں میں گابھا لگانے کا ایک طریقہ رائج تھا کہ نر کھجور کے اندر سے کچھ ذرے لے کر مادہ کھجوروں کے اوپر چھڑکتے تھے تو پھل زیادہ آتا تھا۔ اسی کے متعلق دوسری روایت میں آتا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم اگر یہ نہ کرو تو کیا ہوگا۔ لوگوں نے گابھا لگانا چھوڑ دیا تو پھل کم آئے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ "انتم اعلم بامور دنیا کم" (تم اپنے دنیاوی امور کو بہتر طور پر جانتے ہو) معلوم ہوا کہ یہ وحی کا معاملہ نہیں تھا اور نہ دین کا معاملہ تھا بلکہ یہ تجربات کا معاملہ تھا۔ جن چیزوں کا تعلق اس دنیا کے نفع عاجل سے ہے تو ان چیزوں کا تقاضا خود ہمارے اندر اتنا ہے کہ اس کے اصول، اس کی صنعت اور اس کے طریقے سکھانے کی مذہب کو ضرورت نہیں۔ ضرورت صرف یہ جاننے کی ہے کہ دنیا کی چیزوں کو کن اخلاقی حدود و قیود کے اندر رہ کر استعمال کریں۔ مثال کے طور پر مذہب کو ہمیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کپڑے کی تراش خراش کیسی ہو، ٹوپی اور پاجامے کی وضع قطع کیسی ہو۔ لیکن وہ اخلاقی حدود بتاتا

ہے کہ مرد ریشم کے کپڑے نہ پہنے، کپڑے سے تفاخر کا اظہار نہ ہو۔ مرد عورتوں کا اور عورتیں مردوں کا لباس اختیار نہ کریں، وغیرہ۔ البتہ آخرت کے متعلق یہ چیزیں بتانے کی ہیں کہ خدا کو راضی کرنے کا کیا طریقہ ہے، عبادت کس طرح کی جائے، رکوع و سجود کیسے ہونے چاہئیں۔ گویا اصل بات یہ ہے کہ دنیوی امور کے لیے انسان کے اندر اتنی بات ہے کہ اس کو کچھ لگام لگانے کی ضرورت ہے، مہمیز دینے کی نہیں۔ اس کو اخلاقی اصولوں کا پابند بنانا ضروری ہے۔

احناف کے نزدیک باغ کو گابھا لگایا گیا ہو یا نہ لگایا گیا ہو پھل فروخت کرنے والے کا ہوگا اور باغ کو پانی دینے اور اس کی حفاظت کے جتنے امور ہیں ان کی ذمہ داری مشتری پر نہ ہوگی اور خریدار کو یہ حق بھی ہے کہ وہ فروخت کنندہ سے یہ مطالبہ کر سکتا ہے کہ باغ کا پھل توڑ لو۔ میں اس کے پکنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔ لیکن مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ نہیں، خریدار پانی بھی دے گا، دیکھ بھال بھی کرے گا اور بائع کو پھل اس وقت تک روکنے کا حق ہے جب تک کہ اس کے اترنے کا وقت نہ آجائے۔

میرے نزدیک حنفیہ کا فتویٰ مصلحت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے لیکن روایت کے الفاظ مالکیہ اور شافعیہ کے حق میں جاتے ہیں۔ بیع کے بارے میں یہ اصول معروف ہے کہ اگر بیع میں کوئی ایسی شرط لگا دی جائے جو مالکیت کے منافی ہو تو وہ بیع ناجائز ہے۔ اس اصول کے لحاظ سے حنفیہ کا مسلک درست ہے۔ اس اصول کو مالکیہ اور شافعیہ بھی مانتے ہیں کہ جب تک مکمل تملیک نہ ہو تو بیع نہیں ہوتی۔ باغ کی فروخت کی صورت میں اگر شرائط اس طرح کی ہوں کہ خریدنے والا باغ کو پانی دینے، پھل کو پرندوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے اور اس وقت تک باغ کی دیکھ بھال کا ذمہ دار ہو جب تک پھل اترنے کا وقت نہیں آتا تو یہ بیع کیا ہوئی!

اَلنَّهْيُ عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ حَتّٰى يَبْدُوَ صَلَاحُهَا

صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے پھل فروخت کرنے کی ممانعت

٦ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ حَتّٰى يَبْدُوَ صَلَاحُهَا نَهَى الْبَائِعَ وَ الْمُشْتَرِيَ۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پھل بیچنے سے منع فرمایا جب تک ک۔

پھل کی صلاحیت ظاہر نہ ہو جائے۔ آپ نے بائع اور مشتری دونوں کو منع فرمایا﴾

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ حُمَيْدٍ الطَّوِيلِ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ حَتَّى تُزْهِيَ فَقِيلَ لَهُ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا تُزْهِي فَقَالَ حِينَ تَحْمَرُّ وَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَرَأَيْتَ إِذَا مَنَعَ اللَّهُ الثَّمَرَةَ فَبِمَ يَأْخُذُ أَحَدُكُمْ مَالَ أَخِيهِ۔

﴿رسول اللہ ﷺ نے پھلوں کی بیع سے منع فرمایا ان کے پکنے تک۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ! پکنے سے کیا مطلب ہے۔ فرمایا کہ جب تک وہ سرخ نہ ہو جائے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ بتاؤ اگر اللہ پھل روک دے تو کس چیز کے بدلے تم اپنے بھائی کا مال لو گے؟﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي الرِّجَالِ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ حَارِثَةَ عَنْ أُمِّهِ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ حَتَّى تَنْجُوَ مِنَ الْعَاهَةِ قَالَ مَالِكٌ وَبَيْعُ الثِّمَارِ قَبْلَ أَنْ يَبْدُوَ صَلَاحُهَا مِنْ بَيْعِ الْغَرَرِ

﴿عمرہ بنت عبد الرحمٰن بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پھلوں کے بیچنے سے منع فرمایا جب تک کہ وہ آفت سے محفوظ نہ ہو جائیں۔ اور امام مالک کا کہنا یہ ہے کہ وہ بیع جو صلاحیت ظاہر ہونے سے قبل ہوتی ہے وہ بیع غرر (دھوکہ) ہوتی ہے۔﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنْ خَارِجَةَ بْنِ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ أَنَّهُ كَانَ لَا يَبِيعُ ثِمَارَهُ حَتَّى تَطْلُعَ الثُّرَيَّا۔

﴿زید بن ثابت کے متعلق روایت ہے کہ وہ اپنا باغ نہیں بیچتے تھے جب تک کہ ثریا طلوع نہ ہو۔﴾

وضاحت:

ان تمام روایات میں نبی ﷺ نے باغ کے پھل کا سودا اس وقت تک کرنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ اس کی صلاحیت اور امکانات ظاہر نہ ہو جائیں۔

پھل کی صلاحیت ظاہر ہونے کا کیا مطلب ہے، اس بارے میں روایات مختلف ہیں۔ ایک روایت میں ہے حتی

زهی (جب تک پک نہ جائے) دوسری روایت میں ہے حتی یحمر (جب تک سرخی نہ پیدا ہو جائے) تیسری جگہ فرمایا حتی ینجو من العاهة (جب تک آفات سے محفوظ نہ ہو جائے) زید بن ثابت طلوع ثریا کے زمانہ میں باغ بیچتے- یہ گرمیوں کا زمانہ ہوتا ہے- بدو صلاح یعنی صلاحیت ظاہر ہونے کی شرط کب پوری ہوتی ہے، یہ بات واضح نہیں- حقیقت میں پھل محفوظ تو صرف اس وقت ہوتا ہے جب اس کو توڑ کر گھر میں ڈال لیا جائے- لیکن ظاہر ہے یہاں مراد معروف بلاؤں سے محفوظ ہونا ہے- ہر پھل کے نقصان کا ایک خاص زمانہ ہوتا ہے۔ اگر اس زمانے میں کوئی آفت نہ آئے تو باغ بچ جاتا ہے- پھر بعض روایات میں حتی یبع کا لفظ بھی آیا ہے یعنی پھل پکنے لگے- ان تمام روایات کی روشنی میں یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہو جاتا ہے کہ بدو صلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے-

باغ کے معاملہ میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ اس میں صلاحیت کے ظہور کا کوئی وقت بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو پورے باغ پر محیط ہو- کچھ پھل پہلے تیار ہو جاتے ہیں اور کچھ کافی مدت کے بعد تیار ہوتے ہیں- تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سا وقت ہے جب باغ کا پھل بیچا جا سکتا ہے-

موجودہ زمانے میں ایک باغ دو یا تین سال کے لیے ٹھیکے پر دینے کا رواج ہے- جب بیع ہوتی ہے تو پھل کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا لہذا بدو صلاح کا مرحلہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا- حدیث کی رو سے یہ بیع جائز نہیں تو پھر مسئلے کا حل کیا ہے؟

پہلے تو بدو صلاح کے معاملہ کو لیجیے- میرے نزدیک بدو صلاح کا مطلب یہ ہے کہ جب باغ کی پیداوار پر پھل کا اطلاق ہو سکے اور پھل اگرچہ اپنے تمام استعمالات کے لیے ابھی موزوں نہ ہو لیکن اتنی صلاحیت ضرور ہو چکی ہو کہ وہ ان کام میں لایا جا سکے- مثلاً آم میں جب کیریاں یا گٹھلیاں بن جائیں اور وہ اچار وغیرہ کے کام میں لایا جا سکے تو اس وقت اس کو بیچا جائے- مالٹے بھی کچے ہی قابل فروخت ہو جاتے ہیں تو اس حالت میں ان پر بدو صلاح کا اطلاق کیا جا سکتا ہے-

پورے باغ میں کسی ایک وقت میں بدو صلاح کا اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ درخت پر کچھ پھل تو بدو صلاح کی حالت میں جلدی آ جاتے ہیں درآں حالیکہ اسی درخت پر پھول بھی آ رہے ہوتے ہیں جن کو پھل بننے میں ایک یا دو

مہینے درکار ہوتے ہیں۔ احناف کے نزدیک اگر علاقے کے ایک باغ پر بھی بدو صلاح کی اصطلاح صادق آگئی تو دوسرے تمام باغوں پر بھی اس کا اطلاق ہوگا۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ سارے کے سارے باغ پر بدو صلاح صادق آتی ہو۔ اگر کچھ پھل اس حالت کو پہنچ گئے ہوں تو پورے باغ پر اس کا اطلاق کر دیا جائے گا۔ اور ایسے باغ کی بیع جائز ہوگی۔ میرے نزدیک یہ رائے صحیح اور مسئلہ کا حل پیش کرتی ہے۔

اب رہا ٹھیکے پر دینے کا مسئلہ جب کہ باغ میں پھل کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا تو اس مسئلے کو اس تناظر میں حل کرنا چاہیے کہ بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی حرمت سد ذریعہ کے لیے ہے۔ حقیقت میں ان کے اندر حرمت کا سبب موجود نہیں ہوتا لیکن چونکہ وہ ذریعہ بنتی ہیں حرام کا، اس لیے ان کو روک دیا جاتا ہے۔ لہذا سد ذریعہ میں اصل مصلحت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ وہ مصلحت اگر ملحوظ رہے تو دوسرا طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

میرے نزدیک یہ بیع جائز ہو سکتی ہے لیکن چند شرائط کے ساتھ۔ چونکہ روایت میں ہے کہ اگر اللہ پھل روک لے تو تم کس بنیاد پر اپنے بھائی کا مال لوگے تو اس خطرے کے تدارک کے لیے کہ ایک سال پھل کم آئے یہ کیا جا سکتا ہے کہ بیع ہو تو ایک سال کے لیے نہیں بلکہ کم از کم تین سال کے لئے ہونی چاہیے تاکہ اگر بالفرض ایک سال پھل نہیں آتا یا کم آتا ہے تو اس کی کمی یا نقصان کی تلافی بقیہ دو سالوں میں ہو جائے۔ اس لیے کہ یہ واقعہ ہے کہ بعض درخت یا باغ ایک سال اگر پھل کم دیتے ہیں تو اگلے سال بہت اچھا پھل بھی دیتے ہیں۔ تو اس مسئلہ کا حل صرف یہی ہے کہ دو یا تین سال کے لیے معاملہ کیا جائے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ آفات کے متعلق یہ شرط عائد کر دی جائے کہ اگر نقصان ایک ثلث یا اس سے زیادہ ہو تو مالک اس کا ذمہ دار ہوگا۔ مالکیہ کا فتویٰ بھی یہی ہے۔ اگر نقصان ایک ثلث سے کم ہو تو مالک بری ہوگا۔ یہی معاملہ اس صورت میں بھی ہوگا جب باغ پانی سے محروم ہو جائے اور پھل اس قدر کم کر دے کہ نقصان ایک تہائی سے زیادہ ہو جائے کیونکہ پانی کا انتظام مالک کے ذمہ ہوتا ہے، ٹھیکے دار کو اس پر اختیار نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے یہ بھی ضروری ہے کہ ٹھیکے کی میعاد کم از کم تین سال ہو تاکہ اس قسم کی وجوہ سے جو نقصان ہو اس کی آئندہ سالوں میں تلافی ہو سکے۔

ان شرائط کے تحت بیع میں حرمت کی علت باقی نہیں رہتی اور نہ ہی بیع میں کسی فریق کے لیے غرر یا ضرر کا پہلو پایا جاتا ہے۔

مَاجَاءَ فِي بَيْعِ الْعَرِيَّةِ
عریہ کی فروخت کے بارے میں حکم

حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَرْخَصَ لِصَاحِبِ الْعَرِيَّةِ اَنْ يَبِيْعَهَا بِخَرْصِهَا

﴿زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صاحب عریہ کو اجازت دی کہ وہ اس کو تخمینہ کی بنیاد پر بیچ سکتا ہے۔﴾

حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ دَاوُدَ بْنِ الْحُصَيْنِ عَنْ اَبِي سُفْيَانَ مَوْلَى ابْنِ اَبِي اَحْمَدَ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَرْخَصَ فِي بَيْعِ الْعَرَايَا بِخَرْصِهَا فِيمَا دُوْنَ خَمْسَةِ اَوْسُقٍ اَوْ فِي خَمْسَةِ اَوْسُقٍ۔

﴿حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے عرایا کو فروخت کرنے کی رخصت دی، تخمینہ کر کے، اگر اس کی مقدار پانچ وسق سے کم یا پانچ وسق ہو﴾

وضاحت :

"عریۃ" کے معنی باغ سے الگ کیا ہوا حصہ ہے۔ "عرایا" اس کی جمع ہے۔ عریہ کی شکل یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی کے پاس باغ ہو، وہ اس کو بیچ دے لیکن ساتھ ہی یہ بھی چاہے کہ اس کا تازہ پھل بھی اس کو میسر ہے تو وہ اس کی خاطر کچھ درخت مخصوص کرلے اور باغ والے سے یہ طے کرلے کہ وہ اس کے بدلے میں تخمینہ کر کے خشک پھل اسے دے گا۔

جب تولنا ممکن ہونہ ناپنا تو اس وقت تخمینہ کا طریقہ ہی اختیار کیا جاتا ہے۔ خیبر کی پیداوار کے متعلق روایت میں آتا ہے کہ درخت پر ہی اس کے پھل کا تخمینہ کر لیا جاتا تھا کہ کتنا پھل اترے گا اور اس میں کتنی زکوٰۃ ہوگی۔ معلوم ہوا کہ ان صورتوں میں بیع تخمینہ سے بھی ہو سکتی ہے اور جائے خود تخمینہ پر شریعت کو کوئی اعتراض نہیں۔ شرعی لحاظ سے عریہ کی بیع میں قضیہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں بیع مزابنہ کی صورت ہے جس کی ممانعت ہے کیونکہ مزابنہ یہ ہے کہ التمر بالتمر کیا (کھجور کے بدلے کھجور ناپ کر فروخت کی جائے) اور عریہ کی صورت یہ ہے کہ تازہ

پھل جو ابھی درخت پر ہے وہ خشک کھجور کے بدلے میں بیچا جائے تو یہ بیع المجہول بالمجہول ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے- اس میں ربا اور قمار کا شائبہ بھی ہے-

مالکیہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بیع فی الحقیقت بیع ہے ہی نہیں بلکہ جس طرح کسی چیز میں سے کچھ منہا کر دیا ہوتا ہے یا کسی چیز کا مالک بنا دیا ہوتا ہے یہ اس نوعیت کی چیز ہے اور یہ بیع کی تعریف میں ہی نہیں آتی- میرے نزدیک یہ صرف بات بنائی گئی ہے-

دوسری رائے یہ ہے کہ حقیقت میں مصلحت کی بنا پر ضرورت کے نظریہ کے تحت یہ ایک رخصت ہے اس لیے کہ ایک آدمی نے اپنا باغ تو بیچ دیا لیکن تازہ پھل کھانے کو جی چاہتا ہے تو اس کی کیا شکل ہو- تو اس ضرورت کے تحت یہ عریہ کی شکل اختیار کی جاتی ہے- لیکن اس میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مصلحت کی بنا پر ایک کام جو ناجائز ہے اس کو جائز کیا جا سکتا ہے- شاہ ولی اللہ اس کا جواب اپنے رنگ میں یہ دیتے ہیں کہ ایک احکام مصالح عباد ہیں اور ایک احکام شرائع ہیں- اگر ان میں تصادم ہو تو شریعت مقدم ہوگی- میرے نزدیک یہ کوئی خاص نکتہ نہیں- مصالح عباد شریعت ہی کا حصہ ہیں- جو جائز ہے اس میں بھی مصلحت ہے اور جو حرام ہے اس میں بھی مصلحت ہے- شریعت سے الگ کوئی مصالح نہیں اور شریعت کے تمام احکام میں مصلحت عباد ملحوظ ہے-

میرے نزدیک بیع کی یہ شکل بیع مزابنہ میں ایک استثنا کی صورت ہے- یہ ضرورت کے تحت بھی ہے اور اس شرط کے ساتھ بھی کہ مقدار پانچ وسق سے زیادہ نہ ہو- مقدار معین کرنے سے فتنے کا دروازہ بھی بند ہو جاتا ہے اور ضرورت بھی پوری ہو جاتی ہے- اس میں کسی نقصان کا اندیشہ بھی نہیں ہوتا- یہ رخصت صرف عریہ کے لئے ہے، دوسری شکلوں میں تر اور خشک کھجور کی بیع جائز نہیں-

شاہ ولی اللہ نے اس روایت کی ترتیب بدل دی ہے اور اس کو بیع مزابنہ کے اوپر تمہید کے طور پر رکھ دیا ہے- اس سے وہ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ یہ بیع اسی کا حصہ ہے- میرے نزدیک یہ بات معقول ہے-

اَلجَائِحَةُ فِی بَیْعِ الثِّمَارِ وَالزَّرْعِ

پھلوں اور کھیتی کی بیع میں آفت سے نقصان

☐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی الرِّجَالِ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ اُمِّهٖ عَمْرَةَ بِنْتِ

عبدالرحمن انّهٗ سمعھا تقولُ ابتاع رجلٌ ثمر حائطٍ فی زمانِ رسولِ اللّٰہ ﷺ فعالجہٗ و قام فیہ حتّٰی تبین لہٗ النُّقصانُ فسال ربَّ الحائطِ انْ یضع لہٗ او انْ یُقیلہٗ فحلف انْ لا یفعل فذھبت امُّ المُشتری الٰی رسُولِ اللّٰہ ﷺ فذکرت ذٰلک لہٗ فقال رسُولُ اللّٰہ ﷺ تالّٰی انْ لا یفعل خیرًا فسمع بذٰلک ربُّ الحائطِ فاتٰی رسُولَ اللّٰہ ﷺ فقال یا رسُولَ اللّٰہِ ھُو لہٗ۔

﴿ محمد بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی والدہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پھلوں کا باغ خریدا۔ اس نے اس کی دیکھ بھال کی اور اس میں ٹھہرا رہا یہاں تک کہ اس پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اس باغ میں نقصان ہوگا۔ اس نے باغ کے مالک سے درخواست کی کہ وہ قیمت میں کچھ کمی کر دے یا بیع کو فسخ کر دے۔ مالک نے قسم کھا کر کہا کہ وہ یہ نہیں کرنے کا۔ خریدنے والے کی والدہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور یہ قصہ بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ عجیب بات ہے کہ اس نے نیکی نہ کرنے کی قسم کھائی ہے۔ باغ والے نے جب یہ سنا تو فوراً رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ حضور میں نے مانا جو یہ کہتا ہے۔﴾

٦ حدّثنی عنْ مالکٍ انّہٗ بلغہٗ انّ عمر بْن عبدالعزیزِ قضٰی بوضعِ الجائحۃِ قال مالکٌ و علٰی ذٰلک الْامْرُ عندنا۔ قال مالکٌ والجائحۃُ الّتی تُوضعُ عنِ المُشتری الثُّلثُ فصاعدًا ولا یکُونُ مادُون ذٰلک جائحۃً۔

﴿ امام مالک سے روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے آفت کا نقصان منہا کرنے کا فیصلہ دیا۔ امام مالک کہتے ہیں کہ ہمارا فتویٰ اسی پر ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ آفت کا نقصان جو مشتری سے منہا کیا جائے گا وہ ایک ثلث قیمت یا اس سے زیادہ ہے۔ نقصان ایک ثلث سے کم ہو تو یہ آفت قرار نہیں پائے گی۔﴾

وضاحت :

پہلی روایت اگرچہ مرفوع ہے لیکن بعض لوگوں نے اس کو مرسل کہا ہے تاہم اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ دوسری روایت میں ایک تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا اثر ہے اور دوسرا امام مالکؒ کا فتویٰ ہے۔

پہلی روایت میں آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے متعلق دو مختلف رائیں ہیں۔ اس کی روشنی میں شوافع اور حنفیہ آفت کے نقصان کو پورا کرنا باغ کے مالک کے لیے مستحب مانتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ یہ فرماتے کہ اس شخص کو فوراً پکڑ کر حاضر کرو، وہ ایسی حرکت کس طرح کر سکتا ہے تب ہی وجوب کا پہلو نکلتا۔ مالکیہ آفت کا نقصان پورا کرنا واجب مانتے ہیں۔ آنحضرتؐ کے ارشاد سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کو نقصان سے بچانا بڑی اہم نیکی اور ایسی چیز ہے جس کے نہ کرنے کی قسم نہیں کھانی چاہیے۔ اس لیے میرے نزدیک مالکیہ کا مذہب زیادہ قوی ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عمل یہ تھا کہ آفت سے نقصان کی صورت میں قیمت میں کمی کرا دیتے تھے۔ ان کا عمل بھی خلیفہ راشد کی حیثیت سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک (یعنی فقہائے مدینہ کے نزدیک) یہ امر متفق علیہ ہے کہ خریدار سے نقصان کی قیمت منہا کر دی جائے بشرطیکہ نقصان ایک تہائی سے زیادہ ہو۔ ایک تہائی انہوں نے کس بنیاد پر لیا ہے اس کے لیے کوئی دلالۃ النص یا اشارۃ النص نہیں، یہ صرف ذوق سلیم پر مبنی ہے۔ اس بارے میں جب بھی قانون بنایا جائے گا تو کوئی نہ کوئی مقدار تو مقرر کرنی پڑے گی۔ مالکیہ نے وہ ایک تہائی مقرر کی ہے جو میرے نزدیک مناسب ہے۔ یہ بات بھی کہ ایک تہائی سے کم نقصان ہو تو وہ آفت کی تعریف میں نہیں آئے گا، نہایت معقول ہے۔

مَا يَجُوْزُ فِي اسْتِثْنَاءِ الثَّمَرِ

باغ کے پھل مستثنیٰ کرنے کے باب میں

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ كَانَ يَبِيعُ ثَمَرَ حَائِطِهِ وَ يَسْتَثْنِي مِنْهُ۔

ربیعہ بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ قاسم بن محمد اپنے باغ کا پھل بیچتے تھے اور اس میں سے کچھ

درختوں کے پھل مستثنیٰ کر لیتے تھے۔﴾

حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِی بَكْرٍ اَنَّ جَدَّهٗ مُحَمَّدَ بْنَ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ بَاعَ ثَمَرَ حَائِطٍ لَهٗ يُقَالُ لَهُ الْاَفْرَقُ بِاَرْبَعَةِ آلَافِ دِرْهَمٍ وَ اسْتَثْنٰى مِنْهُ بِثَمَانِمِائَةِ دِرْهَمٍ تَمْرًا۔

﴿عبداللہ بن ابی بکر اپنے دادا عمرو بن حزم سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے باغ، افرق کے پھل چار ہزار درہم میں فروخت کیے اور اس میں سے آٹھ سو درہم کے پھل مستثنیٰ کر لیے﴾

وضاحت:

ان دونوں روایتوں میں سے کوئی بھی حدیث نہیں۔ یہ روایات صحابہ کرامؓ کے عمل کو بیان کرتی ہیں۔ ان سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ باغ کے مالک کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ باغ فروخت کرتے وقت اس کے بعض درخت یا پھل کی کچھ مقدار اپنے استعمال کے لئے علیحدہ کر لے، جیسا کہ اوپر بیع عریہ کے متعلق بیان ہوا۔ ان روایات کے بعد امام مالک کا یہ فتویٰ بیان ہوا ہے کہ یہ امر ہمارے نزدیک مجتمع علیہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنا باغ بیچے تو وہ اس میں سے ایک تہائی مقدار تک اپنے لیے مستثنیٰ کر سکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ یہ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ فقہائے مدینہ کا اس امر پر اتفاق ہے، اس کو اجماع امت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض کم علم لوگوں نے اس کو اصطلاحی معنوں میں اجماع امت تصور کر کے اس پر یہ بحث شروع کر دی ہے کہ شوافع اور احناف اس کو نہیں مانتے، حالانکہ یہاں اس بحث کا کوئی موقع نہیں ہے۔

مَا يُكْرَهُ مِنْ بَيْعِ التَّمْرِ

کھجور کی فروخت کی مکروہ شکل

٦ حَدَّثَنِی يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ اَنَّهٗ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ التَّمْرُ بِالتَّمْرِ مِثْلًا بِمِثْلٍ فَقِيْلَ لَهٗ اِنَّ عَامِلَكَ عَلٰى خَيْبَرَ يَاْخُذُ الصَّاعَ بِالصَّاعَيْنِ۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اُدْعُوْهُ لِی فَدُعِیَ لَهٗ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَتَاْخُذُ الصَّاعَ بِالصَّاعَيْنِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَا يَبِيْعُوْنَنِی الْجَنِيْبَ بِالْجَمْعِ صَاعًا بِصَاعٍ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِعِ

الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنيبا-

﴿عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کھجور کے بدلے کھجور برابر خریدیں- پوچھا گیا کہ آپ کے عامل جو خیبر پر مقرر ہیں ایک صاع کھجور دو صاع کے بدلے خریدتے ہیں- آپؐ نے فرمایا کہ ان کو میرے پاس بلاؤ- جب وہ بلائے گئے تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ کیا تم ایک صاع کھجور دو صاع کے بدلے خریدتے ہو- اس پر انھوں نے کہا کہ یہ لوگ جنیب کھجور ملے جلے کھجوروں کے بدلے برابر دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جمع کھجور کو درہموں کے بدلے بیچ دیا کرو اور پھر ان درہموں سے جنیب کھجور خرید لیا کرو-﴾

□ حدثنی عن مالك عن عبدالحمید بن سهیل ابن عبدالرحمن بن عوف عن سعید بن المسیب عن ابی سعید الخدری و عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ استعمل رجلا علی خیبر فجاءه بتمر جنیب فقال له رسول الله ﷺ اكل تمر خیبر هكذا فقال لا والله یا رسول الله انا لناخذ الصاع من هذا بالصاعین والصاعین بالثلاثة فقال رسول الله ﷺ لا تفعل بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنیبا-

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو خیبر پر عامل بنایا- وہ جنیب کھجور لایا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہوتی ہیں- اس نے کہا کہ نہیں، اللہ کی قسم- ہم اس کا ایک صاع دو صاع کے بدلے میں اور اس کے دو صاع تین صاع کے بدلے میں لیتے ہیں- اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو بلکہ جمع کھجور بیچ کر درہم لیا کرو اور پھر ان درہموں سے جنیب کھجور خریدا کرو-﴾

□ حدثنی عن مالك عن عبدالله بن یزید ان زیدا ابا عیاش اخبره انه سال سعد ابن ابی وقاص عن البیضاء بالسلت فقال له سعد ایهما افضل قال البیضاء فنهاه عن ذلك و قال سعد سمعت رسول الله ﷺ یسئل عن اشتراء التمر بالرطب فقال رسول الله ﷺ

اَيَنْقُصُ الرُّطَبُ اِذَا يَبِسَ فَقَالُوا نَعَمْ فَنَهٰى عَنْ ذٰلِكَ۔

﴿ابو عیاش زید نے خبر دی کہ انہوں نے سعد بن ابی وقاص سے بیضاء کے سلت کے ساتھ تبادلے کے بارے میں پوچھا۔ سعد نے دریافت کیا کہ ان دونوں میں سے بہتر کون ہے۔ انہوں نے کہا کہ بیضاء۔ تو سعد نے ان کے تبادلے سے روک دیا اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ سے سنا۔ آپؐ سے پوچھا گیا کہ کیا خشک کھجور تر کھجور کے بدلے میں خرید اجا سکتا ہے، تو آپ نے دریافت فرمایا کیا تر کھجور خشک ہونے پر کم ہو جاتا ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ ہاں۔ تو آپؐ نے اس سودے سے روک دیا۔﴾

وضاحت :

جنیب۔ نہایت اعلیٰ قسم کی کھجور۔

جمع۔ عام قسم کی ملی جلی کھجوریں۔

رطب۔ تر اور تازہ کھجوریں۔

بیضاء۔ جو کی ایک قسم جس کا چھلکا چکنا ہوتا ہے۔

سلت۔ یہ بھی جو کی ایک قسم ہے جس کا چھلکا سخت ہوتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ گندم کی ایک قسم ہے۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے کھجور کو کھجور کے عوض فروخت کرنے سے منع فرمایا اور تبادلہ کی یہ صورت تجویز فرمائی کہ کھجور کو فروخت کر کے دام کھرے کیے جائیں اور اس رقم سے دوسری کھجور خرید کی جائے۔ یہی طریقہ دوسری اجناس کے مبادلہ کی صورت میں بھی استعمال ہوگا۔ اسی لیے جب حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے جو کی قسموں کے مبادلے کی بابت دریافت کیا گیا تو انہوں نے کھجور پر قیاس کر کے اس کے مبادلہ سے منع فرمایا۔

ان روایات میں بڑا اشکال ہے۔ اول تو بعینہ ایک ہی قسم کی جنس کے تبادلے کی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر ایک شخص ایک قسم کی چیز کا بعینہ اسی قسم کی چیز کے ساتھ تبادلہ کیوں کرے گا۔ تبادلہ تو اسی صورت میں ہوگا جب دونوں قسمیں مختلف ہوں۔ دوسرے جب جنس میں اختلاف موجود ہو تو برابر برابر خرید و فروخت ممکن نہیں۔ اعلیٰ قسم کی کھجور کے عوض اسی مقدار میں گھٹیا کھجور آخر کوئی شخص کیوں قبول کرے گا۔ مثال کے طور پر بیج کی گندم

بہت اعلیٰ ہوتی ہے اور عام گندم سے اس کا تبادلہ قرین انصاف بھی نہیں اور معاملے کے لحاظ سے ممکن بھی نہیں- یہی حال باسمتی اور اری چاول کا ہے- دونوں اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بہت مختلف ہیں اور منڈی میں ان کی قیمتیں الگ الگ ہوتی ہیں- عملی زندگی میں یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص باسمتی چاول کے عوض اری چاول برابر مقدار میں قبول کرلے-

بعض فقہاء اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ اگر کسی کو نفع اٹھانا ہو تو صحیح عقد کے ذریعے سے کرے یعنی باقاعدہ معاملہ کی شکل اختیار کرے- اس صورت میں ربا کا فائدہ حاصل ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں- میرے نزدیک یہ جواب صحیح نہیں- یہ تو حیلہ کی ایک شکل ہوئی جو شیطان کا راستہ ہے- اور اگر مسئلہ کا حل نہ نکالا جائے تو زندگی اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ چلنا محال ہو جاتا ہے- لہذا یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ نبیؐ نے جو حکم دیا ہے اس کی حکمت کیا ہے، اس لیے کہ روایت کی تکذیب کی کوئی وجہ نہیں-

میرے نزدیک آپ کی یہ ہدایت سد ذریعہ کے اصول کے تحت تھی- اجناس کے تبادلہ میں مقدار کی کمی بیشی ظاہری طور پر ربا کی ایک قسم نظر آتی ہے- شریعت کا یہ اصول ہے کہ جب کسی برائی کا عام رواج ہو اور اس سے بچنا لوگوں کے لیے آسان نہ ہو تو ان تمام چیزوں کو جو اس برائی کا ذریعہ بن سکتی ہیں یا جن میں حرام کا مظنہ پایا جائے روک دیا جاتا ہے تاکہ اس برائی کا سدباب ہو جائے اور اس کی نفرت طبیعتوں پر غالب آجائے- اس کی ایک مثال ان برتنوں کے استعمال کی ممانعت ہے جو زمانہ جاہلیت میں شراب بنانے اور پینے کے کام آتے تھے- جب شراب کی حرمت کا حکم پوری طرح نافذ ہو گیا تو آپ نے دوسرے مقاصد کے لیے ان برتنوں کے استعمال پر سے پابندی اٹھالی-

باقی رہا مسئلہ کا حل تو اس بارے میں دوسری روایات موجود ہیں جو اس صورت میں اجناس کے تبادلے کا جواز مہیا کرتی ہیں جب سودا اجناس کی موجودگی میں ہو رہا ہو، ادھار نہ ہو- آپؐ نے فرمایا لا ربا الا فی النسیة (سود ادھار کی صورت کے سوا نہیں ہوتا) ظاہر ہے کہ جب معاملہ آمنے سامنے ہو گا تو اس صورت میں تفاضل کی کوئی نہ کوئی بنیاد موجود ہو گی- ادھار میں تفاضل کی صورت میں ربا کا مظنہ موجود ہوتا ہے- اسی طرح صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب الصرف وبیع الذھب بالورق نقدا میں حضرت عبادہ بن الصامت کی ایک روایت کے الفاظ ہیں اذا اختلفت ھذہ الاصناف فبیعوا کیف شئتم (جب یہ اجناس مختلف ہو جائیں تو جس طرح چاہو ان کا سودا کرو) اس روایت کی رو سے گندم اور چاول کی اعلیٰ و ادنیٰ قسموں میں یا سونے چاندی کے مختلف قیراط ہونے کی صورت میں

وزن کی کمی بیشی کے ساتھ سودا جائز ہو گا۔

مَاجَاءَ فِي الْمُزَابَنَةِ وَالْمُحَاقَلَةِ
مزابنہ اور محاقلہ کے بارے میں حکم

۶ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنِ الْمُزَابَنَةِ وَالْمُزَابَنَةُ بَيْعُ الثَّمَرِ بِالتَّمْرِ كَيْلًا وَبَيْعُ الْكَرْمِ بِالزَّبِيبِ كَيْلًا۔

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مزابنہ سے منع فرمایا۔ مزابنہ یہ ہے کہ کھجور کی بیع تازہ پھل کے ساتھ اور انگور کی بیع منقے کے ساتھ وزن کر کے کی جائے۔﴾

۶ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ دَاوُدَ بْنِ الْحُصَيْنِ عَنْ أَبِي سُفْيَانَ مَوْلَى ابْنِ أَبِي أَحْمَدَ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنِ الْمُزَابَنَةِ وَالْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةُ اشْتِرَاءُ الثَّمَرِ بِالتَّمْرِ فِي رُءُوسِ النَّخْلِ وَالْمُحَاقَلَةُ كِرَاءُ الْأَرْضِ بِالْحِنْطَةِ۔

﴿ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مزابنہ اور محاقلہ سے منع کیا ہے۔ مزابنہ تو یہ ہے کہ خشک کھجور کا سودا اس تازہ کھجور کے عوض کیا جائے جو درخت کے اوپر ہے اور محاقلہ یہ ہے کہ زمین کا کرایہ گندم کو ٹھہرایا جائے۔﴾

۶ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنِ الْمُزَابَنَةِ وَالْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةُ اشْتِرَاءُ الثَّمَرِ بِالتَّمْرِ وَالْمُحَاقَلَةُ اشْتِرَاءُ الزَّرْعِ بِالْحِنْطَةِ وَاسْتِكْرَاءُ الْأَرْضِ بِالْحِنْطَةِ

قَالَ ابْنُ شِهَابٍ فَسَأَلْتُ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ عَنِ اسْتِكْرَاءِ الْأَرْضِ بِالذَّهَبِ وَالْوَرِقِ فَقَالَ لَا بَأْسَ بِذَلِكَ۔

﴿سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مزابنہ اور محاقلہ سے منع فرمایا۔ مزابنہ تو خشک کھجور کے بدلے درخت پر لگی تازہ کھجور خریدنا ہے اور محاقلہ کھیتی کو گندم کے بدلے یا زمین کو گندم کے بدلے کرایہ پر لینا ہے۔

ابن شہاب کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن المسیب سے زمین سونے یا چاندی کے بدلے میں کرائے پر لینے کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

وضاحت :

ان تینوں روایات میں ایک ہی مضمون ہے۔ یعنی یہ کہ تازہ پھل اور خشک پھل کی بیع ایک دوسرے سے جائز نہیں، اس لیے کہ ایک طرف تو ایک معین شے ہے لیکن دوسری طرف غیر معین اور مجهول شے ہے۔ تازہ پھل جو ابھی درخت پر ہے کی مقدار کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ پھر وہ آفات سے محفوظ بھی نہیں ہوتا۔ یہی صورت حال انگور اور منقے کے تبادلے میں پیش آتی ہے۔ اس میں بھی بیع مجہول شے کی متعین شے کے ساتھ ہے۔ بیع درست ہونے کے لیے شریعت کا ایک اصول یہ ہے کہ دونوں چیزوں ثمن یا مبیع میں سے ایک بھی مجہول نہ ہو۔ دونوں قطعی طور پر معین ہوں تاکہ ضرر یا غرر کا امکان نہ رہے۔ یعنی کوئی پارٹی نقصان نہ اٹھائے۔

اگر بیع کی تمیز خشک اور تر کھجور دونوں کے ساتھ مان لی جائے تب بھی ان دونوں کی بیع جائز نہیں۔ کیونکہ نبی کریمؐ نے خشک اور تر کھجور کے مبادلے سے منع فرمایا ہے۔ جہاں تک بیع عریہ کا تعلق ہے اگرچہ اس میں بھی تازہ کھجور کے بدلے خشک کھجور ہی دی جاتی ہے تاہم اس میں پانچ وسق کی مقدار لوگوں کی ضرورت اور مصلحت کے تحت جائز کر دی گئی ہے۔ ایک شخص جب اپنا باغ بیچ دیتا ہے تو اس کے تازہ پھل کا وہ پھر بھی حاجت مند ہوتا ہے۔ اس کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ باغ کے تازہ پھل خشک پھل کے بدلے (یا ہری فصل جنس کے عوض) حاصل کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی مقدار پانچ وسق سے زیادہ نہ ہو۔

زمین کے کرائے کے طور پر گندم دینے کا معاملہ بھی جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غرر ہے۔ معلوم نہیں اس قطعہ زمین میں گندم کتنی پیدا ہوتی ہے۔ ہوتی بھی ہے کہ نہیں۔ یہ صورت معاملہ اس عام اصول کے خلاف ہے جس کے تحت کسی بھی فریق کو ضرر یا غرر نہیں ہونا چاہیے۔ سعید بن مسیب کے بیان کی رو سے فقہائے مدینہ کی رائے میں زمین کا کرایہ نقدی کی صورت میں ادا کرنا جائز ہے۔ ہمارے ہاں بعض لوگ بڑے دھوم دھام سے یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ زمین کرایہ پر دینا حرام ہے۔ بعضوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مکان کا کرایہ لینا بھی ناجائز ہے۔ بہر حال مدینہ کے بڑے فقہا کی رائے یہی ہے کہ زمین کرائے پر لی جا سکتی ہے۔ اس میں جو قباحت ہے تو اس کا حل، جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، یہ ہے کہ زمین ایک سال کے لئے نہیں بلکہ دو تین سال کے لیے دی جائے تاکہ اگر ایک

سال فصل کم آئے تو دوسرے یا تیسرے سالوں میں اس کی تلافی ہو سکے- نیز اگر کسی آفت سے کرایہ دار کا نقصان ایک تہائی قیمت سے زیادہ ہو جائے تو مالک اس کی بھی تلافی کر دے-

بَيْعُ الذَّهَبِ بِالْفِضَّةِ تِبْرًا وَعَيْنًا

سونے کی بیع چاندی سے، خواہ ٹکڑوں کی شکل میں ہو یا نقدی کی صورت میں

حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّهُ قَالَ أَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ السَّعْدَيْنِ أَنْ يَبِيعَا آنِيَةً مِنَ الْمَغَانِمِ مِنْ ذَهَبٍ أَوْ فِضَّةٍ فَبَاعَا كُلَّ ثَلَاثَةٍ بِأَرْبَعَةٍ عَيْنًا وَكُلَّ أَرْبَعَةٍ بِثَلَاثَةٍ عَيْنًا فَقَالَ لَهُمَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَرْبَيْتُمَا فَرُدَّا-

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سعدین (یعنی سعد بن ابی وقاصؓ اور سعد بن عبادہؓ) کو حکم دیا کہ غنیمتوں سے سونے یا چاندی کے جو برتن ملے ہیں ان کو بیچ دو- انہوں نے تین کو چار مثقال میں یا چار کو تین مثقال میں بیچ دیا- آپ نے فرمایا یہ تو تم نے ربا کا کام کیا ہے- چنانچہ دونوں نے سودا لوٹا دیا﴾

حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُوسَى بْنِ أَبِي تَمِيمٍ عَنْ أَبِي الْحُبَابِ سَعِيدِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ الدِّينَارُ بِالدِّينَارِ وَالدِّرْهَمُ بِالدِّرْهَمِ لَا فَضْلَ بَيْنَهُمَا-

﴿ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دینار کے بدلے دینار ہے اور درہم کے بدلے درہم- دونوں کے درمیان کمی بیشی نہ ہونی چاہیے-﴾

حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا تَبِيعُوا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ إِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ وَلَا تُشِفُّوا بَعْضَهَا عَلَى بَعْضٍ وَلَا تَبِيعُوا الْوَرِقَ إِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ وَلَا تُشِفُّوا بَعْضَهَا عَلَى بَعْضٍ وَلَا تَبِيعُوا مِنْهَا شَيْئًا غَائِبًا بِنَاجِزٍ-

﴿ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سونے کے بدلے سونا نہ بیچو مگر برابر

برابر اور ایک کو دوسرے پر ذرا برابر بھی زیادہ نہ کرو- اور چاندی کو چاندی کے بدلے نہ بیچو مگر برابر برابر اور ایک کو دوسرے پر ذرا بھی زیادہ نہ کرو اور ان سے کسی غائب کو نقد کے عوض نہ بیچو-﴾

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ قَيْسٍ الْمَكِّيِّ عَنْ مُجَاهِدٍ أَنَّهُ قَالَ كُنْتُ مَعَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فَجَاءَهُ صَائِغٌ فَقَالَ لَهُ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ إِنِّی أَصُوغُ الذَّهَبَ ثُمَّ أَبِيعُ الشَّیْءَ مِنْ ذٰلِكَ بِأَكْثَرَ مِنْ وَزْنِهِ فَأَسْتَفْضِلُ مِنْ ذٰلِكَ قَدْرَ عَمَلِ يَدِی فَنَهَاهُ عَبْدُ اللّٰهِ عَنْ ذٰلِكَ فَجَعَلَ الصَّائِغُ يُرَدِّدُ عَلَيْهِ الْمَسْئَلَةَ وَ عَبْدُ اللّٰهِ يَنْهَاهُ حَتّٰى انْتَهٰى إِلٰى بَابِ الْمَسْجِدِ أَوْ إِلٰى دَابَّةٍ يُرِيدُ أَنْ يَرْكَبَهَا ثُمَّ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ اَلدِّينَارُ بِالدِّينَارِ وَ الدِّرْهَمُ بِالدِّرْهَمِ لَا فَضْلَ بَيْنَهُمَا هٰذَا عَهْدُ نَبِيِّنَا إِلَيْنَا وَ عَهْدُنَا إِلَيْكُمْ

﴿مجاہد کہتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ تھا کہ ایک سنار آیا- اس نے پوچھا کہ اے ابو عبدالرحمٰن (یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی کنیت ہے) میں سونے کے زیور بناتا ہوں اور اس میں کوئی چیز سونے کے اصل وزن سے زیادہ پر بیچ دیتا ہوں- اس طرح میں اپنی محنت کے بقدر اس سے بچا لیتا ہوں- عبداللہ بن عمر نے اس کو ایسا کرنے سے منع کیا- سنار لگا اپنا سوال دہرانے لیکن عبداللہ بن عمرؓ برابر انکار کرتے رہے یہاں تک کہ مسجد کے دروازے تک یا اپنی سواری تک سوار ہونے کے لیے پہنچ گئے- پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ دینار کے بدلے دینار اور درہم کے بدلے درہم ہے- ان کے درمیان کوئی تفاضل نہیں- یہ ہمارے نبی کا ہم سے اور ہمارا تم سے عہد ہے-﴾

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ عَنْ جَدِّهِ مَالِكِ بْنِ أَبِی عَامِرٍ أَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ قَالَ قَالَ لِی رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَبِيعُوا الدِّينَارَ بِالدِّينَارَيْنِ وَ لَا الدِّرْهَمَ بِالدِّرْهَمَيْنِ-

﴿عثمان بن عفانؓ کہتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک دینار کو دو دینار اور ایک درہم کو دو درہم کے بدلے نہ بیچو-﴾

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ أَنَّ مُعَاوِيَةَ بْنَ أَبِی سُفْيَانَ بَاعَ

سِقَايَةً مِنْ ذَهَبٍ أَوْ وَرِقٍ بِأَكْثَرَ مِنْ وَزْنِهَا فَقَالَ أَبُو الدَّرْدَاءِ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَنْهٰى عَنْ مِثْلِ هٰذَا إِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ فَقَالَ لَهُ مُعَاوِيَةُ مَا أَرٰى بِمِثْلِ هٰذَا بَأْسًا فَقَالَ أَبُو الدَّرْدَاءِ مَنْ يَعْذِرُنِي مِنْ مُعَاوِيَةَ أَنَا أُخْبِرُهُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَ يُخْبِرُنِي عَنْ رَأْيِهِ لَا أُسَاكِنُكَ بِأَرْضٍ أَنْتَ بِهَا ثُمَّ قَدِمَ أَبُو الدَّرْدَاءِ عَلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهُ فَكَتَبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ إِلٰى مُعَاوِيَةَ أَنْ لَا تَبِيعَ ذٰلِكَ إِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ وَزْنًا بِوَزْنٍ۔

﴿ عطاء بن یسار روایت کرتے ہیں کہ معاویہ بن ابو سفیانؓ نے سونے یا چاندی کا ایک پیالہ اس کے اپنے وزن سے زیادہ کے عوض بیچا۔ ابو الدرداءؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ اس طرح کی بیع سے منع فرماتے تھے مگر برابر برابر۔ امیر معاویہؓ نے کہا کہ میں اس میں کوئی قباحت نہیں دیکھتا۔ ابو الدرداءؓ نے کہا معاویہؓ سے کون میری جان چھڑائے گا۔ میں اس شخص کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث سناتا ہوں اور یہ مجھے اپنی رائے بتاتا ہے۔ میں تو تمہارے ساتھ اس زمین پر رہنے کا نہیں جس زمین پر تم رہتے ہو۔ پھر حضرت ابو الدرداءؓ حضرت عمرؓ بن خطاب کے پاس آئے اور ان سے ذکر کیا تو انہوں نے حضرت معاویہؓ کو لکھ بھیجا کہ ان چیزوں کو برابر برابر ہی ہم وزن بیچو۔ ﴾

٦ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ لَا تَبِيعُوا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ إِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ وَلَا تُشِفُّوا بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ وَلَا تَبِيعُوا الْوَرِقَ بِالْوَرِقِ إِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ وَلَا تُشِفُّوا بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ وَلَا تَبِيعُوا الْوَرِقَ بِالذَّهَبِ أَحَدُهُمَا غَائِبٌ وَالْآخَرُ نَاجِزٌ وَ إِنِ اسْتَنْظَرَكَ إِلٰى أَنْ يَلِجَ بَيْتَهُ فَلَا تُنْظِرْهُ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمُ الرَّمَاءَ وَالرَّمَاءُ هُوَ الرِّبَا۔

﴿ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ سونے کو سونے کے عوض نہ بیچو مگر برابر اور ذرا بھی اس سے کم و بیش نہ کرو۔ اور چاندی کو چاندی کے بدلے نہ بیچو مگر برابر اور ذرا بھی کم و بیش نہ کرو۔ اور چاندی کو سونے کے بدلے اس صورت میں نہ بیچو کہ ایک چیز تو غائب ہو اور

دوسری موجود ہو- اور اگر تم سے کوئی اتنی سی مہلت مانگے کہ غائب چیز کو گھر میں داخل ہو کر لے آئے گا تو اس کی مہلت بھی نہ دو- مجھے ڈر ہے کہ تم ربا میں نہ پڑ جاؤ-﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ أَنَّهُ قَالَ: قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ الدِّينَارُ بِالدِّينَارِ وَالدِّرْهَمُ بِالدِّرْهَمِ وَالصَّاعُ بِالصَّاعِ وَلَا يُبَاعُ كَالِئٌ بِنَاجِزٍ-

﴿قاسم بن محمد سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ دینار کے بدلے دینار اور درہم کے بدلے درہم اور صاع کے بدلے صاع بیچو- اودھار کے بدلے نقد نہ بیچا جائے-﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ أَنَّهُ سَمِعَ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ يَقُولُ لَا رِبَا إِلَّا فِي ذَهَبٍ أَوْ فِي فِضَّةٍ أَوْ مَا يُكَالُ أَوْ يُوزَنُ بِمَا يُؤْكَلُ أَوْ يُشْرَبُ-

﴿سعید بن مسیب کا فتویٰ ہے کہ سود نہیں مانا جائے گا مگر سونے یا چاندی میں یا جو چیز ناپی جاتی ہو یا وزن کی جاتی ہو یا کھائی جاتی ہو یا پی جاتی ہو-﴾

وضاحت:

مذکورہ روایات میں مرفوع روایات بھی ہیں، تعامل صحابہ کی روایات بھی ہیں اور فتاوی بھی- ان میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر ایک ہی جنس کی دو چیزیں ایک دوسرے کے بدلے میں فروخت کی جائیں تو دونوں کی مقدار برابر ہونی ضروری ہے- اس میں مقدار مختلف نہ ہونے پائے- لہذا اگر سونے کا سونے سے، چاندی کا چاندی سے، ایک دینار کے سکے کا دوسرے دینار کے سکے سے، ایک درہم کا دوسرے درہم سے، اجناس میں سے ایک جنس کا اسی جنس سے تبادلہ کیا جائے تو اس میں تفاضل جائز نہ ہوگا- یعنی ایک سونے کو دوسرے پر اور ایک چاندی کو دوسری چاندی پر فوقیت دے کر مقدار میں کمی بیشی نہ کی جائے گی-

تبادلہ کی جانے والی اشیاء جب ایک ہی جنس سے ہوں تو ان کی مقدار کا برابر ہونا سمجھ میں آتا ہے لیکن ایسے تبادلے کی زندگی میں عام ضرورت سمجھ میں نہیں آتی- اگر کبھی کوئی موقع ایسا پیش آجائے تو ان روایات کی روشنی میں مبادلہ برابر برابر ہی کی بنیاد پر ہوگا-

نبی ﷺ کے زمانے میں سونے یا چاندی کی ایک ہی قسم رہی ہوگی- اس طرح سونے کا سکہ دینار اور چاندی کا

ملاور ہم ہوتا تھا۔ آپ نے ان کے آپس میں تبادلہ کی صورت میں تفاضل کو منع فرمایا۔ رہا سونے چاندی کے برتنوں کو برابر برابر فروخت کرنے کا معاملہ تو ان کی نوعیت سادہ برتنوں کی نہیں رہی ہوگی بلکہ چاندی یا سونے کے ٹکڑوں کی رہی ہوگی جس کے باعث آپ نے برابر برابر بیچنے کا حکم دیا اور زائد پر بیچنے کو ربا کہہ کر بیع کو رد فرمایا۔

موجودہ زمانے میں سونے اور چاندی کی کئی اقسام وجود میں آگئی ہیں۔ مثلاً سونا ۸ قیراط سے لے کر ۲۴ قیراط تک کا ہے۔ ہر ایک قسم کی کوالٹی متعین ہے اور ہر قسم کا بازار کا بھاؤ الگ الگ ہے۔ یہی حال چاندی کا ہے۔ اگر ۲۲ یا ۲۴ قیراط سونے کے باہم تبادلہ کی صورت پیش آئے تو ظاہر ہے کہ اس میں تفاضل ربا ہوگا۔ لیکن اگر مختلف قیراط سونے کا تبادلہ مقصود ہو تو ان کو مختلف اجناس کے طور پر لیا جائے گا تو ان پر اس قاعدہ کا اطلاق ہوگا جس کا اوپر حوالہ آچکا ہے۔ کہ اذا اختلفت هذه الاصناف فبيعوا كيف شئتم (جب یہ اجناس مختلف ہوں تو جس طرح چاہو بیچو)

زیورات کا بھی یہی حال ہے۔ ان میں جو کاریگری اور صنعت کی گئی ہے یا اس میں موتی یا ہیرے جڑاؤ کیے گئے ہیں تو میرے نزدیک اس سے ان کی جنس بدل جاتی ہے۔ ان کا عام سونے سے برابر برابر تبادلے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ رہا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا فتویٰ جس میں انہوں نے سنار کو منع کر دیا کہ وہ اپنی محنت کے بقدر زیادہ وزن پر نہیں بیچ سکتا تو آج کل یہ بھی مسئلہ نہیں رہا کیونکہ نوٹوں سے خریداری ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے سنار کو جس بات سے منع کیا وہ شاید یہ تھی کہ وہ گاہک کے دیے ہوئے سونے ہی میں سے اپنی مزدوری وضع کر لیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ شکل گاہک کے لیے ضرر اور غرر کا باعث ہو سکتی تھی اور اس میں ربا کا شبہ بھی تھا۔ بہر حال حضرت ابن عمرؓ نے اپنے مسلک کے جواز میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی بات نہیں کہی۔ صرف الدینار بالدینار کی روایت ہی کا حوالہ دیا جس کے تحت صنعت یا کاریگری کی صورت از خود شامل نہیں ہو جاتی۔

اسی طرح کا دوسرا واقعہ حضرت امیر معاویہؓ اور ابو الدرداءؓ کا ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اپنا پیالہ اس کے وزن سے زیادہ پر بیچا تو ابو الدرداءؓ کو اس پر اعتراض ہوا اور انہوں نے معاملے کو حضرت عمر بن خطابؓ کے سامنے پیش کیا۔ جنہوں نے امیر معاویہؓ کو لکھ بھیجا کہ وہ ایسا نہ کریں۔ اس واقعہ میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ پیالے کی نوعیت کیا تھی۔ وہ سادہ تھا یا جڑاؤ۔ برتنوں پر نہایت نفیس کاریگری بھی عموماً کی جاتی ہے۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ حضرت امیر معاویہؓ نے بیع کو روک لیا یا نہیں۔ گمان یہی ہے کہ انہوں نے بیع نہیں کیا ہوگا۔ اس پیالے کے متعلق میرا گمان یہ ہے کہ یہ کافی قیمت کا تھا اور اس میں جڑاؤ چیزیں ملی ہوئی تھیں۔ میرے اصول کے مطابق وہ ایک دوسری جنس تھا

جس کو حضرت معاویہؓ بازار کی قیمت پر بیچ سکتے تھے- حضرت عمرؓ نے اصولی حکم بیان کر دیا- عین ممکن ہے کہ ان کو پیالے کی قدر و قیمت کی پوری اطلاع نہ ہو- یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ حضرت عمرؓ اس واقعہ میں کس طرح شامل ہوئے- اس روایت کے متعلق ابن عبدالبر کی تحقیق یہ ہے کہ یہ صرف ایک ہی طریقے سے مروی ہے اس لیے تمام پہلو واضح نہیں ہوتے جو روایت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں- حضرت عمرؓ کے ساتھ اس کا تعلق کچھ خلاف عقل معلوم ہوتا ہے-

دوسرا مسئلہ جو ان روایات سے سامنے آتا ہے وہ ایسے سودے کی ممانعت ہے جس میں تبادلہ کی جانے والی ایک شے سامنے موجود نہ ہو یا اس کا ادھار کیا جا رہا ہو- حضرت عمرؓ نے یہاں تک فرمایا کہ اگر ایک فریق یہ کہے کہ میں ابھی گھر جا کر دام لے آتا ہوں تب بھی اس کو مہلت نہ دو- مجھے ربا کا اندیشہ ہے- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہدایت احتیاطی تدبیر کے لیے ہے- یہ نہیں فرمایا کہ یہ سود ہے بلکہ اس اندیشہ کا اظہار فرمایا کہ اس ڈھیل سے تم سود میں نہ پڑ جاؤ- یہ سب روایات احتیاط کا پہلو لیے ہوئے ہیں- ایسے احکام کا مزاج تشدد کا ہوتا ہے تاکہ لوگوں میں ڈھیل پیدا نہ ہو-

آخری روایت میں سعید بن مسیب کا فتویٰ ہے کہ سود کا اطلاق صرف سونے، چاندی، ناپی جانے والی چیزوں، تولی جانے والی چیزوں، کھائی جانے والی چیزوں اور پی جانے والی چیزوں پر ہوتا ہے- یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا سود کا تعلق صرف انہی چھ چیزوں سے ہے بقیہ تمام چیزوں میں آزادانہ لین دین جائز ہے- اس صورت میں ضروری ہوتا ہے کہ سب میں قدر مشترک تلاش کی جائے- وہ علت معلوم کی جائے جو ان چھ چیزوں میں ربا کی پائی جاتی ہو- اہل ظاہر کا مذہب یہ ہے کہ ربا صرف انہی چھ چیزوں میں ہے اوروں میں نہیں- بعض لوگ کہتے ہیں ناپ تول جانا علت ہے اور یہ علت جس چیز میں پائی جائے گی اس میں ربا پایا جائے گا- بعض کہتے ہیں کہ ثمنیت علت مشترک ہے- میرے نزدیک جامع تعبیر یہ ہے کہ ہر وہ چیز اس میں آئے گی جو مبادلہ کی حیثیت رکھتی ہو یا مبادلے کا کام دے سکتی ہو- اس لیے کہ ربا جب بھی پیدا ہوگا مبادلے کی چیز میں ہوگا- لہٰذا اس میں یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ مبادلہ کی صورت میں تفاضل نہ ہو، معاملہ نسیہ (ادھار) نہ ہو اور مقدار میں کمی بیشی نہ ہو-

مَا جَاءَ فِي الصَّرْفِ

نقدی کے مبادلہ کے بارے میں

٦ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ مَالِكِ بْنِ أَوْسِ بْنِ الْحَدَثَانِ النَّصْرِيِّ أَنَّهُ الْتَمَسَ صَرْفًا بِمِائَةِ دِينَارٍ قَالَ فَدَعَانِي طَلْحَةُ بْنُ عُبَيْدِ اللَّهِ فَتَرَاوَضْنَا حَتَّى اصْطَرَفَ مِنِّي وَ أَخَذَ الذَّهَبَ يُقَلِّبُهَا فِي يَدِهِ ثُمَّ قَالَ حَتَّى يَأْتِيَ خَازِنِي مِنَ الْغَابَةِ وَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَسْمَعُ فَقَالَ عُمَرُ وَ اللَّهِ لَا تُفَارِقُهُ حَتَّى تَأْخُذَ مِنْهُ ثُمَّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الذَّهَبُ بِالْوَرِقِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَ هَاءَ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَ هَاءَ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَ هَاءَ وَ الشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ۔

﴿مالک بن اوس بن حدثان نصری کہتے ہیں کہ ان کو ایک صد دینار کے مبادلے کی ضرورت پیش آئی۔ کہتے ہیں کہ مجھے طلحہ بن عبید اللہ نے بلایا تو ہم نے مبادلہ کا نرخ طے کر لیا یہاں تک کہ انہوں نے مجھ سے صرف طلب کر لیا اور سونا ہاتھ میں لے کر الٹنے پلٹنے لگے۔ پھر کہا کہ میرا منشی رقبے سے آتا ہے تو میں دینار دیتا ہوں۔ حضرت عمر بن خطابؓ سن رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ خدا کی قسم، آپ یہاں سے ہٹیں نہیں جب تک کہ ان سے رقم لے نہ لیں۔ پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ سونا چاندی کے بدلے میں سود ہے مگر یہ کہ اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے۔ گندم کے بدلے گندم سود ہے مگر یہ کہ اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے۔ کھجور کے بدلے کھجور سود ہے مگر یہ کہ اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے۔ جو کے بدلے جو سود ہے مگر یہ کہ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے۔﴾

وضاحت:

مبادلے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو دست بدست یعنی نقد اور دوسری صورت ایک مقررہ مدت کے اندر ادائیگی کی ہے۔ مبادلے کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب ایک شخص کو ایک جنس کے بدلے میں دوسری جنس

کی ضرورت ہو- جیسے دینار کے بدلے درہم کی یا روپے کے بدلے ڈالر، پونڈ یا دوسری کرنسی کی یا ایک قسم کی گندم دوسری قسم کی گندم کے بدلے- علیٰ ہذا القیاس دوسری اجناس یا چیزیں- ایسے مبادلے میں تفاضل جائز ہے- یعنی آپ ایک اعلیٰ قسم کی کھجور دے کر اس سے زیادہ مقدار میں عام قسم کی کھجور لے سکتے ہیں لیکن صرف اس شرط کے ساتھ کہ مبادلہ دست بدست ہو، ادھار نہ ہو کیونکہ ادھار میں سود کا شائبہ ہو جاتا ہے- اسی لئے ادھار میں تفاضل جائز نہیں- ادھار میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جس چیز کے ساتھ مبادلہ کیا جا رہا ہے اس کی نوعیت کیا ہوگی- اس لیے دونوں چیزوں کا موجود ہونا ضروری ہے- حضرت عمرؓ نے اسی وجہ سے تاکید کی کہ معاملہ اسی وقت انجام پذیر ہو جائے تاکہ ربا کا شائبہ نہ رہے-

عام مذہب تو یہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے لیکن احناف اس میں کچھ نرمی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ معاملہ مکمل نہ ہوگا جب تک کہ فریقین ایک دوسرے سے الگ نہ ہو جائیں- خواہ وہ معاملہ کرنے میں کتنا ہی زیادہ وقت لیں، ہو سکتا ہے معاملہ طے کرنے میں تاخیر ضرورت کا تقاضا ہو- مجھے یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے-

معاملہ کی دوسری صورت مقررہ مدت میں ادائیگی کی ہے- مثلاً معاملہ کی شرائط طے ہو جاتی ہیں اور ایک فریق کہتا ہے کہ میں کل رقم بنک سے نکلوا کر دے دوں گا تو اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں- یا یہ صورت ہو کہ خزانچی موجود نہیں اور یہ طے ہو جائے کہ خزانچی کے آجانے پر ادائیگی کر دی جائے گی- تو اس میں کوئی شرعی قباحت معلوم نہیں ہوتی کیونکہ معاملہ کرنے کے وقت ہی یہ طے پایا ہے کہ ادائیگی کل یا پرسوں ہوگی تو اس میں کوئی حرج نہیں- احناف کے مسلک سے بھی اس کا جواز نکلتا ہے- نہ جانے زندگی کے کتنے معاملات اسی طرح طے ہوتے ہیں- اگر آپ پونڈ کے بدلے روپوں کا تبادلہ کرتے ہیں اور آج کے بھاؤ پر معاملہ طے ہو جاتا ہے لیکن ادائیگی کو دو تین روز کے لیے مؤخر کرنا بھی طے پاجاتا ہے تو جائز ہے- اگر مبادلے کا بھاؤ اس دوران تبدیل بھی ہو جائے لیکن ادائیگی طے شدہ بھاؤ پر ہی عمل میں آئے گی-

اس حکم میں دست بدست کی قید احتیاط کے نقطۂ نظر سے ہے- دست بدست اور نسیہ میں جو باریک سا فرق ہے اس کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے- حضرت عمرؓ نے جو تاکید کی ہے اس کی نوعیت بھی یہی ہے- یہ ایک صنف کو دوسری صنف سے بدلنے کا معاملہ تھا- اس کا دست بدست ہونا ہی بہتر تھا- منشی کے موجود نہ ہونے سے معاملہ نسیہ کی صورت میں طے پانے کا امکان تھا- حضرت عمرؓ نے اس خدشہ کے پیش نظر کہ ہو سکتا ہے کہ مرور زمانہ سے لوگ

اس قید کو نظر انداز کرتے کرتے ربا میں ملوث ہو جائیں یہ حکم سد الذریعہ کی حکمت کے تحت دیا۔

اَلْمُرَاطَلَةُ

مسکوک اور غیر مسکوک کا تبادلہ

6 حدثنی یحیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَزِيدَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ قُسَيْطٍ اللَّيْثِيِّ أَنَّهُ رَأَى سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ يُرَاطِلُ الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ فَيُفْرِغُ ذَهَبَهُ فِي كِفَّةِ الْمِيزَانِ وَيُفْرِغُ صَاحِبُهُ الَّذِي يُرَاطِلُهُ ذَهَبَهُ فِي كِفَّةِ الْمِيزَانِ الْأُخْرَى فَإِذَا اعْتَدَلَ لِسَانُ الْمِيزَانِ أَخَذَ وَأَعْطَى ۔

* یزید بن عبداللہ بن قسیط اللیثی روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے سعید بن مسیب کو دیکھا کہ وہ سونے سے سونے کا تبادلہ کر رہے تھے تو وہ اپنا سونا ترازو کے ایک پلڑے میں رکھتے تھے اور ان کے ساتھی جو تبادلہ کر رہے تھے اپنا سونا ترازو کے دوسرے پلڑے میں رکھتے۔ تو جب میزان برابر ہو جاتی تھی تو وہ لین دین کرتے تھے۔

وضاحت :

یہاں ذھب سے مراد دینار ہے اور دوسرے سونے سے مراد سونے کے ٹکڑے ہیں۔ اس وقت سونے کی ایک ہی قسم ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں کی طرح مختلف قیراط کی بہت سی قسمیں نہیں تھیں۔ یہی صورت چاندی کی بھی تھی۔ دینار کے ساتھ سونے کے ٹکڑے بھی سکے کے طور پر چلتے تھے۔ اسی لیے سعید بن مسیب ان کا ہم وزن مبادلہ کر رہے تھے۔ اب سکوں کا الگ نظام وجود میں آگیا ہے اور سونے کی بھی الگ الگ کوالٹی دستیاب ہے۔ اب اگر سونے کے سکے اور سونے کے ٹکڑے کا نرخ بازار میں الگ الگ ہو تو بازار کا نرخ ہی چلے گا۔ موجودہ حالات میں سونا ایک الگ جنس ہے اور سونے کا سکہ ایک دوسری جنس ہے اور اجناس مختلف ہونے کی صورت میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ بیعوا کیف شئتم (جس طرح چاہو ان کی خرید و فروخت کرو)

آگے اس بارے میں امام مالک کے فتویٰ کا حوالہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سونا سونے کے بدلے اور چاندی چاندی کے بدلے بیع کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ اگر دست بدست معاملہ میں ایک آدمی گیارہ دینار دس دینار

کے بدلے میں لے لے تو یہ بیع درست ہے جبکہ وزن برابر اور جنس ایک ہو۔اسی طرح درہموں کے مبادلہ میں بھی کوئی حرج نہیں۔

میرے نزدیک یہ فتویٰ درست ہے۔موجودہ زمانہ کے لحاظ سے میں اس پر یہ اضافہ کرتا ہوں کہ سونا اگر مختلف قیراط کا ہے تو یہ دیکھا جائے گا کہ کس درجے کا سونا ہے۔یکساں درجے والے سونے سے برابر پر معاملہ ہو سکتا ہے۔ورنہ پھر کمی بیشی کرنی پڑے گی اور شریعت میں اس کی اجازت ہے۔

اَلْعِيْنَةُ وَ مَا يُشْبِهُهَا

ادھار پر خرید اور نقد پر فروخت جیسے سودوں کے بارے میں

❑ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنِ ابْتَاعَ طَعَامًا فَلَا يَبِعْهُ حَتّٰى يَسْتَوْفِيَهُ۔

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے غلہ خریدا تو وہ اس کو بیچ نہیں سکتا جب تک کہ وہ اس کو اپنے پورے قبضے میں نہ کر لے۔﴾

❑ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنِ ابْتَاعَ طَعَامًا فَلَا يَبِعْهُ حَتّٰى يَقْبِضَهُ

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے غلہ خریدا وہ اس کو فروخت نہ کرے جب تک کہ اس کو اپنے قبضے میں نہ کر لے۔﴾

❑ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّهُ قَالَ كُنَّا فِي زَمَانِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ نَبْتَاعُ الطَّعَامَ فَيَبْعَثُ عَلَيْنَا مَنْ يَأْمُرُنَا بِانْتِقَالِهِ مِنَ الْمَكَانِ الَّذِي ابْتَعْنَاهُ فِيهِ إِلٰى مَكَانٍ سِوَاهُ قَبْلَ أَنْ نَبِيعَهُ۔

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں غلہ خریدتے تو آپ کا بھیجا ہوا آدمی ہمارے پاس یہ حکم لاتا کہ غلے کو آگے فروخت کرنے سے پہلے اس جگہ سے جہاں ہم نے اسے

ریدا کسی دوسری جگہ منتقل کر لیں ﴾-

حدثنی عن مالك عن نافع أنّ حكيم بن حزام ابتاع طعاما أمر به عمر بن الخطاب للناس فباع حكيم الطعام قبل أن يستوفيه فبلغ ذلك عمر بن الخطاب فردّه عليه و قال لا تبع طعاما ابتعته حتى تستوفيه-

﴿ حضرت نافع روایت کرتے ہیں کہ حکیم بن حزام نے غلہ خریدا جس کا حضرت عمر بن خطابؓ نے وگوں کے لیے خریدنے کا حکم دیا تھا- پھر حکیم نے اس کو قبضہ حاصل کرنے سے پہلے بیچ دیا- جب یہ بات حضرت عمرؓ کو پہنچی تو آپ نے بیع لوٹا دی اور فرمایا کہ جو غلہ آپ نے خریدا ہے اس کو قبضہ کرنے سے پہلے نہ بیچو- ﴾

حدثنی عن مالك أنه بلغه أنّ صكوكا خرجت للناس في زمان مروان ابن الحكم من طعام الجار فتبايع الناس تلك الصكوك بينهم قبل أن يستوفوها فدخل زيد بن ثابت و رجل من أصحاب النبي ﷺ على مروان ابن الحكم فقالا أتحل بيع الربا يا مروان فقال أعوذ بالله وما ذلك فقالا هذه الصكوك تبايعها الناس ثم باعوها قبل أن يستوفوها فبعث مروان ابن الحكم الحرس يتبعونها ينزعونها من أيدي الناس و يردونها الى أهلها-

﴿ امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ مروان بن حکم کے دور حکومت میں جار کے علاقے میں گندم کے پرمٹ وگوں کو دیے گئے تو لوگوں نے ان پرمٹوں کو آپس میں بیچنا شروع کر دیا، پیشتر اس کے کہ غلہ اپنے قبضہ میں لے لیں- تو زید بن ثابتؓ اور ایک صحابی مروان کے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ آپ نے ربا ی بیع شروع کر دی ہے مروان صاحب! اس نے کہا کہ اللہ کی پناہ! کیا بات ہوئی- تو انہوں نے کہا یہ مٹ جو آپ نے دیے ہیں یہ لوگوں کے درمیان بک رہے ہیں، پیشتر اس کے کہ وہ اپنا غلہ وصول یں- اس پر مروان نے اپنے چوبداروں کو ان لوگوں کا تعاقب کرنے کو بھیجا تو انہوں نے لوگوں سے مٹ چھین کر اصل مالکوں کو دیے کہ وہ اپنا غلہ وصول کر لیں- ﴾

□ حدّثنی عن مالکٍ انّه بلغهٗ انّ رجلًا اراد ان یبتاع طعامًا من رجلٍ الی اجلٍ فذهب بهٖ الرّجل الّذی یرید ان یبیعهٗ الطّعام الی السّوق فجعل یریه الصُّبر ویقول لهٗ من ایّها تحبّ ان ابتاع لک فقال المبتاع اتبیعنی ما لیس عندک فاتیا عبد اللّٰه بن عمر فذکرا ذٰلک لهٗ فقال عبد اللّٰه بن عمر للمبتاع لا تبتع منهٗ ما لیس عندهٗ و قال للبائع لا تبع ما لیس عندک۔

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ ایک شخص نے کچھ گندم دوسرے شخص سے کچھ مدت کے لیے ادھار خریدنے کا ارادہ کیا تو وہ شخص خریدار کو بازار لے گیا اور اس سے کہا کہ یہ ڈھیریاں ہیں، جس میں سے چاہو میں خرید دیتا ہوں۔ خریدار نے کہا کہ آپ میرے پاس وہ چیز بیچ رہے ہیں جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ تو دونوں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے پاس آئے اور ان سے اس معاملہ کا ذکر کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے خریدار سے کہا کہ آپ اس سے وہ چیز نہ خریدیں جو اس کے پاس نہیں اور بیچنے والے سے کہا کہ وہ چیز نہ بیچو جو تمہارے پاس نہیں۔﴾

□ حدّثنی عن مالکٍ عن یحیی بن سعیدٍ انّهٗ سمع جمیل بن عبد الرّحمٰن المؤذّن یقول لسعید بن المسیّب انّی رجلٌ ابتاع من الارزاق الّتی تعطی النّاس بالجار ماشاء اللّٰه ثمّ ارید ان ابیع الطّعام المضمون علیّ الی اجلٍ فقال لهٗ سعیدٌ اترید ان توفّیهم من تلک الارزاق الّتی ابتعت فقال نعم فنهاهٗ عن ذٰلک۔

﴿سعید بن مسیب سے ایک شخص نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں اس غلے میں سے جو جار کے علاقوں کے غلوں میں سے لوگوں کو ملتے ہیں جتنا اللہ چاہے خرید لوں۔ پھر جو غلہ میرے ذمہ ضمانت کے طور پر ادھار ہے اس میں سے دے دوں۔ سعید بن مسیب نے کہا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تم ان کو پورا کر دو اس غلہ سے جو تم نے خریدا ہے تو اس شخص نے کہا ہاں۔ اس پر سعید بن مسیب نے اس کو منع کر دیا۔﴾

ان احادیث کی روایت کے بعد امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات ہمارے نزدیک متفق علیہ ہے کہ جس کسی نے

گندم، جو کی قسم کی کوئی چیز، باجرہ یا جوار، دالیں یا وہ چیزیں جن میں زکوٰۃ واجب ہے یا سالن کی قسموں سے کوئی چیز جیسے تیل، گھی، شہد، سرکہ، پنیر، تل، دودھ یا اس طرح کی ساری چیزیں خریدیں تو وہ ان میں سے کسی کو بھی بیچ نہیں سکتا جب تک کہ وہ ان کو قبضہ میں نہ لے لے اور ان کو پوری طرح سے وصول نہ کرے۔

وضاحت:

طعام سے عام طور پر غلہ مراد ہوتا ہے اور گندم کے لیے بھی اس لفظ کا استعمال عام ہے۔ روایات میں تین تک مرفوع احادیث ہیں۔ ایک روایت میں حضرت عمر بن خطابؓ کا حکم ہے جو مرفوع روایات سے مستنبط ہے۔ دو روایات صحابہ کے آثار میں سے ہیں اور ایک روایت حضرت سعید بن مسیب جو کہ مدینہ منورہ کے مشہور فقیہ ہیں، کا فتویٰ ہے۔ اس کے بعد اپنے فتویٰ میں امام مالکؒ نے طعام کے لفظ کی تشریح کی ہے کہ اس میں کھانے پینے کی تمام چیزیں شامل ہیں۔ میرے نزدیک ان کی یہ تشریح درست ہے۔

امام مالکؒ کا یہ فرمانا بھی ٹھیک ہے کہ وہ تمام کھانے پینے کی چیزیں جن پر زکوٰۃ واجب ہو اسی حکم میں ہیں۔ میرے نزدیک زکوٰۃ ان تمام خوردنی اشیاء پر واجب ہے جو تجارتی مقاصد کے لیے کاشت کی جاتی ہیں۔ صرف ان کی ایک مقررہ مقدار زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے۔ احناف کا بھی یہی مسلک ہے۔

ان تمام روایات میں یہ حکم بیان ہوا ہے کہ جب کسی جنس کا سودا ہو جائے تو خریدار کو چاہیے کہ وہ اس کو قبضہ میں لے کر کسی دوسری جگہ منتقل کرے۔ اگر وہ آگے اس کو فروخت کرنا چاہتا ہے تو منتقلی کے بعد نئے مقام سے فروخت کرے۔

قبضے میں لے کر فروخت کرنے کی یہ پابندی صرف خوردنی اشیاء سے ہی متعلق ہے جو قابل انتقال ہیں۔ دوسری چیزیں مثلاً غیر منقولہ جائیداد یا جن کی نقل و حمل میں زحمت ہو اس حکم کے تحت نہیں آتیں۔ خوردنی اشیاء کے متعلق اس حکم کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ نزاع کا خطرہ نہ رہے۔ خریدار کی ملکیت تامہ جب تک نہ ہو اس بات کا اندیشہ باقی رہتا ہے کہ انتقال کے وقت جنس کا کوئی نقص واضح ہو جائے اور نزاع کی صورت پیدا ہو جائے۔ اس لیے کامل قبضے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

حدیث میں خرید کردہ مال کو قبضہ میں لینے کا جو حکم ہے، مال کو دوسری جگہ منتقل کرنا اس کی کامل شکل ضرور ہے لیکن واحد یہی شکل نہیں۔ قبضہ کے معنی یہ ہیں کہ شے بالکل آپ کے تصرف میں آجائے۔ آپ اس کے دام ادا

کرنے کے بعد اس کی ملکیت اس طرح حاصل کر چکے ہوں کہ اب اگر دوسری جگہ اس کو فروخت کرنا چاہیں تو اس میں آپ کے اختیار پر کوئی قدغن نہ ہو۔ اس صورت میں نزاع کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ جہاں تک جگہ کا معاملہ ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ خریدار کے پاس غلہ رکھنے کے لیے جگہ ہی نہ ہو اور وہ اس بات پر مجبور ہو کہ وہ اسی جگہ سے اس کو فروخت کر دے جہاں سے اس نے غلہ خریدا۔ اس طرح کی صورت میں سودا کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔

پرمٹوں کے اجراء کی روایت میں قبضے سے پہلے فروخت کرنے کی ممانعت کی ایک اور حکمت سامنے آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے جار کے کسی علاقے میں غذائی اجناس کی کمی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے لوگوں میں پرمٹ تقسیم کیے جن کو پیش کر کے وہ سرکاری گودام سے غلہ حاصل کر سکتے تھے۔ لوگوں نے ان پرمٹوں کی تجارت شروع کر دی اور غلہ وصول کر کے اس کو فروخت کرنے کی بجائے پرمٹ فروخت ہونا شروع ہو گئے۔ اس طرح کے سودوں کے باعث مصنوعی طور پر اشیائے ضرورت کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بعض صحابہ نے حکومت کی توجہ پرمٹوں کے کاروبار کی طرف مبذول کرائی تو حکومت نے اس کو روکنے کے اقدامات کیے۔

اس سے اگلی روایت سے دلالی کی ممانعت مستنبط ہوتی ہے۔ چونکہ روایت زیر بحث میں دلال کو گندم کی فروخت سے روکا گیا اس لیے اس روایت کی رو سے غلے اور اس قسم کی غذائی ضروریات کی چیزوں پر دلالی کی ممانعت صاف ظاہر ہے۔ اس کی حکمت یہی معلوم ہوتی ہے کہ اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں اعتدال رہے۔ اشیائے خورد و نوش کے علاوہ دوسری اشیاء کی دلالی پر پابندی اس روایت سے مستنبط نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں آج مقامی یا بین الاقوامی تجارت میں جو دلالی رائج ہے وہ ایک ناگزیر ضرورت بن چکی ہے۔ اس میں قیمتوں کا تعین بین الاقوامی منڈیوں کے بھاؤ کے مطابق ہوتا ہے اور اس میں دلال کا رول نہ صرف اہم ہے بلکہ بہت سے نزاعات سے بچنے کا باعث بھی ہے۔ میرے نزدیک اس روایت کا کسی دلالی پر اطلاق نہیں ہوتا۔

ان روایات کو پڑھ کر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ صدر اول کے لوگوں نے ان چیزوں پر اتنی سختی سے عمل کیوں کیا۔ میرے خیال میں اگر وہ لوگ ایسا نہ کرتے تو آج یہ تعلیمات ہوا ہو گئی ہوتیں۔ وہ اگر کسی چیز میں رتی برابر بھی ڈھیل دے دیتے تو آج یہ ڈھیلیں بڑھتے بڑھتے نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتی تو انہوں نے اصل سے آپ کو آگاہ کر دیا۔ اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ حالات میں جو تغیر ہوا ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے اور اس کوشش کے

...ا کہ کوئی حرام حلال نہ ہونے پائے اور کوئی حلال حرام نہ ہونے پائے اس سختی کو کم کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ...انے کے لحاظ سے کام کیا اور بالکل ٹھیک کیا۔ اب حالات کے تغیر اور صنعت و حرفت کی ترقی نے جدید مسائل کو جنم ...یا ہے۔ ان کے معروضی مطالعہ اور شریعت کے احکام کی روشنی میں آراء قائم کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔

مَا يُكْرَهُ مِنْ بَيْعِ الطَّعَامِ إِلَى أَجَلٍ

غلے کو ادھار بیچنے کی کراہت کی ایک شکل

٦ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ أَنَّهُ سَمِعَ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ وَ سُلَيْمَانَ بْنَ ...سَارٍ يَنْهَيَانِ أَنْ يَبِيعَ الرَّجُلُ حِنْطَةً بِذَهَبٍ إِلَى أَجَلٍ ثُمَّ يَشْتَرِي بِالذَّهَبِ تَمْرًا قَبْلَ أَنْ يَقْبِضَ الذَّهَبَ۔

﴿ابو الزناد سے روایت ہے کہ انھوں نے سنا کہ سعید بن مسیب اور سلیمان بن یسار دونوں اس بات سے ...ع کرتے تھے کہ کوئی شخص سونے کے عوض گندم ادھار بیچے اور پھر اس رقم سے کھجور خریدے پیشتر ...اس کے کہ اس نے سونے پر قبضہ کیا ہو۔﴾

وضاحت:

مطلب یہ ہے کہ آپ نے کچھ دینار کی گندم فروخت کی اور ابھی قیمت وصول نہیں کی۔ قرض واجب الادا ...ہے۔ پھر جب ادائیگی کا مقررہ وقت آئے تو آپ یہ کہہ دیں کہ مجھے اس رقم کے عوض کھجور دے دی جائے۔

سعید بن المسیب اور سلیمان بن یسار دونوں حضرات فقہاء مدینہ میں سے ہیں۔ یہ دونوں معاملہ کی اس شکل سے ...منع کرتے تھے۔ ان کا انحصار اس روایت پر معلوم ہوتا ہے کہ قبضہ کرنے سے پہلے کسی چیز کا سودا کرنا منع ہے۔ ...ہمارے نزدیک اس شکل میں کمزوری کا پہلو یہ ہے کہ چونکہ رقم ابھی تک قرض ہے تو جب تک آپ بعینہ وہ رقم ...وصول نہ کر لیں تہمت کا موقع باقی رہے گا۔ ہو سکتا ہے اس میں آپ تفاضل کی کوئی صورت پیدا کر لیں۔ لہٰذا اس ...صورت میں معاملہ کی ممانعت احتیاط کے پہلو سے اور موقع تہمت سے بچنے کے لیے ہے۔

اس مضمون کی ایک روایت ابوبکر بن محمد بن حزم سے بھی مروی ہے۔

اَلسُّلْفَةُ فِي الطَّعَامِ

غلے کی خرید میں پیشگی رقم کی ادائیگی

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّهُ قَالَ لَا بَأْسَ بِاَنْ يُسَلِّفَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِي الطَّعَامِ الْمَوْصُوفِ بِسِعْرٍ مَعْلُومٍ اِلَى اَجَلٍ مُسَمًّى مَالَمْ يَكُنْ فِي زَرْعٍ لَمْ يَبْدُ صَلَاحُهُ اَوْ تَمْرٍ لَمْ يَبْدُ صَلَاحُهُ۔

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ اس بات میں کچھ حرج نہیں کہ کوئی شخص کسی شخص کو غلہ خریدنے کے لیے پیشگی رقم دے کہ جس کی تاریخ معین کر دی گئی ہو اور قیمت بھی متعین کر دی گئی ہو بشرطیکہ اس کا تعلق کسی ایسی کھیتی یا ایسے کھجور سے نہ ہو جس کی صلاحیت ابھی ظاہر نہیں ہوئی﴾

وضاحت:

یہ دراصل بیع سلم ہے جس میں اوصاف کے تعین کے ساتھ آپ ایک چیز پیشگی رقم دے کر خریدتے ہیں۔ اس طرح کی صورت معاملہ میں کوئی حرج نہیں۔ فی زمانہ تمام بیرونی تجارت اسی اصول پر ہو رہی ہے۔ کروڑوں اربوں روپے کے معاہدے ہوتے ہیں جن میں خرید کیے جانے والے مال کے اوصاف متعین کر دیے جاتے ہیں اور تمام دوسری شرائط لکھ دی جاتی ہیں جن کے پورا نہ ہونے کی صورت میں بیع فسخ کی جا سکتی ہے۔ بیع سلم کی اس صورت میں احناف یہ قید لگاتے ہیں کہ خیار بھی ہونا چاہیے یعنی مال وقت پر نہ ملے یا صفات کے مطابق نہ ملے تو خریدار کو اختیار ہونا چاہیے کہ بیع کو فسخ کر دے۔ میرے نزدیک یہ قید ضروری ہے، خیار ہونا چاہیے۔

غلے کی صلاحیت کے ظاہر ہونے یا نہ ہونے کا تعلق صرف اس صورت حال سے ہے جب کسی خاص کھیت یا باغ کی فصل کا معاملہ درپیش ہو لیکن بیع سلم کی عام صورت جس میں مال کے اوصاف کا تعین کر دیا گیا ہو اس ذیل میں نہیں آتی۔ یہ بیع مجہول نہیں بلکہ اگر مال مخلوق نہ بھی ہو تو بھی اس میں کچھ حرج نہیں کیونکہ اس میں مال موصوف ہے اور بائع مقررہ وقت پر اس کو مہیا کرنے کا پابند ہے۔ مثال کے طور پر ایک کارخانہ دار ایسا مال فراہم کرنے کا ذمہ

ے سکتا ہے جو خاص صفات کا حامل ہو- سودا کرتے وقت یہ مال غیر مخلوق ہو گا لیکن چونکہ اوصاف متعین ہیں اس لیے یہ معاملہ درست ہو گا- البتہ یہ ضروری ہے کہ معاہدہ میں خریدار کو یہ اختیار دیا گیا ہو کہ مال اوصاف کے مطابق نہ ہونے کی صورت میں قبول نہیں کیا جائے گا اور بیع فسخ کر دی جائے گی- معاہدہ میں اگر خیار نہ ہو تو اعتراض وارد ہوتا ہے- اس لیے حنفیہ خیار کی جو شرط لگاتے ہیں اس کو میں ضروری سمجھتا ہوں- اس ضمن میں امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر ایک شخص متعین مدت کے اختتام پر متعین غلہ حاصل کرنے کے لیے پیشگی ادائیگی کر دیتا ہے لیکن اس مدت کے پورا ہونے پر وہ بائع کے پاس وہ چیز نہیں پاتا جس کا لینا طے ہوا تھا تو اس پیشگی ادا کردہ رقم سے وہ کوئی دوسری چیز نہیں خرید سکتا جب تک کہ وہ رقم واپس اپنے قبضہ میں نہ لے لے- میرے نزدیک اس میں بھی احتیاط کا پہلو مد نظر ہے کہ رقم چونکہ پیشگی دی ہوئی تھی اس لیے اس کے بدلے کوئی دوسری جنس لینے میں تفاضل نہ ہو جائے-

بَیْعُ الطَّعَامِ بِالطَّعَامِ لَا فَضْلَ بَیْنَهُمَا

تفاضل کے بغیر غلے کے بدلے غلے کی فروخت

6 حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ سُلَیْمَانَ بْنَ یَسَارٍ قَالَ فَنِیَ عَلَفُ حِمَارِ سَعْدِ بْنِ اَبِی وَقَّاصٍ فَقَالَ لِغُلَامِهِ خُذْ مِنْ حِنْطَةِ اَهْلِكَ فَابْتَعْ بِهَا شَعِیْرًا وَلَا تَاْخُذْ اِلَّا مِثْلَهٗ-

سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ سعد بن ابی وقاصؓ کے گدھے کے دانے ختم ہو گئے- انہوں نے اپنے غلام سے کہا کہ گھر سے گندم لو اور اس کے عوض جا کر جو خرید و لیکن لینا برابر برابر-

وضاحت :

حضرت سعدؓ کی اس ہدایت کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی- اجناس کی خرید و فروخت کے بارے میں میری رائے جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں، یہ ہے کہ جن چیزوں کی جنس مختلف مانی گئی ہے ان کی مقداریں مبادلہ میں مختلف ہو سکتی ہیں- جو اور گندم کو ایک جنس نہیں مانا جا سکتا اس لیے اس میں تفاضل میں کوئی قباحت نہیں-

یہ روایت امام صاحب کی بلاغیات میں سے ہے- دوسری روایت جو انہیں نافع کے ذریعہ سے ملی ہے اس میں سلیمان بن یسارؒ یہی واقعہ عبدالرحمن بن الاسودؒ سے منسوب کرتے ہیں-

اَلْحُكْرَةُ وَالتَّرَبُّصُ

ذخیرہ اندوزی اور انتظار

اجناس کی ذخیرہ اندوزی اس انتظار میں کہ جب قیمت بڑھے گی تو ان کو فروخت کریں گے، حرمت دیا احتکار کہلاتی ہے۔

☐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ لَاحُكْرَةَ فِی سُوقِنَا لَا يَعْمِدُ رِجَالٌ بِاَيْدِيهِمْ فُضُولٌ مِنْ اَذْهَابٍ اِلٰى رِزْقٍ مِنْ رِزْقِ اللّٰهِ نَزَلَ بِسَاحَتِنَا فَيَحْتَكِرُونَهُ عَلَيْنَا وَلٰكِنْ اَيُّمَا جَالِبٍ جَلَبَ عَلٰى عَمُودِ كَبِدِهِ فِی الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ فَذٰلِكَ ضَيْفُ عُمَرَ فَلْيَبِعْ كَيْفَ شَاءَ اللّٰهُ وَلْيُمْسِكْ كَيْفَ شَاءَ اللّٰهُ۔

﴿امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے فرمایا کہ ہمارے بازاروں میں ذخیرہ اندوزی جائز نہیں۔ کوئی شخص جس کے پاس فاضل رقم موجود ہو یہ ارادہ کرے کہ اللہ کے بخشے ہوئے رزقوں میں سے جو رزق ہماری سرزمین میں اترے اس کو ہم سے روک کر ذخیرہ کرلے۔ ہاں یہ ہے کہ جو کوئی مال لانے والا اپنی محنت کر کے گرمیوں اور سردیوں میں مال لائے تو وہ عمرؓ کا مہمان ہے اور اپنا مال چاہے بیچے اور چاہے روک رکھے، جیسے اللہ تعالیٰ چاہے۔﴾

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ يُونُسَ بْنِ يُوسُفَ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ مَرَّ بِحَاطِبِ بْنِ اَبِی بَلْتَعَةَ وَهُوَ يَبِيعُ زَبِيبًا لَهُ بِالسُّوقِ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اِمَّا اَنْ تَزِيدَ فِی السِّعْرِ وَ اِمَّا اَنْ تُرْفَعَ مِنْ سُوقِنَا۔

﴿سعید بن مسیب روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ حاطبؓ بن ابی بلتعہ پر گزرے تو وہ بازار میں منقے بیچ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا کہ آپ یا تو بھاؤ کو بڑھائیں ورنہ ہمارے بازار سے اٹھا دیے جائیں گے۔﴾

٦ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ كَانَ يَنْهٰى عَنِ الْحُكْرَةِ۔

(امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عثمانؓ ذخیرہ اندوزی سے منع فرماتے تھے)

وضاحت :

پہلی روایت میں حضرت عمرؓ کا یہ حکم بیان ہوا ہے کہ ہمارے ہاں ذخیرہ اندوزی نہ کی جائے۔ ان کی یہ بات بالکل ٹھیک ہے کیونکہ سرمایہ جب تک بازی نہ کھیلے وہ سودی سرمایہ ہے۔ وہ بزدل سرمایہ ہے جو دوسروں کی چراگاہ میں چر کر موٹا ہونا چاہتا ہے۔ جو سرمایہ بازی کھیل کر بازار کا مقابلہ کرتا ہے اس کا منافع طیب ہے۔ ذخیرہ اندوزی کر کے سرمایہ دار عوام کے استعمال کی اشیاء کی قیمتیں بڑھاتے ہیں تاکہ ان کی جیبوں سے پیسہ کھینچ کر اپنے سرمائے کو اور بڑھائیں۔ اسلام میں ایسا کرنا ناجائز ہے۔ البتہ اسلام اس بات کا حق دیتا ہے کہ آدمی بازار کی قیمت کو موافق نہ پا کر اپنا مال فروخت کے لیے پیش نہ کرے۔ یہ ذخیرہ اندوزی نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کے قول کے دوسرے حصہ کا یہ مطلب ہے۔ دوسری روایت حاطب بن ابی بلتعہ کے متعلق ہے کہ وہ بازار میں منقے بیچ رہے تھے۔ ممکن ہے کہ فالتو ہو گیا ہو اور وہ چاہتے ہوں کہ جلدی بک جائے اور اس مقصد کے لیے بازار کے بھاؤ سے کم پر بیچ رہے ہوں۔ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یا تو بھاؤ بڑھاؤ ورنہ اٹھ جاؤ۔ یعنی میں تم کو سستا نہیں بیچنے دوں گا۔ حضرت عمرؓ کا فلسفہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص بازار کا بھاؤ گرانے کی مصنوعی شکل پیدا کرے تو یہ بھی صحیح نہیں۔ مارکیٹ ریٹ کا احترام بہر حال ہونا چاہیے۔ مارکیٹ کے نظام میں توازن قائم رکھنا ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ آسانی سے غلطی کرنے والے نہیں تھے۔ حاطب بازار میں مستقل بیٹھنے والے نہیں تھے۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے کہا کہ اگر بیٹھنا ہے تو اس کوچے کی جو روایت ہے اس کا احترام کرو۔

اسلام کی رو سے حکومت کا فرض ہے کہ وہ مارکیٹ کے نظام کو کنٹرول کرے اور اتفاقی طور پر اگر کوئی صاحب دکاندار بنے ہوں تو مارکیٹ ریٹ کا لحاظ کریں اور مصنوعی طور پر قیمت میں کمی بیشی کر کے دوسرے دکانداروں کے لیے مشکلات نہ پیدا کریں۔ تیسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ بھی حضرت عمرؓ کی طرح ذخیرہ اندوزی کو ناجائز قرار دیتے اور اس سے منع فرماتے تھے۔

ذخیرہ اندوزی یا احتکار صرف غذائی اشیاء میں ناجائز سمجھا جاتا ہے جو زندگی کی ناگزیر ضروریات میں سے ہیں۔ شوافع کے نزدیک احتکار یہ ہے کہ غلہ یا غذائیت کی دوسری اشیاء جو انسانوں اور جانوروں کی زندگی قائم رکھنے

کے لیے ناگزیر ہیں، خرید کر ذخیرہ کرلی جائیں، صرف اس مقصد کے لیے کہ بھاؤ بڑھایا جائے یا جب بھاؤ بڑھ جائے گا تو فروخت کریں گے، اپنی ضرورت کے لیے خرید کر رکھ لینا احتکار نہیں اور نہ ہی غذائی اشیاء کے علاوہ دوسری اشیاء پر احتکار کا اطلاق ہوتا ہے۔ احناف کے نزدیک بھی انسانوں اور مویشیوں کی غذائیت کی اشیاء کے علاوہ احتکار نہیں اور نہ ہی ایسی ذخیرہ اندوزی گناہ ہے جس سے کسی شہر کے لوگوں کو کوئی ضرر نہ پہنچے۔

مَا يَجُوزُ مِنْ بَيْعِ الْحَيَوانِ بَعْضِهِ بِبَعْضٍ وَالسَّلَفِ فِيهِ

ایک جانور کی دوسرے جانور کے بدلے میں خرید و فروخت اور اس میں ادھار کرنے کا جواز

❏ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ صَالِحِ بْنِ كَيْسَانَ عَنْ حَسَنِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنَّ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ بَاعَ جَمَلًا لَهُ يُدْعَى عُصَيْفِيرًا بِعِشْرِينَ بَعِيرًا إِلَى أَجَلٍ۔

﴿حسن بن محمد بن علی سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنا اونٹ جس کو عصیفیر کہتے تھے بیس اونٹوں کے بدلے میں ادھار بیچا۔﴾

❏ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ أَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ اشْتَرَى رَاحِلَةً بِأَرْبَعَةِ أَبْعِرَةٍ مَضْمُونَةٍ عَلَيْهِ يُوفِيهَا صَاحِبُهَا بِالرَّبَذَةِ۔

﴿امام مالکؒ نافعؒ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بار برداری کا ایک اونٹ چار اونٹوں کے عوض خریدا اس ضمانت پر کہ اونٹ کا مالک ربذہ کے مقام پر قبضہ دے گا۔﴾

وضاحت:

یہ دونوں روایتیں مرفوع احادیث نہیں بلکہ صحابہؓ کے اثر ہیں۔ حضرت علیؓ کے متعلق ہے کہ انہوں نے اپنا اونٹ جس کو عصیفیر کے نام سے پکارا جاتا تھا، بیس اونٹوں کے عوض فروخت کیا اور وہ بھی ادھار۔ اس میں اگرچہ بظاہر ایک ہی جنس یعنی اونٹ کا معاملہ ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کا اونٹ کسی خاص اور اعلیٰ نسل کا تھا جو بیس اونٹوں کے عوض فروخت ہوا۔ پھر اس میں یہ بھی تھا کہ یہ بیس اونٹ ہاتھوں ہاتھ نہیں بلکہ ایک معینہ مدت کے

بعد دیے گئے۔اس میں وہی فلسفہ ہے کہ جب جنس مختلف ہو تو جس طرح چاہے بیچو۔ تمام جانور ایک ہی قسم کے نہیں ہوتے بلکہ کوئی دو جانور بھی ایک دوسرے کے بالکل کفو نہیں ہوتے اس لیے ان کی خرید و فروخت میں تفاضل اور نسیہ (ادھار) جائز ہے۔

دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق ہے کہ انہوں نے ایک سواری کا اونٹ چار اونٹوں کے عوض خریدا اس ضمانت پر کہ اس کا مالک یہ اونٹ ربذہ کے مقام پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے حوالے کرے گا۔ یعنی اس میں بھی ایک معینہ مدت کے لیے ادھار تھا اور ایک کے بدلے چار اونٹ کا مبادلہ تھا۔ اگرچہ دونوں قسم کے جانور اونٹ ہی تھے لیکن ان کی جنس مختلف تھی جس کی وجہ سے تفاضل اور نسیہ درست تھا۔ اگر ایک اونٹ کے بدلے ایک اونٹ اور کچھ نقدیا ادھار رقم بھی ثمن کے طور پر ہو تو وہ بھی جائز ہو گی۔ شوافع کا مسلک بھی یہی ہے اور میرے نزدیک یہ ٹھیک ہے، بشرطیکہ مدت معین ہو اور جانوروں کے اوصاف واضح ہوں۔ احناف کے ہاں یہ جائز نہیں۔

مَا لَا يَجُوْزُ مِنْ بَيْعِ الْحَيَوَانِ

کن جانوروں کی بیع کا جواز نہیں ہے

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ بَيْعِ حَبَلِ الْحَبَلَةِ وَ كَانَ بَيْعًا يَتَبَايَعُهُ اَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ كَانَ الرَّجُلُ يَبْتَاعُ الْجَزُوْرَ اِلَى اَنْ تُنْتَجَ النَّاقَةُ ثُمَّ تُنْتَجَ الَّتِي فِي بَطْنِهَا۔

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس جانور کی بیع سے منع فرمایا جو ابھی پیٹ میں ہے۔ بیع کا یہ طریقہ اہل جاہلیت میں رائج تھا کہ ایک آدمی اونٹوں کو خرید لیا کرتا یہاں تک کہ جو اونٹنی ابھی جننے والی ہوتی وہ بھی اور اس کا بچہ بھی جو کچھ جنتا۔﴾

وضاحت:

اہل جاہلیت کے ہاں نسل کی بڑی اہمیت تھی۔ اچھی نسل کا جانور حاصل کرنے کے لیے وہ یہ کرتے کہ کسی خاص نسل کی اونٹنی اگر گابھن ہونے کے بعد مادہ بچہ جنتی جو بڑی ہونے کے بعد گابھن ہوتی تو اس کے متوقع بچے کا بھی

سودا کر لیتے تاکہ اس کی نسل بھی حاصل کر لیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جاہلیت کی اس بیع سے منع فرمایا۔ اس کی علت بالکل واضح ہے کہ یہاں سارا معاملہ مجہول ہے۔ نہ معلوم گابھن اونٹنی کیا جنتی ہے، سالم یا ناقص، نر یا مادہ، پھر وہ نر یا مادہ بلوغت کو پہنچتے بھی ہیں یا نہیں اور اگر پہنچ جاتے ہیں تو کیا جنتے ہیں۔ غرضیکہ سارا معاملہ مجہول بھی ہے اور معدوم بھی۔ اس بیع میں مدت بھی معین نہیں کہ کب یہ سارا عمل مکمل ہو گا اور ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ ایسی بیع میں ایک فریق یا دونوں کو ضرر بھی ہے اور غرر بھی۔

امام مالکؒ کے نزدیک ایسی بیع میں کچھ حرج نہیں اگر جانور کی صفات متعین کر دی جائیں اور خریدنے والے کو اس بات کا خیار ہو کہ اگر جانور موصوف نہ حاصل ہو تو بیع کو رد کر دے۔ میرے نزدیک اس صورت میں بھی ایسی بیع درست نہیں کیونکہ مدت معین نہیں ہو سکتی۔

بَيْعُ الْحَيَوَانِ بِاللَّحْمِ

جانور کو گوشت کے بدلے فروخت کرنا

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْحَيَوَانِ بِاللَّحْمِ۔

﴿سعید بن میسب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جانور کو گوشت کے بدلے بیچنے سے منع فرمایا۔﴾

وضاحت:

یہ روایت اگرچہ مرسل ہے لیکن ایسی بیع کے منع فرمانے کی علت واضح ہے کہ اس میں ضرر کا اندیشہ ہے۔ احناف کے نزدیک ایسی بیع فاسد اور مکروہ ہے اور اس کی مثال بیع مزابنہ اور محاقلہ جیسی ہے۔ میرے نزدیک ایسی بیع اس لیے درست نہیں کہ جانور کے گوشت کا صحیح صحیح اندازہ کرنا ممکن نہیں۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس بات پر فقہائے مدینہ کا اتفاق ہے کہ اونٹ یا گائے بکری یا ان جیسے جنگلی جانوروں کے گوشت کا اگر تبادلہ کیا جائے گا تو مقدار اور وزن برابر رکھنا ہو گا، اس لیے کہ سب ایک ہی جنس ہیں۔

امام مالکؒ اور فقہائے مدینہ کا یہ فتویٰ میرے نزدیک صحیح نہیں۔ اگر آپ ہرن کا شکار کریں تو اس کے گوشت کو بکری کے بہتر سے بہتر گوشت پر ترجیح ہو گی۔ نیل گائے کے گوشت کو گائے یا بھینس کے بہترین سے

بن گوشت پر ترجیح ہو گی۔ اسی طرح مچھلی کا گوشت اونٹ کے گوشت یا گائے بکری کے گوشت کے مقابل میں قابل ترجیح ہو سکتا ہے۔ گوشت کی ان اقسام کی قدر و قیمت اور جنس بھی مختلف ہو جاتی ہے اس لیے یکساں مقدار پر ان کا تبادلہ ممکن نہیں۔

مَاجَاءَ فِي ثَمَنِ الْكَلْبِ

کتے کی قیمت کے بارے میں روایت

حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ أَبِي بَكْرِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ الْحَارِثِ بْنِ هِشَامٍ عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ الْأَنْصَارِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَمَهْرِ الْبَغِيِّ وَحُلْوَانِ الْكَاهِنِ۔

ابو مسعود انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت، زانیہ کی اجرت اور کاہن کے حلوہ سے منع فرمایا۔

وضاحت:

اس روایت میں نبی اکرم ﷺ نے جن تین چیزوں سے منع فرمایا ہے ان میں پہلی چیز کتے کی قیمت لینا ہے۔ جب کوئی شخص کتے پکڑ پکڑ کر بیچنے کا دھندا شروع کر دے تو یہ کوئی پسندیدہ فعل نہیں۔ کتا ہمیشہ سے فصل اور گلے کی نگرانی کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے نہ اس کو سدھانے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ کوئی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اگر کسی کو کتے کی ضرورت ہو تو اس سے کتے کی قیمت وصول کرنا ایک خست کا کام ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کی حکمت یہی معلوم ہوتی ہے۔

باقی رہا سدھائے ہوئے کتوں کا مسئلہ تو ایسے کتوں کا معاملہ الگ ہے۔ زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں میں شکاری کتے خاص شکار کے مقصد کے لئے سدھائے جاتے تھے۔ اس کا قرآن مجید میں بھی ذکر ہے۔ مَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ۔ (مائدہ ۵: ۴) "اور شکاری جانوروں میں سے جن کو تم نے سدھایا ہے اس علم میں سے کچھ سکھا کر جو خدا نے تم کو سکھایا"۔ تکلیب کا لفظ ٹریننگ دینے کے معنی کے لیے خاص ہو کر رہ گیا۔ کتوں کی ٹریننگ منشیات کا پتہ لگانے کے لیے بھی کی جاتی ہے۔ ایسے کتے ہوائی اڈوں اور بندرگاہوں پر اس

مقصد کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح سدھائے ہوئے کتے فوج اور پولیس میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان کتوں کی ٹریننگ پر نہ صرف محنت کرنی پڑتی ہے بلکہ خاصا خرچ کرنا پڑتا ہے۔ میرے نزدیک ایسے سدھائے ہوئے کتوں کی قیمت لینے میں کوئی حرج نہیں اور وہ اس حدیث کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں۔

مالکیہ کا فتویٰ یہ ہے کہ کتے کی قیمت نہیں لینی چاہیے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ اس معاملہ میں وہ شکاری یا غیر شکاری کتے کا فرق نہیں کرتے۔ شوافع بھی مالکیہ کے ہم خیال ہیں لیکن ان کے نزدیک قیمت نہ لینے کی علت کتے کی نجاست ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور صاحبین کے نزدیک کتے کی بیع جائز ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ کتا ایک کار آمد جانور ہے جو نگہبانی اور شکار کے لیے مفید ہے۔ وہ اس بارے میں ایک حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں شکاری کتے کی بیع کو عام کتے سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ یہ حدیث نسائی میں ہے اگرچہ بالاتفاق ضعیف ہے۔ احناف یہ بھی کہتے ہیں کہ سدھائے ہوئے کتے کو اگر کوئی قتل کر دے تو اس پر جرمانہ عائد کیا جا سکتا ہے۔ میری بھی یہی رائے ہے اور میرے نزدیک حنفیہ کا مسلک زیادہ معقول ہے۔

روایت میں دوسری چیز جس کی نبی اکرم ﷺ نے ممانعت فرمائی وہ زانیہ کی اجرت ہے۔ زنا جب ایک کبیرہ گناہ ہے تو اس کو کمائی کا ذریعہ بنانا بدرجہ اولیٰ حرام ہے۔

تیسری چیز جس کی نبی اکرم ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے وہ کاہن کا حلوہ ہے جو اس کو کہانت کی اجرت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ بھی بالاتفاق حرام ہے۔ قرآن مجید کی رو سے شیاطین جھوٹوں اور گناہ گاروں پر القا کرتے ہیں۔ اس روایت کا اطلاق منجم اور کاہن دونوں پر ہوتا ہے کیونکہ دونوں کا عمل باطل اور کل کا کل جھوٹ ہوتا ہے۔ ان کی پیشگوئیوں میں اگر کبھی کبھار تقدیر الٰہی سے کوئی بات سچی ثابت ہو جاتی ہے تو کاہن یا منجم کے علم کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔

اَلسَّلَفُ وَ بَيْعُ الْعُرُوْضِ بَعْضِهَا بِبَعْضٍ
پیشگی ادائیگی کے ساتھ سامان کی بیع

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعٍ وَ سَلَفٍ۔

امام مالکؒ سے روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی بیع سے منع فرمایا جس

میں سلف یعنی پیشگی ادائیگی ہو۔

وضاحت :

امام مالکؒ اس کی تفصیل یوں کرتے ہیں کہ ایک آدمی دوسرے سے کہے کہ میں فلاں چیز لے لوں گا اس شرط پر کہ آپ فلاں چیز مجھے اس قیمت پر دے دیں۔اس صورت حال میں بیع اور سلف دونوں شامل ہو جاتے ہیں۔ پیشگی ادائیگی کی صورت یہ ہے کہ آپ نے معاملہ طے کر دیا کہ فلاں چیز لوں گا اس شرط پر کہ تم فلاں چیز مجھے دے دو۔اگر سلف کی شرط اڑا دی جائے تو بیع جائز ہو جائے گی۔

میرے نزدیک بیع میں کوئی شرط بیع کے منشا کے خلاف داخل کرنا جائز نہیں۔نیز زیر بحث معاملہ میں مذکورہ شرط کے باعث یہ بیع جائز نہیں ہے۔اس میں ضرر و غرر کے علاوہ قمار کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے۔

اَلسُّلْفَةُ فِى الْعُرُوْضِ
سامان کے ضمن میں پیشگی

٦ حَدَّثَنِى يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ اَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَبَّاسٍ وَ رَجُلٌ يَسْاَلُهُ عَنْ رَجُلٍ سَلَفَ فِى سَبَائِبَ فَاَرَادَ بَيْعَهَا قَبْلَ اَنْ يَقْبِضَهَا فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ تِلْكَ الْوَرِقُ بِالْوَرِقِ وَ كَرِهَ ذٰلِكَ۔

قاسم بن محمد کہتے ہیں کہ میں نے سنا کہ ایک آدمی عبداللہ بن عباسؓ سے دوسرے شخص کے بارے میں فتویٰ پوچھ رہا تھا جس نے پیشگی رقم کچھ چادروں کی خریداری کے لیے دے دی پھر ان چادروں کو قبضہ میں لینے سے پہلے بیچنا چاہا۔ابن عباس نے کہا یہ تو چاندی کے بدلے چاندی کا سا معاملہ ہے اور اس کو مکروہ گردانا۔

وضاحت :

اس معاملہ میں ایک غلطی یہ تھی کہ قبضے سے پہلے فروخت جائز نہیں۔کیونکہ قبضے کے بغیر ملکیت تامہ نہیں ہوتی۔جن چیزوں کے بارے میں نزاع پیدا ہونے کا سوال نہیں ہوتا ان چیزوں کی بیع ہو جائے گی۔احناف

صرف غلے میں بیع سے پہلے قبضہ کی شرط مانتے ہیں، دوسری چیزوں کی بیع سے پہلے قبضہ ضروری نہیں سمجھتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک نبی اکرم ﷺ نے طعام کے بارے میں پیشگی قبضہ کا حکم دیا ہے۔

امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ کسی نے غلام یا جانور یا سامان کی خرید کے لیے اگر پیشگی رقم دے دی جب کہ خریدی جانے والی چیز کے اوصاف معین اور مدت مقرر کر دی گئی ہو تو اس مدت کے پورا ہونے پر اگر مشتری اس چیز کو اسی شخص کے پاس جس سے اس نے اس کو خریدا تھا اس قیمت سے زیادہ پر فروخت کر دے جو اس نے پیشگی ادا کی ہے تو اس میں ربا کا شائبہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ رقم بائع کے پاس کچھ عرصہ رہی ہے اور اس نے اس رقم سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن اگر کسی دوسرے کے پاس بیچے تو کچھ حرج نہیں۔ میرے نزدیک امام مالک کی یہ بات ٹھیک ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ سامان اس شخص کے ہاتھ نہ بیچے جس سے خریدا ہے بلکہ کسی اور کے ہاتھ بیچ دے تاکہ ربا کا شائبہ نہ رہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں یہ بات متفق علیہ ہے کہ سونے اور چاندی کے سوا جو چیزیں وزن کی جاتی ہیں جیسے تانبا، شبہ، رانگ، سکہ، لوہا، سبزی، انجیر، روئی اور ان جیسی دوسری چیزیں تو ان کے بارے میں کچھ حرج نہیں کہ ایک صنف کی ایک چیز کے بدلے میں دوسری صنف کی چیزیں دو دی جائیں۔ مثلاً لوہے کے ایک رطل کے بدلے دو رطل لوہا اور پیتل کے ایک رطل کے بدلے میں دو رطل پیتل۔ یہ امام مالک کا فتویٰ ہے۔ یہ اس اصول پر مبنی ہے کہ اگر جنس مختلف ہو تو تفاضل جائز ہے البتہ امام مالک وزن کی شرط جو لگاتے ہیں اس کی علت میری سمجھ میں نہیں آئی۔

اَلنَّهْيُ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ

ایک بیع کے اندر دو بیع کی ممانعت

❑ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ۔

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع کے اندر دو بیع کرنے سے منع فرمایا۔﴾

❑ حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِرَجُلٍ اِبْتَعْ لِي هٰذَا الْبَعِيْرَ بِنَقْدٍ حَتّٰى اَبْتَاعَهُ مِنْكَ اِلٰى اَجَلٍ فَسَاَلَ عَنْ ذٰلِكَ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ فَكَرِهَهُ وَ نَهٰى عَنْهُ۔

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ ایک آدمی نے دوسرے سے کہا یہ اونٹ آپ میرے لیے نقد خرید لو اور

میں آپ سے ایک مدت کے بعد خرید لوں گا- پھر عبداللہ بن عمرؓ سے فتویٰ پوچھا تو انہوں نے اس سودے کو مکروہ جانا اور اس سے روکا-﴾

☐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ" اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ سُئِلَ عَنْ رَجُلٍ اشْتَرٰی سِلْعَةً بِعَشَرَةِ دَنَانِیْرَ نَقْدًا اَوْ بِخَمْسَةَ عَشَرَ دِیْنَارًا اِلٰی اَجَلٍ فَکَرِهَ ذٰلِكَ وَ نَهٰی عَنْهُ-

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ قاسم بن محمد سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے ایک چیز یک وقت دس دینار نقد یا پندرہ دینار ادھار پر خریدی تو انہوں نے اس کو ناجائز جانا اور اس سے منع کیا-﴾

وضاحت:

ترمذی نے ایک بیع میں دو بیعوں کی روایت کو وصل کیا ہے اور نسائی نے اسے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے- قاسم بن محمد والی روایت میں ایک ہی بیع میں دو بیعوں کی مثال موجود ہے- اس میں ادھار کی صورت میں پانچ دینار کی زیادتی اصل میں دس دینار پر ربا کی ایک شکل ہے- اسی علت کی وجہ سے رسول اکرم ﷺ نے ایسی بیع سے منع فرمایا ہے- اونٹ کے سودے والی روایت میں بیع کے مکروہ یا ناجائز ہونے کی علت میری سمجھ میں نہیں آئی- اس میں اصل مشتری تو وہ ہے جو نقد خرید رہا ہے- اس کے سودے میں ناجائز ہونے کی کوئی علت نہیں- رہ گیا دوسرا آدمی جو بعد میں خریدے گا تو وہ اس وقت بیع نہیں کر رہا بلکہ صرف بیع کا وعدہ کر رہا ہے- اس وعدہ کے ناجائز ہونے کی علت مجھ پر واضح نہیں-

بَیْعُ الْغَرَرِ

دھوکا بازی کی بیع

☐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی حَازِمِ بْنِ دِیْنَارٍ عَنْ سَعِیْدِ ابْنِ الْمُسَیَّبِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰی عَنْ بَیْعِ الْغَرَرِ-

﴿سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دھوکے بازی کی بیع سے منع فرمایا﴾

وضاحت:

اسلام میں بیع کا یہ مسلم اصول ہے کہ اس میں کسی ایک فریق کو بھی دھوکا نہیں ہونا چاہیے۔ جس بیع میں ایک فریق کو نقصان یا اس سے دھوکہ ہو رہا ہو تو وہ بیع حرام ہے۔ بیع غرر کی تعریف امام مالک نے یہ کی ہے کہ وہ بیع جس کا ظاہر مشتری کو دھوکہ دینے والا اور اس کا باطن مجہول ہو۔ مشتری دھوکہ تو کھا جائے لیکن وہ دھوکا اتنا پر پیچ ہو کہ اس کا پتہ نہ پا سکے۔ اس کی مثال انہوں نے یہ دی کہ ایک آدمی کا اونٹ گم ہو گیا اور اس کی قیمت پچاس دینار ہے۔ تلاش کرنے والا یہ کہے کہ یہ لو بیس دینار، اگر مل گیا تو اسی قیمت پر اونٹ میرا ہو گا۔ اب اگر وہ پا جائے تو بائع کے تیس دینار گئے اور اگر نہ ملا تو خریدنے والے کے بیس دینار گئے۔ اس میں حرمت کا اصل پہلو یہ ہے کہ یہ شرط باطل ہے کیونکہ اس میں ایک نہ ایک فریق کو ضرر اور غرر لازمی ہے۔ فرض کریں اونٹ مل بھی جاتا ہے تو نہ معلوم کس حالت میں ملتا ہے۔ زخمی ہو چکا ہے یا بیمار ہے۔ آوارہ پھرنے کے دوران اس کو کسی قسم کا بھی ضرر پہنچ سکتا ہے۔ اگر ملتا ہی نہیں تب خریدنے والے کو نقصان لازم ہے۔ پس وہ تمام شکلیں جن میں ایک فریق کے لیے کسی قسم کا خطرہ ہو ناجائز ہیں۔ یہی حال جوئے اور ریس وغیرہ کا ہے۔ جیتنے والے گھوڑے کا مالک سب رقم سمیٹ لیتا اور باقی سب لٹ جاتے ہیں۔ اسی سبب سے جوئے اور ریس کو حرام ٹھہرایا گیا ہے۔

بیع غرر کی دوسری مثال امام مالک نے یہ بیان کی ہے کہ جو بچہ ابھی مادہ کے پیٹ میں ہے اس کی بیع بھی غرر کی ایک قسم ہے۔ معلوم نہیں نر پیدا ہوتا ہے یا مادہ، سالم پیدا ہوتا ہے یا ناقص، کچھ روز زندہ رہتا بھی ہے یا نہیں۔ غرض کچھ بھی متعین طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ میرے نزدیک ایسی صورت میں علی الوصف اگر معاملہ کیا جائے تو درست ہو سکتا ہے۔ سب کچھ تحریر کر لیا جائے کہ اگر مذکورہ صفات کے مطابق بچہ پیدا ہو تو ٹھیک ورنہ بیع فسخ کر دی جائے گی یعنی مشتری کو خیار کا حق رہے گا۔ یہ بات امام مالک کے بیع علی الوصف کے اصول کے مطابق ہے۔

اَلْمُلَامَسَۃُ وَ الْمُنَابَذَۃُ

ہاتھ لگا کر اور چیز پھینک کر سودا کرنا

"ملامسہ" کے معنی ہاتھ لگانے اور منابذہ کے معنی پھینک دینے کے ہیں۔ یہ ناجائز بیع کی قسمیں ہیں۔ ملامسہ بیع میں جس چیز پر آپ ہاتھ رکھ دیں گے وہ ثمن بن جائے گی اور جس چیز کا مطالبہ کریں گے وہ مبیع بن جائے

کی- منابذہ میں ایک شخص دوسرے کی طرف کپڑا پھینک دیتا ہے اور دوسرا شخص اس کی طرف کوئی چیز تو وہ بھی ثمن اور مثمن بن جاتی ہیں- یہ جوے کی ایک شکل ہے، اس لیے ناجائز ہے-

٦ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيَى بْنِ حَبَّانَ وَعَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى عَنِ الْمُلَامَسَةِ وَالْمُنَابَذَةِ-

﴿ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ملامسہ و منابذہ سے منع فرمایا-﴾

وضاحت:

امام مالکؒ نے اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ ملامسہ یہ ہے کہ ایک آدمی کپڑے کو ہاتھ لگائے- اس کو کھولے نہیں یعنی اس کی حقیقت معلوم کیے بغیر اس کو خریدے یا رات کو خریدے جب کہ اس کو معلوم نہ ہو کہ اس میں کیا ہے- منابذہ یہ ہے کہ آدمی اپنی چیز دوسرے شخص کے آگے پھینک دے اور دوسرا اپنی چیز اس کے بدلے میں پھینکے اور دونوں کو ایک دوسرے کی چیز کی اصلیت یا اس کی قیمت کا کچھ اندازہ نہ ہو- یہ دونوں صورتیں صریح جوا ہیں اس لیے نبی ﷺ نے ان سے منع فرمایا ہے-

اس زمانے میں سودے کی ایک اور صورت بھی تھی کہ فہرست کے مطابق مال کی بیع ہوتی- مال کو کھول کر نہیں دیکھا جاتا تھا- بس پیٹیوں میں مال بند ہوتا اور پیٹیاں گن کر پوری کر لی جاتیں- امام مالک کے نزدیک یہ منابذہ میں نہیں آتا- آج کل تجارت کا انداز یہی ہے- اس میں اگر خریدار کو خیار حاصل ہو کہ اگر مال فہرست کے مطابق نہ ہو تو بیع کو رد کر دے تو پھر اس سودے میں کچھ حرج نہیں اور یہ صورت ملامسہ یا منابذہ کے حکم میں نہیں آتی-

بَيْعُ الْمُرَابَحَةِ

منافع پر بیچنا

امام مالکؒ بیع المرابحہ یعنی منافع پر بیچنے کے بارے میں اپنا فتویٰ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں یہ بات متفق علیہ ہے کہ اگر کسی شخص نے ایک شہر میں کپڑا خریدا پھر وہ اس کو لے کر دوسرے شہر میں آیا اور وہ کپڑا نفع پر بیچا ہے تو وہ اس کی قیمت میں دلالوں کی اجرت، کپڑا تہہ کرنے اور لادنے کا خرچ اور ٹھہرنے کی جگہ کا کرایہ وغیرہ شامل نہیں کر سکتا- صرف باربرداری کا خرچہ شامل کر سکتا ہے- میرے خیال میں یہ فتویٰ اس زمانے میں نہیں چل

سکتا- ہر چیز کا خرچہ جو اس سے متعلق ہو گا وہ شمار کرنا پڑے گا- آج کل ٹیلی فون کا خرچہ، دفتر کے اخراجات اور ہوٹل کا کرایہ وغیرہ سب خرچ شامل کرنے کے بعد منافع کا تعین ہو سکے گا- میری رائے میں اس زمانے میں تجارت کے جو اصول ہیں اور جن پر معاملات قائم ہیں وہ بالکل فطری ہیں-

اَلْبَیْعُ عَلَی الْبَرْنَامِجِ

فہرست کے مطابق بیع

فہرست کے مطابق بیع کے باب میں بھی کوئی حدیث یا اثر نہیں- صرف امام مالکؒ کا فتوی ہے- آج کل بین الاقوامی تجارت اسی طریقہ پر ہو رہی ہے- ایجنٹوں کے ذریعے سے مال آتا ہے اور بغیر دیکھے دکھائے صرف اعتماد پر فروخت ہوتا ہے- یہ بیع علی الوصف کے زمرے میں آتی ہے-

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ایک شخص دوسرے شخص سے کہتا ہے کہ وہ کپڑا جو آپ نے فلاں شخص سے خریدا ہے مجھے اس کے متعلق معلوم ہے- اگر میں تمہارے حصہ میں اتنا نفع دے دوں تو کیا تم مجھے شریک بنا لو گے- اگر وہ مان جائے تو یہ شخص بھی اس کا شریک بن جائے گا- اگر بعد میں وہ دیکھے کہ مال تو فہرست کے مطابق نہیں یا گراں ہے تو امام مالکؒ کے نزدیک وہ اس کو لازمی لینا ہو گا اور اس کو خیار نہیں رہے گا- کیونکہ اس نے معلومات ہوتے ہوئے سودا کیا تھا-

بَیْعُ الْخِیَارِ

بیع جس میں مال واپس کرنے کا اختیار ہو

□ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَلْمُتَبَایِعَانِ کُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا بِالْخِیَارِ عَلٰی صَاحِبِهٖ مَالَمْ یَتَفَرَّقَا اِلَّا بَیْعَ الْخِیَارِ-

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خرید و فروخت کا معاملہ کرنے والے اپنی خرید و فروخت کے بارے میں اس وقت تک اختیار رکھتے ہیں جب تک وہ الگ نہیں ہوتے- مگر بیع خیار کا معاملہ اس سے الگ ہے-﴾

وضاحت :

بیع کا عام اور معروف طریقہ یہ ہے کہ آپ دکان پر گئے، کوئی شے خریدی، پیسے دیے اور چلے گئے۔ بائع سے الگ ہونے سے پہلے آپ چیز کی دیکھ بھال اور مول بھاؤ کر لیتے ہیں اور آپ کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ شے خریدیں یا نہ خریدیں۔

بیع خیار میں مشتری خیار کی شرط لگا دیتا ہے تو اس کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کے متعلق فوری فیصلہ ممکن نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک آدمی بکری خریدتا ہے۔ وہ بائع سے کہتا ہے کہ دیکھوں گا کہ کتنا دودھ دیتی ہے۔ اسی وقت فوری فیصلہ اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک آدمی ایک گھوڑا خریدتا ہے، اسے دیکھنا ہے کہ وہ اڑیل ہے یا شائستہ ہے۔ علی ہذا القیاس ریڈیو اور ٹی وی کا معاملہ بھی ایسا ہے کہ مشتری کہہ سکتا ہے کہ چند دن اس کی کارکردگی دیکھ کر فیصلہ کروں گا۔ تو ایسی چیزوں کی بیع کا معاملہ الگ ہے۔ اس میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کتنے دن کا خیار ہوگا۔ یہ عرصہ غیر متعین نہیں ہو سکتا۔ احناف اور شوافع کے نزدیک تین دن تک فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ اس کی کوئی حد معروف مقرر نہیں۔ احناف اور شوافع جو تین دن کی قید لگاتے ہیں تو یہ مدت بہت سی چیزوں کے لیے کافی ہے لیکن سب چیزوں کے لیے کافی نہیں۔ مثلاً آپ نے مکان لینا ہے اور اس کے پڑوس اور اس کے ماحول کو معلوم کرنا ہے تو اس کے لیے تین دن کی مدت قرین انصاف نہیں معلوم ہوتی۔ دوسری طرف مالکیہ کا مسلک بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔ خیار کی مدت کو غیر معین عرصہ کے لیے معلق نہیں رکھا جا سکتا۔ میرے نزدیک چیزوں کے لحاظ سے خیار کی اتنی مدت متعین ہوگی جس پر بائع اور مشتری دونوں رضامند ہو جائیں۔

اس زمانہ میں باہر کے ملکوں سے جو بیع ہوتی ہے وہ سب بیع سلم ہوتی ہے۔ اس میں رقم دے دی جاتی ہے اور ہر نائج (فہرست) کے مطابق مال لیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی خیار ہوتا ہے کہ اگر مال معینہ اوصاف کے مطابق نہ ہو تو آپ بیع فسخ کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک بیع کے اس طریقہ میں کوئی خرابی نہیں۔

بعض ممالک میں خیار کا ایک شریفانہ طریقہ بھی ہے کہ آپ چیز لے جائیں اور اسے استعمال کریں۔ استعمال کے بعد اگر دیکھیں کہ ناقص ہے یا آپ کو پسند نہیں تو واپس کر دیں۔ بائع بڑی شرافت سے واپس لے لیتا ہے۔ اس بیع میں نہ مالم یتفرقا کی بحث ہے نہ خیار کی مدت کی۔ کاروبار کی ترقی کے لیے یہ حربہ اختیار کیا جاتا ہے۔

حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ كَانَ يُحَدِّثُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَيُّمَا بَيِّعَيْنِ تَبَايَعَا فَالْقَوْلُ مَا قَالَ الْبَائِعُ اَوْ يَتَرَادَّانِ۔

﴿عبداللہ بن مسعود بیان کرتے تھے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ دو فریق جب کوئی معاملہ کر چکیں تو اختلاف کی صورت میں بائع کا قول معتبر ہوگا یا پھر وہ دونوں بیع منسوخ کر دیں﴾

وضاحت :

یہ روایت بہت مبہم ہے۔ اس میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیع ہو چکنے کے بعد اختلاف کی صورت میں خالی بائع کا قول کیوں معتبر ہوگا، مشتری کا موقف بھی تو درست ہو سکتا ہے۔ آگے امام مالک نے اپنا ایک فتویٰ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس روایت کے مضمون سے مطمئن نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر بیع کے بعد بائع اور مشتری میں جھگڑا پیدا ہو جائے تو بائع سے کہا جائے گا کہ وہ قسم کھائے یا مشتری کی بات مان لے۔ اگر وہ قسم کھا جائے تو مشتری سے کہا جائے گا کہ وہ یا تو بائع کا قول تسلیم کرلے یا اپنے قول پر قسم کھائے۔ اس طرح امام صاحب بائع اور مشتری دونوں کو موقع دیتے ہیں۔ احناف اس بارے میں یہ کہتے ہیں کہ اگر مال تلف ہو گیا ہو تب صرف مشتری کے قول کا لحاظ ہوگا۔

مَاجَاءَ فِي الرِّبَا فِي الدَّيْنِ

قرضے میں ربا کے بارے میں

حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنْ بُسْرِ بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ عُبَيْدٍ اَبِي صَالِحٍ مَوْلَى السَّفَّاحِ اَنَّهُ قَالَ بِعْتُ بَزًّا لِي مِنْ اَهْلِ دَارِ نَخْلَةَ اِلَى اَجَلٍ ثُمَّ اَرَدْتُ الْخُرُوْجَ اِلَى الْكُوْفَةِ فَعَرَضُوْا عَلَيَّ اَنْ اَضَعَ عَنْهُمْ بَعْضَ الثَّمَنِ وَ يَنْقُدُوْنِي فَسَاَلْتُ عَنْ ذٰلِكَ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ فَقَالَ لَا آمُرُكَ اَنْ تَاْكُلَ هٰذَا وَلَا تُوْكِلَهُ۔

﴿سفاح کے آزاد کردہ غلام عبید ابی صالح بیان کرتے ہیں کہ میں نے دار نخلہ والوں کے پاس ادھار پر کپڑے بیچے۔ پھر میرا ارادہ ہوا کہ کوفہ چلا جاؤں تو ان لوگوں نے یہ پیشکش کی کہ میں قیمت کم کر دوں

اور نقد وصول کر لوں- میں نے زید بن ثابتؓ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نہ تو تمہیں اس کے کھانے کی اجازت دیتا ہوں نہ کھلانے کی-﴾

۶ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ حَفْصِ بْنِ خَلْدَةَ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الرَّجُلِ يَكُونُ لَهُ الدَّيْنُ عَلَى الرَّجُلِ اِلٰى اَجَلٍ فَيَضَعُ عَنْهُ صَاحِبُ الْحَقِّ وَيُعَجِّلُهُ الْآخَرُ فَكَرِهَ ذٰلِكَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ وَنَهٰى عَنْهُ-

﴿سالم بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی کا دوسرے پر ایک مدت مقررہ تک کے لیے قرض ہے- رقم میں حق والا کچھ کمی کر دیتا ہے اور دوسرا مدت سے پہلے واپس کر دیتا ہے تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کو مکروہ جانا اور اس سے منع فرمایا-﴾

وضاحت :

یہ دونوں روایتیں ضع و تعجل کے اصول سے متعلق ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ قرض کی فوراً ادائیگی کے بدلے قرض کی رقم میں کمی کر دی جائے- یہ اصول جاہلیت میں عام تھا- قرض کی مدت جب ختم ہو جاتی تو قرض خواہ کہتا کہ ادا کرو گے یا سود دو گے- اگر وہ رقم دے دیتا تو فبہا، ورنہ وہ قرض کی رقم میں اضافہ کر دیتا اور مدت بڑھا دیتا- قریش تاجر قوم تھی- یہ لوگ یہودی مہاجنوں سے بڑی بڑی رقمیں سود پر ادھار لیتے تھے- جب مدت پوری ہو جاتی تو یہود کہتے کہ ادا کرو ورنہ رقم اور مدت میں اضافہ کر دیا جائے گا- اس زمانہ کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ سودی شکل جاہلیت کے زمانے میں تھی اب بالکل بدل گئی ہے اور اس کے حق میں بڑی دلپذیر تقریر کرتے ہیں- لیکن جب تجزیہ کیا جائے تو کوئی خاص فرق نہیں ہوتا- صرف شکل ذرا بدلی ہوئی ہوتی ہے-

کلیہ یہ ہے کہ تاجر اور سود خور کے منافع میں اصولی فرق ہے- تاجر جو منافع لیتا ہے اس کے لیے اس کا سرمایہ بازی کھیلتا ہے، بازار کے اتار چڑھاؤ کا مقابلہ کرتا ہے، معاشرے کی خدمت کرتا ہے، تب جا کر منافع حاصل کرتا ہے- بخلاف اس کے سود خور کا سرمایہ ایک ایسا سانڈ ہے جو دوسرے کی چراگاہ میں چر کر موٹا ہوتا ہے اور خطرہ مول نہیں لینا چاہتا- "ضع و تعجل" کا اصول اسلام کے تحت نہیں آتا- اس لیے زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمرؓ نے اس کو مکروہ جانا-

نبی ﷺ نے جب بنو نضیر کو جلاوطن کیا تو انہوں نے کہا کہ ہمارے قرضے لوگوں کے ذمے ہیں اور ان کی مدت ابھی پوری نہیں ہوئی۔ تو آپ نے فرمایا "ضع و تعجل" مطلب یہ کہ رقم کم کرو اور فوراً وصول کر لو۔ اس واقعہ کی روشنی میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے لیے اس طرح کرنا جائز تھا تو اب یہ ناجائز کیوں ہو گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بنو نضیر کی جلاوطنی کا معاملہ حرمت ربوا سے پہلے کا ہے کیونکہ حرمت ربوا کا حکم حجۃ الوداع کے موقع پر آیا جس کے بعد آپ نے فرمایا ربوا الجاھلیہ موضوع تحت قدمی ھاتین (جاہلیت کے زمانے کا سود میرے ان دو قدموں کے نیچے ہے)

بنو نضیر کے معاملے کی ایک دوسری توجیہ بھی ہو سکتی ہے کہ آنحضرتؐ نے اس کو ایک سیاسی مسئلے کے طور پر حل فرمایا۔ اور اس میں کوئی خلاف شرع بات معلوم نہیں ہوتی۔ ایک قوم کو جلاوطن کیا جا رہا ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ ان کی رقم ہڑپ نہ کی جائے تو اس معاملے کا بہترین حل یہی تھا کہ وہ رقم کم لے لیں اور نقد معاملہ طے ہو جائے۔ اس صورت حال میں اور نسیئہ پر تفاضل میں بنیادی فرق ہے۔ بنو نضیر کا معاملہ ایک سیاسی مسئلے کے طور پر حل کیا گیا۔ جب کہ نسیئہ کاربا اخلاقی بنیاد پر حرام ہے۔

جَامِعُ الدَّيْنِ وَ الْحِوَلِ

قرض اور حوالہ کے بارے میں جامع باب

□ حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ وَ اِذَا اُتْبِعَ اَحَدُكُمْ عَلٰى مَلِيٍّ فَلْيَتْبَعْ۔

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صاحب مال کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے اور اگر تم میں سے کوئی کچھ مدت کے لیے ٹالا جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ قبول کرے۔﴾

وضاحت:

اس روایت میں پہلا جملہ "مطل الغنی ظلم" (مالدار کا قرض ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے) تو بالکل صاف ہے۔ لیکن روایت کا دوسرا حصہ ہو از اعی ہے۔ اکثر شارحین نے "ملی" کو غنی کے معنی میں لیا ہے۔ یہ لفظ اس معنی میں بھی آتا ہے لیکن اہل لغت میں اس کے معروف معنی ملیا کے ہیں جس معنی میں وہ قرآن مجید میں ہے کہ

آزر نے حضرت ابراہیم سے کہا تھا واهجرنی ملیا۔ یہاں ملیا کا لفظ ساعت، مدت، وقت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ واهجرنی ملیا کے معنی 'یہاں سے دور ہو جاؤ اور میرے پاس کبھی نہ آئیو' کے بھی ہو سکتے ہیں اور 'یہاں سے کچھ مدت کے لیے چلے جاؤ' کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اتبع کے معنی کسی کو کسی رخ پر ٹالنے کے آتے ہیں۔ اس طرح قرآن مجید کے مطابق معنی لینے سے حدیث کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ اگر کسی کو کچھ مدت کے لیے ٹالا جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ قبول کرے۔ اس طرح دونوں فقرے بہت پر حکمت معلوم ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کسی غنی کا مال رکھتے ہوئے ٹال مٹول کرنا خبیثانہ حرکت ہے۔ ایسا کرنے والا لئیم آدمی ہے۔ لیکن تم بھی ذرا آدمی ہو۔ اگر تم کو کچھ وقت کے لیے ٹالا جاتا ہے تو ٹل بھی جاؤ۔ اگر ملی کو غنی کے معنی میں لیا جائے، جیسا کہ اکثر شارحین نے لیا ہے، تو مطلب یہ ہو گا کہ جب تم میں سے کسی کو مالدار شخص کے حوالے کیا جائے تو چاہیے کہ وہ قبول کرے۔ غور کیجئے کیا یہ ایک معقول بات ہے۔ آخر اپنی بلا دوسرے کے سر کیوں ڈالی جائے اور قرض خواہ کو اس تجویز کو ماننے پر کیوں مجبور کیا جائے۔ شارحین اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ واجب نہیں، محض ایک مشورہ ہے۔ تو اس مشورے کی ضرورت قرضے کی ادائیگی میں کیسی! یہ بالکل مہمل بات معلوم ہوتی ہے۔ اتنے عظیم فقرہ "مطل الغنی ظلم" کے بعد کوئی اچھی بات ہونی چاہیے۔ میرے خیال میں ملی کے معنی غنی لینے کے بجائے اگر مدت لیا جائے تو بات نہایت پر حکمت بن جاتی ہے۔ والعلم عند اللہ۔

مَاجَاءَ فِی اِفْلَاسِ الْغَرِیْمِ

خریدار کے دیوالیہ ہو جانے کے بارے میں

٦ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَبِی بَكْرِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ الْحَارِثِ بْنِ هِشَامٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَیُّمَا رَجُلٍ بَاعَ مَتَاعًا فَاَفْلَسَ الَّذِی ابْتَاعَهُ مِنْهُ وَلَمْ یَقْبِضِ الَّذِی بَاعَهُ مِنْ ثَمَنِهٖ شَیْئًا فَوَجَدَهُ بِعَیْنِهٖ فَهُوَ اَحَقُّ بِهٖ وَ اِنْ مَاتَ الَّذِی ابْتَاعَهُ فَصَاحِبُ الْمَتَاعِ فِیْهِ اُسْوَةُ الْغُرَمَاءِ۔

ابوبکر بن عبدالرحمن سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص کوئی چیز بیچے اور

خریدنے والا دیوالیہ ہو جائے لیکن بائع نے ابھی قیمت میں سے کچھ نہ لیا ہو اور اس کا مال بعینہ خریدار کے پاس مل جائے تو وہ بیچنے والا اس مال کا سب سے زیادہ حق دار ہو گا۔ اور اگر خریدار مر گیا ہو تو بیچنے والا بھی دوسرے دعویداروں کے ساتھ برابر کا شریک ہو گا۔﴾

□ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ اَبِي بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ عَنْ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ عَنْ اَبِي بَكْرِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ هِشَامٍ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَيُّمَا رَجُلٍ اَفْلَسَ فَاَدْرَكَ الرَّجُلُ مَالَهُ بِعَيْنِهِ فَهُوَ اَحَقُّ بِهِ مِنْ غَيْرِهِ۔

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دیوالیہ ہو جائے اور اس کے پاس مال بیچنے والا اپنا مال پا جائے تو وہ دوسروں کے مقابلے میں اپنے مال کا زیادہ حق دار ہو گا۔﴾

وضاحت :

ان دونوں روایات کا مفہوم ایک ہی ہے۔ پہلی روایت کے مطابق دیوالیہ شخص کی موت کی صورت میں بائع کا حق دوسرے دعویداروں کے ساتھ ہی ہو گا۔ اس کو اپنا مال واپس لینے کا حق نہیں ہو گا اگرچہ وہ مال بعینہ دیوالیہ شخص کے اموال میں موجود ہو۔ احناف کے نزدیک دونوں صورتوں یعنی دیوالیہ ہونے کی صورت میں بھی اور موت کی صورت میں بھی بائع دوسرے دعویداروں میں شریک ہو گا۔ وہ بائع کا حق دوسروں سے فائق نہیں مانتے لیکن مالکیہ دوسری روایت کی بناء پر بائع کا حق دوسرے دعویداروں کے مقابل میں اولیٰ مانتے ہیں۔ میرے نزدیک احناف کا مسلک زیادہ معقول ہے۔

مَا يَجُوزُ مِنَ السَّلَفِ
پیشگی دینے کی جائز شکلیں

□ حَدَّثَنِی يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ اَبِي رَافِعٍ مَوْلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهُ قَالَ اسْتَسْلَفَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بَكْرًا فَجَاءَتْهُ اِبِلٌ مِنَ الصَّدَقَةِ قَالَ اَبُو

رافع فامرني رسول الله ﷺ ان اقضي الرجل بكره فقلت لم اجد في الابل الا جملا خيارا رباعيا فقال رسول الله ﷺ اعطه اياه فان خيار الناس احسنهم قضاء۔

﴿رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام ابو رافع بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جوان اونٹ قرض لیا۔ پھر آپ کے پاس صدقے کے اونٹ آگئے۔ ابو رافع کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں اس شخص (قرض خواہ) کو ایک جوان اونٹ دے دوں۔ میں نے عرض کیا کہ اونٹوں میں کوئی جوان اونٹ نہیں، سب چھ سات سالہ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہی دے دو کیونکہ بہترین آدمی وہ ہوتے ہیں جو قرض کو بہترین طریقے سے ادا کریں۔﴾

وضاحت:

اس روایت میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے لیکن بعض لوگوں نے اس پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ آنحضرتؐ صدقے کے مال کے متولی تھے، تو کیا متولی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ چھ اونٹ کے بدلے میں کسی قرض خواہ کو جوان اونٹ دے دے۔ میرے نزدیک یہ سوال اس لیے نہیں پیدا ہوتا کہ خیر، عدل اور نیکی کے اصولوں کا لحاظ رکھنا بھی بیت المال کے متولی کا فرض ہے۔ بیت المال کا متولی کوئی منشی یا کلرک نہیں ہوتا بلکہ ایک صاحب اختیار شخص ہوتا ہے۔ میرے خیال میں متولی کو یہ حق حاصل ہے کہ جو بات حق کے اعلیٰ معیار کے مطابق ہے وہ کرے۔ یہ کام یتیم کا متولی بھی کر سکتا ہے اور یہ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ قرآن مجید معاملات میں احسن طریقہ اختیار کرنے کا جو حکم دیتا ہے یہ بات اس میں داخل ہے۔

نبی ﷺ تو فضائل اعمال سکھانے پر مامور تھے۔ اس خیر کی تعلیم دینے میں آپ کیوں کمزوری دکھاتے جب کہ اتفاق سے اس تعلیم کا ایک مناسب موقع سامنے آگیا تھا۔

□ حدثني مالك عن حميد بن قيس المكي عن مجاهد انه قال استسلف عبدالله بن عمر من رجل دراهم ثم قضاه دراهم خيرا منها فقال الرجل يا ابا عبد الرحمن هذه خير من دراهمي التي اسلفتك فقال عبد الله بن عمر قد علمت ولكن نفسي بذلك

طَيِّبَةً-

﴿مجاہد سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے ایک شخص سے کچھ درہم قرض لیے پھر اس کو ان سے اچھے درہم واپس کیے- اس شخص نے کہا کہ اے ابو عبدالرحمن! یہ ان درہموں سے جو میں نے آپ کو دیئے تھے بہتر ہیں- تو عبداللہ بن عمرؓ نے کہا مجھے معلوم ہے لیکن میرا دل اس پر راضی ہے-﴾

وضاحت :

اس زمانے میں درہم و دینار مسکوک بھی ہوتے تھے اور غیر مسکوک بھی- بعض میں اچھی چاندی یا سونا ہوتا تھا اور دوسروں میں کچھ کم ہوتا تھا- اس طرح درہم کی حقیقی مالیت کم و بیش ہو جاتی تھی- حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جب بہتر مالیت کے درہم واپس کیے تو لینے والے نے درہموں کا فرق محسوس کیا اور حضرت عبداللہ کے سامنے اس کا اظہار کیا- انھوں نے وضاحت کی کہ میں جانتے ہوئے یہ دے رہا ہوں- اگر قرض واپس کرنے والا اصل سے بہتر چیز اپنی رضا سے دے اور وہ کسی شرط یا وعدے اور رواج پر مبنی نہ ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں- اس میں ربا کا شائبہ پیدا نہیں ہوتا-

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے نزدیک قرض کی واپسی کا یہ معاملہ اس روایت کے تحت نہیں آتا جس میں حضور ﷺ نے فرمایا الورق بالورق والذھب بالذھب ربا الا مثلا بمثل یدا بید -یعنی یہ کہ سونا یا چاندی کے تبادلے میں اگر ادھار اور تفاضل ہو تو سود کا شائبہ پیدا ہو جاتا ہے- ایک بات ضرور ہے کہ کوئی شخص اسی سے حیلہ شرعی کا راستہ کھول سکتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان راستوں کو بند کرنا ممکن نہیں-

مَالَا يَجُوزُ مِنَ السَّلَفِ

پیشگی دینے کی ناجائز شکلیں

☐ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِ قَالَ فِي رَجُلٍ اَسْلَفَ رَجُلًا طَعَامًا عَلٰى اَنْ يُعْطِيَهُ اِيَّاهُ فِي بَلَدٍ آخَرَ فَكَرِهَ ذٰلِكَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَ قَالَ فَاَيْنَ الْحَمْلُ يَعْنِي حُمْلَانَهُ-

﴾امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک ایسے شخص کے معاملے کو، جس نے دوسروں کو پیشگی گندم اس شرط پر دی تھی کہ وہ اس کو کسی دوسرے شہر میں ادا کرے گا، ناپسند فرمایا اور کہا کہ اس کی باربرداری کا کیا ہو گا-﴿

وضاحت :

حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا بالکل ٹھیک تھا- اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ ادا کرنے والے کا رقبہ اس شہر میں رہا ہو جہاں گندم واپس کی جاتی تھی اور اس کو باربرداری کا خرچ نہ اٹھانا پڑتا ہو لیکن یہ شکل ہمیشہ تو نہیں ہو سکتی- جس شخص کی وہاں قریب زمین وغیرہ نہ ہو تو اس کو لازماً باربرداری کا خرچ اٹھانا پڑے گا- اس وجہ سے اس معاملے میں سود داخل ہو جائے گا-

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَجُلًا أَتَى عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ فَقَالَ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ إِنِّي أَسْلَفْتُ رَجُلًا سَلَفًا وَ اشْتَرَطْتُ عَلَيْهِ أَفْضَلَ مِمَّا أَسْلَفْتُهُ فَقَالَ عَبْدُاللَّهِ بْنُ عُمَرَ فَذٰلِكَ الرِّبَا قَالَ فَكَيْفَ تَأْمُرُنِي يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ عَبْدُاللَّهِ السَّلَفُ عَلَى ثَلَاثَةِ وُجُوهٍ سَلَفٌ تُسْلِفُهُ تُرِيدُ بِهِ وَجْهَ اللَّهِ فَلَكَ وَجْهُ اللَّهِ وَسَلَفٌ تُسْلِفُهُ تُرِيدُ بِهِ وَجْهَ صَاحِبِكَ فَلَكَ وَجْهُ صَاحِبِكَ وَسَلَفٌ تُسْلِفُهُ لِتَأْخُذَ خَبِيثًا بِطَيِّبٍ فَذٰلِكَ الرِّبَا قَالَ فَكَيْفَ تَأْمُرُنِي يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ أَرَى أَنْ تَشُقَّ الصَّحِيفَةَ فَإِنْ أَعْطَاكَ مِثْلَ الَّذِي أَسْلَفْتَهُ قَبِلْتَهُ وَ إِنْ أَعْطَاكَ دُونَ الَّذِي أَسْلَفْتَهُ فَأَخَذْتَهُ أُجِرْتَ وَ إِنْ أَعْطَاكَ أَفْضَلَ مِمَّا أَسْلَفْتَهُ طَيِّبَةً بِهِ نَفْسُهُ فَذٰلِكَ شُكْرٌ شَكَرَهُ لَكَ وَ لَكَ أَجْرُ مَا أَنْظَرْتَهُ-

﴾امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اے ابو عبدالرحمٰن! (یہ عبداللہ بن عمر کی کنیت ہے) میں نے ایک شخص کو قرض دیا ہے اور یہ شرط ٹھہرائی ہے کہ تم مجھ کو اس سے افضل واپس کرو گے- اس پر عبداللہ بن عمرؓ نے کہا یہ تو ربا ہوتا ہے- اس نے کہا پھر آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں- عبداللہ بن عمرؓ نے کہا پیشگی دینے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں- ایک

یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دیں تو آپ کو اللہ کی رضا مل جائے گی۔ دوسری یہ کہ آپ اپنے ساتھی کی خوشنودی چاہتے ہیں تو وہ آپ کو حاصل ہو جائے گی۔ تیسری یہ کہ آپ طیب مال کے بدلے خبیث مال حاصل کریں تو یہ ربا کی شکل ہے۔ اس شخص نے کہا کہ آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا میرا مشورہ یہ ہے کہ کاغذ جو لکھا گیا ہے اس کو پھاڑ دو۔ اگر وہ شخص ویسا ہی مال واپس دے جیسا آپ نے دیا تھا تو قبول کر لیجئے اور اگر اس مال سے کمتر دے اور آپ قبول کر لیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ اور اگر اس نے اپنی خوشی سے بہتر مال دیا تو یہ اس کی طرف سے آپ کے لیے شکریہ کا اظہار ہو گا۔ اور آپ کو اس مہلت کا اجر ملے گا جو آپ نے اس کو دی۔﴾

☐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ اَنَّهُ سَمِعَ عَبْدَ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ يَقُوْلُ مَنْ اَسْلَفَ سَلَفًا فَلَا يَشْتَرِطُ اِلَّا قَضَاءَهُ۔

﴿نافعؒ نے عبداللہ بن عمرؓ کو فرماتے سنا کہ جو کوئی کسی کو پیشگی دے تو ادائیگی کی شرط کے سوا اور کوئی شرط نہ لگائے۔﴾

☐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ كَانَ يَقُوْلُ مَنْ اَسْلَفَ سَلَفًا فَلَا يَشْتَرِطُ اَفْضَلَ مِنْهُ وَ اِنْ كَانَتْ قَبْضَةً مِنْ عَلَفٍ فَهُوَ رِبًا۔

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے تھے کہ جس کسی نے کچھ پیشگی دیا تو وہ اس سے افضل کی واپسی کی شرط نہ لگائے، اگرچہ ایک مٹھی چارے کی ہو، کیونکہ وہ سود ہو جائے گا۔﴾

وضاحت:

یہ تینوں روایتیں اس بارے میں ہیں کہ اگر کسی کو آپ کوئی چیز کچھ مدت کے لیے ادھار دیں تو سوائے اس کی بروقت ادائیگی کے اس پر اور کوئی ایسی شرط عائد نہ کریں جس سے ربا یا ربا کا شائبہ بھی پیدا ہوتا ہو۔ پہلی دونوں روایتوں میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اور تیسری روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے جو فقہ حنفی کے ستون اعظم ہیں۔ ان روایات سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ قرض لینے کی صورت میں خواہ تفاضل ہو (یعنی

دیے گئے اور واپس لیے گئے مال کی مقدار میں فرق ہو) یا جو مال دیا گیا اس سے بہتر کا مطالبہ ہو یا کوئی اور طرح کا فائدہ مقدر یا مشروط ہو تو وہ ربا ہو جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی رائے میں کسی کو کچھ دینے میں ایثار کا جذبہ کار فرما ہونا چاہیے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی مطلوب ہو یا کم از کم اپنے مسلمان بھائی کی مدد مقصود ہو۔ لیکن اگر اس کام کے پیچھے کوئی اور دنیوی غرض یا مقصد کار فرما ہو تو، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا، اس صورت میں طیب مال کے بدلے خبیث مال (یعنی سود) حاصل ہو گا اور اللہ کے ہاں اجر کے بدلے میں عذاب ملے گا۔

مَا يُنْهَى عَنْهُ مِنَ الْمُسَاوَمَةِ وَالْمُبَايَعَةِ

مول بھاؤ کرنے کے معاملے میں جن چیزوں سے روکا گیا ہے

حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضٍ۔

«حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کی بیع کے اوپر بیع نہ کرے۔»

وضاحت:

مطلب یہ ہے کہ اگر ایک سودا ہو گیا ہے تو آپ یہ نہیں کر سکتے کہ اس بیع کو ختم کرنے کے لیے خریدار سے یہ کہیں کہ میں سستا دیتا ہوں یا فروخت کنندہ سے کہیں کہ اس بیع کو ختم کرو، میں تم کو زیادہ دام دیتا ہوں۔ بازار میں جو مقابلہ ہوتا ہے وہ اس کے تحت نہیں آتا۔ مقابلہ آپ کر سکتے ہیں۔ لیکن بیع مکمل ہونے کے بعد بیع کی اجازت نہیں یعنی یہ کہ معاملہ طے ہو چکا تب آپ آگئے اور اس بیع کو خراب کرنے کی کوشش کی۔

حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا تَلَقَّوُا الرُّكْبَانَ لِلْبَيْعِ وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضٍ وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا يَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ وَلَا تُصَرُّوا الْاِبِلَ وَالْغَنَمَ فَمَنِ ابْتَاعَهَا بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ بَعْدَ اَنْ يَحْلُبَهَا اِنْ رَضِيَهَا اَمْسَكَهَا وَاِنْ سَخِطَهَا رَدَّهَا وَصَاعًا مِنْ تَمْرٍ۔

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ باہر سے مال لانے والوں کا مال خریدنے کے لیے آگے بڑھ کر استقبال کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اور ایک دوسرے کی بیع پر بیع نہ کرو۔ اور قیمت بڑھانے کے لیے مصنوعی بیع نہ کرو۔ اور شہر کا مقیم دیہاتی کا تاجر نہ بنے۔ اور اونٹ یا بکری کے تھن میں دودھ جمع نہ کرو اور جس کسی نے ایسی شکل میں جانور خریدا تو دودھ دوہنے کے بعد اس کو اختیار ہے کہ اگر راضی ہو تو ٹھیک ورنہ بیع کو رد کر دے اور ایک صاع کھجور ادا کرے۔﴾

وضاحت:

تلقی الرکبان کا مطلب یہ ہے کہ جس راستے سے منڈی میں مال آتا ہے آپ اس راستے پر شہر سے باہر نکل کر بیٹھ جاتے ہیں اور مال لے کر آنے والے قافلوں کو چائے سگریٹ پلا کر اس سے مول بھاؤ کر لیتے ہیں۔ آپ ان کو یہ موقع نہیں دیتے کہ وہ مارکیٹ میں پہنچ کر اپنے مال کی قیمت کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ ایسا کرنا پبلک کے مفاد کے ساتھ خیانت ہے۔ اس میں منڈی میں کاروبار کرنے والوں کا بھی نقصان ہے اور دیہات سے مال لانے والوں کو مال کا صحیح معاوضہ نہ ملنے کا اندیشہ ہے۔

ایک بیع کے اوپر دوسری بیع کرنے کی صورت پچھلی روایت میں زیر بحث آچکی ہے۔

قیمت بڑھانے کے لیے مصنوعی بیع کو نجش کہتے ہیں۔ مثال اس کی یہ ہے کہ ایک مال پانچ روپے کا ہے۔ آپ اس کو سات روپے میں خریدنے کا معاملہ کر لیتے ہیں حالانکہ آپ کی نیت خریدنے کی نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ قیمت بڑھا دیں اور آپ کی زیادہ بولی دیکھ کر حقیقی خریدار زیادہ قیمت پر معاملہ کرے۔ یہ معاملہ نجش کہلاتا ہے اور اگر اس کو پیشہ بنا لیا جائے، کچھ لوگ یہی کام شروع کر دیں تو یہ ناجش ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا کیونکہ یہ مصنوعی طور پر منڈی کی قیمتیں بڑھانے کی ایک کوشش اور پبلک کے لیے ضرر کا باعث ہے۔

شہر کے مقامی آدمی کو دیہاتی کا دلال بننے سے حضورؐ نے روکا اور فرمایا کہ دیہاتی کو مال بازار میں لانے دیں۔ کھلے بازار میں جو بھاؤ چل رہا ہے اس پر وہ مال فروخت کرے۔ اس ہدایت کی وجہ یہ ہے کہ مقیم شہری دیہاتیوں کو بے وقوف بنا کر ان کو نقصان پہنچاتے اور مارکیٹ کے بھاؤ کو خراب کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں آڑھتی یہی کام کرتے ہیں اور

فریب کسانوں کو نقصان بھی پہنچاتے ہیں- اس لیے اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے-

جانوروں کی بیع میں فریب دہی کی ایک شکل یہ ہے کہ ایک یا دو دن دودھ نہیں نکالتے تو جانور کے تھن موٹے ہو جاتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ گائے یا بکری بہت دودھ دینے والی ہے- یہ مصنوعی طور پر دودھ زیادہ دکھانا ہوتا ہے- ایسی بیع میں مشتری کو اختیار ہوگا کہ دو تین دن دودھ دوہنے کے بعد فیصلہ کرے کہ آیا وہ بیع کو قائم رکھتا ہے یا رد کرتا ہے- عام قسم کی بیع میں خیار نہیں ہوتا- آپ نے اپنی پسند سے دوکان سے ایک چیز خریدی اور گھر چلے گئے- اب اگر ناقص ہے تو دکاندار کی صوابدید پر ہے، چاہے تو واپس کرلے، چاہے انکار کرے- لیکن دودھ دینے والے یا دوسرے جانوروں کے معاملے میں مشتری کو خیار کا حق حاصل ہوتا ہے- اس کو بیع کے وقت یہ ظاہر کر دینا چاہیے کہ وہ جانور کی عادات دیکھ کر یا اس کا دودھ نکال کر دو یا تین دن میں بیع کا فیصلہ کرے گا- احناف کے ہاں خیار کی مدت تین دن ہے جبکہ مالکیہ کے ہاں ہر چیز کی الگ الگ مدت ہے- میرے نزدیک مالکیہ کی بات زیادہ قوی ہے- ہر چیز کی نوعیت کے لحاظ سے یہ مدت مقرر کی جاسکتی ہے-

٦ قَالَ مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنِ النَّجْشِ قَالَ مَالِكٌ وَالنَّجْشُ اَنْ تُعْطِيَهُ بِسِلْعَتِهِ اَكْثَرَ مِنْ ثَمَنِهَا وَ لَيْسَ فِيْ نَفْسِكَ اشْتِرَاؤُهَا فَيَقْتَدِيْ بِكَ غَيْرُكَ-

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نجش سے منع فرمایا- امام مالکؒ کہتے ہیں کہ نجش یہ ہے کہ تم سامان کی اصل قیمت سے زیادہ قیمت لگاؤ جبکہ تمہارا ارادہ مال خریدنے کا نہیں، تم صرف یہ چاہتے ہو کہ دوسرا آدمی آپ کے پیچھے لگ کر قیمت زیادہ لگائے-﴾

یہ وہی نجش ہے جس کی وضاحت پچھلی روایت میں ہو چکی ہے-

جَامِعُ الْبُيُوْعِ

معاملات پر جامع باب

٦ حَدَّثَنِيْ يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلًا ذَكَرَ

لِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ انّهٗ یُخدَعُ فِی البُیُوعِ فقالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا بَایَعتَ فقُل لَا خِلَابَةَ قالَ فکانَ الرَّجُلُ اِذَا بَایَعَ یقُولُ لَا خِلَابَةَ۔

﴿عبداللہ بن دینار سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا کہ میں سودے میں دھوکا کھاجاتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ جب خریدو تو "لاخلابہ" کہہ دیا کرو۔ چنانچہ وہ شخص جب خریدتا تو "لاخلابہ" کہہ دیتا۔﴾

وضاحت:

"لاخلابہ" کے معنی ہیں کہ دھوکا نہیں ہوگا۔ یہ کہنے سے یہ شرط عاید کرنا مقصود ہے کہ اگر دھوکا ہوا تو میں اس سودے سے بری ہوں۔ یہ بھی خیار ہی کی ایک شکل ہے۔ لاخلابہ کے ساتھ مدت کی شرط بھی لگا سکتے ہیں۔ احناف کے ہاں تین دن کی مدت کی شرط لگائی جاسکتی ہے لیکن یہ مدت کسی نص پر مبنی نہیں۔ آپ اس سے زیادہ مدت کی شرط بھی لگا سکتے ہیں۔

كتاب القراض

كتاب المساقاة

كتاب كراء الارض

كتاب الشفعه

کتاب القراض

"قراض" ایک اصطلاح ہے۔ اہل کوفہ اسی کو مضاربت کہتے ہیں۔ تجارت کے لیے کچھ رقم دوسرے کو دے کر منافع میں شریک ہونا قراض یا مضاربت کہلاتا ہے۔ یہ وہی کام ہے جو نبی ﷺ نے بعثت سے پہلے کیا۔ آپ حضرت خدیجہؓ کے مال سے جو تجارت کرتے تھے وہ قراض ہی کا معاملہ ہوتا تھا۔ قراض کی اصطلاح جاہلیت کے زمانے سے رائج ہے اور اسلام نے اس کو قائم رکھا۔

مَاجَاءَ فِی الْقِرَاضِ

قراض کے بارے میں روایات

۱ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ زَیْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّهُ قَالَ خَرَجَ عَبْدُاللّٰهِ وَ عُبَیْدُ اللّٰهِ ابْنَا عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فِی جَیْشٍ اِلَی الْعِرَاقِ فَلَمَّا قَفَلَا مَرَّا عَلٰی اَبِی مُوسَی الْاَشْعَرِیِّ وَهُوَ اَمِیْرُ الْبَصْرَةِ فَرَحَّبَ بِهِمَا وَسَهَّلَ ثُمَّ قَالَ لَوْ اَقْدِرُ لَكُمَا عَلٰی اَمْرٍ اَنْفَعُكُمَا بِهِ لَفَعَلْتُ ثُمَّ قَالَ بَلٰی هٰهُنَا مَالٌ مِنْ مَالِ اللّٰهِ اُرِیْدُ اَنْ اَبْعَثَ بِهِ اِلٰی اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ فَاُسْلِفُكُمَاهُ فَتَبْتَاعَانِ بِهِ مَتَاعًا مِنْ مَتَاعِ الْعِرَاقِ ثُمَّ تَبِیْعَانِهِ بِالْمَدِیْنَةِ فَتُؤَدِّیَانِ رَاْسَ الْمَالِ اِلٰی اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَیَكُوْنُ الرِّبْحُ لَكُمَا فَقَالَا وَدِدْنَا ذٰلِكَ فَفَعَلَ وَ كَتَبَ اِلٰی عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنْ یَاْخُذَ مِنْهُمَا الْمَالَ فَلَمَّا قَدِمَا بَاعَا فَاُرْبِحَا فَلَمَّا دَفَعَا ذٰلِكَ اِلٰی عُمَرَ قَالَ اَكُلُّ الْجَیْشِ اَسْلَفَهُ مِثْلَ مَا اَسْلَفَكُمَا قَالَا لَا فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ ابْنَا اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ فَاَسْلَفَكُمَا اَدِّیَا الْمَالَ وَرِبْحَهُ فَاَمَّا عَبْدُاللّٰهِ فَسَكَتَ وَاَمَّا عُبَیْدُ اللّٰهِ فَقَالَ مَا یَنْبَغِی لَكَ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ هٰذَا لَوْ نَقَصَ هٰذَا الْمَالُ اَوْ هَلَكَ لَضَمِنَّاهُ فَقَالَ عُمَرُ اَدِّیَاهُ فَسَكَتَ عَبْدُ اللّٰهِ وَ رَاجَعَهُ عُبَیْدُ اللّٰهِ فَقَالَ رَجُلٌ مِنْ جُلَسَاءِ عُمَرَ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَوْ جَعَلْتَهُ قِرَاضًا فَقَالَ عُمَرُ جَعَلْتُهُ قِرَاضًا فَاَخَذَ عُمَرُ رَاْسَ الْمَالِ وَ نِصْفَ رِبْحِهِ وَ اَخَذَ عَبْدُ اللّٰهِ وَعُبَیْدُ اللّٰهِ ابْنَا عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ نِصْفَ رِبْحِ الْمَالِ۔

زید بن اسلم روایت کرتے ہیں کہ ان کے باپ نے بتایا کہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبداللہ اور عبیداللہ ایک لشکر کے ساتھ عراق گئے۔ جب لوٹنے لگے تو وہ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے ملنے گئے

جو بصرہ کے امیر تھے- انہوں نے اچھی طرح سے ان کا خیر مقدم کیا- پھر کہا کہ اگر میں کچھ کر سکتا تو آپ لوگوں کو نفع پہنچانے کی کوشش کرتا- پھر کہا کہ یہاں پر بیت المال کا کچھ مال ہے جس کو میں امیر المومنین کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں- میں یہ کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کو یہ مال سلف کے طور پر پیشگی دے دیتا ہوں- آپ اس سے عراق کی کچھ چیزیں خرید لیں اور مدینہ جا کر بیچ دیں- راس المال امیر المومنین کو پہنچا دینا اور نفع آپ دونوں کا ہوگا- دونوں حضرات نے کہا کہ ہم بھی کچھ اسی طرح کا کام چاہتے تھے- چنانچہ ابو موسیٰ نے ایسا ہی کیا اور امیر المومنین کو لکھ دیا کہ وہ مال ان سے وصول کر لیں- جب یہ دونوں مدینہ آئے تو انہوں نے مال فروخت کر کے نفع اٹھایا لیکن جب مال حضرت عمرؓ کو دیا تو انہوں نے پوچھا کہ کیا ابو موسیٰ نے لشکر کے ہر آدمی کو اس طرح مال پیشگی دیا تھا جس طرح تم کو دیا- انہوں نے جواب دیا کہ نہیں- تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ امیر المومنین کے صاحبزادے ہونے کے ناطے انہوں نے تمہیں مال دیا- لہٰذا آپ لوگ مال بھی ادا کرو اور منافع بھی- اس پر عبداللہ تو خاموش رہے مگر عبیداللہ نے کہا، امیر المومنین آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے- اگر مال کم ہو جاتا یا تباہ ہو جاتا تو ہم ذمہ دار بھی تو تھے- حضرت عمرؓ نے کہا کہ نہیں، ادا کرو- عبداللہ پھر خاموش رہے لیکن عبیداللہ نے وہی بات دہرائی- اس پر مجلس کے لوگوں میں سے ایک نے کہا کہ امیر المومنین آپ اس کو قراض قرار دے دیں تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ چلو میں قراض قرار دے دیتا ہوں- چنانچہ حضرت عمرؓ نے اصل مال اور آدھا منافع لے لیا اور نصف منافع دونوں بھائیوں نے وصول کیا- ؎

وضاحت:

یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے مزاج کے عین مطابق ہے- اس میں انہوں نے جو گرفت کی ہے وہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی اس عنایت پر کی ہے جو انہوں نے خاص حضرت عمرؓ کے صاحبزادوں پر کی- یہ چیز تہمت کا موقع پیدا کرنے والی تھی- امیر المومنین کے صاحبزادے ہونے کی وجہ سے اقربا پرستی کا الزام آتا تھا-

فقہ کی رو سے اس معاملہ میں کوئی خرابی نہیں- ابو موسیٰ اشعری کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ مال حفاظت امیر المومنین تک پہنچ جائے کیونکہ یہ امیر المومنین کے گھر کے لوگ تھے اور مال پہنچانے کے ضامن تھے- انہوں نے ان کے ذریعے مال بھیجنے کو زیادہ قابل اعتماد پایا ہوگا- ان کی یہ خواہش بھی تھی کہ اس طرح ان لوگوں کو نفع بھی حاصل ہو جائے- یہ طریقہ خلاف شریعت نہ تھا- البتہ یہ طرز عمل ہر قسم کے شک اور تہمت سے بالا نہ تھا- اس

واقعہ سے امیر المومنین کی پوزیشن پر حرف رکھا جا سکتا تھا۔لہذا حضرت عمرؓ نے اصرار کیا کہ میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔

اس واقعہ کو موجودہ زمانے پر منطبق کرنا صحیح نہیں۔ آج کل تو مال بھیجنا کوئی مسئلہ نہیں لیکن اس زمانے میں یہ ایک مسئلہ تھا۔ڈاک اور بنک کا انتظام جیسا آج ہے اس زمانے میں نہ تھا۔ مال حفاظت منزل مقصود تک پہنچانا آسان کام نہ تھا۔امیر المومنین کے صاحبزادوں کی ضمانت پر مال کی ترسیل کو حضرت ابو موسیٰ نے غنیمت سمجھا۔ اس ناظر میں ان کا طرز عمل بھی درست تھا۔ اس پر حضرت عمرؓ کو جو اعتراض تھا وہ صرف یہ تھا کہ اس طرح امیر المومنین کے صاحبزادوں کو دوسرے لوگوں پر غیر ضروری ترجیح مل رہی تھی۔ جب اہل مجلس میں سے کسی صاحب نے معاملے کو قراض قرار دینے کی راہ نکال دی تو حضرت عمرؓ کی پریشانی ختم ہو گئی۔

اس واقعہ اور حضرت عمرؓ کے فیصلہ سے یہ معلوم ہوا کہ امانت کا مال تجارت میں لگایا جا سکتا ہے۔ یتیموں کا مال بھی تو امانت ہوتا ہے۔ اس کو تجارت میں لگانا جائز ہی نہیں بلکہ احسن ہے۔ یتامیٰ کے مال کے متعلق آنحضرت ﷺ کی ہدایت ہے کہ اس سے تجارت کرو تاکہ زکوٰۃ اس کو ختم نہ کردے۔ اس لحاظ سے بھی ابو موسیٰ اشعری کا فعل ٹھیک تھا۔ ان کے اوپر مال کے پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی اور اس کی ضمانت انہوں نے دونوں اصحاب سے لی تھی۔

اس روایت سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے قراض کی شرعی حیثیت کو درست قرار دیا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا۔لہذا یہ طریقہ جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی ہے اور اس پر کوئی شرعی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

٦ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنِ الْعَلَاءِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ اَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ اَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ اَعْطَاهُ مَالًا قِرَاضًا يَعْمَلُ فِيهِ عَلَى اَنَّ الرِّبْحَ بَيْنَهُمَا۔

﴿علاء بن عبدالرحمٰن اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفانؓ نے ان کو مال مضاربت پر دیا کہ وہ اس سے تجارت کریں اور منافع دونوں میں برابر تقسیم ہوگا۔﴾

وضاحت :

اس روایت میں دو صحابہ کرام کا اثر ہے۔ قراض کے ضمن میں کوئی نص قطعی قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔ معاملہ کی یہ صورت میرے نزدیک اسی بنیاد پر درست ہے جس پر اولیاء یتامیٰ کو اجازت ہے کہ وہ یتامیٰ کے مال سے تجارت کر کے ان کو نفع پہنچا سکتے ہیں۔ اس پر اجماع بھی ہے اور کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔

کتاب المساقاۃ

مساقات سے مراد بٹائی پر زراعت ہے۔ یعنی ایک مالک زمین کسی شخص کے ساتھ یہ معاملہ کر لیتا ہے کہ زمین پر محنت وہ کرے گا اور پیداوار ایک متعین نسبت سے مالک اور مزارع میں تقسیم ہو گی۔

مَاجَاءَ فِي الْمُسَاقَاةِ

بٹائی پر زراعت کے بارے میں روایات

❐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لِيَهُودِ خَيْبَرَ يَوْمَ افْتَتَحَ خَيْبَرَ أُقِرُّكُمْ فِيهَا مَا أَقَرَّكُمُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى أَنَّ الثَّمَرَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ قَالَ فَكَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَبْعَثُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ رَوَاحَةَ فَيَخْرُصُ بَيْنَهُ وَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَقُولُ إِنْ شِئْتُمْ فَلَكُمْ وَ إِنْ شِئْتُمْ فَلِي فَكَانُوا يَأْخُذُونَهُ۔

﴿سعید بن المسیب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب خیبر کو فتح کیا تو یہود خیبر سے کہا کہ میں تم کو یہاں ٹھہرنے کی اس وقت تک مہلت دوں گا جب تک اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو ٹھہرانا چاہے۔ شرط یہ ہو گی کہ پھل ہمارے اور تمہارے درمیان مساوی تقسیم ہو گا۔ رسول اللہ عبداللہ بن رواحہؓ کو بھیجا کرتے اور وہ آپ کے اور یہود کے درمیان تخمینہ سے پھل تقسیم کرتے۔ وہ یہود سے کہتے کہ چاہو تو تم لے لو اور چاہو تو میرے لیے چھوڑ دو۔ تو یہود اس کو لے لیتے تھے۔﴾

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَبْعَثُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ رَوَاحَةَ إِلَى خَيْبَرَ فَيَخْرُصُ بَيْنَهُ وَ بَيْنَ يَهُودِ خَيْبَرَ قَالَ فَجَمَعُوا لَهُ حَلْيًا مِنْ حَلْيِ نِسَائِهِمْ فَقَالُوا لَهُ هٰذَا لَكَ وَ خَفِّفْ عَنَّا وَتَجَاوَزْ فِي الْقَسْمِ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ رَوَاحَةَ يَا مَعْشَرَ الْيَهُودِ وَاللّٰهِ إِنَّكُمْ لَمِنْ أَبْغَضِ خَلْقِ اللّٰهِ إِلَيَّ وَمَا ذَاكَ بِحَامِلِي عَلَى أَنْ أَحِيفَ عَلَيْكُمْ فَأَمَّا مَا عَرَضْتُمْ مِنَ الرَّشْوَةِ فَإِنَّهَا سُحْتٌ" وَ إِنَّا لَا نَأْكُلُهَا فَقَالُوا بِهٰذَا قَامَتْ

السَّمٰوٰتُ وَالْاَرضُ-

﴿ابن شہاب سلیمان بن یسار سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عبداللہ بن رواحہؓ کو خیبر بھیجا کرتے تھے-وہ آپ کے اور یہود کے درمیان پھل کا تخمینہ کرتے - یہود نے اپنی عورتوں کے زیورات جمع کیے اور ان کے پاس لے آئے کہ یہ قبول کر لو اور ہمارے ساتھ رعایت کرو اور تقسیم میں فرق نہ کرو-اس پر عبداللہ بن رواحہ نے کہا کہ اے یہود، اللہ کی قسم، تم میرے نزدیک اللہ کی مبغوض ترین مخلوق ہو، تاہم یہ بات بھی مجھے اس پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ میں تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی کروں-اپنی یہ رشوت جو تم نے پیش کی تو یہ مال حرام ہے-ہم یہ نہیں کھاتے-اس پر یہود پکار اٹھے کہ اسی عدل پر آسمان اور زمین قائم ہیں-﴾

وضاحت:

یہ دونوں روایات ابن شہاب سے ہیں- پہلی روایت مرسل ہے-ان روایات میں ایک مشکل ان کا یہ بیان ہے کہ آنحضرتؐ عبداللہ بن رواحہ کو ہر سال خیبر بھیجا کرتے تھے جب کہ دوسری روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عبداللہ بن رواحہ صرف ایک ہی مرتبہ خیبر گئے-

پہلی روایت میں یہود کے ساتھ نبی ﷺ کی جس گفتگو کا حوالہ ہے یہ واقعہ فتح خیبر کے موقع پر پیش آیا-جنگ میں یہود کو شکست ہوئی تو نبی ﷺ نے ان کو خیبر سے نکلنے کا حکم نہیں دیا- معلوم ہوتا ہے آپ کو اس معاملہ میں وحی کے ذریعے کسی واضح حکم کا انتظار تھا-لہذا آپ نے ان سے یہ کہا کہ جب تک اللہ تعالیٰ اس سرزمین پر تمہیں رہنے دے اس وقت تک ہمارے اور تمہارے درمیان زمین کی پیداوار برابر تقسیم ہوا کرے گی-گویا آپ نے ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو مفتوح اہل ذمہ کے ساتھ کیا جاتا ہے-اس میں کسی ناانصافی کا کوئی شائبہ نہ تھا-

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقریباً چالیس ہزار وسق کھجور کی تقسیم کا معاملہ تھا-اس میں مشکل یہ پیش آتی تھی کہ جب تک کھجور کی یہ مقدار پک کر تیار نہ ہو جائے اور اتر نہ جائے تو اس کی نگرانی کیسے کی جائے-اگر یہود پر اعتماد کیا جاتا تو وہ اس کو ویسے ہی ٹھکانے لگا لیتے-لہذا اس کی شکل یہ اختیار کی گئی کہ درختوں پر ہی پھل کا تخمینہ کر لیا جاتا اور اس مقدار کو برابر تقسیم کر لیا جاتا-

روایت کی رو سے عبداللہ بن رواحہؓ درختوں پر پھل کی مقدار کا تخمینہ کرتے اور یہود کو پیشکش کرتے تھے

کہ اگر چاہو تو تم لے لو اور اگر چاہو تو میں لے لیتا ہوں- مطلب یہ ہے کہ تم لے لو اور مسلمانوں کے حصے کے ضامن ہو اور اگر میں لے لوں تو تمہارے حصہ کا ضامن بنتا ہوں- تو یہود لے لیا کرتے اور مسلمانوں کے حصے کے ضامن ہوتے تھے- یہود نے عبداللہ بن رواحہؓ سے تخمینہ میں رعایت حاصل کرنے کے لیے اپنی عورتوں کے زیورات کی شکل میں رشوت دینی چاہی تو انہوں نے اس کو مسترد کر دیا اور کہا کہ یہ مال حرام ہے جسے مسلمان نہیں کھاتے- لیکن اطمینان رکھو کہ اگرچہ تم ایک مبغوض قوم ہو پھر بھی میں تم سے کوئی ناانصافی نہیں کروں گا- اس پر انہوں نے داد دی کہ اسی عدل کی وجہ سے آسمان اور زمین قائم ہیں-

تخمینہ کے باب میں فقہاء کا اختلاف ہے- احناف اور شوافع اس کو نہیں مانتے لیکن مالکیہ مانتے ہیں- احناف اس کو مزابنہ پر قیاس کرتے ہیں- وہ اس کو بیع میں داخل کرتے ہیں اور پھر بیع المجہول بالمجہول کے اصول پر اس کو رد کرتے ہیں- لیکن میرے نزدیک اس میں کوئی چیز بھی خلاف عقل نہیں اور یہ ایک ناگزیر عمل ہے- تخمینہ صرف خاص خاص حالات میں ہی اختیار کیا جاتا ہے، جہاں اس کے سوا اور کوئی شکل ممکن ہی نہ ہو- اگر کوئی چیز ناپی جا سکتی نہ تولی اور گنی جا سکتی تو تخمینہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا- آنحضرتؐ نے تخمینہ کا استعمال زکوٰۃ کے مال میں کیا ہے تو زکوٰۃ کے مال سے مقدس مال اور کون سا ہوگا-

اہل ظاہر نے تخمینہ کو صرف کھجور اور انگور تک محدود کر دیا ہے- اہل ظاہر کی اسی طرح کی باتیں ہیں جن کو کوئی عاقل نہیں مان سکتا- بہت سی بھس (توڑی) آپ بیچنا چاہتے ہیں تو ترازو لے کر تو نہیں بیٹھیں گے یا ایک بہت بڑی عمارت منہدم ہو رہی ہے، آپ اس کا ملبہ خریدنا چاہتے ہیں، وہ نہ تو تولا جا سکتا ہے نہ گنا جا سکتا ہے- اس کو کھجور یا انگور پر کس طرح قیاس کر سکتے ہیں- بس یہی ایک تخمینہ کرنے کا طریقہ ہے جو مسئلے کا حل ہے- یہ عقلی بھی ہے اور فطری بھی- اس کے سوا کوئی دوسری شکل مسئلے کا حل نہیں ہو سکتی- خیبر کے معاملے کو بیع پر محمول کرنا درست نہیں کیونکہ کوئی چیز خرید یا فروخت نہیں کی جا رہی تھی بلکہ فصل کی بٹائی کا معاملہ طے کیا جا رہا تھا اور نہ ہی اس میں کوئی چیز مجہول ہے- درختوں پر پھل ہے یا کھیتی کی فصل ہے جو ابھی پک کر تیار نہیں ہے کہ اس کو تقسیم کر لیا جائے- تخمینہ ہی اس کا واحد قابل عمل حل تھا جس میں فریقین کو برابر کا حق دیا گیا کہ چاہیں لے لیں چاہیں دے دیں-

یہ بات بھی درست نہیں کہ آنحضرتؐ نے یہ معاملہ غیر مسلموں کے ساتھ کیا اس لیے یہ مسلمانوں کے لیے نظیر نہیں ہو سکتا- معاملہ کسی کے ساتھ بھی ہو آپ نے مال کے متولی کی حیثیت سے کیا اور اس سے اس قسم کے ہر معاملہ میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے-

کتاب کراء الارض

مَاجَاءَ فِی کِرَاءِ الْاَرْضِ

زرعی زمین کرایہ پر دینا

٦ حَدَّثَنَا یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَبِیْعَةَ بْنِ اَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ حَنْظَلَةَ بْنِ قَیْسٍ الزُّرَقِیِّ عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِیْجٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰی عَنْ كِرَاءِ الْمَزَارِعِ قَالَ حَنْظَلَةُ فَسَاَلْتُ رَافِعَ بْنَ خَدِیْجٍ بِالذَّهَبِ وَالْوَرِقِ فَقَالَ اَمَّا بِالذَّهَبِ وَالْوَرِقِ فَلَا بَاْسَ بِهٖ۔

«حنظلہ بن قیس الزرقی رافع بن خدیج سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کھیتوں کا کرایہ لینے سے روکا ہے۔ حنظلہ کہتے ہیں کہ میں نے رافع بن خدیج سے پوچھا کہ سونے چاندی کے بدلے میں ہو تب بھی؟ انہوں نے کہا کہ سونے چاندی کے بدلے میں ہو تب کوئی حرج نہیں۔»

وضاحت :

راوی خود نبی ﷺ کے حکم کا جو مطلب سمجھے ہیں وہ یہ ہے کہ روپے کے بدلے میں زمین کرایہ پر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن ہمارے بعض دانشوروں نے اس حکم کو عام مان کر پہلے زمین کا کرایہ ناجائز قرار دیا پھر اسی کے ضمن میں مکانوں کا کرایہ بھی ناجائز قرار دے دیا۔ حالانکہ زمین کا کوئی ایک ہی مصرف تو نہیں ہے کہ اس پر کاشت ہوتی ہے۔ زمین کے بے شمار مصرف ہیں۔ کارخانے اور سکول قائم کرنے، دھان خشک کرنے کی جگہ بنانے، بھیڑوں کے ریوڑ پالنے اور مرغی خانہ یا دوسرے جانوروں کے فارم بنانے کے لیے زمین درکار ہوتی ہے جو خریدی نہیں جاتی اور کچھ عرصہ کے لیے کرایہ پر حاصل کی جاتی ہے، تو ان مقاصد کے لیے زمین کرایہ پر لینے میں کوئی قباحت نہیں۔

کرایہ کی جو شکل قابل اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ زرعی زمین ایک مقررہ مقدار فصل کے بدلے کرایہ پر دی جائے۔ مثلاً مالک زمین یہ طے کر لیتا ہے کہ میں پیداوار میں سے پچاس من غلہ ہر فصل پر لے لیا کروں گا۔ معاملہ کی یہ شکل صحیح نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے متوقع مقدار میں غلہ پیدا ہی نہ ہو لیکن مالک زمین اپنا مقررہ حصہ لے گا۔ یہ صورت ضرر اور غرر کی ہے۔ اس مشکل کا حل میں پہلے بتا چکا ہوں کہ زمین کم از کم دو یا تین سال کے

لیے دی جائے اور ایک تہائی سے زیادہ نقصان کی صورت میں مالک بھی نقصان برداشت کرے- تب اس معاملہ میں بھی کوئی قباحت نہیں رہ جاتی-

احناف پیداوار کے بدلے زمین کرایہ پر دینے کے مخالف ہیں- مخالفت کی وجہ یہ ہے کہ کرایہ زمین کی پیداوار میں سے لینے کی صورت میں پیداوار کا جھگڑا پیش آ سکتا ہے- میں نے اس کا جو حل بتایا ہے اس سے احناف کی علت مخالفت باقی نہیں رہتی- امام مالک کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ پیداواری جنس کی مقررہ مقدار کے عوض زمین کرائے پر دینا جائز نہیں- البتہ نقدی پر معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں- مکان اور زمین نقد کرائے پر لیے اور دیے جا سکتے ہیں-

کتاب الشفعۃ

مَا تَقَعُ فِيهِ الشُّفْعَةُ

وہ چیزیں جن میں شفعہ ہو سکتا ہے

شفعہ کے لغوی معنی ایک چیز کے ساتھ دوسری چیز کو ملا لینا ہے- اس کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ اگر آپ کے کھاتے میں کوئی دوسرا شریک ہو اور آپ اس میں سے بغیر اپنے شریک سے مشورہ کیے فروخت کر دیں تو شریک کے مصالح کو نقصان پہنچ سکتا ہے- اس سے ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف کا موقع پیدا ہو گا- عقل کا بھی تقاضا ہے اور شریعت نے بھی اس کی اجازت دی ہے کہ شریک کو حق ہے کہ وہ شفعہ کرے- اگر آپ نے کوئی چیز بیچی ہے تو اس میں شریک کا حق مقدم ہو گا- البتہ اس میں بہت سی شرطیں اور قیدیں ہیں جن کو جاننے کی ضرورت ہے-

پہلی بات یہ ہے کہ شفعہ ہر چیز کے اندر نہیں بلکہ شفعہ مکان یا زمین پر ہی ہو سکتا ہے اور کسی چیز میں نہیں- جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ آدمی اگر کپڑے بھی بیچے تو شفعہ ہو سکتا ہے تو یہ غیر عقلی اور فضول بات ہے- دوسری شرط یہ ہے کہ ملکیت واضح نہ ہو بلکہ ملک مشاع ہو یعنی دو فریق کھاتے میں حصہ دار تو ہیں لیکن ملکیت ابھی غیر معین ہے- اس کے حدود متعین نہیں ہوئے ہیں- اس صورت میں اگر ایک فریق بیچے تو دوسرا شفعہ کر سکتا ہے لیکن جب حدود متعین ہو جائیں اور ملکیت واضح ہو تو پھر حق شفعہ باقی نہیں رہتا-

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہ ہو جس کے تقسیم ہونے سے اس کا فائدہ ختم ہو جاتا ہو- جیسے ایک کنواں اگر تقسیم ہو جائے تو پھر کنواں ہی نہیں رہے گا- اسی طرح کی کوئی اور چیز جس کی تقسیم اس کی منفعت کو

ختم کر دے، اس میں شفعہ نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص کوئی ایسی چیز بیچے جو مخلوط ہے تو اگرچہ وہ اپنا حصہ ہی بیچے گا لیکن دوسرا آدمی یہ چاہے گا کہ یہ حصہ بھی اس کو مل جائے تاکہ کوئی اجنبی آدمی شریک نہ ہو جائے۔ لہذا بیع کرنے والے کو چاہیے کہ دوسرے فریق کو اطلاع کر دے تاکہ جو کچھ کارروائی اس کو کرنی ہے کرلے۔ اگر اس کو اطلاع نہ کی جائے تو وہ یہ حق رکھتا ہے کہ وہ مداوا چارہ جوئی کر کے اپنے شفعہ کا حق محفوظ کرلے۔ لیکن یہ اختیار بہت طویل مدت تک نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے بیع کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ایک چیز بیع ہوتی ہے تو مشتری کو قبضہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کو غیر محدود مدت تک قبضہ سے نہیں روکا جا سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ شفعہ جلد از جلد کیا جائے۔ اگر زیادہ دیر کر دی جائے تو پھر شفعہ کا حق ساقط ہو جائے گا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حق شفعہ استعمال کرنے میں کتنی دیر کی جا سکتی ہے۔ اس معاملے میں فقہا مدت متعین نہیں کرتے۔ میرے نزدیک اس میں بیع خیار والا معاملہ ہونا چاہیے۔ یعنی اگر دوسرے شریک کو اطلاع کر دی گئی تو آپ نے حق ادا کر دیا۔ اس کو شفعہ کا حق صرف اس صورت میں رہے گا جب اس کو اطلاع نہیں کی جاتی۔ میرے نزدیک خیار کی مدت معاملے کی نوعیت کے لحاظ سے مقرر ہونی چاہیے۔ البتہ یہ مدت غیر محدود نہیں ہو سکتی۔ زیادہ سے زیادہ دو چار ماہ کا وقت دے دیا جائے گا۔

☐ **حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِيْدِ ابْنِ الْمُسَيَّبِ وَ عَنْ اَبِىْ سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَضٰى بِالشُّفْعَةِ فِيْمَا لَمْ يُقْسَمْ بَيْنَ الشُّرَكَاءِ فَاِذَا وَقَعَتِ الْحُدُوْدُ بَيْنَهُمْ فَلَا شُفْعَةَ فِيْهِ۔**

﴿ابن شہاب سعید بن مسیب اور ابی سلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شفعہ کا فیصلہ اس جائیداد کے بارے میں کیا جس کی تقسیم شریکوں کے درمیان نہیں ہوئی تھی۔ اگر تقسیم ہو کر حدود متعین ہو چکے ہوں تو شفعہ نہیں ہے۔﴾

وضاحت:

اس روایت سے یہ ظاہر ہے کہ صرف شریک ملکیت ہی شفعہ کر سکتا ہے، شریک کھاتہ نہیں۔ اگر حدود متعین ہو گئے ہوں تو شفعہ کا حق ختم ہو جاتا ہے۔ عام لوگ بھی شفعہ نہیں کر سکتے۔ احناف کے نزدیک پڑوسی شفعہ کر سکتا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ پڑوسی کے حقوق بہت ہیں۔ روایات میں یہاں تک آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ

جبریل میرے پاس آئے اور پڑوسی کے بارے میں اس قدر نصیحت کرنے لگے کہ میں ڈر گیا کہ کہیں اس کو شریک جائیداد نہ بنا دیں۔ پڑوسی کے حقوق بلاشبہ بہت زیادہ ہیں لیکن یہ اسی طرح ہیں جس طرح دوسرے مسلمان بھائیوں کے بہت سے حقوق ہیں۔ پڑوسی کا کوئی قانونی حق ثابت نہیں۔ لہٰذا احناف کا مسلک میری سمجھ میں نہیں آتا۔

مَالَا تَقَعُ فِيهِ الشُّفْعَةُ

وہ چیزیں جن میں شفعہ نہیں ہو سکتا

□ ۔ قَالَ يَحْيٰى قَالَ مَالِكٌ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عُمَارَةَ عَنْ اَبِي بَكْرِ بْنِ حَزْمٍ اَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ قَالَ اِذَا وَقَعَتِ الْحُدُوْدُ فِي الْاَرْضِ فَلَا شُفْعَةَ فِيْهَا وَلَا شُفْعَةَ فِي بِئْرٍ وَلَا فِي فَحْلِ النَّخْلِ قَالَ مَالِكٌ وَعَلٰى هٰذَا الْاَمْرُ عِنْدَنَا۔

﴿ابوبکر بن حزم کہتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفانؓ کا فتویٰ یہ ہے کہ جب زمین کی حدود معین ہو جائیں تو اس میں شفعہ کا حق نہیں رہتا۔ اور کنویں اور نر کھجور میں بھی شفعہ نہیں۔ مالک کہتے ہیں کہ ہمارا فتویٰ اسی پر ہے۔﴾

وضاحت :

فحل کھجور کے اس نر درخت کو کہتے ہیں جس کے پھول چھڑک کر دوسری کھجوروں کی تابیر کرتے ہیں۔ اس سے کھجوریں خوب پھل دیتی ہیں۔ ایسے درخت باغ میں دو تین ہی ہوتے ہیں۔

کنویں اور کھجور میں شفعہ نہ ہونے کی علت یہ ہے کہ تقسیم سے ان کی منفعت ختم ہو جاتی ہے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ راستے کے بارے میں بھی شفعہ نہیں ہو سکتا۔ راستہ بھی مشترک ہی رہے گا۔ تقسیم سے جس چیز کا مفاد ختم ہو جاتا ہو اس میں شفعہ نہیں۔

اس روایت میں خلیفہ راشد کا اثر ہے اور عام طور پر خلفائے راشدین ایسے فتوے اہل علم کے مشورے سے دیتے تھے۔ قاضی ابو یوسفؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو بھی اسی زمرے میں شامل کیا ہے اور یہ ٹھیک کیا ہے۔ اس دور خیر کے یہ فتوے اجماع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کتاب الاقضیہ

اَلتَّرْغِیْبُ فِی الْقَضَاءِ بِالْحَقِّ

حق کے مطابق فیصلہ کرنے کی ترغیب

٦ حَدَّثَنَا یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ ابْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِیْهِ عَنْ زَیْنَبَ بِنْتِ اَبِیْ سَلَمَةَ زَوْجِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ وَ اِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَیَّ فَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ اَنْ یَّكُوْنَ اَلْحَنَ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ فَاَقْضِیْ لَهٗ عَلٰی نَحْوِ مَا اَسْمَعُ مِنْهُ فَمَنْ قَضَیْتُ لَهٗ بِشَیْءٍ مِنْ حَقِّ اَخِیْهِ فَلَا یَاْخُذَنَّ مِنْهُ شَیْئًا فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَهٗ قِطْعَةً مِنَ النَّارِ۔

ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا کہ آنحضرت کا ارشاد ہے کہ میں ایک انسان ہوں اور تم میرے پاس اپنے مقدمے لاتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی اپنے بیان کے زور پر اپنی وکالت میں بڑھا ہوا ہو اور میں اس کے دلائل سن کر اس کے حق میں فیصلہ دے دوں۔ تو جس کے لیے میں نے اس کے بھائی کے حق میں سے کسی چیز کا فیصلہ دے دیا تو وہ اس میں سے نہ لے اس لیے کہ میں نے اس کے لیے آگ کے ٹکڑے کا فیصلہ کیا ہے۔

وضاحت :

یہ روایت حق کے مطابق فیصلے کی ترغیب تو دیتی ہی ہے لیکن اس سے ایک اہم نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کی معصومیت کا دائرہ اس کے اجتہاد کی حد تک ہے۔ اجتہادی امور میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی نگرانی ہوتی ہے۔ اگر اصلاح کی ضرورت ہو تو وہ کر دی جاتی ہے۔ یہی پیغمبر کی معصومیت کا تقاضا ہے۔ لیکن مقدمے کا فیصلہ اس سے الگ ہے۔ پیغمبر اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ وہ شہادت اور مقدمے کی روداد کی روشنی میں فیصلہ کرے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ پیغمبر کے سامنے مقدمہ کی روداد ایسے طریقے سے پیش کی جائے اور غلط موقف کے حق میں دلائل کچھ ایسی قوت سے پیش کیے جائیں کہ ان کی بنا پر وہ حق کے خلاف فیصلہ کر دے، اس لیے کہ مقدمے کی روداد اس کی متقاضی ہے۔

پیغمبر کسی معاملے کا فیصلہ علم غیب کی بنا پر نہیں کر سکتا۔ اگر وہ مقدمات کا فیصلہ علم غیب کی بنا پر کرنے کا پابند ہوتا تو ہماری عدالتیں کس اصول پر فیصلے کرتیں، وہ تو غیب نہیں جانتیں۔ ایک قاضی جو دلائل کی روشنی میں

اور روداد کے مطابق فیصلہ کرتا ہے وہ پیغمبر کی متابعت میں فیصلہ کرتا ہے۔ اگر اس کا فیصلہ حق کے مطابق نہ بھی ہو تب بھی وہ عند اللہ ماجور ہوگا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اس روایت سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ اگر پیغمبر بشریت کے تقاضے سے کسی وکیل کے دلائل سے متاثر ہو کر کوئی ایسا فیصلہ کر دیتا ہے جو حق کے مطابق نہیں ہے تو وہ فیصلہ تو نافذ ہو جائے گا لیکن اس سے کوئی ناحق حق نہیں بن جائے گا۔ جو شخص بے ایمانی سے، پیغمبر کو چکمہ دے کر اور اپنی وکالت کے زور پر ناحق دنیا کی کچھ متاع لے اڑا تو وہ یاد رکھے کہ یہ متاع اس کے لیے جہنم کی آگ کا ایک ٹکڑا ہوگی جس کا سامنا اسے آخرت میں کرنا ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس ایک آدمی قاضی سے اگر کوئی ناحق فیصلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ اس کی سزا آخرت میں بھگتے گا۔

▢ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِبْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اخْتَصَمَ إِلَيْهِ مُسْلِمٌ وَ يَهُودِيٌّ فَرَأَى عُمَرُ أَنَّ الْحَقَّ لِلْيَهُودِيِّ فَقَضَى لَهُ فَقَالَ لَهُ الْيَهُودِيُّ وَاللَّهِ لَقَدْ قَضَيْتَ بِالْحَقِّ فَضَرَبَهُ عُمَرُبْنُ الْخَطَّابِ بِالدِّرَّةِ ثُمَّ قَالَ وَمَا يُدْرِيكَ فَقَالَ لَهُ الْيَهُودِيُّ إِنَّا نَجِدُ أَنَّهُ لَيْسَ قَاضٍ يَقْضِي بِالْحَقِّ إِلَّا كَانَ عَنْ يَمِينِهِ مَلَكٌ وَعَنْ شِمَالِهِ مَلَكٌ يُسَدِّدَانِهِ وَ يُوَفِّقَانِهِ لِلْحَقِّ مَا دَامَ مَعَ الْحَقِّ فَإِذَا تَرَكَ الْحَقَّ عَرَجَا وَتَرَكَاهُ۔

﴿سعید بن مسیب روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس ایک مسلمان اور ایک یہودی مقدمہ لائے۔ حضرت عمرؓ کو یہ بات نظر آئی کہ حق یہودی کے ساتھ ہے۔ آپ نے یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ یہودی نے کہا اللہ کی قسم، آپ نے حق کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس کو ایک درہ لگایا۔ پھر کہا تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی۔ یہودی نے کہا، ہمارے ہاں روایت ملتی ہے کہ جو قاضی حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے ایک فرشتہ اس کے داہنے اور ایک فرشتہ اس کے بائیں ہوتا ہے۔ یہ فرشتے اس کو درست رکھتے اور حق کی توفیق دیتے رہتے ہیں جب تک وہ حق پر ہوتا ہے۔ اور جب وہ حق کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ چل دیتے اور اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔﴾

وضاحت :

حضرت عمرؓ کے سامنے یہودی نے جو بات کی یہ اسی طرح کی بات ہے جیسی خیبر کے یہودیوں نے کھجوروں کی فصل کی تقسیم کے بارے میں فیصلہ پر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو کہی تھی کہ اسی انصاف کی وجہ سے آسمان اور زمین قائم ہیں۔ اس یہودی نے بھی حضرت عمرؓ کے فیصلے کی داد دی۔ اس پر انہوں نے پوچھ لیا کہ اچھا تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں حق پر ہوں۔ شاید اس لیے کہہ رہے ہو کہ فیصلہ تمہارے حق میں ہو گیا۔ لیکن یہودی اپنی بات پر اڑا رہا کہ ہمارے ہاں یہ روایت بیان ہوئی ہے کہ جو قاضی حق فیصلہ کرتا ہے تو اس کے داہنے اور بائیں دو فرشتے اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے میرے حق میں فیصلہ کیا ہے ورنہ ہماری بات پر کسی کو کیسے اعتبار آسکتا ہے۔

یہودی کے تحسین کے کلمات سے لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ چونکہ اس نے حضرت عمرؓ کے منہ پر ان کی تعریف کر دی تھی اس لیے انہوں نے اس پر درہ اٹھالیا۔ میرے نزدیک یہ خیال درست نہیں۔ یہ بات کہ خدا کی قسم، آپ نے حق کے مطابق فیصلہ کیا ایسی نہیں تھی کہ اس پر درہ مارا جائے۔ اگرچہ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ کسی کی تعریف اس کے منہ پر کرنا اچھی بات نہیں، بہت ہی بے ہودہ بات ہے اور اس کی حوصلہ شکنی بھی کرنی چاہیے۔ لیکن یہ موقع سزا دینے کا نہیں تھا۔ یہودی نے اپنی بات کے حق میں اپنے ہاں کی کسی روایت کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ میں یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ توفیق بخشی۔ یہ ایسی بات نہیں تھی جس پر حضرت عمرؓ اسے سزا دیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں درہ تو رہتا ہی تھا لیکن وہ ہمیشہ اس کو سزا دینے ہی کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ کبھی وہ محض ڈرانے دھمکانے کے لیے کسی شخص پر اٹھا لیتے رہے ہوں گے اور کبھی پیار سے بھی ایسا کرتے رہے ہوں گے۔ یہاں پیار ہی سے اٹھانے کا موقع نظر آتا ہے۔ حضرت عمرؓ جیسے معقول، مہذب اور شائستہ آدمی سے یہ بات بالکل بعید ہے کہ وہ حق یا ناحق ہر موقع پر لوگوں کی ٹھکائی کر دیتے رہے ہوں۔ یقیناً لوگوں کو موقع و محل سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔

مَاجَاءَ فِي الشَّهَادَاتِ

گواہوں کے بارے میں روایات

٦ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللَّهِ بْنِ أَبِي بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو ابْنِ حَزْمٍ

عَنْ أَبِيهِ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ عُثْمَانَ عَنْ أَبِي عَمْرَةَ الْأَنْصَارِيِّ عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ الشُّهَدَاءِ الَّذِي يَأْتِي بِشَهَادَتِهِ قَبْلَ أَنْ يُسْأَلَهَا أَوْ يُخْبِرُ بِشَهَادَتِهِ قَبْلَ أَنْ يُسْأَلَهَا۔

﴿زید بن خالد جہنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں بتاؤں کہ سب سے بہتر گواہ کون ہے۔ وہ جو اپنی گواہی پیش کرے قبل اس کے کہ اس سے سوال کیا جائے یا (شاید یوں فرمایا کہ) وہ اپنی گواہی کی خبر دے قبل اس کے کہ اس سے پوچھا جائے۔﴾

وضاحت :

اس امت کا فریضہ منصبی شہداء اللہ فی الارض کا ہے جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۳ میں ہے "لتکونوا شھداء علی الناس"۔ یہ حق کی گواہی دینے والی امت ہے۔ اس فریضہ منصبی کا تقاضا یہ ہے کہ امت کے افراد کا اجتماعی مزاج یہ ہو کہ آدمی کسی مظلوم کی حق تلفی ہوتے دیکھ کر خود بول پڑے کہ میں جانتا ہوں کہ اس بیچارے کا حق ہے اور اس کو اس کے حق سے محروم کیا جارہا ہے۔ اس سے بحث نہ ہو کہ عدالت اس کو طلب کرتی ہے یا نہیں۔ وہ ہزاروں کے سامنے بھی اپنی گواہی پیش کرنے کے لیے تیار رہے۔ آج ہمارا مزاج یہ ہو گیا ہے کہ گواہی بکتی ہے۔ پیشہ ور گواہ عدالتوں میں موجود ہوتے ہیں۔ آپ کا کوئی مقدمہ ہو وہ گواہی دینے کے لیے حاضر رہتے ہیں۔ یہ بدمعاشی ہے۔ ایسے لوگ اس امت کے فرض منصبی کی مخالفت کرنے والے ہیں۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ أَبِي عَبْدِالرَّحْمٰنِ أَنَّهُ قَالَ قَدِمَ عَلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْعِرَاقِ فَقَالَ لَقَدْ جِئْتُكَ لِأَمْرٍ مَالَهُ رَأْسٌ وَلَا ذَنَبٌ فَقَالَ عُمَرُ مَا هُوَ قَالَ شَهَادَاتُ الزُّوْرِ ظَهَرَتْ بِأَرْضِنَا فَقَالَ عُمَرُ أَوْ قَدْ كَانَ ذٰلِكَ قَالَ نَعَمْ فَقَالَ عُمَرُ وَاللّٰهِ لَا يُؤْسَرُ رَجُلٌ فِي الْإِسْلَامِ بِغَيْرِ الْعُدُوْلِ۔

﴿ربیعہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس ایک شخص اہل عراق میں سے آیا۔ اس نے کہا کہ میں ایک ایسے معاملے کی خبر لایا ہوں کہ جس کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ کیا ہے۔

اس نے کہا کہ ہمارے ملک میں جھوٹی شہادتیں بہت پھیل رہی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اچھا یہ ہونے لگا۔ اس نے کہا جی ہاں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کوئی بات نہیں، میں اللہ کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اسلام میں کوئی شخص عدول گواہوں کی گواہی کے بغیر قید نہیں کیا جائے گا۔﴾

وضاحت:

روایت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ عراق سے آنے والے شخص کی آمد کا کوئی خاص پس منظر تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس کے خلاف کوئی سازش تھی اور بعض لوگ اس کو گرفتار کروانا چاہتے تھے۔ وہ گھبرا کر اپنی پیشگی ضمانت کے لیے حضرت عمرؓ کے پاس آگیا۔ اس نے آکر امیر المومنین سے کہا کہ ہمارے علاقے میں لوگ بے سروپا باتیں منسوب کر کے جھوٹی گواہی دے دیتے ہیں۔ اس طرح عراق میں جھوٹی گواہی کا فتنہ پھیل رہا ہے۔ حضرت عمرؓ سمجھ گئے کہ اس کے خلاف کوئی گواہی کا مسئلہ ہے اور اس کو گرفتاری کا اندیشہ ہے تو انہوں نے تسلی دی کہ فکر نہ کرو۔ اسلام میں عادل گواہوں کی گواہی کے بغیر کسی کو پکڑا نہیں جائے گا۔ یعنی میری طرف سے اطمینان رکھو کہ میرے قاضی تمہارے خلاف عادل گواہوں کی گواہی کے بغیر کوئی اقدام نہیں کر سکتے۔

اس روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سیفٹی ایکٹ کی نوعیت کے قوانین جن میں بغیر کسی شہادت کے ہی لوگوں کو دھر لیا جاتا ہے اسلام کے خلاف اور باطل ہیں۔ اہل سیاست کا یہ مطالبہ بجا ہے کہ ایسے قوانین نہیں ہونے چاہئیں۔ ان کا غلط استعمال ہوتا ہے۔ اسلام کا اصول یہ ہے کہ جب تک حکومت باقاعدہ مقدمہ نہ بنائے کسی کو گرفتار کر کے جیل میں نہیں ٹھونس سکتی۔

حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ لَا تَجُوزُ شَهَادَةُ خَصْمٍ وَلَا ظَنِينٍ۔

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مخالف کی شہادت اور جس شخص کے متعلق بدگمانی کے وجوہ پائے جائیں اس کی گواہی جائز نہیں۔﴾

وضاحت:

یہ حضرت عمرؓ کا فتویٰ ہے۔ جس طریقے سے آپ کے حلیف یا رشتہ دار کی گواہی آپ کے حق میں مشتبہ ہے اسی طرح سے اگر آپ یہ ثابت کر دیں کہ آپ کے اور گواہ کے درمیان جھگڑا ہے تو پھر اس کی شہادت نہیں لی

جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ پیشہ ور گواہ ہے، جھوٹی گواہی دیتا پھرتا ہے یا کسی مقدمے میں ماخوذ ہے یا کسی غیر قانونی کاروبار میں ملوث ہے تو اس کی گواہی ناقابل قبول ہو گی، اس لیے کہ وہ عدول نہیں، اور اسلام میں غیر عدول کی گواہی معتبر نہیں۔

ہمارے فقہاء نے ایک اصول یہ بنا رکھا ہے کہ صحابہ کے بعد کوئی شخص عدول نہیں اور جس شخص کا عدول ہونا معلوم نہ ہو اس کی گواہی نہیں لی جائے گی۔ میرے خیال میں یہ اصول صحیح نہیں۔ اصول یہ ہونا چاہیے کہ آپ اگر کسی شخص کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں کر سکتے، کوئی وجہ تہمت نہیں لا سکتے تو وہ عدول مانا جائے گا، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، اور وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتا ہو، عدالتی معاملات میں وہ عدول سمجھا جائے گا الا یہ کہ آپ اس کے خلاف کوئی الزام ثابت کر دیں۔

اَلْقَضَاءُ فِی شَهَادَةِ الْمَحْدُوْدِ

جس پر حد جاری ہو چکی ہو اس کی گواہی کے بارے میں فیصلہ

□ قَالَ يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ وَغَيْرِهِ اَنَّهُمْ سُئِلُوا عَنْ رَجُلٍ جُلِدَ الْحَدَّ اَتَجُوْزُ شَهَادَتُهُ فَقَالُوا نَعَمْ اِذَا ظَهَرَتْ مِنْهُ التَّوْبَةُ وَحَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهُ سَمِعَ ابْنَ شِهَابٍ يُسْئَلُ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ مِثْلَ مَا قَالَ سُلَيْمَانُ بْنُ يَسَارٍ قَالَ مَالِكٌ وَذٰلِكَ الْاَمْرُ عِنْدَنَا وَذٰلِكَ لِقَوْلِ اللّٰهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَ اُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَحِيْمٌ قَالَ مَالِكٌ فَالْاَمْرُ الَّذِي لَا اخْتِلَافَ فِيْهِ عِنْدَنَا اَنَّ الَّذِي يُجْلَدُ الْحَدَّ ثُمَّ تَابَ وَ اَصْلَحَ تَجُوْزُ شَهَادَتُهُ وَهُوَ اَحَبُّ مَا سَمِعْتُ اِلَيَّ فِي ذٰلِكَ۔

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ سلیمان بن یسار اور دوسرے لوگوں سے اس شخص کی گواہی کے جواز کے بارے میں پوچھا گیا جس پر حد جاری ہو چکی ہو تو انہوں نے کہا کہ اس آدمی کی شہادت جائز ہے بشرطیکہ

اس کی توبہ ظاہر ہو چکی ہو۔امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ابن شہاب سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے بھی وہی بات کہی جو سلیمان بن یسار نے کہی تھی۔امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں بھی فتویٰ یہی ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قول ہے "اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر الزام لگائیں پھر اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ نہ پیش کریں تو ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو۔ یہی لوگ اصل فاسق ہیں۔البتہ جو لوگ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کرلیں گے تو اللہ مغفرت فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو شخص حد جاری ہونے کے بعد توبہ اور اصلاح کرلے تو اس کی شہادت جائز ہے اور اس بارے میں یہی سب سے زیادہ پسندیدہ بات ہے جو میں نے سنی ہے۔

وضاحت :

جس شخص پر کوئی شرعی حد جاری ہو چکی ہو اس کی گواہی قبول کرنے یا رد کرنے کے بارے میں یہ فقہائے مدینہ اور امام مالکؒ کے فتوے ہیں۔احناف کا مسلک الگ ہے۔احناف کے نزدیک ایسے شخص کی شہادت کبھی قبول نہ ہوگی۔جس آیت کو امام مالکؒ نے دلیل میں پیش کیا ہے اسی کو احناف بھی پیش کرتے ہیں۔تاویل میں ان کو اختلاف ہے۔امام مالکؒ اور ان کے مسلک کے دوسرے لوگ اس آیت کی تاویل یوں کرتے ہیں کہ الا الذین کا استثنا اس بات کی دلیل ہے کہ تہمت لگانے والا اگر توبہ اور اصلاح کرلے تو اس کی شہادت قبول ہونی چاہیے۔امام ابو حنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ استثنا اولئک هم الفاسقون سے ہے۔مراد یہ ہے کہ جو شخص توبہ اور اصلاح کرلے گا وہ فسق سے نکل جائے گا نہ کہ ساقط الشہادۃ ہونے سے۔اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ اس طرح آیت میں ابدا کا لفظ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔اس لیے کہ تاب کو کسی لفظ کے ساتھ معلق نہیں کرسکتے۔اگر ایسا کریں گے تو ابدا کا لفظ اس کے منافی ہوگا۔لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ توبہ کرکے اصلاح کرلیں گے وہ فاسقوں کے زمرے میں سے نکل جائیں گے لیکن ان کی شہادت قبول نہ ہوگی۔میرے نزدیک احناف کا مسلک قوی ہے۔میں نے تفسیر تدبر قرآن میں یہی مسلک اختیار کیا ہے۔قانون یہ ہے کہ ایک شخص کسی پاکدامن عورت پر اگر زنا جیسے سنگین جرم کا الزام لگاتا ہے اور ثبوت میں شہادت نہیں پیش کرسکتا تو اس کی سزا کے طور پر وہ ہمیشہ کے لیے ساقط الشہادت ہو جائے گا۔رہا توبہ کا

معاملہ تو یہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے، وہ قبول کرے یا نہ کرے۔ وہ دلوں کا حال جانتا ہے۔ یہ بات قرآن مجید کی زبان اور نظام کے لحاظ سے زیادہ قوی ہے۔

اَلْقَضَاءُ بِالْيَمِيْنِ مَعَ الشَّاهِدِ

گواہ کے ساتھ قسم کو ملا کر فیصلہ

☐ قَالَ يَحْيٰى قَالَ مَالِكٌ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ أَبِيْهِ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَضٰى بِالْيَمِيْنِ مَعَ الشَّاهِدِ وَ عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِالْعَزِيْزِ كَتَبَ إِلٰى عَبْدِالْحَمِيْدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ ابْنِ زَيْدِ بْنِ الْخَطَّابِ وَهُوَ عَامِلٌ عَلَى الْكُوْفَةِ أَنِ اقْضِ بِالْيَمِيْنِ مَعَ الشَّاهِدِ وَ حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ أَبَا سَلَمَةَ بْنَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ وَ سُلَيْمَانَ بْنَ يَسَارٍ سُئِلَا هَلْ يُقْضٰى بِالْيَمِيْنِ مَعَ الشَّاهِدِ فَقَالَا نَعَمْ قَالَ مَالِكٌ مَضَتِ السُّنَّةُ فِي الْقَضَاءِ بِالْيَمِيْنِ مَعَ الشَّاهِدِ الْوَاحِدِ يَحْلِفُ صَاحِبُ الْحَقِّ مَعَ شَاهِدِهٖ وَ يَسْتَحِقُّ حَقَّهٗ فَإِنْ نَكَلَ وَ أَبٰى أَنْ يَحْلِفَ أُحْلِفَ الْمَطْلُوْبُ فَإِنْ حَلَفَ سَقَطَ عَنْهُ ذٰلِكَ الْحَقُّ فَإِنْ أَبٰى أَنْ يَحْلِفَ ثَبَتَ عَلَيْهِ الْحَقُّ لِصَاحِبِهٖ۔

﴿ جعفر بن محمد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مقدمے کا فیصلہ ایک گواہ اور قسم کے ساتھ بھی کیا۔ امام مالک ابی الزناد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو، جو کوفہ کے عامل تھے، یہ لکھا کہ مقدمے کا فیصلہ ایک گواہ اور قسم کے ساتھ کر دیا کرو۔ امام مالک کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن اور سلیمان بن یسار سے پوچھا گیا کہ کیا ایک گواہ اور قسم کے ساتھ مقدمے کا فیصلہ ہو سکتا ہے تو ان دونوں حضرات نے کہا کہ ہاں۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مقدمات کے فیصلے کے بارے میں یہ طریقہ طے ہے کہ مدعی اپنے ایک گواہ کے ساتھ قسم کھائے گا اور وہ اپنے حق کا مستحق بن جائے گا۔ اور اگر وہ انکار کرے اور قسم

نہ کھائے تو مدعاعلیہ سے قسم لی جائے گی۔اگر وہ قسم کھالے تو اس سے وہ حق ساقط ہو جائے گا۔اگر قسم کھانے سے انکار کرے تو اس کے اوپر مدعی کا حق ثابت ہو جائے گا۔[۱۸]

وضاحت:

یہ روایت ایک بالکل نیا اصول عدل بیان کر رہی ہے۔اس کی رو سے کسی مقدمہ میں کوئی دعوٰی لے کر آپ عدالت میں جاتے ہیں، آپ کے ہمراہ ایک گواہ ہے، عدالت دوسرا گواہ مانگتی ہے لیکن وہ آپ پیش نہیں کرتے۔ اس روایت کی رو سے عدالت آپ کو یہ موقع دے گی کہ آپ قسم کھائیں اور یہ قسم دوسرے گواہ کے قائم مقام ہو جائے گی۔یہ نیا اصول عدل قرآن مجید میں متعارف نہیں کرایا گیا ہے۔

احناف اس کے مخالف ہیں۔ان کی دلیلوں میں سے یہ بات مجھے پسند آئی کہ یہ بات قرآن مجید کے خلاف ہے۔قرآن مجید میں شہادت کے لیے دو مرد گواہ مقرر کیے گئے ہیں۔اگر دو مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں ایک مرد کی قائم مقام ہوں گی۔مالکیہ وغیرہ سب روایت کے مضمون پر متفق ہیں اور انہوں نے یہ بات نبی ﷺ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرف منسوب کی ہے۔

احناف کی دلیل کا ایک بہت نادر نکتہ یہ ہے کہ قسم کو قرآن نے بھی اور حدیث نے بھی جو تسلیم کیا ہے وہ صرف مدعاعلیہ کی طرف سے کیا ہے نہ کہ مدعی کی طرف سے۔حدیث میں آیا ہے البینة علی المدعی والیمین علی من انکر۔جس کی مراد یہ ہے کہ مدعی اپنے دعوٰی کے ثبوت کے لیے شہادت پیش کرے گا اور مدعاعلیہ کے پاس اگر کوئی گواہ یا کوئی دلیل نہیں تو وہ قسم کھائے گا۔گویا یہ کمزور کو ایک ہتھیار دیا گیا ہے جس کو وہ بصورت مجبوری استعمال کر سکتا ہے۔روایت زیر بحث یہ ہتھیار مدعی کو پکڑا دیتی ہے۔میرے نزدیک احناف کا یہ نکتہ بہت مضبوط ہے۔قسم صرف مدعاعلیہ کا ہتھیار ہے، مدعی کا نہیں۔مدعی کے لیے بینہ ضروری ہے اور بینہ کے معنی ہیں شہادت، قرینہ، دلیل جو وہ پیش کرے گا۔عدالت اس کی روشنی میں اس کے دعوٰی کو جانچ کر فیصلہ کرے گی۔

مالکیہ اور ان کے ہم خیال لوگوں کی ایک اور کمزوری بھی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ یہ اصول صرف مالی معاملات میں لاگو ہوگا اور دوسرے جتنے بھی معاملات ہیں مثلاً حدود، نکاح، طلاق، عتاق، سرقہ، فریہ وغیرہ، ان میں لاگو نہیں ہوگا۔اس کے لاگو نہ ہونے کا سبب بیان نہ کرنا ان کے موقف کو کمزور کرتا ہے۔یہ سب معاملات بے حد خطرناک ہیں۔اگر یہ ہتھیار آپ ان معاملات میں مدعی کو پکڑا دیں تو زنا، حد اور قتل وغیرہ میں غضب ہی ہو جائے گا۔

میں احناف کے موقف کو مضبوط پاتا ہوں اور اس روایت کے تصور عدل کو صحیح نہیں سمجھتا۔

اَلْقَضَاءُ فِی الدَّعْوٰی

دعویٰ میں فیصلہ کا اصول

□ قَالَ یَحْیٰی قَالَ مَالِكٌ عَنْ حُمَیْدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ الْمُؤَذِّنِ اَنَّهُ كَانَ یَحْضُرُ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِیْزِ وَهُوَ یَقْضِی بَیْنَ النَّاسِ فَاِذَا جَاءَهُ الرَّجُلُ یَدَّعِی عَلَی الرَّجُلِ حَقًّا نَظَرَ فَاِنْ كَانَتْ بَیْنَهُمَا مُخَالَطَةٌ اَوْ مُلَابَسَةٌ اَحْلَفَ الَّذِیْ اُدُّعِیَ عَلَیْهِ وَ اِنْ لَمْ یَكُنْ شَیْءٌ مِنْ ذٰلِكَ لَمْ یُحَلِّفْهُ

﴿حمید بن عبدالرحمٰن المؤذن کہتے ہیں کہ وہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس اس وقت موجود رہتے جب وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے۔ اگر ان کے پاس کوئی ایسا شخص آتا جو کسی دوسرے شخص کے خلاف حق کا دعویدار ہوتا تو وہ غور کرتے۔ اگر دیکھتے کہ ان دونوں کے درمیان معاملہ تجارت یا کاروبار وغیرہ کا ہے تو وہ مدعا علیہ سے قسم لیتے اور اگر ایسی کوئی بات نہ ہوتی تو پھر قسم نہ لیتے۔﴾

وضاحت:

قسم کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ کوئی اصولی چیز نہیں ہے۔ یہ صرف اسی صورت میں ہے جب گواہ یا دوسری شہادت اور قرائن موجود نہ ہوں۔ قسامہ کا قانون بھی یہی ہے کہ اگر ایک علاقے میں قتل ہو گیا ہے اور کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ قاتل کون ہے، کوئی قرینہ بھی نہیں ہے، مقتول کے اولیاء کچھ پتہ نہیں دے رہے ہیں، قاتل کا کوئی نشان نہیں ہے تو ایسی شکل میں اسلام میں بھی اور قدیم مذاہب میں بھی یہ طریقہ رہا ہے کہ لوگوں سے قسم لیتے تھے۔ اسی کو قسامہ کہتے ہیں۔ اس کے لیے قدیم زمانے سے مختلف طریقے رائج رہے ہیں۔ مثلاً قربانی کے جانور ذبح کر کے اس کے گوشت پر یا معبدوں کے پاس کھڑا کر کے قسم لیتے رہے ہیں۔

یہ بات واضح رہے کہ قسم کھانے پر کسی شریف آدمی کو مجبور کرنا اس کی بڑی بے وقعتی ہے۔ اول تو یہ مطالبہ بڑی سنگین چیز ہے کہ قسم کھایئے کہ آپ سچ کہیں گے۔ یہ غیرت مند انسان کی غیرت کے خلاف بات ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایک دفعہ قسم کھانے کو کہا گیا تو انہوں نے ایک فروخت شدہ غلام واپس لے لیا لیکن قسم کھانا گوارانہ کیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا معمول یہ نہیں تھا کہ مقدمہ آیا اور جھٹ سے مدعا علیہ سے قسم کھانے کا مطالبہ کردیا بلکہ غور فرماتے۔اگر ان دونوں کے درمیان کوئی تجارت یا لین دین کا معاملہ رہا ہو تا تب قسم لیتے۔اگر ایسا کوئی معاملہ نہ رہا ہو تا تو قسم کا سوال ہی نہ تھا۔

اَلْقَضَاءُ فِی شَهَادَةِ الصِّبْيَانِ
بچوں کی شہادت کے متعلق فیصلہ

❐ قَالَ یَحْیٰی قَالَ مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ الزُّبَيْرِ كَانَ يَقْضِي بِشَهَادَةِ الصِّبْيَانِ فِيمَا بَيْنَهُمْ مِنَ الْجِرَاحِ۔

﴿ہشام کہتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیرؓ بچوں کی آپس کی مار پیٹ کا فیصلہ ان کی شہادت پر کرتے تھے۔﴾

وضاحت:

اگر بچوں کی لڑائی کا معاملہ بن جائے تو ظاہر ہے اس میں بچوں کی شہادت قبول کرنی پڑے گی، ورنہ قانون شہادت کی رو سے بچوں کی شہادت قابل قبول نہیں۔ یہ شہادت انہی کے آپس کے جھگڑے کو نمٹانے کے لیے قبول ہو گی نہ کہ بڑوں کے خلاف۔امام مالک یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ جس جگہ بچوں کے درمیان جھگڑا ہوا ہو وہاں سے ان کے نکلنے سے پہلے پہلے ان کی گواہی معتبر ہو گی تاکہ بڑے اس کو سکھا پڑھا کر ان کا بیان تبدیل نہ کر چکے ہوں۔لہذا اگر وہ جھگڑے کے مقام سے الگ ہو جائیں تو ان کی شہادت معتبر نہیں ہو گی۔ہاں اگر موقع پر انہوں نے عادل لوگوں کو اپنی شہادت پر گواہ بنا لیا ہو تو بڑوں کی گواہی ضمناً قابل قبول ہو گی۔یہ بجائے خود حجت نہ ہو گی بلکہ اس کے حق میں قرائن ہونے چاہئیں۔

مَاجَاءَ فِی الْحِنْثِ عَلٰی مِنْبَرِ النَّبِیِّ ﷺ
منبر رسولؐ پر جھوٹی قسم کھانے کے متعلق روایات

❐ قَالَ یَحْیٰی حَدَّثَنَا مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ اَبِي وَقَّاصٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ نِسْطَاسٍ

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ حَلَفَ عَلٰی مِنْبَرِی آثِمًا تَبَوَّأَ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔

﴿جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص میرے اس منبر پر جھوٹی قسم کھائے گا تو وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنائے۔﴾

وضاحت :

اس روایت کی وضاحت اگلے باب میں آ رہی ہے۔

□ وَ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنِ الْعَلَاءِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ مَعْبَدِ بْنِ کَعْبٍ السُّلَمِیِّ عَنْ اَخِیْهِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ کَعْبِ بْنِ مَالِكٍ الْاَنْصَارِیِّ عَنْ اَبِی اُمَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ بِیَمِیْنِهٖ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ وَ اَوْجَبَ لَهُ النَّارَ قَالُوْا وَ اِنْ کَانَ شَیْئًا یَسِیْرًا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَ اِنْ کَانَ قَضِیْبًا مِنْ اَرَاكٍ وَ اِنْ کَانَ قَضِیْبًا مِنْ اَرَاكٍ وَ اِنْ کَانَ قَضِیْبًا مِنْ اَرَاكٍ قَالَهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ۔

﴿ابو امامہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کسی مسلم کا اپنی قسم کے ذریعے سے حق مارا تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام اور دوزخ کو واجب کر دے گا۔ لوگوں نے کہا حضور، اگر حقیر چیز ہو تب بھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جی اگر پیلو کی مسواک بھی ہو تب بھی۔ اگر پیلو کی مسواک بھی ہو تب بھی۔ اگر پیلو کی مسواک بھی ہو تب بھی۔ یہ بات آپ نے تین مرتبہ فرمائی۔﴾

وضاحت :

اس روایت کے متعلق ہمارے علماء حضرات نے بڑا اختلاف کیا ہے۔ وہ اس سوال کی طرف نکل گئے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ معمولی سی مسواک کے باعث اللہ تعالیٰ بندے کے اوپر دوزخ واجب کر دے اور جنت سے اس کو محروم کر دے۔ انھوں نے اس معارضے کا جواب دینے کی کوشش میں بحث کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

میرے نزدیک یہ بات بالکل صحیح ہے۔ اس میں اصلی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ حدیث میں چھوٹی سی چیز پر

ے عذاب کی اطلاع دی گئی ہے بلکہ سارا زور قسم پر ہے، جو بعض حالات میں جب شاہد اور قرائن اور دوسرے دلائل موجود نہ ہوں، عدل کا واحد ذریعہ ہوتی ہے- اللہ کی قسم کو کسی مسلمان کا حق مارنے کا ذریعہ بنانا بہت بڑا گناہ ہے- اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مچھر مارنے کے لیے توپ داغ دے- جب قسم اتنی بڑی اہمیت کی چیز ہو کہ معاملات میں فیصلہ کا واحد ذریعہ قرار پائے تو اس کو معمولی چیزوں کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے- ایک چھوٹی سی چیز، خواہ وہ مسواک ہی ہو، کو ہڑپ کرنے کے لیے اگر کسی مسلمان نے خدا کی قسم کو ذریعہ بنایا تو اس سے بڑھ کر اس کی محرومی اور کیا ہو سکتی ہے- اتنے بڑے گناہ کی سزا جنت سے محرومی اور دوزخ کا واجب ہونا ہی صحیح ہے-

جَامِعُ مَا جَاءَ فِي الْيَمِينِ عَلَى الْمِنبَرِ

منبر پر قسم کے بارے میں جامع باب

٦ قَالَ يَحْيَى قَالَ مَالِكٌ عَنْ دَاوُدَ ابْنِ الْحُصَيْنِ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا غَطَفَانَ بْنَ طَرِيفٍ الْمُرِّيَّ يَقُولُ اخْتَصَمَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ الْأَنْصَارِيُّ وَ ابْنُ مُطِيعٍ فِي دَارٍ كَانَتْ بَيْنَهُمَا إِلَى مَرْوَانَ بْنِ الْحَكَمِ وَهُوَ أَمِيرٌ عَلَى الْمَدِينَةِ فَقَضَى مَرْوَانُ عَلَى زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ بِالْيَمِينِ عَلَى الْمِنْبَرِ فَقَالَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ أَحْلِفُ لَهُ مَكَانِي قَالَ فَقَالَ مَرْوَانُ لَا وَاللّٰهِ إِلَّا عِنْدَ مَقَاطِعِ الْحُقُوقِ قَالَ فَجَعَلَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ يَحْلِفُ أَنَّ حَقَّهُ لَحَقٌّ" وَ يَأْبَى أَنْ يَحْلِفَ عَلَى الْمِنْبَرِ قَالَ فَجَعَلَ مَرْوَانُ بْنُ الْحَكَمِ يَعْجَبُ مِنْ ذٰلِكَ قَالَ مَالِكٌ لَا أَرَى أَنْ يُحَلَّفَ أَحَدٌ عَلَى الْمِنْبَرِ عَلَى أَقَلَّ مِنْ رُبُعِ دِينَارٍ وَذٰلِكَ ثَلَاثَةُ دَرَاهِمَ-

داؤد بن حصین سے روایت ہے کہ انہوں نے غطفان بن طریف المری سے سنا۔ وہ کہتے تھے کہ زید بن ثابت انصاریؓ اور ابن مطیع کے درمیان ایک مکان کے بارے میں، جس میں دونوں حصہ دار تھے، جھگڑا ہو گیا اور وہ مقدمہ مروان بن الحکم، جو مدینے کا امیر تھا، کے پاس لے گئے- مروان بن الحکم نے فیصلہ کیا کہ زید بن ثابت منبر پر قسم کھائیں- زید بن ثابت نے کہا کہ میں اپنی جگہ پر ہی قسم کھا لیتا ہوں- مروان بن حکم نے کہا نہیں- اللہ کی قسم آپ کو اس جگہ پر قسم کھانی پڑے گی جو حقوق کے فیصلوں کا

مقام ہے۔ زید بن ثابت قسم کھانے لگے کہ حق میرا ہے اور میں قسم کھا رہا ہوں لیکن منبر پر قسم کھانے سے انکار کیا۔ مروان کو اس پر بڑا تعجب ہوا۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ میرا یہ خیال ہے کہ منبر پر ربع دینار سے کم قیمت کی چیز کے بارے میں قسم نہیں لی جا سکتی۔ اور یہ تین درہم ہوتے ہیں۔

وضاحت :

حلف اٹھوانے کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے اور یہ عدالت کے پاس ان صورتوں میں فیصلہ کا ایک ذریعہ ہے جب گواہ اور ثبوت موجود نہ ہوں۔ منبر پر قسم لینا قسم کو مغلظ کرنے کے لیے تھا اور مروان نے اسی لیے حضرت زید بن ثابتؓ سے اس کا تقاضا کیا اور وہ برابر اس کا انکار کرتے رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو قسم کھانا ہی بڑا مرحلہ ہے۔ پھر قسم جب منبر نبوی پر کھائی جائے تو یہ چوآتشہ ہو جائے گی۔ اس لیے اس روایت میں جو پیچھے گزری نبی ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص منبر پر جھوٹی قسم کھائے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔ قسم کو مغلظ کرنے کا قرآن مجید میں کوئی ذکر نہیں۔

امام مالک کہتے ہیں کہ ربع دینار یا تین درہم سے کم قیمت کی چیز کے بارے میں منبر پر قسم نہیں لی جا سکتی۔ بعض فقہا نے قیمت اس سے بڑھا دی ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ عدالت کو یہ حق ہی نہیں کہ قسم اٹھوانے کے لیے کسی کو منبر پر لے جائے۔ شریعت میں صرف قسم ہے، اس کا مغلظ کرنے کا حکم نہیں۔ یہ بعد کی بدعت ہے۔ ایمان جتنا کم ہوتا گیا قسم کو اتنا ہی زیادہ مغلظ کرنا شروع کر دیا گیا۔ صدر اول میں جب دینی غیرت اور ایمان تھا لوگ سادہ قسم بھی اٹھانے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق یہ روایت گزر چکی ہے کہ انہوں نے فروخت کیا ہوا غلام واپس لے لیا مگر قسم کھانے پر آمادہ نہ ہوئے۔

قسم کھانا بہر حال اچھی بات نہیں ہے۔ بس ایک مجبوری ہے اور جائز ہے لیکن اس کو دو آتشہ کرنا بدعت ہے۔ لہذا قرآن اٹھوا کر قسم لینا اور مسجد میں جا کر قسم لینا سب جہالت ہے۔ میرے نزدیک احناف کی یہ بات بہت معقول ہے کہ تغلیظ یمین جائز نہیں۔

مَالَا يَجُوْزُ مِنْ غَلَقِ الرَّهْنِ

رہن کے ضبط کا جواز نہ ہونے کے بارے میں

❏ قَالَ يَحْيَى حَدَّثَنَا مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ

ﷺ قَالَ لَا يَغْلَقُ الرَّهْنُ قَالَ مَالِكٌ وَ تَفْسِيرُ ذٰلِكَ فِيمَا نُرَى وَاللّٰهُ اَعْلَمُ اَنْ يَرْهَنَ الرَّجُلُ الرَّهْنَ عِنْدَ الرَّجُلِ بِالشَّيْءِ وَ فِي الرَّهْنِ فَضْلٌ عَمَّا رُهِنَ فِيهِ فَيَقُولُ الرَّاهِنُ لِلْمُرْتَهِنِ اِنْ جِئْتُكَ بِحَقِّكَ اِلٰى اَجَلٍ يُسَمِّيهِ لَهُ وَاِلَّا فَالرَّهْنُ لَكَ بِمَا رُهِنَ فِيهِ. قَالَ فَهٰذَا لَا يَصْلُحُ وَلَا يَحِلُّ وَ هٰذَا الَّذِي نُهِيَ عَنْهُ وَ اِنْ جَاءَ صَاحِبُهُ بِالَّذِي رَهَنَ بِهِ بَعْدَ الْاَجَلِ فَهُوَ لَهُ وَ اُرٰى هٰذَا الشَّرْطَ مُنْفَسِخًا۔

﴿سعید بن مسیب راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رہن ضبط نہیں کیا جائے گا۔

امام مالک کہتے ہیں کہ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک آدمی کسی کے پاس کوئی چیز رہن رکھے اور رہن اس رقم سے زیادہ کا ہو جو رہن کے بدلے میں دی گئی ہے، پھر راہن اس شخص سے جس کے پاس رہن رکھ رہا ہے یہ کہے کہ اگر میں مقررہ مدت تک تمہارا حق ادا کروں تو یہ چیز میری ہے ورنہ یہ رہن آپ کا ہو گا۔ امام مالک کہتے ہیں کہ یہ معاملہ جائز نہیں اور حلال نہیں۔ اس سے منع کیا گیا ہے۔ اگر قرض لینے والا قرض کی رقم جس کے بدلے میں رہن رکھا گیا ہے مدت گزرنے کے بعد بھی واپس کرے تو رہن واپس لینا اسی کا حق ہے۔ میرے نزدیک مذکورہ شرط فسخ متصور ہو گی۔﴾

وضاحت:

زمانہ جاہلیت میں یہ بات تھی کہ مدت مقررہ کے بعد اگر راہن رقم ادا کرتا تو مرتہن کو حق ہوتا تھا کہ چاہے رہن شدہ چیز ضبط کرے یا زیادہ رقم کا مطالبہ کرے اور یہی سود تھا۔ یہ بات اسلام نے ختم کر دی۔ پس نہ ہی رہن ضبط ہو سکتا ہے اور نہ ہی مدت مقررہ کی شرط لگانا درست ہے۔

رہن رکھنا صرف مجبوری کی صورت میں جائز ہے۔ اگر قرض دینے والا رہن رکھتا ہے تو وہ شرافت کے خلاف کام کرتا ہے۔ رہن کو ہڑپ کرنے کے لیے کوئی تدبیر نہیں کرنی چاہیے۔ ورنہ یہ رویہ بالکل یہودیت ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ رہن کی صورت وہاں اختیار کی جائے جہاں قرض لکھنے کے لیے کاتب میسر نہ ہو۔ جہاں قرض کی تحریر کا موقع ہو وہاں رہن مقبوضہ کی اجازت نہیں۔ یہ تو صرف سفر کی مجبوریوں کی بنا پر جائز ہے۔ جیسے ہی مجبوریاں

ختم ہو جائیں رہن شدہ چیز لوٹا دی جائے۔ رہن ایک عارضی چیز ہے۔ اس سے کسی کو فائدہ اٹھانے کا حق نہیں۔

اَلْقَضَاءُ فِي الْمُسْتَكْرَهَةِ مِنَ النِّسَاءِ

اس عورت کے بارے میں فیصلہ جس کے ساتھ بالجبر برائی کی گئی ہو

حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّ عَبْدَ الْمَلِكِ بْنَ مَرْوَانَ قَضَى فِي امْرَأَةٍ أُصِيبَتْ مُسْتَكْرَهَةً بِصَدَاقِهَا عَلَى مَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ بِهَا قَالَ يَحْيَى سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُولُ اَلْأَمْرُ عِنْدَنَا فِي الرَّجُلِ يَغْتَصِبُ الْمَرْأَةَ بِكْرًا كَانَتْ أَوْ ثَيِّبًا إِنَّهَا إِنْ كَانَتْ حُرَّةً فَعَلَيْهِ صَدَاقُ مِثْلِهَا وَ إِنْ كَانَتْ أَمَةً فَعَلَيْهِ مَا نَقَصَ مِنْ ثَمَنِهَا وَالْعُقُوبَةُ فِي ذٰلِكَ عَلَى الْمُغْتَصِبِ وَلَا عُقُوبَةَ عَلَى الْمُغْتَصَبَةِ فِي ذٰلِكَ كُلِّهِ وَ إِنْ كَانَ الْمُغْتَصِبُ عَبْدًا فَذٰلِكَ عَلَى سَيِّدِهِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ أَنْ يُسَلِّمَهُ۔

﴿ابن شہاب سے روایت ہے کہ عبدالملک بن مروان نے ایک عورت کے بارے میں، جس کو مجبور کر کے اس کے ساتھ برائی کی گئی تھی، یہ فیصلہ کیا کہ جو شخص ملوث ہے وہ اس کا مہر ادا کرے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ہر اس شخص کے لیے جو ناجائز طور پر کسی عورت سے زیادتی کرے، خواہ وہ کنواری ہو یا شادی شدہ، فتویٰ یہ ہے کہ اگر عورت آزاد ہے تو زیادتی کرنے والے پر اس کا مہر مثل ہو گا اور اگر لونڈی ہے تو جتنی اس کی قیمت اس حادثے کی وجہ سے کم ہوئی اتنی قیمت دلوائی جائے گی۔ زیادتی کرنے کی سزا شرارت کرنے والے کو دی جائے گی، عورت کو نہیں۔ اور اگر زیادتی کرنے والا غلام ہو تو اس کی ذمہ داری اس کے مالک پر ہو گی الا یہ کہ وہ غلام کو حوالے کر دے۔﴾

وضاحت:

لونڈی اور غلاموں کا مسئلہ تو آج کل ختم ہو چکا لہٰذا اس حوالہ سے روایت پر بحث کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہاں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حقوق العباد کے سلسلے کی سزائیں کیا ایک وقت دی جا سکتی ہیں یا نہیں۔ یعنی ایک

سزا تو زیادتی کرنے والے کے زنا کے جرم کی ہوگی اور دوسری یہ کہ عورت کے نقصان کی تلافی کے لیے اس کو مال دینا ہوگا۔ یہ دونوں ایک ساتھ جاری ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ موجودہ قانون میں سزائیں جمع کی جاتی ہیں۔ مثلاً اتنا جرمانہ اور اتنی قید یا کوڑے۔ اگر جرمانہ ادا نہ کرے تو مزید قید۔ لیکن بعض صورتوں میں یہ بھی ہے کہ دونوں سزائیں ایک ساتھ جاری نہیں ہوں گی۔ میرے نزدیک دونوں سزائیں بیک وقت دی جا سکتی ہیں۔

اَلْقَضَاءُ فِيمَنِ ارْتَدَّ عَنِ الْإِسْلَامِ

اسلام سے مرتد کے متعلق فیصلہ

☐ حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ غَيَّرَ دِينَهُ فَاضْرِبُوا عُنُقَهُ وَ مَعْنَى قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ فِيمَا نُرَى وَاللّٰهُ اَعْلَمُ مَنْ غَيَّرَ دِينَهُ فَاضْرِبُوا عُنُقَهُ اَنَّهُ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْإِسْلَامِ اِلَى غَيْرِهِ مِثْلُ الزَّنَادِقَةِ وَ اَشْبَاهِهِمْ فَاِنَّ اُولٰئِكَ اِذَا ظُهِرَ عَلَيْهِمْ قُتِلُوا وَلَمْ يُسْتَتَابُوا لِاَنَّهُ لَا تُعْرَفُ تَوْبَتُهُمْ وَ اَنَّهُمْ كَانُوا يُسِرُّونَ الْكُفْرَ وَ يُعْلِنُونَ الْاِسْلَامَ فَلَا اَرَى اَنْ يُسْتَتَابَ هٰؤُلَاءِ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهُمْ قَوْلُهُمْ وَ اَمَّا مَنْ خَرَجَ مِنَ الاِسْلَامِ اِلَى غَيْرِهِ وَ اَظْهَرَ ذٰلِكَ فَاِنَّهُ يُسْتَتَابُ فَاِنْ تَابَ وَ اِلَّا قُتِلَ لَوْ اَنَّ قَوْمًا كَانُوا عَلَى ذٰلِكَ رَاَيْتُ اَنْ يُدْعَوْا اِلَى الْاِسْلَامِ وَ يُسْتَتَابُوا فَاِنْ تَابُوا قُبِلَ ذٰلِكَ مِنْهُمْ وَ اِنْ لَمْ يَتُوبُوا قُتِلُوا وَلَمْ يُعْنَ بِذٰلِكَ فِيمَا نُرَى وَاللّٰهُ اَعْلَمُ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْيَهُودِيَّةِ اِلَى النَّصْرَانِيَّةِ وَلَا مِنَ النَّصْرَانِيَّةِ اِلَى الْيَهُودِيَّةِ وَلَا مَنْ يُغَيِّرُ دِينَهُ مِنْ اَهْلِ الْاَدْيَانِ كُلِّهَا اِلَّا الْاِسْلَامَ فَمَنْ خَرَجَ مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَى غَيْرِهِ وَ اَظْهَرَ ذٰلِكَ فَذٰلِكَ الَّذِي عُنِيَ بِهِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

زید بن اسلمؒ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اس کی گردن اڑا دو۔ امام مالک کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کے قول کا مطلب، جہاں تک میرا خیال ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے، یہ ہے کہ جو شخص اسلام سے نکل کر کسی غیر دین کو اختیار کرے، جیسے زنادقہ یا ان کے بھائی بند، تو جب ان پر قابو پایا جائے تو ان کو قتل کر دیا جائے، ان سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ ان کی توبہ کا کچھ معلوم نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ کفر کو چھپاتے اور اسلام کا اعلان کرتے رہے- میرا خیال یہ ہے کہ ان لوگوں سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے نہ ان کے قول کو قبول کیا جائے- رہے وہ لوگ جو اسلام سے نکل کر کسی دوسرے دین کی طرف چلے جاتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں تو ان سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا- اگر توبہ کر لیں تو فبہا ورنہ قتل کر دیے جائیں- تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی قوم اس طرح کی ہو گی تو میری رائے میں اس کو اسلام کی طرف بلایا جائے گا اور توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا- اگر توبہ کر لیں تو وہ قبول کر لی جائے گی اور اگر توبہ نہ کریں تو قتل کر دیے جائیں گے- اس سے وہ لوگ مراد نہیں جو اپنا دین کسی اور دین سے بدل لیں، مثلاً یہودیت سے نصرانیت یا نصرانیت سے یہودیت- دوسرے ادیان کو بدلنے والے بھی مراد نہیں- مراد صرف وہ لوگ ہیں جو اسلام سے نکل کر کسی دوسرے دین میں چلے جائیں اور یہ تبدیلی ظاہر ہو- واللہ اعلم-"

وضاحت:

امام مالکؒ نے یہاں مرتد سے وہ لوگ مراد نہیں لیے جو سیدھے سادے طریقے سے کسی کے چکر میں پھنس کر کفر میں مبتلا ہوئے ہوں اور اسلام سے ہٹ گئے ہوں بلکہ زنادقہ، ملاحدہ اور شریر لوگ مراد لیے ہیں جو اسلام میں سرنگ لگاتے ہیں، اسلام کا انکار تو نہیں کرتے لیکن ایسے فلسفے چلاتے ہیں جو اسلام کی شدید ترین نفی کر دیتے ہیں- امام صاحب کا فتویٰ یہ ہے کہ ان پر قابو پانے کے بعد ان کو قتل کر دیا جائے گا اور ان سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ ایسے لوگوں کی توبہ کا کوئی اعتبار نہیں-

ارتداد کی ایک شکل بنی اسماعیل کے ارتداد کی تھی- مشرکین عرب یا دوسرے الفاظ میں بنی اسماعیل کے متعلق شریعت کا جو مسلمہ قانون قرآن مجید میں بیان ہوا ہے یہ ہے کہ اتمام حجت کے بعد ان کے لیے دو ہی راستے تھے- ایمان لائیں یا پھر تلوار ان کا فیصلہ کرے- وہ ذمی یا غلام نہیں بنائے جا سکتے تھے- کیونکہ ان پر اللہ کی طرف سے براہ راست حجت تمام کر دی گئی تھی- وہ اگر اسلام لا کر پھر کفر کی طرف آتے تو ان کی سزا بھی قتل تھی- ان کے ارتداد کی صورت میں ان سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا جس کے لیے تین دن یا اس سے زیادہ کی مہلت بھی دی جا سکتی ہے- مہلت کی مدت امیر کی صوابدید پر ہے- مہلت کی مدت گزر جانے کے بعد اسلام کی طرف نہ آنے کی

صورت میں ان کے قتل کا حکم تھا- زنادقہ و ملاحدہ اگر انفرادی یا اجتماعی صورت میں امن و امان کا مسئلہ پیدا کریں تو ان کے خلاف فوجی کارروائی ہو سکتی ہے، جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ کے دور خلافت میں اہل ردہ کے ساتھ ہوا- حضرت علیؓ نے خوارج کے معاملے میں بھی یہ کہا تھا کہ میں ان سے تعرض اس وقت تک نہ کروں گا جب تک یہ لوگ کوئی فساد نہ برپا کریں- اگر یہ بغاوت یا ہنگامہ کریں گے تو ان کے خلاف جنگ کروں گا- یہی پالیسی ہر اسلامی ریاست اپنائے گی-

اس دور میں حالات بالکل تبدیل ہو گئے ہیں- اب آپ کی یونیورسٹیوں میں مارکس، فرائڈ اور برگسان کے مرید پیدا ہو رہے ہیں- اخبار اٹھا کر دیکھ لیجئے کہ اب آپ کی تہذیب، تمدن، کلچر، ثقافت یہ ملاحدہ اور قلمی اداکار اور اداکارنیاں بنا رہی ہیں- اور آپ کے جو فرمانروا ہیں وہ ان کی جوتیاں سیدھی کرتے ہیں- بڑے بڑے لوگ جو مذہب کی منادی کرنے والے تھے اب وہ ان ملاحدہ کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں کہ نجات دہندہ یہی ہیں- وہ دن گئے جب یہ نشہ تھا کہ ہم اسلام قائم کریں گے- یہ زمانہ بڑے ابتلا کا ہے- ایک صحیح اسلامی مملکت کے لیے تو ضروری ہے کہ وہ زنادقہ و مرتدین کو قتل کرے لیکن آج یہ مسئلہ بہت مشکل ہو گیا ہے- اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ آپ ایسے لوگوں کی گردن اڑا سکیں- ایسا کرنے سے پہلے ان کا ہاتھ آپ کی گردن پر ہو گا-

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَبْدِ الْقَارِيِّ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهٗ قَالَ قَدِمَ عَلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَجُلٌ مِنْ قِبَلِ اَبِي مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ فَسَاَلَهٗ عَنِ النَّاسِ فَاَخْبَرَهٗ ثُمَّ قَالَ لَهٗ عُمَرُ هَلْ كَانَ فِيْكُمْ مِنْ مُغَرِّبَةِ خَبَرٍ فَقَالَ نَعَمْ رَجُلٌ كَفَرَ بَعْدَ اِسْلَامِهٖ قَالَ فَمَا فَعَلْتُمْ بِهٖ قَالَ قَرَّبْنَاهُ فَضَرَبْنَا عُنُقَهٗ فَقَالَ عُمَرُ اَفَلَا حَبَسْتُمُوْهُ ثَلَاثًا وَ اَطْعَمْتُمُوْهُ كُلَّ يَوْمٍ رَغِيْفًا وَاسْتَتَبْتُمُوْهُ لَعَلَّهٗ يَتُوْبُ وَ يُرَاجِعُ اَمْرَ اللّٰهِ ثُمَّ قَالَ عُمَرُ اَللّٰهُمَّ اِنِّي لَمْ اَحْضُرْ وَلَمْ آمُرْ وَلَمْ اَرْضَ اِذْ بَلَغَنِي-

﴿ عبد القاری اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت ابو موسیٰ اشعری کے پاس سے حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس آیا- انھوں نے لوگوں کا حال پوچھا تو اس نے بتایا- پھر حضرت عمرؓ نے پوچھا کوئی اہم خبر بھی ہے- اس نے کہا ہاں ایک شخص نے اسلام لانے کے بعد کفر کیا تھا- حضرت عمرؓ نے پوچھا تو آپ لوگوں نے اس کے ساتھ کیا کیا- اس شخص نے کہا کہ ہم نے اس کو پکڑا اور گردن مار

دی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ لوگوں نے اس کو تین دن کے لیے گرفتار کر لیا ہوتا۔ اس کو ہر روز ایک چپاتی کھانے کو دیتے اور اس سے توبہ کا مطالبہ کرتے۔ شاید وہ توبہ کرتا اور اللہ کے امر کی طرف لوٹتا۔ پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا اے اللہ! نہ میں موقع پر موجود تھا نہ میں نے حکم دیا اور نہ میں اس وقت اس پر راضی ہوا جب مجھے اطلاع ملی۔﴾

وضاحت:

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کا مطالبہ ضروری ہے اور اس کے لیے کم از کم تین دن کی مہلت ہونی چاہیے۔ امیر کی صوابدید پر زیادہ دن کی مہلت بھی دی جا سکتی ہے۔ امام مالک نے پچھلی روایت میں توبہ کی گنجائش بھی نہیں رکھی اور اس کی وجہ بیان کر دی ہے۔ دراصل ارتداد کی نوعیتیں مختلف ہیں اور ہر ایک شخص کا معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ امیر معاملے کی نوعیت اور اشخاص کے خاص حالات کو ملحوظ رکھ کر فیصلہ کرے گا۔

اَلْقَضَاءُ فِي مَنْ وَجَدَ مَعَ امْرَأَتِهِ رَجُلًا

اس شخص کے بارے میں جو اپنی بیوی کو دوسرے آدمی کے ساتھ دیکھ لے

☐ حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ سُهَيْلِ بْنِ أَبِي صَالِحٍ السَّمَّانِ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ قَالَ لِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ أَرَأَيْتَ إِنْ وَجَدْتُ مَعَ امْرَأَتِي رَجُلًا أُمْهِلُهُ حَتَّى آتِيَ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ نَعَمْ

﴿ابو صالح السمان حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ سعد بن عبادہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ حضور، اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ کسی اور مرد کو دیکھ لوں تو کیا میں اس سے اس وقت تک تعرض نہیں کر سکتا جب تک کہ میں چار گواہ نہ لاؤں۔ آپ نے فرمایا جی ہاں۔﴾

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّ رَجُلًا مِنْ أَهْلِ الشَّامِ يُقَالُ لَهُ ابْنُ خَيْبَرِيٍّ وَجَدَ مَعَ امْرَأَتِهِ رَجُلًا فَقَتَلَهُ أَوْ قَتَلَهُمَا مَعًا فَأَشْكَلَ عَلَى مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي

سُفْيَانَ الْقَضَاءُ فِيهِ فَكَتَبَ إِلَى أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ يَسْأَلُ لَهُ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ عَنْ ذٰلِكَ فَسَأَلَ أَبُو مُوسَى عَنْ ذٰلِكَ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ فَقَالَ لَهُ عَلِيٌّ إِنَّ هٰذَا الشَّيْءَ مَا هُوَ بِأَرْضِي عَزَمْتُ عَلَيْكَ لَتُخْبِرَنِّي فَقَالَ لَهُ أَبُو مُوسَى كَتَبَ إِلَيَّ مُعَاوِيَةُ بْنُ أَبِي سُفْيَانَ أَنْ أَسْأَلَكَ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ عَلِيٌّ أَنَا أَبُو حَسَنٍ إِنْ لَمْ يَأْتِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَلْيُعْطَ بِرُمَّتِهِ۔

«سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ اہل شام میں سے ایک شخص نے، جس کا نام ابن خیبری تھا، اپنی بیوی کے ساتھ ایک دوسرے آدمی کو پایا تو اس نے مرد کو یا ان دونوں کو قتل کر دیا۔ حضرت معاویہؓ کے لیے اس مقدمہ کا فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تو انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو لکھا کہ وہ اس بارے میں ان کے لیے حضرت علیؓ ابن ابی طالب سے پوچھیں۔ انہوں نے حضرت علیؓ سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ ہمارے علاقے کا واقعہ نہیں اور میں تاکید سے مطالبہ کرتا ہوں کہ مجھے بتائیں کہ یہ کہاں کا واقعہ ہے۔ اس پر حضرت ابو موسیٰ اشعری نے بتایا کہ حضرت معاویہؓ نے مجھے لکھا ہے کہ میں اس سے متعلق آپ سے پوچھوں۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ میرا لقب ابو حسن ہے۔ جب تک وہ چار گواہ نہ لائے، قاتل کو مقتول کے ورثا کے سپرد کر دیا جائے۔»

وضاحت:

"فلیعط برمته" کے شاہ ولی اللہ نے دو معنی بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ "قاتل کی رسی مقتول کے ورثا کو پکڑا دی جائے، وہ قاتل کے ساتھ جو چاہیں کریں"۔ دوسرے یہ کہ "مقتول کی دیت دی جائے" دونوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ دیت میں بھی یہ امکان ہوتا ہے کہ ورثا دیت قبول نہ کریں اور قاتل کو قصاص میں قتل کر دیں۔

یہ معاملہ بڑا نازک ہے۔ اگر شوہر کو یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ حالت غیر میں دیکھتے ہی عورت یا مرد کی گردن اڑا دے تو بڑے فساد ہو سکتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ قانون کا معاملہ ہے جسے عدالت میں ثابت کرنا ہو گا۔ اگر مقدمہ ثابت ہو جائے تو قاتل کے ساتھ یہ رعایت کی جا سکتی ہے کہ اس سے دیت لے لی جائے اور قصاص میں اس کو قتل نہ کیا جائے۔ شاہ ولی اللہ صاحب یہ مطلب لیتے ہیں کہ مقتول کے ورثا کو دیت کے اونٹ دے دیے جائیں

لیکن مجھے اس تعبیر پر اطمینان نہیں۔

رہا یہ مسئلہ کہ چار گواہ ایسے ہوں جو یہ گواہی دیں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے عورت اور مرد کو قابل اعتراض حالت میں دیکھا ہے تو یہ تعلیق بالمحال ہے۔ کسی بھی ملک اور معاشرہ میں یہ بات ممکن نہیں کہ اس طرح کے چار کیا ایک یا دو گواہ بھی مل جائیں۔ گواہ کے متعلق اب تک یہ بات میری تحقیق میں نہیں آئی کہ وہ زنا کے متعلق کس طرح کی گواہی دیں۔ میرے نزدیک قرینہ خود بھی گواہ ہے۔ پھر ڈاکٹر کی رپورٹ اور پولیس کا قابل اعتراض حالت میں پکڑنا یہ سب مل کر چار گواہ بن سکتے ہیں۔ سورہ یوسف میں قرینہ کے گواہ ہونے کی مثال موجود ہے۔ وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ (یوسف: ۲۷) اگر اس کی قمیض پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو یہ عورت جھوٹی ہے اور یوسف سچا ہے۔ قرینہ ایک ایسا گواہ ہوتا ہے جو جھوٹ نہیں بولتا جبکہ گواہ جھوٹ بول سکتا ہے۔ شہادت کے صحیح ہونے کے لیے فطری شرائط یہ ہیں کہ گواہ صادق اور امین ہو، اس پر حد نہ جاری ہوئی ہو، وہ اچھے کردار کا ہو اور واقعہ کا عینی شاہد ہو۔ ایک ہی واقعہ کے شاہد مختلف پہلو سے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ میں نے اس شخص کو فلاں کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا۔ کوئی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ہم نے اس کمرے کو کھولا تو ہم نے ان کو قابل اعتراض حالت میں پایا۔ کوئی اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس آدمی کی اس عورت کے ہاں آمد و رفت رہی ہے۔ یہ سب قرائن مل کر مقدمہ تیار ہوتا ہے۔ قرائن کی شہادت جدید قانون میں بھی تسلیم کی گئی ہے۔

بعض روایتوں میں اربعہ شہداء کے ساتھ المروۃ فی المکحلہ کے الفاظ آئے ہیں جن کا تقاضا یہ ہے کہ مرد اور عورت کو عین زنا کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا گیا ہو۔ آیا یہ الفاظ آنحضرت ﷺ کے ہیں یا بعد کے، یہ بات تحقیق طلب ہے۔ موطا حدیث کی قدیم ترین کتاب ہے۔ اس میں صرف اربعہ شہداء کے الفاظ ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی قید نہیں لگائی گئی۔ ایک تو اربعہ شہداء کی قید ہی تعلیق بالمحال ہے، اوپر سے المروۃ فی المکحلہ کی مزید شرط جرم کو بالکل ہی ناقابل گرفت بنا سکتی ہے۔

رہی یہ بات کہ اگر اس طریقہ سے جرم کے چار گواہ نہ ملیں تو کیا صورت ہوگی۔ میرے نزدیک ایسی شکل میں شوہر کے سامنے لعان کا اختیار موجود ہے۔ وہ اس اختیار کو استعمال کر کے اپنی بے وفا بیوی سے جان چھڑا سکتا ہے۔ لعان کی صورت اسی طرح کے معاملات کے لیے شریعت نے تجویز کی ہے اور یہ بات بالکل قطعی ہے کہ لعان

کے بعد میاں بیوی میں جدائی کرا دی جائے گی۔

اَلْقَضَاءُ فِی الْمَنْبُوْذِ
پھینکے ہوئے بچے کے متعلق فیصلہ

"منبوذ" پھینکے ہوئے بچے کو کہتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی عورت فتنے میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس میں بچے کی ذمہ داریاں اٹھانے کا حوصلہ ہوتا اور نہ ہی بدنامی کا مقابلہ کرنے کا، تو وہ بچے کو کسی جگہ پھینک دیتی ہے۔ بعض اوقات والدین اپنی جائز اولاد کو بھی غربت، فلاکت یا دماغی کمزوری کی وجہ سے پھینک دیتے ہیں۔ ایسے بچے کے بارے میں فیصلہ کیا ہوگا، یہ اس باب میں بیان ہوا ہے۔

قَالَ یَحْیٰی قَالَ مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سُنَیْنٍ اَبِیْ جَمِیْلَةَ رَجُلٌ مِنْ بَنِیْ سُلَیْمٍ اَنَّهُ وَجَدَ مَنْبُوْذًا فِیْ زَمَانِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ فَجِئْتُ بِهٖ اِلٰی عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ مَا حَمَلَكَ عَلٰی اَخْذِ هٰذِهِ النَّسَمَةِ فَقَالَ وَجَدْتُهَا ضَائِعَةً فَاَخَذْتُهَا فَقَالَ لَهٗ عَرِیْفُهٗ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِنَّهٗ رَجُلٌ صَالِحٌ فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ اَكَذٰلِكَ قَالَ نَعَمْ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اِذْهَبْ فَهُوَ حُرٌّ وَلَكَ وَلَاؤُهٗ وَ عَلَیْنَا نَفَقَتُهٗ قَالَ یَحْیٰی سَمِعْتُ مَالِكًا یَقُوْلُ الْاَمْرُ عِنْدَنَا فِی الْمَنْبُوْذِ اَنَّهٗ حُرٌّ وَ اَنَّ وَلَاءَهٗ لِلْمُسْلِمِیْنَ هُمْ یَرِثُوْنَهٗ وَ یَعْقِلُوْنَ عَنْهُ۔

ابن شہاب سنین ابی جمیلہ قبیلہ بنی سلیم کے آدمی سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک گرا پڑا بچہ پایا۔ اس کا بیان ہے کہ میں اس کو لے کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے پوچھا کہ اس جان کو کیوں اٹھائے پھر رہے ہو۔ اس شخص نے جواب دیا کہ میں نے گمان کیا کہ یہ جان ضائع ہو جائے گی تو اٹھا لیا۔ حضرت عمرؓ کے سیکرٹری نے کہا کہ امیر المومنین، یہ آدمی نیک ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا واقعی ایسا ہے؟ اس نے کہا جی ہاں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا جاؤ یہ آزاد ہے۔ اس کا ولاء تم کو حاصل ہوگا۔ اور اس کا خرچ ہم دیں گے۔

یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک کو یہ کہتے سنا کہ پھینکے ہوئے بچے کے بارے میں ہمارا فتویٰ

یہ ہے کہ وہ آزاد ہے- اس کا ولاء مسلمانوں کے لیے ہے- وہی اس کے وارث ہوں گے اور وہی اس کی دیت بھی دیں گے-

وضاحت :

"ولاء" عرب کے معاشرتی اور سماجی نظام کا بڑا اہم حصہ تھا- عرب کی زندگی قبائلی تھی- اس میں کوئی شخص کسی قبیلہ کے ساتھ تعلق کے بغیر نہیں کھپ سکتا تھا- اگر باہر کے کچھ لوگوں کو قبیلہ کے ساتھ وابستہ کرنا ہوتا تو اس کی صورت ولاء کی تھی- جن لوگوں کا نسب معلوم نہ ہوتا یا جو غلام آزاد ہوتے وہ ولاء کے رشتہ سے قبیلہ کا فرد بن جاتے- وہ جب مرتے تو ان کے مال کا وارث وہی قبیلہ بنتا- اگر ان سے کوئی جرم سرزد ہوتا تو تاوان یا دیت بھی قبیلہ کے ذمہ ہوتی- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھینکے ہوئے بچے کا مسئلہ بھی اسی قاعدے سے حل کیا کہ اس کی پرورش کی ذمہ داری اٹھانے والے کو اس کا ولاء دے دیا لیکن خرچہ بیت المال سے ادا کرنے کا حکم دیا-

مالکیہ یہ کہتے ہیں کہ منبوذ کا "ولاء" مسلمانوں کو من حیث القوم حاصل ہوگا- وہی اس کے وارث بھی ہوں گے اور دیت بھی دیں گے- میرے خیال میں امیر المومنین نے ٹھیک کیا کہ خرچہ بیت المال پر ڈالا جو سب مسلمانوں کا مشترکہ ہے اور ولاء کا فیصلہ بھی انہوں نے امیر کی حیثیت سے ایک صالح آدمی کے حق میں دے دیا جس کو بچے کی پرورش کی ذمہ داری سونپ دی تھی، تاکہ وہ پوری توجہ اور شفقت سے اس کو خاندان کا ایک فرد سمجھ کر اس کی پرورش کرے-

مالکیہ کے ہاں ایک چیز ہے قیاس مرسل- اس کا کوئی ضابطہ نہیں ہے- جن معاملات میں شریعت نے کوئی واضح ہدایت نہیں دی اور ان کا حل مسلمانوں کی مصلحت پر چھوڑ دیا ہے تو جس مصلحت کی طرف مسلمانوں کا ذہن جائے گا وہی شریعت ہے- احناف اس کو استحسان کہتے ہیں- حضرت عمرؓ کا عمل اسی کے تحت آتا ہے- یہ عمل حکمت اور مصلحت ملت کے نقطہ نظر سے بھی بہت اچھا تھا-

اَلْقَضَاءُ بِالْحَاقِ الْوَلَدِ بِاَبِيْهِ

بیٹے کو باپ کی طرف منسوب کرنے کے بارے میں فیصلہ

☐ قَالَ يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ

ﷺ انها قالت کان عتبۃ بن ابی وقاص عھد الی اخیہ سعد بن ابی وقاص ان ابن ولیدۃ زمعۃ منی فاقبضہ الیک قالت فلما کان عام الفتح اخذہ سعد وقال ابن اخی قد کان عھد الی فیہ فقام الیہ عبد بن زمعۃ فقال اخی و ابن ولیدۃ ابی ولد علی فراشہ فتساوقا الی رسول اللہ ﷺ فقال سعد یارسول اللہ ابن اخی قد کان عھد الی فیہ وقال عبد بن زمعۃ اخی و ابن ولیدۃ ابی ولد علی فراشہ فقال رسول اللہ ﷺ ھو لک یا عبد بن زمعۃ ثم قال رسول اللہ ﷺ الولد للفراش و للعاھر الحجر ثم قال لسودۃ بنت زمعۃ احتجبی منہ لما رأی من شبھہ بعتبۃ بن ابی وقاص قالت فما رآھا حتی لقی اللہ-

﴿حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ عتبہؓ بن ابی وقاص نے اپنے بھائی سعدؓ بن ابی وقاص کو یہ ذمہ داری سونپی کہ زمعہ کی لونڈی کا بیٹا مجھ سے ہے، تم اس کو اپنے قبضہ میں کر لینا- حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب مکہ فتح ہوا تو سعدؓ نے اس بچے کو لے لیا اور کہا کہ یہ میرے بھائی کا بیٹا ہے- اس نے اس کے بارے میں مجھے ذمہ دار ٹھہرایا ہے- عبد بن زمعہؓ اٹھے اور کہا کہ یہ میرا بھائی ہے- میرے باپ کی لونڈی کا بیٹا ہے اور اس کے بستر پر پیدا ہوا ہے- دونوں مقدمہ لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گئے- سعد بن ابی وقاصؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ یہ میرے بھائی کا بیٹا ہے- اس نے مجھے اس کی ذمہ داری سونپی ہے- عبد بن زمعہ نے کہا کہ یہ میرا بھائی ہے، میرے باپ کی لونڈی سے اس کے بستر پر پیدا ہوا ہے- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ تمہارا ہے اے عبد بن زمعہ- پھر آپ نے فرمایا کہ بیٹا اس کی طرف منسوب ہوگا جس کے بستر پر پیدا ہوا اور زانی کے لیے پتھر ہے- پھر آپ نے اپنی اہلیہ سودہ بنت زمعہ سے فرمایا کہ اس سے پردہ کرنا کیونکہ آپ نے اس لڑکے کے اندر عتبہ بن ابی وقاص کی مشابہت دیکھی- چنانچہ اس نے مرتے دم تک ان کو (حضرت سودہؓ بنت زمعہ کو) نہیں دیکھا-﴾

وضاحت:

غلامی کے نظام نے بڑے بڑے قضیے پیدا کر دیے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ آخر تک الجھے ہی رہے،

یہاں تک کہ یہ طے کرنا پڑا کہ نسب، اولاد اور وراثت کی تقسیم کے معاملات جس نہج پر جاہلیت میں طے پا چکے ہیں اب ان کو ادھیڑا نہیں جائے گا۔ جو شخص جس کا باپ یا بیٹا مان چکا سو مان چکا۔ اب وہی مانا جائے گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب یہ ہمارے مسائل نہیں۔ ہمارے لیے یہ صرف تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

الولد للفراش وللعاهر الحجر کا مطلب یہ ہے کہ جس کے بستر پر بچہ پیدا ہوا ہے، یعنی جس کی منسوبہ زوجہ سے پیدا ہوا ہے، وہ اسی کا ہے۔ فیصلہ کن چیز یہی ہے اور زانی کے منہ پر پتھر، نامرادی اور خاک ہے۔ یعنی تعلقات اگر ناجائز رہے ہیں تو اس کے باعث نامرادی ہاتھ آئے گی۔ بچے کی باپ کے ساتھ نسبت کا فیصلہ قیافہ سے نہیں کیا جائے گا۔ روایت کے حوالے سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصول پہلے سے معلوم و مروج تھا لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ حضورؐ نے یہ اصول بیان فرمایا۔

آنحضرتؐ کی زوجہ سودہؓ بنت زمعہ آپ کی ابتدائی ازواج میں سے تھیں اور یہ ان کے بھائی کا معاملہ تھا۔ آنحضرتؐ نے اس قضیہ کے بعد ان کو ہدایت کی کہ وہ اس بھائی سے پردہ کریں کیونکہ اس کی شکل و شباہت واقعی عتبہ بن ابی وقاص سے ملتی تھی۔ تاہم آپؐ نے بچے کی نسبت کا فیصلہ مذکور قانون کے مطابق فرمایا۔

☐ وَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَزِيدَ ابْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْهَادِي عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِبْرَاهِيمَ بْنِ الْحَارِثِ التَّيْمِي عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي اُمَيَّةَ اَنَّ امْرَاَةً هَلَكَ عَنْهَا زَوْجُهَا فَاعْتَدَّتْ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَ عَشْرًا ثُمَّ تَزَوَّجَتْ حِينَ حَلَّتْ فَمَكَثَتْ عِنْدَ زَوْجِهَا اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَ نِصْفَ شَهْرٍ ثُمَّ وَلَدَتْ وَلَدًا تَامًّا فَجَاءَ زَوْجُهَا اِلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهُ فَدَعَا عُمَرُ نِسْوَةً مِنْ نِسَاءِ الْجَاهِلِيَّةِ قُدَمَاءَ فَسَاَلَهُنَّ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَتِ امْرَاَةٌ مِنْهُنَّ اَنَا اُخْبِرُكَ عَنْ هٰذِهِ الْمَرْاَةِ هَلَكَ عَنْهَا زَوْجُهَا حِينَ حَمَلَتْ فَاُهْرِيقَتْ عَلَيْهِ الدِّمَاءُ فَحَشَّ وَلَدُهَا فِي بَطْنِهَا فَلَمَّا اَصَابَهَا زَوْجُهَا الَّذِي نَكَحَهَا وَاَصَابَ الْوَلَدَ الْمَاءُ تَحَرَّكَ الْوَلَدُ فِي بَطْنِهَا وَ كَبِرَ فَصَدَّقَهَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَ فَرَّقَ بَيْنَهُمَا وَ قَالَ عُمَرُ اَمَا اِنَّهُ لَمْ يَبْلُغْنِي عَنْكُمَا اِلَّا خَيْرٌ وَ اَلْحَقَ الْوَلَدَ بِالْاَوَّلِ۔

◈ سلیمان بن یسار عبد اللہ بن ابی امیہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت کے شوہر کی وفات ہو گئی۔

جب عدت کے چار ماہ دس دن گزر گئے تو اس نے حلت کے بعد دوسرا نکاح کر لیا- نئے شوہر کے پاس اس نے جب ساڑھے چار ماہ گزارے تو اس کے ہاں ایک پورا بچہ پیدا ہوا- اس کا شوہر حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ ماجرا سنایا- حضرت عمرؓ نے جاہلیت کے زمانہ کی بڑی بوڑھیوں کو بلوایا اور ان سے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ تو ایک مائی نے کہا کہ میں بتاتی ہوں کہ اس عورت کا کیا معاملہ ہے- یہ حاملہ تھی جب اس کا شوہر وفات پا گیا- بچے پر خون پڑتا رہا تو وہ پیٹ میں سوکھ گیا- پھر جب دوسرے شوہر سے ملاقات ہوئی تو بچے پر پانی پڑ گیا تو وہ حرکت میں آیا اور بڑا ہو گیا- حضرت عمرؓ نے مائی کی تصدیق کی اور عورت اور اس کے خاوند میں تفریق کر دی اور فرمایا کہ آپ دونوں سے مجھے بہت فائدہ ہوا- آپ نے بچے کو پہلے خاوند کی اولاد قرار دیا-

وضاحت:

اس طرح کا مسئلہ حل کرنے کے لیے حضرت عمرؓ موجودہ زمانے کی طرح کا کوئی میڈیکل بورڈ تو نہیں بٹھا سکتے تھے، یہی کر سکتے تھے کہ مائیوں وغیرہ سے مشورہ کریں کہ وہی ان معاملات کی خبر رکھتی تھیں- بچے کی پیدائش کی اقل مدت عام طور پر چھ ماہ مانی جاتی ہے- اس سے بھی کم مدت میں بچے کی ولادت کے بارے میں حضرت عمرؓ نے مائیوں کا مشورہ سن کر ان کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے رہنمائی دی- اس کو راوی حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ آپ نے ان کی رائے کی تصدیق کی- حالانکہ تصدیق کرنے کا سوال نہیں تھا- گفتگو کے نتیجہ میں یہ بات آپ کی سمجھ میں آئی کہ حمل پہلے ہی شخص کا ہے- زمانہ عدت میں استبراء رحم کا مقصد حاصل نہ ہوا اور عورت نے دوسرا نکاح کر لیا- یہ رائے قائم ہو جانے پر حضرت عمرؓ نے وہ فیصلہ کیا جو مہذب دنیا کا اخلاق ہے- آپ نے عورت کو طلاق دلوا دی اور بچہ اس کے پہلے شوہر سے منسوب کر دیا-

☐ وَحَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ أَنَّ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِ كَانَ يُلِيطُ أَوْلَادَ الْجَاهِلِيَّةِ بِمَنِ ادَّعَاهُمْ فِي الْإِسْلَامِ فَأَتَى رَجُلَانِ كِلَاهُمَا يَدَّعِي وَلَدَ امْرَأَةٍ فَدَعَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ قَائِفًا فَنَظَرَ إِلَيْهِمَا فَقَالَ الْقَائِفُ لَقَدِ اشْتَرَكَا فِيهِ فَضَرَبَهُ عُمَرُ بْنُ

الخطّاب بالدرّة ثمّ دعا المرأة فقال اخبريني خبرك فقالت كان هذا لاحد الرّجلين يأتيني وهي في ابلٍ لاهلها فلا يفارقها حتى يظنّ و تظنّ انّه قد استمرّ بها حبل ثمّ انصرف عنها فاهريقت عليه دماء ثمّ خلف عليها هذا تعني الآخر فلا ادري من ايّهما هو قال فكبّر القائف فقال عمر للغلام و الِ ايّهما شئت۔

﴿سلیمان بن یسار روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ جاہلیت کی اولاد کو ان سے منسوب کر دیتے جو اسلام میں ان کے مدعی ہوتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ دو آدمی آئے وہ دونوں ایک عورت کے بیٹے کے مدعی تھے۔ حضرت عمرؓ نے ایک قیافہ شناس کو بلایا۔ اس نے دونوں کو دیکھا تو قیافہ لگایا کہ اس میں دونوں شخص شریک ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس پر اپنا درہ اٹھایا۔ پھر عورت کو بلایا اور کہا کہ بی بی ٹھیک ٹھیک بتا کہ واقعہ کیا ہے۔ اس نے کہا کہ بچہ ان دونوں مردوں میں سے کسی ایک کا ہے۔ یہ آدمی میرے پاس آتا تھا جب میں اس گھر کے اونٹ چراتی تھی۔ یہ اس وقت تک میری جان نہیں چھوڑتا تھا جب تک یہ گمان نہ کر لے اور میں بھی گمان نہ کر لوں کہ حمل ہو گیا۔ پھر وہ چلا گیا اور بچے کے اوپر خون جاری رہا۔ پھر یہ دوسرا شخص آ گیا۔ اب میں نہیں جانتی کہ ان میں سے بچہ کس کا ہے۔ اس پر قیافہ شناس نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ حضرت عمرؓ نے لڑکے سے کہا کہ تم جس کے چاہو بیٹے بن جاؤ۔﴾

وضاحت:

زمانہ جاہلیت میں لونڈیوں کی کوئی عزت و ناموس نہ تھی۔ وہ ایک سے دوسرے شخص کو فروخت ہوتی تھیں اور وہ ان سے جنسی تعلق قائم کر لیتے تھے۔ جب بچہ پیدا ہوتا تو اس کے نسب کے بارے میں قضیہ پیدا ہو جاتا۔

حضرت عمرؓ نے فیصلہ کرنے کے لیے اگرچہ قیافہ شناس کو بلایا لیکن فیصلہ اس کی رائے پر نہیں کیا بلکہ لڑکے کے اوپر چھوڑ دیا کہ بالغ ہو کر جس کے ساتھ چاہے اپنا نسب جوڑ لے۔ بعض معاملات میں جدید قانون میں بھی بچے کو بلوغت کے بعد خود فیصلہ کرنے کو کہا جاتا ہے۔

احناف کا مسلک یہ ہے کہ وہ قیافے کو نہیں مانتے۔ ان روایات سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عمرؓ

نے قیافے کو کوئی اہمیت دی ہو بلکہ آپ نے حالات کے مطابق فیصلہ کیا- میرے نزدیک بھی قیافہ کوئی چیز نہیں-

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ أَوْ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ قَضَى أَحَدُهُمَا فِي امْرَأَةٍ غَرَّتْ رَجُلًا بِنَفْسِهَا وَذَكَرَتْ أَنَّهَا حُرَّةٌ فَتَزَوَّجَهَا فَوَلَدَتْ لَهُ أَوْلَادًا فَقَضَى أَنْ يَفْدِيَ وَلَدَهُ بِمِثْلِهِمْ قَالَ يَحْيَى سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُولُ وَالْقِيمَةُ أَعْدَلُ فِي هَذَا إِنْ شَاءَ اللَّهُ-

﴿امام مالک کی یہ بات پہنچی کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب یا حضرت عثمانؓ بن عفان دونوں میں سے کسی ایک نے ایک ایسی عورت کے بارے میں، جس نے ایک شخص کو یہ کہہ کر دھوکہ دیا تھا کہ وہ آزاد ہے تو اس شخص نے اس سے نکاح کر لیا اور اس کے اولاد بھی ہوئی، فیصلہ کیا کہ وہ اولاد کا فدیہ دے گا انہی کے مانند- امام مالک کہتے ہیں کہ قیمت زیادہ قرین انصاف ہے-﴾

وضاحت :

یہ روایت میری سمجھ میں نہیں آئی- جب آدمی آزاد ہے تو اولاد بھی آزاد ہو گی- فدیے یا قیمت کا کیا سوال؟ میرے خیال میں راوی نے معاملہ کو سمجھا نہیں-

اَلْقَضَاءُ فِي أُمَّهَاتِ الْأَوْلَادِ

ماں بننے والی لونڈیوں کے بارے میں فیصلہ

☐ قَالَ يَحْيَى قَالَ مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللَّهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ مَا بَالُ رِجَالٍ يَطَؤُونَ وَلَائِدَهُمْ ثُمَّ يَعْزِلُوهُنَّ لَا تَأْتِينِي وَلِيدَةٌ يَعْتَرِفُ سَيِّدُهَا أَنْ قَدْ أَلَمَّ بِهَا إِلَّا أَلْحَقْتُ بِهِ وَلَدَهَا فَاعْزِلُوا بَعْدَ ذَلِكَ أَوِ اتْرُكُوا-

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے کہا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنی لونڈیوں سے تعلقات زن و شو قائم کرتے ہیں، پھر ان کو چھوڑ دیتے ہیں۔ تو کوئی لونڈی اگر ایسی میرے پاس آئے گی جس سے اس کے آقا نے ملاقات کا اعتراف کیا ہو گا تو اس سے جو اولاد ہو گی میں

اس کو اسی آقا کے کھاتے میں ڈال دوں گا- اس کے بعد چاہے چھوڑ دیا جوڑ دو-﴾

وضاحت:

حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ جس مالک نے ملاقات کی ہے بچہ اسی کا ہے- چاہے بعد میں لونڈی کو چھوڑ دے چاہے رکھے رہے- اس میں حضرت عمرؓ مالک کو یہ رعایت دے رہے ہیں کہ وہ اگر وطی کا اعتراف کرے تب ایسا کیا جائے گا ورنہ نہیں- اس زمانہ میں غلامی کا یہ مسئلہ سرے سے موجود ہی نہیں رہا اس لیے اس میں زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں-

اَلْقَضَاءُ فِی عِمَارَۃِ الْمَوَاتِ

مردہ زمینوں کو آباد کرنے کے بارے میں فیصلہ

□ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ اَحْیَا اَرْضًا مَیْتَةً فَهِیَ لَهُ وَلَیْسَ لِعِرْقٍ ظَالِمٍ حَقٌّ. قَالَ مَالِكٌ وَالْعِرْقُ الظَّالِمُ كُلُّ مَا احْتُفِرَ اَوْ اُخِذَ اَوْ غُرِسَ بِغَیْرِ حَقٍّ-

﴿عروہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اس کی ہے اور اس پر کسی ناجائز تصرف کرنے والے کا حق نہیں- امام مالک کہتے ہیں کہ ناجائز تصرف یہ ہے کہ بغیر کسی حق کے اس میں کنواں کھودا جائے یا قبضہ کیا جائے یا اس میں درخت لگائے-﴾

□ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ مَنْ اَحْیَا اَرْضًا مَیْتَةً فَهِیَ لَهُ قَالَ مَالِكٌ وَ عَلٰی ذٰلِكَ الْاَمْرُ عِنْدَنَا-

﴿سالم بن عبداللہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ جس نے مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اس کی ہے- امام مالک کہتے ہیں کہ ہمارا فتویٰ یہی ہے-﴾

وضاحت:

زمین کے اوپر جب اللہ کے بندے آنے لگے تو کھیتی باڑی کا کام شروع ہوا- آغاز میں تو یہ ہوا کہ جتنا رقبہ

کسی نے آباد کر لیا وہ اس کا ہو گیا- اس کے مرنے پر یہ رقبہ اس کی آل اولاد کو منتقل ہوا- جوں جوں دنیا کی آبادی میں اضافہ ہوا، مزید رقبہ زیر کاشت آتا گیا، یہاں تک کہ اب زمین لوگوں کی قانونی ملکیت ہے یا بعض قطعات حکومت کی ملکیت ہیں- کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسرے کی زمین کو اپنے تصرف میں لے آئے یا اس میں کنواں کھودے یا اس پر قبضہ کر لے- البتہ اگر قطعے افتادہ پڑے ہوں اور مالکوں کو ان کے آباد کرنے کی فکر نہ ہو تو حکومت یہ حکم دے سکتی ہے کہ لوگ ان کو معین مدت میں آباد کریں، ورنہ حکومت کو حق ہو گا کہ وہ ان کو اپنے قبضہ میں لے کر ان کو آباد کرنے کا انتظام کرے-

یہ روایات غیر آباد افتادہ زمین کو آباد کرنے کا طریقہ بتاتی ہیں- آج کل حکومت جو زمین دیتی ہے وہ عام طور پر اس شرط کے تحت دیتی ہے کہ دو یا تین سال میں آباد کر لی جائے ورنہ حکومت کو حق ہو گا کہ زمین واپس اپنے قبضے میں لے لے اور کسی دوسرے شخص کو موقع دے کہ وہ مقررہ مدت میں آباد کرے- آنحضرت ﷺ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی افتادہ مردہ زمین کو آباد کرے گا تو وہ اسی کی ملکیت ہو گی اور کسی دوسرے کو یہ حق نہیں ہو گا کہ وہ اس میں کسی قسم کی مداخلت کرے- اسی پر حضرت عمرؓ کا عمل بیان کیا گیا ہے اور مالکیہ کا فتویٰ بھی یہی ہے- میرے نزدیک یہ بات نہایت معقول ہے کہ افتادہ زمینیں پڑی نہیں رہنی چاہئیں۔ ان کو آباد کرنا چاہیے، خواہ وہ زمین حکومت کی ملکیت ہو یا کسی دوسرے کی- میرا تجربہ یہ ہے کہ بعض زمینیں اس لیے غیر آباد پڑی ہوئی ہیں کہ ان کی آبپاشی کے لیے پانی میسر نہیں- جیسے ہی پانی کا بندوبست ہو جائے گا زمین آباد ہو جائے گی- آج کل زمین نے سرمائے کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اب افتادہ زمین بہت کم ہے- صرف ایسے علاقوں میں ہے جہاں پانی دستیاب نہیں اور بارش بھی نہیں ہوتی- خاص کر صحرائی علاقے غیر آباد ہیں جہاں زمین آباد کرنا ممکن نہیں-

اَلْقَضَاءُ فِی الْمِیَاهِ

پانی کے بارے میں فیصلے

حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِی بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ فِی سَیْلِ مَهْزُوْرٍ وَمَذَیْنَبٍ یُمْسَكُ حَتَّی الْكَعْبَیْنِ ثُمَّ یُرْسِلُ الْاَعْلٰی عَلَی الْاَسْفَلِ.

﴿عبداللہ بن ابی بکر کو یہ بات پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے مہزور اور مذینب کے سیلاب کے پانی کے بارے میں حکم دیا کہ اوپر کی زمینوں والے ٹخنوں تک روک کر باقی کو نیچے والوں کے لیے چھوڑ دیا کریں﴾

وضاحت :

مہزور اور مذینب مدینہ کے نزدیک دو وادیاں تھیں۔ ان کے سیلاب کا پانی لوگوں کے باغات کو سیراب کرتا لیکن جیسا کہ پانی کی قلت کے علاقوں میں ہوتا ہے بارشوں میں لوگ کدال یا پھاوڑے لے کر زمینوں پر پہنچ جاتے اور حریفوں کا پانی کاٹ کر اپنے رقبوں میں زیادہ پانی روکنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح بارش کا یہ پانی جھگڑے کا باعث بنتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کا فیصلہ یوں فرمایا کہ جو لوگ وادی کے اوپر کے حصے میں ہیں وہ ٹخنوں کی بلندی سے زیادہ پانی نہ روکیں اور اس سے زائد پانی کو نیچے والوں کے لیے چھوڑ دیں۔ ٹخنوں تک اونچا پانی زمین کی سیرابی کے لیے کافی ہوتا ہے اور اس سے زیادہ پانی روکنے میں دوسروں کی حق تلفی ہے۔ آج کل بھی نہروں، بندوں اور ڈیموں کے پانی کے استعمال کے قاعدے ہیں۔ ایک خاص مقدار تک پانی نہروں میں چھوڑا جاتا ہے اور بقیہ کو ملک کے زیریں حصہ کی آبپاشی کے لیے دریا میں بہنے دیا جاتا ہے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يُمْنَعُ فَضْلُ الْمَاءِ لِيُمْنَعَ بِهِ الْكَلَأُ

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فالتو پانی اپنے چارے اور چراگاہ کی حفاظت کے لیے نہیں روکا جائے گا۔﴾

وضاحت :

ایک تو پبلک کنواں ہوتا ہے جس کا پانی ہر ایک لے سکتا ہے اور اس میں باری ٹھہرائی جاتی ہے۔ یہ روایت اس کے متعلق نہیں بلکہ ذاتی کنویں سے متعلق ہے۔ اس میں مالک کا حق مقدم ہوگا۔ اس کے بعد جو فالتو پانی ہوگا اس کو روکنے کا حق مالک کو نہیں ہوگا۔ کنویں کے ارد گرد گھاس اور چارہ مالک کا ہوتا ہے۔ اس کی حفاظت کی بنا پر بھی مالک کو فالتو پانی روکنے کا حق نہیں ہوگا۔ ایک چیز جس کو "شفہ" کہتے ہیں یعنی ہونٹ تر کرنا یا پیاس بجھانا اس سے آپ نہیں روک سکتے۔ یہ ہونٹ خواہ انسانوں کے ہوں یا مویشیوں کے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کنویں کے پاس چارے کا

کھیت ہے، اس کو بکریاں یا اونٹ تباہ کر دیں گے۔ پانی دینا واجب ہے۔ کھیت سے روکنا آپ کا حق ہے۔ لیکن آپ اپنے کھیت کو بچانے کا بندوبست کریں۔ پانی پینے سے نہیں روک سکتے۔

یہ ضروری ہے کہ ہر کنویں کی حریم ہو یعنی اس کے ساتھ کچھ زمین چھوڑ دی جائے تا کہ جانور وہاں پر بیٹھ سکیں اور پانی پی سکیں۔ اگر کنویں کے ساتھ کسی دوسرے کی زمین ہو تو اس پر بھی کنویں کی حریم بنانے کے لیے قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی تفصیلات قاضی ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

۶ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ اَبِی الرِّجَالِ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ اُمِّهِ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَنَّهَا اَخْبَرَتْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا یُمْنَعُ نَقْعُ بِئْرٍ

﴿محمد بن عبدالرحمٰن کی والدہ عمرہ نے ان کو خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی کنویں کا نفع روکا نہیں جا سکتا۔﴾

وضاحت:

یہ روایت بھی اوپر والی روایت کے ہم معنی ہے۔ پانی ایسی چیز نہیں جس سے روکا جائے۔ یہ "ماعون" میں داخل ہے۔ قرآن مجید میں آخرت سے غافل لوگوں کا کردار بیان کرتے ہوئے ان کی حالت کی صفت بھی بتائی ہے کہ وہ ماعون یعنی استعمال کی معمولی اشیاء کو بھی لوگوں سے روکتے ہیں۔ تو کنویں کا پانی روکنے والے بھی مذکورہ کردار کے حامل ہوئے۔ چشموں کا پانی بھی اس میں شامل ہے۔ البتہ کارپوریشنوں اور میونسپل کمیٹیوں کا پانی اس میں شامل نہیں۔ ان کا پانی ملکی قوانین کے تحت ہی استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔

اَلْقَضَاءُ فِی الْمَرْفِقِ
فوائد کے متعلق فیصلہ

"مرفق" وہ سہولت یا فائدہ ہے جس میں مالک کا نقصان نہ ہو رہا ہو۔ اس کا ایک تو اخلاقی پہلو ہے کہ صرف اس بنیاد پر کہ آپ کسی چیز کے قانونی مالک ہیں دوسروں کو فائدہ نہ اٹھانے دیں۔ ایسا کرنے سے بہت سے مالی نقصانات ہوتے ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو شریعت کے نقطہ نظر سے ہے۔ شریعت نے حکومت کو یہ قانونی حق دیا ہے کہ اس طرح کی رکاوٹ یا ممانعت پیدا کرنے والے کو وہ روک سکتی ہے۔

□ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ یَحْیٰی الْمَازِنِی عَنْ اَبِیهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ۔

﴿یحییٰ مازنی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی نہ خود ضرر اٹھائے اور نہ کسی کو ضرر پہنچائے۔﴾

وضاحت :

یہ اسی طرح کا کلیہ ہے جیسا کہ لا ضرر ولا غرر کا کلیہ ہے۔

لا ضرر ولا غرر کا مطلب یہ ہے کہ معاملے کی وہ تمام شکلیں صحیح ہیں جن میں دونوں پارٹیوں میں سے کسی ایک کو نہ نقصان پہنچے نہ اس سے دھوکہ ہو۔ لا ضرر ولا ضرار کا مفہوم یہ ہے کہ معاملہ میں نہ ہم کو کسی سے نقصان پہنچے اور نہ ہم کسی کے نقصان کا سبب بنیں۔ ہمارے ہاں فریقین کے باہم معاملے میں یہ ایک بنیادی اصول ہے۔ اس کی روشنی میں کوئی ایسا معاملہ جائز نہیں جس میں فریقین میں سے ایک فریق کو نقصان پہنچ رہا ہو اور دوسرا اس نقصان کا ذمہ دار ہو لیکن نقصان میں شریک نہ ہو۔ یہ ان دس اصولوں میں سے ایک ہے جن کو فقہ کی بنیاد بتایا جاتا ہے۔

میرے نزدیک یہ جملہ دعا کا مفہوم بھی دیتا ہے اور معاملات کی بنیاد بھی فراہم کرتا ہے۔

□ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا یَمْنَعْ اَحَدُكُمْ جَارَهُ خَشَبَةً یَغْرِزُهَا فِی جِدَارِهِ ثُمَّ یَقُوْلُ اَبُوْهُرَیْرَةَ مَالِی اَرَاكُمْ عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ وَاللّٰهِ لَاَرْمِیَنَّ بِهَا بَیْنَ اَكْتَافِكُمْ

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی بھی اپنے پڑوسی کو اس سے نہ روکے کہ وہ اس کی دیوار میں اپنی کھونٹی ٹھوک لے۔ ابو ہریرہؓ نے یہ بھی فرمایا کہ کیا بات ہے کہ میں تمہیں اپنی بات سے اعراض کرتے دیکھتا ہوں۔ خدا کی قسم میں تمہارے آگے یہ چیز پھینکتا ہی رہوں گا۔﴾

وضاحت :

مطلب یہ ہے کہ ایک پڑوسی اگر آپ کی دیوار میں کوئی کھونٹی گاڑنا چاہتا ہے تو اس کو یہ سہولت دینی چاہیے الا آنکہ آپ کو نقصان پہنچ سکتا ہو۔ بغیر کسی معقول سبب کے اسے روکنا نہیں چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے قول پر شارحین نے بلاوجہ تفسیر شروع کر دی ہے کہ کیا اس زمانے میں مسلمانوں کی اخلاقی حالت اتنی گر گئی تھی کہ حضرت ابو ہریرہؓ کو یہ کہنا پڑا کہ تم سنو یا نہ سنو، میں تمہارے اوپر یہ مبارک تعلیم پھینکتا ہی رہوں گا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے اقوال سے کسی جگہ میرے اوپر یہ اثر نہیں پڑا کہ ان کی زندگی ہی میں مسلمانوں کی مومنی حالت اتنی بگڑ چکی تھی۔ اس زمانے میں آج کل کا سفلہ پن مشکل ہی سے ملتا ہو گا لیکن اکا دکا واقعات پیش آنا کوئی بعید بات نہیں۔ انسان ہمیشہ سے انسان ہی تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ اپنے مزاج کے لحاظ سے ان معاملات میں بڑے حساس تھے۔ انہوں نے سنا ہو گا یا کسی کو دیکھا ہو گا کہ اس طرح کی خست سے کام لے رہا ہے تو انہوں نے کہہ دیا ہو گا کہ سنو یا نہ سنو، میں تو تمہارے آگے یہ تعلیم پیش کرتا ہی رہوں گا۔

ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ محض اخلاقی نصیحتیں ہیں لیکن میرے نزدیک ان معاملات میں یہ کہنا کہ یہ محض ایک اخلاقی بات ہے، آپ کو اختیار ہے اس پر عمل کریں یا نہ کریں، درست نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وقت آئے جب قانون بنانے والوں کو مداخلت کرنی پڑے تو ایسی مداخلت غلط نہیں ہو گی۔ آگے والی روایت سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ عَمْرِو ابْنِ يَحْيَى الْمَازِنِی عَنْ اَبِيهِ اَنَّ الضَّحَّاكَ بْنَ خَلِيفَةَ سَاقَ خَلِيجًا لَهُ مِنَ الْعُرَيْضِ فَاَرَادَ اَنْ يَمُرَّ بِهِ فِی اَرْضِ مُحَمَّدِ بْنِ مَسْلَمَةَ فَاَبَى مُحَمَّدٌ فَقَالَ لَهُ الضَّحَّاكُ لِمَ تَمْنَعُنِی وَهُوَ لَكَ مَنْفَعَةٌ تَشْرَبُ بِهِ اَوَّلًا وَآخِرًا وَلَا يَضُرُّكَ فَاَبَى مُحَمَّدٌ فَكَلَّمَ فِيهِ الضَّحَّاكُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فَدَعَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ مُحَمَّدَ بْنَ مَسْلَمَةَ فَاَمَرَهُ اَنْ يُخَلِّیَ سَبِيلَهُ فَقَالَ مُحَمَّدٌ لَا فَقَالَ عُمَرُ لِمَ تَمْنَعُ اَخَاكَ مَا يَنْفَعُهُ وَهُوَ لَكَ نَافِعٌ تَسْقِی بِهِ اَوَّلًا وَآخِرًا وَهُوَ لَا يَضُرُّكَ فَقَالَ مُحَمَّدٌ لَا وَاللّٰهِ فَقَالَ عُمَرُ وَاللّٰهِ لَيَمُرَّنَّ بِهِ وَلَوْ عَلَى بَطْنِكَ فَاَمَرَهُ عُمَرُ اَنْ يَمُرَّ بِهِ فَفَعَلَ الضَّحَّاكُ۔

یحییٰ مازنی سے روایت ہے کہ ضحاک بن خلیفہ نے پانی کی ایک کھال وادی عریض سے نکالی اور چاہا کہ اس کو محمد بن مسلمہ کے رقبے میں سے گزارے تو محمد بن مسلمہ نے انکار کر دیا۔ ضحاک نے کہا کہ آپ کیوں روکتے ہیں جب کہ اس میں آپ کا بھی نفع ہے۔ آپ مجھ سے پہلے اس میں سے پیو گے اور آخر میں

بھی آپ کا حق رہے گا اور آپ کا اس میں کچھ نقصان بھی نہیں ہے۔ لیکن محمد بن مسلمہ نے انکار ہی کیا۔ ضحاک نے اس بارے میں حضرت عمر بن خطابؓ سے بات کی۔ حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ کو بلایا اور کہا کہ ان کا راستہ چھوڑ دیں۔ محمد بن مسلمہ نے انکار کیا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ اپنے بھائی کو اس چیز سے کیوں روکتے ہو جس میں آپ کا بھی نفع ہے۔ اور اول اور آخر اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ نیز اس میں آپ کا کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ محمد بن مسلمہ نے قسم کھا کر انکار کیا۔ حضرت عمرؓ نے بھی قسم کھا کر کہا کہ یہ ضرور اپنی کھال نکالیں گے اگرچہ تمہارے پیٹ پر سے نکالنی پڑے۔ حضرت عمرؓ نے ضحاک کو حکم دیا کہ کھال نکالیں، تو انہوں نے ایسا ہی کیا۔

وضاحت :

"عریض" وادی کا نام ہے۔ "خلیج" سے مراد معروف معنی میں خلیج نہیں ہے لیکن ہے یہ اسی طرح کی چیز بہت چھوٹے پیمانے پر۔ برساتی ندی نالے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ مدینہ کے گرد و نواح میں جب بارش ہوتی تو بعض جگہوں پر پانی زیادہ جمع ہو جاتا۔ مدینہ کے لوگ وہاں سے اپنے باغوں کے لیے نالیاں نکال لیتے تھے۔ اسی طرح کی ایک بڑی نالی یا کھال ضحاک نے بھی بنانی چاہی لیکن پانی کے ذخیرہ اور ان کے رقبے کے درمیان محمد بن مسلمہ کی زمین حائل تھی جنہوں نے ضحاک کو اپنی زمین میں سے کھال نکالنے کی اجازت نہ دی۔

محمد بن مسلمہؓ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ انہوں نے انکار کر دیا جس پر خلیفہ کو مداخلت کرنی پڑی اور انہوں نے محمد بن مسلمہؓ کی خواہش کے علی الرغم ضحاک کو کھال نکالنے کی اجازت دے دی۔ اس اجازت کی بنیاد یہ تھی کہ محمد بن مسلمہ کا کھال سے سیراب ہونے کا فائدہ ظاہر تھا اور وہ کوئی نقصان ثابت نہیں کر سکے۔ ان کا انکار صرف اس بنیاد پر تھا کہ رقبہ ان کا ہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اس طرح کے معاملات میں حکومت یا کارپوریشن مداخلت کر سکتی ہے۔ بعض فقہا نے اس معاملے میں تشدد کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی کی ملکیت میں بغیر اس کی اجازت کے دخل نہیں دینا چاہیے۔ یہ مولویانہ فتویٰ ہے اور ٹھیک نہیں۔ بلاشبہ یہ اصول تو ہے کہ مالک کو کوئی ضرر نہ ہو اور اگر ضرر ہو تو نفع اس سے زیادہ ہونا چاہیے۔ لیکن صرف اس بنیاد پر کہ آپ کا رقبہ ہے، آپ دوسرے آدمی کو ایک فائدہ اٹھانے سے روک نہیں سکتے۔ حکومت کو حق ہے کہ وہ اس میں مداخلت کرے اور اس

آدمی کو آپ کی مرضی کے خلاف اجازت دے دے۔

□ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ عَمْرِوبْنِ یَحْیَی الْمَازِنِی عَنْ اَبِیْهِ اَنَّهُ قَالَ کَانَ فِی حَائِطِ جَدِّهِ رَبِیعٌ لِعَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ عَوْفٍ فَاَرَادَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ اَنْ یُحَوِّلَهُ اِلٰی نَاحِیَةٍ مِنَ الْحَائِطِ هِیَ اَقْرَبُ اِلٰی اَرْضِهٖ فَمَنَعَهُ صَاحِبُ الْحَائِطِ فَکَلَّمَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِ فِی ذٰلِكَ فَقَضٰی لِعَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ بِتَحْوِیْلِهٖ۔

﴿یحییٰ مازنی کہتے ہیں کہ ان کے دادا کے باغ میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے لیے ایک چھوٹی نالی تھی۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے چاہا کہ اس کا رخ باغ کے اس گوشے کی طرف پھیر دیں جو ان کی زمین سے قریب تر ہو۔ باغ کے مالک نے انھیں اس سے روک دیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت عمرؓ سے بات کی تو انھوں نے نالی کا رخ پھیرنے کے معاملہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے حق میں فیصلہ دے دیا۔﴾

وضاحت :

انسان ہمیشہ انسان رہتا اور جذباتی کیفیات کی زد میں رہتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ انسان کو ملکیت کا کچھ غلط تصور ہو جاتا ہے اور وہ اخلاقی حدود کو پہچاننے سے قاصر رہ جاتا ہے۔

بات اس روایت میں بھی وہی ہے جو پچھلی روایت میں ہے کہ جب ایک شخص کو دوسرے کو کوئی سہولت مہیا کرنے سے نقصان نہ ہوتا ہو تو اسے اپنے پڑوسی کو فائدہ پہنچانا چاہیے۔ اسے اپنی ملکیت کے باعث رکاوٹ پیدا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ سب قوانین زمینداری اور کارپوریشن سے متعلق ہیں۔

اَلْقَضَاءُ فِی قَسْمِ الْاَمْوَالِ

مالوں کی تقسیم کے بارے میں فیصلہ

□ حَدَّثَنِی یَحْیَی عَنْ مَالِكٍ عَنْ ثَوْرِ بْنِ زَیْدِ الدِّیْلِیِّ اَنَّهُ قَالَ بَلَغَنِی اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَیُّمَا دَارٍ اَوْ اَرْضٍ قُسِمَتْ فِی الْجَاهِلِیَّةِ فَهِیَ عَلٰی قَسْمِ الْجَاهِلِیَّةِ وَ اَیُّمَا دَارٍ اَوْ اَرْضٍ

اَدرَکَھَا الْاِسْلَامُ وَلَمْ تُقْسَمْ فَھِیَ عَلٰی قَسْمِ الْاِسْلَامِ۔

﴿ثور بن زید دیلی کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی گھر یا رقبہ جاہلیت میں تقسیم ہو چکا ہو وہ جاہلیت کی تقسیم ہی پر رہے گا اور جس گھر یا رقبہ کی تقسیم کا مرحلہ اسلام کے آنے تک پیش نہیں آیا وہ اسلام کے اصولوں پر تقسیم ہو گا۔﴾

وضاحت:

مطلب یہ ہے کہ غیر منقولہ جائداد کی تقسیم کے بارے میں جو فیصلے اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں کر دیے گئے اسلام میں ان کو نہیں بدلا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس باب کو دوبارہ کھولنے میں بہت جھگڑے اور بکھیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ لہذا جاہلیت میں جو ہو چکا وہ مانا جائے گا۔ اس میں کوئی ردوبدل نہیں ہو گا۔ مکان یا رقبہ اسی کا ہے جس کو مل چکا۔ اس کا حق تسلیم کر لیا جائے گا۔ صرف ان معاملات میں اصلاح ہو گی جن کا تعلق دین کے اصولی مسائل سے ہے۔

ہمارے ہاں کے بعض دانشمند معاملات کی ان باریکیوں کو نہیں سمجھتے۔ انہوں نے عشری اور خراجی زمینوں کے بارے میں کہیں پڑھ لیا ہے تو آج وہ پاکستان کی زمینوں کے بارے میں وہی حکم لگانا چاہتے ہیں جو صدر اول میں مسلمانوں نے مفتوح علاقوں پر لگایا تھا۔ یہ ایک فضول بات ہے۔ کوئی صفت زمین کے ساتھ چپکی نہیں رہتی۔ ہر صفت کا تعلق مالکوں سے ہوتا ہے۔ پورے رقبے کا تعلق ریاست سے ہوتا ہے۔ زمین کا اصل مالک خدا تعالیٰ ہے اور خدا کی خلیفہ حکومت ہوتی ہے۔ زمین کے موجودہ مالکوں کے بارے میں یہ بحث نہیں ہو سکتی کہ فلاں زمانے میں اس زمین کا مالک یہودی یا نصرانی یا ہندو تھا۔ یہ سب بحثیں ختم ہو چکی ہیں۔ جو تقسیم چلی آ رہی ہے وہ اصولاً آپ کو آج بھی ماننی پڑے گی۔ البتہ مفتوح اہل ذمہ کے بارے میں آپ کو مداخلت کرنے کا حق ہے۔ معاہد اہل ذمہ کے بارے میں نہیں۔ معاہد اہل ذمہ کے ساتھ جو معاہدہ ہو گا اس کے مطابق عمل ہو گا۔ مثلاً پاکستان کے اہل ذمہ معاہد اہل ذمہ ہیں۔ ان سے متعلق جو معاہدہ ہو چکا ہے بس اسی پر فیصلہ ہو گا۔ آپ ان پر کوئی اور چیز لاگو نہیں کر سکتے۔ ان کی املاک اور معاہدہ کا تحفظ کیا جائے گا۔ یہ چیز اسلام میں مسلم ہے۔

مَالَا یَجُوزُ مِنَ النَّحْلِ

کون سا عطیہ جائز نہیں

☐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ

عبدالقاری اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ مَابَالُ رِجَالٍ یَنْحَلُوْنَ اَبْنَاءَ هُمْ نُحْلًا ثُمَّ یُمْسِکُوْنَهَا فَاِنْ مَاتَ ابْنُ اَحَدِهِمْ قَالَ مَالِیْ بِیَدِیْ لَمْ اُعْطِهِ اَحَدًا وَ اِنْ مَاتَ هُوَ قَالَ هُوَ لِابْنِیْ قَدْ کُنْتُ اَعْطَیْتُهُ اِیَّاهُ مَنْ نَحَلَ نِحْلَةً فَلَمْ یَحُزْهَا الَّذِیْ نُحِلَهَا حَتّٰی یَکُوْنَ اِنْ مَاتَ لِوَرَثَتِهٖ فَهِیَ بَاطِلٌ۔

﴿عبدالرحمٰن بن عبدالقاری سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ لوگوں کا عجیب حال ہے کہ اپنے بیٹوں کو کچھ عطیہ دیتے ہیں تو اسے اپنے قبضہ میں رکھتے ہیں۔ اگر بیٹا مر گیا تو کہہ دیا کہ میرا مال میرے ہاتھ میں محفوظ ہے، میں نے یہ کسی کو نہیں دیا۔ اور اگر خود کو موت آگئی تو کہا کہ یہ میرے بیٹے کا ہے، میں نے اس کو دے دیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر کسی نے اس طرح کا ہبہ کیا اور جس کو ہبہ کیا گیا اس نے اس پر قبضہ نہیں کیا کہ اگر وہ مر جائے تو اس کے ورثا کا ہو سکے تو اس طرح کا ہبہ باطل ہو گا۔﴾

وضاحت:

یہ ہبہ کرنے والوں کی ایک چالاکی بتائی ہے کہ قبضہ نہیں کراتے تھے تاکہ موھوب لہٗ کی وفات کی صورت میں ہبہ ساقط ہو جائے اور معطی کا ہی رہے۔ موھوب لہٗ کے وارث اس کے حق دار نہ ہو سکیں۔ اور اگر معطی کی وفات ہو جائے تو یہ موھوب لہٗ کا حق رہے۔ دوسرے ورثا کو کچھ کہنے کا موقع نہ ملے۔ حضرت عمرؓ نے قانون بنایا کہ قبضہ ضروری ہے ورنہ ہبہ باطل ٹھہرے گا۔

اَلْقَضَاءُ فِی الْهِبَةِ

ہبہ کے بارے میں فیصلہ

☐ حَدَّثَنِیْ مَالِكٌ عَنْ دَاوُدَ بْنِ الْحُصَیْنِ عَنْ اَبِیْ غَطَفَانَ بْنِ طَرِیْفٍ الْمُرِّیِّ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ مَنْ وَهَبَ هِبَةً لِصِلَةِ رَحِمٍ اَوْ عَلٰی وَجْهِ صَدَقَةٍ فَاِنَّهٗ لَا یَرْجِعُ فِیْهَا وَمَنْ وَهَبَ هِبَةً یَرٰی اَنَّهٗ اِنَّمَا اَرَادَ بِهَا الثَّوَابَ فَهُوَ عَلٰی هِبَتِهٖ یَرْجِعُ فِیْهَا اِذَا لَمْ یُرْضَ مِنْهَا قَالَ یَحْیٰی سَمِعْتُ مَالِكًا یَقُوْلُ الْاَمْرُ الْمُجْتَمَعُ عَلَیْهِ عِنْدَنَا اَنَّ الْهِبَةَ اِذَا تَغَیَّرَتْ عِنْدَ الْمَوْهُوْبِ لَهٗ

لِلثَّوَابِ بِزِيَادَةٍ اَوْ نُقْصَانٍ فَاِنَّ عَلَى الْمَوْهُوْبِ لَهُ اَنْ يُعْطِيَ صَاحِبَهَا قِيْمَتَهَا يَوْمَ قَبَضَهَا۔

﴿ابو غطفان بن طریف بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جس کسی نے کسی کو صلہ رحمی یا صدقہ کے طور پر ھبہ کیا تو اس میں رجوع کرنا جائز نہیں۔ اور جس کسی نے ھبہ کیا اور اس سے مقصود اچھا رد عمل تھا تو وہ اپنے ھبہ پر اختیار رکھتا ہے۔ وہ اس سے رجوع کر سکتا ہے جب موھوب لہٗ کے طرز عمل سے راضی نہ ہو۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں یہ بات متفق علیہ ہے کہ اچھے طرز عمل سے مشروط ہبہ میں اگر موھوب لہٗ کے ہاں کمی بیشی واقع ہو جائے تو موھوب لہٗ پر واجب ہے کہ وہ ہبہ کرنے والے کو اس دن کی رائج قیمت دے جس روز اس نے قبضہ کیا تھا۔﴾

وضاحت :

ھبہ اگر اللہ کی رضا کے لیے کیا ہے تو اس کا رجوع کرنا ایسا ہے جیسے قے کر کے خود اس کو چاٹنا۔ لیکن اگر آپ نے ھبہ اس لیے کیا ہے کہ موھوب لہٗ آپ کے ساتھ اچھا معاملہ رکھے گا، حسن سلوک سے پیش آئے گا تو یہ ھبہ کو خاص حالات سے مخصوص کر دیتا ہے۔ اس صورت میں چونکہ ھبہ کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہے، اس لیے اگر وہ شرائط پوری نہ ہوں تو ہبہ کو واپس لیا جا سکتا ہے۔ اس کے متعلق امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ علمائے اہل مدینہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر موہوب لہٗ کے پاس ہبہ میں کچھ تغیر واقع ہو جائے اور اس کی قیمت میں کمی وبیشی ہو جائے تو ہبہ کی واپسی کی صورت میں واپسی کے روز اس کی قیمت کی تشخیص ہو گی اور ہبہ کے دن کی قیمت سے کمی وبیشی کا حساب ہو گا۔

اَلْقَضَاءُ فِي الْعُمْرٰى

حین حیات کے لیے دی ہوئی چیز کے متعلق فیصلہ

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ بْنِ شِهَابٍ عَنْ اَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْاَنْصَارِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَيُّمَا رَجُلٍ اُعْمِرَ عُمْرٰى لَهُ وَلِعَقِبِهِ فَاِنَّهَا لِلَّذِي يُعْطَاهَا لَا تَرْجِعُ اِلَى الَّذِي اَعْطَاهَا اَبَدًا لِاَنَّهُ اَعْطَى عَطَاءً وَقَعَتْ فِيْهِ الْمَوَارِيْثُ۔

﴿جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے حینِ حیات کے لیے کسی شخص اور اس کے اخلاف کے لیے کچھ دیا، تو وہ اس کا ہو جائے گا جس کو دیا گیا ہے۔ وہ اس شخص کو اب کبھی نہیں لوٹے گا جس نے وہ دیا تھا، کیونکہ اس کے دیے ہوئے میں اب وراثت قائم ہو گئی۔﴾

وضاحت:

عمریٰ سے مراد وہ چیز ہے جو کسی کو حینِ حیات استعمال کے لیے دے دی جائے۔ عمریٰ کسی شرط کے ساتھ مشروط بھی ہو سکتا ہے۔ شرط اگر یہ ہے "لك و لعقبك" تمہارے لیے اور تمہارے اخلاف کے لیے، تو دینے والے کا حق اس پر سے ساقط ہو جائے گا اور عمریٰ پانے والے کی وفات کی صورت میں وراثت لاگو ہو جائے گی۔ لیکن اگر اس طرح کی بات نہیں کہی گئی بلکہ یہ واضح کر دیا گیا کہ تم اس چیز کو اپنی یا میری زندگی تک استعمال میں لا سکتے ہو تو وہ چیز دونوں میں سے کسی ایک کی وفات کے بعد لوٹ آئے گی۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْقَاسِمِ اَنَّهُ سَمِعَ مَكْحُولَ الدِّمَشْقِيَّ يَسْأَلُ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ عَنِ الْعُمْرٰى وَمَا يَقُولُ النَّاسُ فِيهَا فَقَالَ الْقَاسِمُ بْنُ مُحَمَّدٍ مَا اَدْرَكْتُ النَّاسَ اِلَّا وَهُمْ عَلٰى شُرُوطِهِمْ فِي اَمْوَالِهِمْ وَ فِيمَا اُعْطُوا قَالَ يَحْيٰى سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُولُ وَ عَلٰى ذٰلِكَ الْاَمْرُ عِنْدَنَا اَنَّ الْعُمْرٰى تَرْجِعُ اِلَى الَّذِي اَعْمَرَهَا اِذَا لَمْ يَقُلْ هِيَ لَكَ وَلِعَقِبِكَ۔

﴿عبدالرحمٰن بن قاسم سے روایت ہے کہ انہوں نے مکحول دمشقی کو قاسم بن محمد سے عمریٰ اور اس کے بارے میں لوگوں کے فتووں کے متعلق سوال کرتے سنا۔ قاسم بن محمد نے جواب دیا کہ میں نے تو لوگوں کو اپنے عطیوں اور مالوں کے معاملے میں اپنے اپنے شرائط ہی پر پایا۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ عمریٰ ہمیشہ دینے والے کی طرف لوٹ جائے گا، جب تک اس نے یہ وضاحت نہ کر دی ہو کہ یہ تیرے اور تیرے اخلاف کے لیے ہے۔﴾

وضاحت:

مطلب یہ ہے کہ لوگ بالعموم کسی کو کوئی چیز استعمال کے لیے دیتے وقت شرائط عائد کر دیتے ہیں تو فیصلہ

انہی شرائط کے مطابق ہوگا- یہ بات بالکل معقول ہے کیونکہ اس میں جائداد کی منتقلی کا سوال پیدا ہوتا ہے لہذا شرائط کی تصریح ضروری ہے- اگر کسی نے واضح شرائط عائد نہ کی ہوں تو پھر شبہ کا فائدہ عمریٰ دینے والے کو ملنا چاہیے، اگر وہ اس کا مدعی ہے-

□ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ وَرِثَ مِنْ حَفْصَةَ بِنْتِ عُمَرَ دَارَهَا قَالَ وَ كَانَتْ حَفْصَةُ قَدْ اَسْكَنَتْ بِنْتَ زَيْدِ بْنِ الْخَطَّابِ مَا عَاشَتْ فَلَمَّا تُوُفِّيَتْ بِنْتُ زَيْدٍ قَبَضَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ الْمَسْكَنَ وَرَاٰى اَنَّهُ لَهُ-

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت حفصہ بنت عمرؓ سے وراثت میں ان کا گھر پایا- حضرت حفصہ نے اس گھر میں زید بن خطاب کی لڑکی کو عمر بھر کے لیے ٹھہرا رکھا تھا- جب بنت زید کی وفات ہو گئی تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مکان پر قبضہ کر لیا- ان کا خیال تھا کہ وہ اس کے حق دار ہیں-﴾

وضاحت :

اس واقعہ میں اوپر والی روایت کی دلیل ہے کہ عمریٰ یا ہبہ حیات ہبہ میں جب تک لک و لعقبک کی شرط نہ ہو وہ دینے والے یا اس کے ورثا کی طرف لوٹ جاتا ہے-

اَلْقَضَاءُ فِی اللُّقَطَةِ

گرے پڑے مال کے بارے میں فیصلہ

□ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ اَبِی عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ يَزِيدَ مَوْلَی الْمُنْبَعِثِ عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِیِّ اَنَّهُ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَسَاَلَهُ عَنِ اللُّقَطَةِ فَقَالَ اعْرِفْ عِفَاصَهَا وَوِكَاءَهَا ثُمَّ عَرِّفْهَا سَنَةً فَاِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا وَ اِلَّا فَشَاْنُكَ بِهَا قَالَ فَضَالَّةُ الْغَنَمِ يَا رَسُولَ اللّٰهِ قَالَ هِیَ لَكَ اَوْ لِاَخِيكَ اَوْ لِلذِّئْبِ قَالَ فَضَالَّةُ الْاِبِلِ قَالَ مَالَكَ وَلَهَا مَعَهَا سِقَاؤُهَا وَحِذَاؤُهَا تَرِدُ الْمَاءَ وَتَاْكُلُ الشَّجَرَ حَتّٰی يَلْقَاهَا رَبُّهَا-

﴿زید بن خالد جہنی سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا- اس نے

گرے پڑے مال کا حکم پوچھا- آپ نے فرمایا کہ اس چیز کا برتن اور بندھن پہچان رکھو اور ایک سال تک اس کو پہچنواؤ- اگر مالک آجائے تو اس کو دے دو ورنہ اس سے جو چاہو کرو- اس نے کہا کہ یا رسول اللہ اگر بکری ہو؟ آپ نے فرمایا کہ اس کا فائدہ تم اٹھاؤ گے یا تمہارا بھائی ورنہ بھیڑیا کھا جائے گا- اس نے کہا حضورؐ اگر گم شدہ اونٹ ہو؟ آپ نے فرمایا، اس سے تمہیں کیا بحث؟ اس کا مشکیزہ اور جوتا اس کے ساتھ ہے- چشمے پر جا کر پانی پی لے گا، جنگل میں جا کر چرے گا، یہاں تک کہ اس کا مالک اسے پالے گا-»

وضاحت:

گری پڑی چیز کے بارے میں سائل کے سوال پر آنحضرت ﷺ نے جو جواب دیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر آدمی اس چیز کو اٹھالے تو اس کے مالک کی تلاش میں اسے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھنی چاہیے- ایک سال تک اس کا اعلان کراتے رہنا چاہیے اور اگر مالک نہ ملے تب وہ چیز اس کی ہو جائے گی- چھوٹے جانور کی صورت میں مالک کے ملنے تک اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے- ایسے بڑے جانور جو اپنا دفاع خود کر سکتے ہیں تو ان کو قبضہ میں لے کر خواہ مخواہ ان کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لینی چاہیے- مشکیزہ اور جوتا تعبیر ہے اس بات کی کہ اونٹ اپنا پیٹ خود بھر سکتا ہے اور اپنے پاؤں سے چل پھر سکتا اور خطرے کی صورت میں بھاگ سکتا ہے-

□ وَحَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ أَيُّوبَ بْنِ مُوسٰی عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بَدْرٍ الْجُهَنِيِّ أَنَّ أَبَاهُ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ نَزَلَ مَنْزِلَ قَوْمٍ بِطَرِيْقِ الشَّامِ فَوَجَدَ صُرَّةً فِيهَا ثَمَانُونَ دِينَارًا فَذَكَرَهَا لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ عَرِّفْهَا عَلٰی أَبْوَابِ الْمَسَاجِدِ وَ اذْكُرْهَا لِكُلِّ مَنْ يَأْتِي مِنَ الشَّامِ سَنَةً فَإِذَا مَضَتِ السَّنَةُ فَشَأْنُكَ بِهَا-

«عبداللہ بن بدر جہنی کہتے ہیں کہ شام کے راستے میں وہ ایک منزل پر اترے- وہاں ان کو ایک تھیلی ملی جس میں ۸۰ دینار تھے- انہوں نے اس کا ذکر حضرت عمرؓ سے کیا- انہوں نے کہا کہ ایک سال تک مسجدوں کے دروازوں پر اس کا تعارف کراؤ اور ہر اس شخص سے جو شام سے آئے اس کا ذکر کرو- جب ایک سال گزر جائے تو اس کے بعد اس سے جو چاہو کرو-»

□ وحدثني مالك عن نافع أن رجلا وجد لقطة فجاء إلى عبدالله بن عمر فقال له إني وجدت لقطة فما ذا ترى فيها فقال له عبدالله بن عمر عرفها قال قد فعلت قال زد قال قد فعلت فقال عبدالله لا آمرك أن تأكلها ولو شئت لم تأخذها۔

﴿نافع کہتے ہیں کہ ایک شخص کو گرا پڑا مال ملا۔ وہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے پڑا ہوا مال پایا ہے تو اس کے بارے میں آپ کیا فتویٰ دیتے ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ اس کا اعلان کرو۔ اس نے کہا یہ تو میں کر چکا۔ انہوں نے کہا اور کرلو۔ اس نے کہا بہتیرا کیا ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا میں یہ اجازت تو نہیں دے سکتا کہ تم اس کو ہڑپ کرلو۔ اگر چاہتے تو نہ اٹھاتے۔﴾

وضاحت:

یہ اوپر کی حدیث میں بیان کردہ نبی ﷺ کی ہدایت کی عملی مثالیں بیان ہوئی ہیں۔

القضاء في الضوال

گمشدہ یا آوارہ جانوروں کے متعلق فیصلہ

□ حدثني مالك عن يحيى بن سعيد عن سليمان بن يسار أن ثابت بن الضحاك الأنصاري أخبره أنه وجد بعيرا بالحرة فعقله ثم ذكره لعمر بن الخطاب فأمره عمر أن يعرفه ثلاث مرات فقال له ثابت إنه قد شغلني عن ضيعتي فقال له عمر أرسله حيث وجدته۔

□ وحدثني مالك عن يحيى بن سعيد عن سعيد بن المسيب أن عمر بن الخطاب قال وهو مسند ظهره إلى الكعبة من أخذ ضالة فهو ضال۔

□ وحدثني مالك أنه سمع ابن شهاب يقول كانت ضوال الإبل في زمان عمر بن الخطاب إبلا مؤبلة تناتج لا يمسها أحد حتى إذا كان زمان عثمان بن عفان أمر

تعریفھا ثم تباع فاذا جاء صاحبھا اعطی ثمنھا۔

ثابت بن ضحاک انصاریؓ نے خبر دی کہ ان کو حرۃ کے علاقہ میں ایک اونٹ ملا تو انہوں نے اس کو باندھ چھوڑا۔ پھر حضرت عمر بن خطابؓ سے ذکر کیا تو انہوں نے حکم دیا کہ آپ تین مرتبہ اس کا اعلان کریں۔ ثابت نے ان سے کہا کہ اس نے تو میرا اپنا کاروبار درہم برہم کر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ پھر اسے جہاں پایا ہے وہیں لے جا کر چھوڑ دو۔

سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے، جب وہ خانہ کعبہ سے اپنی کمر کی ٹیک لگائے ہوئے تھے، فرمایا کہ جس کسی نے گمشدہ جانور کو ہڑپ کر لیا وہ گمراہ آدمی ہے۔

ابن شہاب کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں کھوئے ہوئے اونٹوں کا ایک ریوڑ بن گیا تھا جس سے بچے پیدا ہونے لگ گئے۔ کوئی ان کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ جب حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا تو انہوں نے حکم دیا کہ ان کا اعلان کرایا جائے، پھر ان کو بیچ دیا جائے اور جب ان کے مالک آئیں تو ان کو اونٹوں کی قیمت دے دی جائے۔ ۞

وضاحت :

اوپر گری پڑی چیز یا آوارہ جانور کے بارے میں کل چھ روایات نقل ہوئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے دور سے لے کر حضرت عثمانؓ کے دور تک گمشدہ مال و متاع کے متعلق احکام میں تدریجی ارتقاء ہوا ہے۔ صرف پہلی روایت مرفوع حدیث ہے، باقی سب صحابہ کے آثار ہیں۔ گری پڑی چیز کے متعلق تو یہ ہوا کہ ایک سال تک اعلان کرنے کی شرط کو لوگوں نے مشکل سمجھا اور یہ رجحان پیدا ہو گیا کہ گری پڑی چیز کو نہ ہی اٹھایا جائے۔ اعلان کے کھکھیڑ میں نہ پڑنا ہی بہتر ہے۔ گمشدہ اونٹ کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس کو پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنا زاد و راحلہ ساتھ لیے ہوئے ہے۔ حضرت عمرؓ کے پاس جب یہ مسئلہ آیا تو انہوں نے حکم دیا کہ تین مرتبہ مختلف موقعوں پر اس کا اعلان کیا جائے۔ جب پکڑنے والے صاحب نے کہا کہ اس چکر میں کون اپنا کاروبار خراب کرے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس کو جہاں سے پکڑا تھا وہیں چھوڑ دو۔ اس کے بعد کوئی گمشدہ اونٹ کو ہاتھ نہ لگاتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کا ایک ریوڑ بن گیا اور افزائش نسل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ صورت حال

لوگوں کے لیے دردِ سر بن گئی تو حضرت عثمانؓ کے دور میں پھر یہ فیصلہ ہوا کہ لوٹ کا اعلان کرنے کے بعد اس کو فروخت کر دیا جائے اور جب مالک آئے تو اس کو قیمت دے دی جائے۔

اس زمانے میں حکومت نے مویشی خانے یا کانجی ہاؤس بنا رکھے ہیں جہاں آوارہ جانوروں کو رکھا جاتا ہے۔ مالک اگر آتا ہے تو خرچہ کی رقم ادا کر کے مویشی لے جا سکتا ہے۔ یہ اچھا انتظام ہے، بشرطیکہ ایمانداری سے چلایا جائے۔ مجھے حضرت عثمانؓ کا طریقہ درست معلوم ہوتا ہے۔

صَدَقَةُ الْحَيِّ عَنِ الْمَيِّتِ

زندہ کا مردہ کی طرف سے صدقہ

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ سَعِيدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ شُرَحْبِيلَ بْنِ سَعِيدِ بْنِ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّهُ قَالَ خَرَجَ سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فِي بَعْضِ مَغَازِيهِ فَحَضَرَتْ أُمَّهُ الْوَفَاةُ بِالْمَدِينَةِ فَقِيلَ لَهَا أَوْصِي فَقَالَتْ فِيمَ أُوصِي إِنَّمَا الْمَالُ مَالُ سَعْدٍ فَتُوُفِّيَتْ قَبْلَ أَنْ يَقْدَمَ سَعْدٌ فَلَمَّا قَدِمَ سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ ذُكِرَ ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ سَعْدٌ يَا رَسُولَ اللّٰهِ هَلْ يَنْفَعُهَا أَنْ أَتَصَدَّقَ عَنْهَا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ نَعَمْ فَقَالَ سَعْدٌ حَائِطُ كَذَا وَ كَذَا صَدَقَةٌ عَنْهَا لِحَائِطٍ سَمَّاهُ۔

﴿شرحبیل بن سعید روایت کرتے ہیں کہ سعد بن عبادہؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کسی غزوہ میں نکلے۔ اس دوران میں مدینہ میں ان کی والدہ کی وفات ہو گئی۔ وفات کے وقت ان سے کہا گیا کہ آپ کچھ وصیت کر دیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں کس چیز میں وصیت کر سکتی ہوں، سارا مال تو سعد کا ہے۔ سعد کی واپسی سے پہلے ان کی وفات ہو گئی۔ جب سعد بن عبادہؓ آئے تو ان سے اس بات کا ذکر کیا گیا۔ سعد نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ، اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ کروں تو کیا ان کو نفع ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں۔ سعد نے کہا کہ فلاں فلاں باغ ان کی طرف سے صدقہ ہے۔ باغ کو انہوں نے نامزد کر دیا۔﴾

وضاحت :

سعد بن عبادہؓ مسلمانوں کے ایک بڑے لیڈر ہیں۔ یہ ان کا واقعہ ہے۔ ان کی والدہ کی وفات کے وقت والدہ نے کہا کہ اگر آپ کچھ وصیت کرنا چاہتی ہیں تو کر دیں۔ انہوں نے کہا کس طرح وصیت کروں۔ مال تو سعد کا ہے۔ یعنی اگر سعد موجود ہوتے تو میں کچھ کہتی۔ ان کی عدم موجودگی میں کیا وصیت کروں۔ ان کی وفات کے بعد جب سعد آئے تو ان کو والدہ کا یہ جواب بتایا گیا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ اگر میں والدہ کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا ان کو نفع ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ہاں۔ چنانچہ انہوں نے ایک باغ ماں کی طرف سے صدقہ کر دیا۔

اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر اولاد اپنے والدین کی طرف سے صدقہ کرے تو آخرت میں وہ ان کے کام آئے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاد حقیقت میں اپنے ماں باپ کے عمل میں شریک ہوتی ہے اس لیے کہ وہ ان کی تربیت میں پروان چڑھتی اور انہی کی تربیت سے نیکی اور بدی سیکھتی ہے۔ لہذا عام حالات میں بھی اولاد کے نیک اعمال میں سے والدین کو کچھ حصہ ملتا ہے۔ اولاد اگر خاص طور پر والدین کی طرف سے کوئی نیکی کرے تو ان کو اس کا ثواب بدرجہ اولیٰ ملنا چاہیے۔ لیکن والدین کو اولاد کے عمل کے فائدہ کا تعلق صرف انہی معاملات سے ہے جن میں آدمی کا نیکی کر کے والدین کا کوئی حق ادا کرنا ممکن ہے۔ چنانچہ والدین نے اگر نماز نہیں پڑھی تو اولاد نماز پڑھ کر ان کا فرض ادا نہیں کر سکتی۔ حج بدل کے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ کرائے کا حج بدل کوئی چیز نہیں، لیکن اگر کسی کے ماں باپ کو حج کی خواہش رہی لیکن ان کے پاس اس کے وسائل نہیں تھے، اولاد کے پاس ذرائع ہیں تو ان کی خواہش کی تکمیل میں اولاد حج کرے گی تو والدین کو ثواب ضرور ملے گا۔

رہے روزمرہ کے معاملات جن کے متعلق اندیشہ ہو کہ ان میں والدین سے کوتاہی ہوئی ہے تو میرے نزدیک اگر اولاد وقتاً فوقتاً اپنے نوافل میں والدین کا کچھ حق رکھے تو اس کا ثواب ان کو ملے گا۔ تو جہاں تک اولاد کا تعلق ہے ان کے اعمال کا ثواب والدین کو ملتا ہے، دوسروں کے اعمال کا نہیں۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ إِنَّ أُمِّي افْتُلِتَتْ نَفْسُهَا وَ أَرَاهَا لَوْ تَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ أَفَأَتَصَدَّقُ عَنْهَا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نَعَمْ۔

﴿حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ حضور، میری والدہ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر وہ بات کر سکتیں تو کچھ صدقہ کرتیں۔ اب کیا میں ان کی طرف سے صدقہ کر دوں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، ہاں۔﴾

وضاحت :

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وہی اوپر والی روایت ہے لیکن میرا رجحان اس طرف ہے کہ یہ الگ ہے۔ بات اس میں بھی وہی ہے کہ اگر اولاد والدین کی طرف سے صدقہ کرے گی تو بے شک وہ قبول ہو گا۔ اولاد کا عمل یوں بھی قبول ہوتا ہے۔ اس میں سے والدین کو حصہ ملتا ہے بشرطیکہ اس نیکی میں ان کی تربیت کو دخل رہا ہو۔ مثلاً والدین نے ان کو تعلیم دلائی اور اس تعلیم کے فیض سے وہ کوئی نیکی کرتی ہے۔ عام تربیت کے اندر بھی ماں باپ کا حصہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اولاد کی نیکی حقیقت میں والدین کی کمائی میں شامل ہے۔

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَجُلًا مِنَ الْأَنْصَارِ مِنْ بَنِي الْحَارِثِ بْنِ الْخَزْرَجِ تَصَدَّقَ عَلَى أَبَوَيْهِ بِصَدَقَةٍ فَهَلَكَا فَوَرِثَ ابْنُهُمَا الْمَالَ وَهُوَ نَخْلٌ فَسَأَلَ عَنْ ذَلِكَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ قَدْ أُجِرْتَ فِي صَدَقَتِكَ وَخُذْهَا بِمِيرَاثِكَ۔

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ انصار کے قبیلہ بنو حارث بن خزرج کے ایک شخص نے اپنے ماں باپ پر صدقہ کیا۔ پھر دونوں کی وفات ہو گئی تو بیٹے کو وہی مال وراثت میں ملا، اور یہ کھجوروں کا ایک باغ تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا مسئلہ پوچھا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم کو صدقے کا اجر بھی مل گیا اور اب وراثت میں یہ باغ بھی پاؤ۔﴾

وضاحت :

یہ ہے ہم خرما و ہم ثواب۔ یہ ویسی ہی بات ہے جیسے حضرت عائشہؓ کی لونڈی بریرہؓ کو کچھ گوشت صدقہ میں ملا، انہوں نے پکانے کی غرض سے اس کو ہنڈیا میں چولہے پر رکھا ہوا تھا۔ اتنے میں نبی ﷺ تشریف لائے اور حضرت عائشہؓ سے پوچھا، کھانے کو کچھ ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ بریرہ کو صدقے کا گوشت ملا ہے، وہ تو آپ

جا ئیں گے نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ان کے لیے صدقہ ہے، ہمارے لیے ہدیہ ہو گا۔

اَلْاَمْرُ بِالْوَصِیَّةِ

وصیت کے متعلق حکم

حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَا حَقُّ امْرِیءٍ مُسْلِمٍ لَهُ شَیْءٌ یُوْصٰی فِیْهِ یَبِیْتُ لَیْلَتَیْنِ اِلَّا وَوَصِیَّتُهُ عِنْدَهُ مَكْتُوْبَةٌ

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کے اوپر یہ ضروری حق ہے کہ اگر اس کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس کے بارے میں اس کو وصیت کرنی ہو تو دو راتیں بھی نہ گزرنے دے بجز اس کے کہ اس کے پاس اس کی وصیت لکھی ہوئی ہو۔

وضاحت:

اگر کسی چیز میں آپ کو وصیت کرنی ہے تو اس کے متعلق بہت چوکس ہونا چاہیے۔ یہ انتظار نہ کرنا چاہیے کہ ہو جائے گی، ابھی کیا جلدی ہے۔ بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے جھگڑے بن جاتے ہیں اور خاندان میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے تاکید ہے کہ وصیت وقت سے بہت پہلے لکھ کر رکھی جائے۔ معلوم نہیں موت کس وقت آجائے۔ قرآن کا بھی یہی مفہوم معلوم ہوتا ہے۔

جَوَازُ وَصِیَّةِ الصَّغِیْرِ وَالضَّعِیْفِ وَالْمُصَابِ وَالسَّفِیْهِ

بچے، کمزور، بیمار اور نادان کی وصیت کے جواز کے بارے میں

حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِی بَكْرِ بْنِ حَزْمٍ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّ عَمْرَو بْنَ سُلَیْمٍ الزُّرَقِیَّ اَخْبَرَهُ اَنَّهُ قِیْلَ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اِنَّ هٰهُنَا غُلَامًا یَفَاعًا لَمْ یَحْتَلِمْ مِنْ غَسَّانَ وَ وَارِثُهُ بِالشَّامِ وَهُوَ ذُوْ مَالٍ وَ لَیْسَ لَهُ هٰهُنَا اِلَّا ابْنَةُ عَمٍّ لَهُ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَلْیُوْصِ لَهَا قَالَ فَاَوْصٰی لَهَا بِمَالٍ یُقَالُ لَهُ بِئْرُ جُشَمٍ قَالَ عَمْرُو بْنُ سُلَیْمٍ فَبِیْعَ ذٰلِكَ الْمَالُ بِثَلَاثِیْنَ اَلْفَ دِرْهَمٍ وَ ابْنَةُ

عَمَّتِهِ الَّتِي أَوْصَى لَهَا هِيَ أُمُّ عَمْرِو بْنِ سُلَيْمٍ الزُّرَقِيِّ۔

﴿ابو بکر بن حزم سے روایت ہے کہ عمرو بن سلیم الزرقی نے ان کو خبر دی کہ حضرت عمر بن خطابؓ کو بتایا گیا کہ یہاں ایک کمسن نابالغ لڑکا ہے۔ وہ غسان قبیلے کا اور مال دار ہے لیکن اس کا وارث شام میں ہے۔ یہاں اس کی چچا کی بیٹی کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ اس لڑکی کے لیے وصیت کر دے۔ تو اس نے چچازاد بہن کے لیے کچھ جائداد، جو بئر جشم کے نام سے موسوم ہے، کی وصیت کر دی۔ عمرو بن سلیم کہتے ہیں کہ وہ باغ تیس ہزار درہم میں بکا۔ اس لڑکے کی چچازاد بہن، جس کے حق میں اس نے وصیت کی، عمرو بن سلیم کی والدہ تھیں۔﴾

وضاحت:

جس طرح یہ معاملہ یہاں بیان ہوا ہے یہ اصول کے خلاف ہے۔ احناف اور شوافع اس کو نہیں مانتے لیکن مالکیہ کا یہی مسلک ہے۔ احناف اور شوافع اپنے مسلک کی بنیاد قرآن مجید کا یہ حکم بتاتے ہیں کہ یتیم کا مال اس کے حوالے نہ کرو جب تک اس میں سمجھ بوجھ پیدا نہ ہو جائے۔ جب قرآن مجید ان کا حق دینے میں یہ قید لگاتا ہے تو پھر وصیت کے معاملے میں ان کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ احناف اور شوافع کا مسلک زیادہ قوی ہے۔ قرآن مجید سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ باقی رہ گیا حضرت عمرؓ کا فیصلہ تو وہ تمام کوائف کو ملحوظ رکھ کر کیا گیا ہو گا جو ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ مثلاً لڑکے کے وارث کون لوگ تھے، وہ مسلمان تھے یا کافر، بئر جشم کے علاوہ جائداد کیا تھی اور اس کا کیا ہوا۔ وغیرہ۔

اَلْوَصِيَّةُ فِي الثُّلُثِ لَا يُتَعَدّٰى

ایک ثلث سے زیادہ میں وصیت نہیں کر سکتے

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ قَالَ جَاءَنِي رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَعُودُنِي عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ مِنْ وَجَعٍ اشْتَدَّ بِي فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ قَدْ بَلَغَ بِي مِنَ الْوَجَعِ مَا تَرَى وَأَنَا ذُو مَالٍ وَلَا يَرِثُنِي إِلَّا ابْنَةٌ لِي أَفَأَتَصَدَّقُ بِثُلُثَيْ مَالِي قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَا فَقُلْتُ فَالشَّطْرُ قَالَ لَا ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَلثُّلُثُ وَالثُّلُثُ كَثِيرٌ

اِنَّكَ اَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ اَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُوْنَ النَّاسَ وَ اِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِي بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ اِلَّا اُجِرْتَ حَتّٰى مَا تَجْعَلُ فِي فِي امْرَاَتِكَ قَالَ فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اُخَلَّفُ بَعْدَ اَصْحَابِي فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّكَ لَنْ تُخَلَّفَ فَتَعْمَلَ عَمَلًا صَالِحًا اِلَّا ازْدَدْتَ بِهِ دَرَجَةً وَ رِفْعَةً وَلَعَلَّكَ اَنْ تُخَلَّفَ حَتّٰى يَنْتَفِعَ بِكَ اَقْوَامٌ وَ يُضَرَّبِكَ آخَرُوْنَ اَللّٰهُمَّ اَمْضِ لِاَصْحَابِي هِجْرَتَهُمْ وَ لَا تَرُدَّهُمْ عَلٰى اَعْقَابِهِمْ لٰكِنِ الْبَائِسُ سَعْدُ بْنُ خَوْلَةَ يَرْثِي لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ مَاتَ بِمَكَّةَ۔

﴿ سعد بن ابی وقاص روایت کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے سال رسول اللہ ﷺ میری بیماری کی شدت میں عیادت کو آئے۔ میں نے کہا یارسول اللہ مجھے جو تکلیف ہے وہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ میرے پاس مال بہت ہے اور بیٹی کے سوا اور کوئی میرا وارث نہیں ہے۔ تو کیا میں دو تہائی صدقہ کردوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ میں نے کہا نصف کردوں۔ آپؐ نے فرمایا نہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک ثلث صدقہ کردو اور ایک ثلث بھی بہت ہے۔ یہ بات کہ تم اپنی اولاد کو خوشحالی میں چھوڑو اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو محتاج چھوڑو کہ وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ اگر تم اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرو گے تو تم کو اس کا اجر ملے گا یہاں تک کہ تم اپنی بیوی کو جو لقمہ بھی کھلاؤ گے اس پر بھی تم کو اجر ملے گا۔ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ یارسول اللہ! کیا میں اپنے ساتھیوں کے بعد مزید زندگی پاؤں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تمہیں مہلت نہ ملی تو تم نے جو عمل صالح کیے ہیں اس کے نتیجے میں تمہارے درجات کی بلندی اور عزت میں اضافہ ہو گا۔ اور اس بات کا امکان ہے کہ تم زندگی پاؤ اور تمہارے ذریعے سے قوموں کو فائدہ پہنچے اور دشمنوں کا تمہارے ہاتھوں نقصان ہو۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے دعا فرمائی کہ اے رب، میرے اصحاب کی ہجرت کو کامل کر اور ان کو پیٹھ پیچھے نہ لوٹا۔ بچارے سعد بن خولہؓ کے ساتھ آپ نے ہمدردی کی کیونکہ وہ مکہ میں ہی وفات پا گئے تھے۔﴾

وضاحت :

آنحضرت ﷺ نے حضرت سعدؓ کو ایک ثلث یعنی ایک تہائی تک مال صدقہ کرنے کی اجازت دی۔

ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ایک تہائی بھی بہت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے زیادہ نہیں بڑھنا چاہیے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ایک ثلث بھی نہ دے۔ جس کے پاس وافر مال ہے اور ورثا زیادہ نہیں تو سب ورثا کو کافی مال وراثت میں مل جائے گا۔ اس صورت میں ایک ثلث تک صدقہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اس سے کم کی تو گنجائش آپ کے اس ارشاد سے ہی نکلتی ہے کہ ورثا کو تنگ حال نہ چھوڑو کہ آپ صدقہ کر دو اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ اس کا فلسفہ آپ نے یہ بیان فرمایا کہ اولاد پر اگر اللہ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کیا جائے تو وہ بھی نیکی ہے اور اس کا اجر ہے، یہاں تک کہ بیوی پر خرچ بھی اسی زمرے میں آتا ہے، یعنی وہ بھی صدقہ ہے۔ صرف دوسروں کو دینا ہی صدقہ نہیں، بیوی بچوں کا حق سب سے پہلے ہے۔ اولاد کے لیے خوش حالی چاہنا فطرت کا تقاضا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ اولاد پر خرچ کرنا بھی عبادت ہے۔ صرف یہی عبادت نہیں کہ آپ کسی دوسرے کو اٹھا کر دے دیں۔

اس کے بعد حضرت سعدؓ نے نبی ﷺ کے سامنے اس خدشے کا اظہار کیا کہ معلوم نہیں میں اپنے ساتھیوں کے بعد زندہ رہوں گا یا نہیں۔ آنحضرت نے فرمایا اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر زندگی کی مہلت نہ ملے تو نیک اعمال کے نتیجہ میں اجر میں زیادتی اور بلندی اور عزت حاصل ہو گی۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ تم مہلت حیات پاؤ اور تمھارے ذریعے سے قوموں کو فائدہ ہو۔ زندگی ہو تو آدمی بڑے بڑے کام کر جاتا ہے۔ حضرت سعدؓ بہت بڑے آدمی تھے۔ اگر ان کو زندگی کے اور دن مل جاتے تو کوئی کارنامہ کر جاتے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ نبی ﷺ کی توقع کے مطابق حضرت سعدؓ نے دین کی سربلندی کے لیے بے پناہ کام کیا اور ایران کی بادشاہت کا خاتمہ کر کے اس علاقے کو ہمیشہ کے لیے اسلامی مملکت کا حصہ بنا دیا۔

روایت میں بیان کردہ واقعہ مکہ میں پیش آیا۔ نبی ﷺ نے حضرت سعدؓ کی یہ تشویش دیکھی کہ کہیں ان کا وقت آخر مکہ میں نہ آجائے۔ مکہ میں مر جانا عام طور پر تو باعث تشویش نہیں لیکن حضرت سعدؓ نے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی تھی اور مسلمان ہجرت کو بڑی اونچی چیز سمجھتے تھے، اور بجا طور پر ایسا سمجھتے تھے۔ دارالہجرت سے واپسی ان کو ناگوار تھی۔ لہٰذا اس کے بارے میں آنحضرتؐ نے تشفی کر دی کہ تم زندہ رہو گے۔ اور دعا بھی فرمائی کہ اے اللہ میرے اصحاب کی ہجرت کو کامل کر اور ان کو پیٹھ پیچھے نہ لوٹا۔ یعنی اب کسی کو یہ ابتلا پیش نہ آئے کہ ہجرت کے درجے سے گر کر وہ یہاں آکر وفات پائے۔ آپ نے سعد بن خولہؓ کے لیے ہمدردی کی کیونکہ ان کی وفات مکہ میں ہو گئی تھی۔

اَمْرُ الحَامِلِ وَالمَرِيْضِ وَالَّذِی یَحْضُرُ القِتَالَ فِی اَمْوَالِهِمْ

حاملہ، مریض اور محاذ جنگ پر سپاہی کے مالی معاملات

امام مالک کے فتوے:

یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک کو فرماتے سنا کہ بہترین بات جو میں نے حاملہ کی وصیت اور اس کے مالی معاملات اور اس کے تصرفات کے بارے میں سنی وہ یہ ہے کہ حاملہ عورت مریض کے حکم میں ہے- اگر مرض ہلکا ہو اور کوئی اندیشے کی بات نہ ہو تو جس طرح مریض اپنے مال میں جو چاہے تصرف کر سکتا ہے اسی طرح سے حاملہ عورت بھی کر سکتی ہے- لیکن اگر مرض اندیشہ ناک ہو تو مریض کو ایک تہائی سے زیادہ میں تصرف کی اجازت نہیں- کہتے ہیں کہ اسی طرح سے حاملہ عورت کا ابتدائے حمل کا دور تو خوشی اور مسرت کا ہے- وہ نہ مرض ہے اور نہ ہی اندیشہ ناک ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے- "ہم نے اس کو خوشخبری دی اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی" نیز یہ فرمایا کہ "اس نے ہلکا سا حمل اٹھالیا اور اس کے ساتھ وقت گزارا- پھر جب وہ بوجھل ہو گئی تو دونوں میاں بیوی نے اپنے رب سے دعا شروع کی کہ اگر تو نے ہم کو اچھی اولاد بخشی تو ہم تیرے شکر گزار بندے بنیں گے"- حاملہ عورت کا ابتدائی حمل کا زمانہ چھ ماہ ہے- کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا کہ "مائیں اپنے بچوں کو دو سال دودھ پلائیں" اور فرمایا کہ "ان کا حمل اور دودھ چھڑانا تیس ماہ ہے" تو جب حاملہ کے چھ ماہ گزر جائیں تو اس کو جائز نہیں کہ صرف ایک ثلث مال کے سوا اپنے مالی فیصلے کر سکے- میں نے مالک کو کہتے سنا کہ جو سورما محاذ جنگ پر ہے جب صف بندی ہو جائے تو اس کو بھی ایک ثلث سے زیادہ میں فیصلہ کا اختیار نہیں- کیونکہ وہ بھی اس وقت حاملہ اور مریض اندیشہ ناک کے حکم میں ہے اور یہ اس وقت تک کے لیے ہے جب تک وہ جنگ کی حالت میں رہتا ہے-

یہ سب امام مالک کے فتوے ہیں- جب ایک تہائی سے زیادہ میں وصیت کی ممانعت ہے تو کسی کے حاملہ یا مریض یا لڑائی میں ہونے سے کیا فرق پڑے گا- امام مالک کے ان نکتوں کے حق میں دلیل کیا ہے؟ وصیت کے بارے میں کوئی مرفوع روایت یا نص نہیں ہے- لہٰذا جب تک آدمی اپنے ہوش و حواس میں ہو وہ اپنے مال میں کامل

تصرف کا حق رکھتا ہے۔ حمل یا بیماری کی بنا پر اس کے حقوق مالکانہ کس طرح ساقط کیے جا سکتے ہیں۔ اوپر جو ایک ثلث کے بارے میں روایت گزری ہے اس میں اس طرح کی کوئی بات نہیں۔ ایک ثلث سے زیادہ میں وصیت کرنے کی ممانعت ہے لیکن یہ حرمت کے حکم میں نہیں بلکہ آپ نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ اپنے ورثا کو فقیر اور مسکین نہ چھوڑو۔ دوسری حکمت جو اس کی بتائی وہ یہ کہ یہ نہ سمجھو کہ دینی چیزوں پر جو خرچ ہوتا ہے وہ دنیا داری ہے، بلکہ وہ بھی دینداری ہے اور اس کا اجر ہے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو پورا حق ہے کہ وہ اپنے مال میں کامل تصرف کر سکتا ہے۔ باقی یہ ضرور ہے کہ اگر وصیت کرے تو ایک ثلث سے زیادہ نہ کرے۔ اپنے ورثا کو کھاتا پیتا چھوڑے، یہ بھی عبادت ہے۔

اَلْوَصِيَّةُ لِلْوَارِثِ وَالْحِيَازَةِ

وارث کو وصیت کرنے اور قبضہ کے بارے میں

امام مالک کے فتوے:

یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک سے سنا۔ وہ فرماتے تھے کہ آیت "اگر کوئی شخص کوئی مال چھوڑے تو اپنے والدین اور اقربا کے لیے وصیت کر جائے" منسوخ ہو گئی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حقوق و فرائض مقرر فرما دیے۔ وہ کہتے ہیں کہ امام مالک فرماتے تھے کہ ہمارے ہاں ثابت سنت، جس میں کوئی اختلاف نہیں، یہ ہے کہ وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں، بجز اس صورت کے کہ میت کے دوسرے وارث اس کی اجازت دے دیں۔ اگر بعض ورثا اجازت دے دیں اور دوسرے نہ دیں تو جنہوں نے اجازت دے دی ان کا حق وہ حاصل کر سکتا ہے، دوسرے انکار کرنے والے اپنا حق لے لیں گے۔

سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۸۰ سورہ نساء کی آیت 'یُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي اَوْلَادِكُمْ' (اللہ تعالیٰ تم کو تمہاری اولادوں کے بارے میں وصیت کرتا ہے) سے منسوخ ہے۔ یہاں تک تو معروف بات ہے جس میں امام مالک کا کوئی خاص نکتہ نہیں ہے۔

اس کے بعد امام مالک یہ فرماتے ہیں کہ علمائے مدینہ کا یہ متفق علیہ مسلک ہے کہ وارث کے لیے وصیت جائز نہیں قرار دی جاسکتی جب تک کہ میت کے دوسرے ورثا اس کی اجازت نہ دیں۔ مصلحت کے تحت تو وارث کے لیے وصیت کی اجازت کی بات اچھی ہے لیکن اس کی کامیابی مشکوک ہے۔ جب اجازت لینے کا مرحلہ آئے گا تو جھگڑا کھڑا ہو جائے گا۔ پھر اس بات کی دلیل کیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے وصیت کر دی تو اور کسی کا کیا حق رہ گیا۔ تو ان حضرات کے فتوے اور اللہ تعالیٰ کی وصیت میں مطابقت کیسے ہوگی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وصیت کو مانا ہے لیکن اس میں قبضہ کی شرط مانی ہے، مشورہ یا اجازت لینے کی نہیں۔ ورثا کو وصیت مصلحت کے تحت تو کی جاسکتی ہے کیونکہ جس ورثا مثلاً پوتے کی وراثت کا جھگڑا ہو سکتا ہے۔ ایسی وصیت پر اعتراض نہیں۔ مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ دوسرے ورثا کو راضی کر لیا جائے تاکہ بعد میں اختلاف نہ ہو۔ گویا وصیت صرف اس وارث کے حق میں کی جائے گی جس کی کمزوری یا کمسنی یا اس کے حقوق و فرائض جانانے میں کمی رہ گئی ہو، تعلیم ادھوری رہ گئی ہو، ابھی کمانے کے قابل نہ ہو۔ جبکہ دوسرے کمانے کے قابل ہو چکے ہوں۔ وغیرہ۔ میری دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ نے یہ شرط مشورہ نہیں مانی ہے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میں نے دوسرے ورثا سے اجازت نہیں لی تھی۔ ظاہر ہے کہ وارث کا یہی معاملہ ہے بلکہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک وارث جو ابھی پردے میں چھپا تھا، اس کا بھی لحاظ رکھا۔ یہ اجازت والی بات امام مالک کی ہے۔ یہ از قسم قیاس مرسل ہے۔ جس کے لیے کوئی ضابطہ نہیں۔

جَامِعُ الْقَضَاءِ وَ كَرَاهِيَتُهُ

منصب قضا اور اس کے مکروہ ہونے کے بارے میں

حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّ أَبَا الدَّرْدَاءِ كَتَبَ إِلَى سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ أَنْ هَلُمَّ إِلَى الْأَرْضِ الْمُقَدَّسَةِ فَكَتَبَ إِلَيْهِ سَلْمَانُ إِنَّ الْأَرْضَ لَا تُقَدِّسُ أَحَدًا وَ إِنَّمَا يُقَدِّسُ الْإِنْسَانَ عَمَلُهُ وَ قَدْ بَلَغَنِي أَنَّكَ جُعِلْتَ طَبِيبًا تُدَاوِي فَإِنْ كُنْتَ تُبْرِئُ فَنِعِمَّا لَكَ وَ إِنْ كُنْتَ مُتَطَبِّبًا فَاحْذَرْ أَنْ تَقْتُلَ إِنْسَانًا فَتَدْخُلَ النَّارَ فَكَانَ أَبُو الدَّرْدَاءِ إِذَا قَضَى بَيْنَ اثْنَيْنِ ثُمَّ أَدْبَرَا

عَنۡهُ نَظَرَ اِلَيۡهِمَا وَ قَالَ ارۡجِعَا اِلَىَّ اَعِيۡدَا عَلَىَّ قِصَّتَكُمَا مُتَطَبِّبٌ" وَاللهِ۔

﴿یحییٰ بن سعید روایت کرتے ہیں کہ ابوالدرداء نے حضرت سلمان فارسیؓ کو لکھا کہ یہاں اس ارض مقدس میں تشریف لایئے۔ سلمان نے ان کو لکھا کہ کوئی زمین کسی کو مقدس نہیں کرتی بلکہ انسان کو اس کا عمل پاک کرتا ہے۔ مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ آپ لوگوں کے علاج کے لیے طبیب بنا دیئے گئے ہیں۔ اگر آپ کے علاج سے لوگ صحت پائیں تو آپ کے کیا کہنے اور اگر آپ یوں ہی عطائی ہیں تو احتیاط کریں، کہیں کسی انسان کو قتل کر کے آپ جہنم میں داخل نہ ہوں۔ ابوالدرداء کا حال یہ ہو گیا کہ جب وہ دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرتے اور وہ ان کے پاس سے ہٹتے تو وہ ان پر نظر ڈالتے اور کہتے کہ بھائی پھر آجاؤ اور اپنا قصہ مجھے دہرا دو۔ میں تو واللہ ایک عطائی بندہ ہوں۔﴾

وضاحت :

ابوالدرداءؓ فقہاء صحابہ میں سے ہیں اور ان کا مقام دینی اعتبار سے خاصا بلند ہے۔ سلمان فارسیؓ بھی مشہور صحابی ہیں۔ ابوالدرداءؓ کسی زمانے میں شام میں قاضی مقرر کر دیئے گئے۔ انہوں نے حضرت سلمان فارسی کو دعوت دی کہ آپ یہاں تشریف لائیں، یہ ارض مقدس ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ زمین کسی کو پاک نہیں کرتی بلکہ انسان کا اپنا عمل اس کو پاک کرتا ہے۔ یہ محض سخن گسترانہ بات ہے۔ ان کی دعوت سے اس قسم کا ادعا تو معلوم نہیں ہوتا۔ شام کا ارض مقدس ہونا معلوم ہے۔ یہاں پہلا قبلہ اور حرم اور انبیاء کا مرکز ہے۔ لیکن حضرت سلمان نے، معلوم ہوتا ہے اس فقرے کو گوارا نہیں کیا اور کہا کہ آپ کس زعم میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ ارض مقدس میں جا کر مقدس ہو گئے ہیں۔ کوئی سرزمین کسی کو مقدس نہیں بناتی۔

مزید حضرت سلمانؓ نے یہ بھی لکھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگوں کے علاج کے لیے طبیب بنا دیئے گئے ہو۔ اس میں اشارہ ان کے قاضی بنانے کی طرف ہے کہ وہ لوگوں کی دینی ضروریات اور مشکلات کا مداوا کریں۔ حضرت سلمانؓ نے لکھا کہ اگر لوگوں کو آپ سے فائدہ ہوا تو کیا کہنے اور اگر یونہی عطائی ہو تو بچ کے رہنا کہ لاعلمی میں کسی کو قتل کر کے جہنم میں داخل نہ ہوں۔ یہ جملہ بھی غیر ضروری طریقے سے تیز اور سخت ہے۔ اس لیے

ابوالدرداء کا حال یہ ہوا کہ جب بھی وہ آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرتے اور وہ وہاں سے ہٹتے تو پھر ان کی طرف دیکھتے اور کہتے کہ بیٹھو اپنا قصہ ذرا پھر سے سناؤ۔ آخر میں عطائی جو ہوا۔ میرے خیال میں یہ بھی سلمانؓ پر فقرہ چست کرتے کہ جب مجھے انہوں نے عطائی قرار دے چھوڑا ہے تو خدا کے لیے پھر سنا دو تاکہ میں عطائی نہ رہوں اور جہنم میں داخل نہ ہوں۔

یہ بزرگوں کی باتیں ہیں مگر دلچسپ ہیں۔ سلمان فارسیؓ نے جو باتیں لکھیں ان کے لکھنے کا موزوں موقع نہ تھا۔ بے تکلفی میں یہ بات لکھی جا سکتی ہے۔ دونوں بڑے آدمی ہیں۔ میرے خیال میں یہ سب بے تکلفی میں ہوا۔

حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ دَلَافٍ الْمُزَنِيِّ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَجُلًا مِنْ جُهَيْنَةَ كَانَ يَسْبِقُ الْحَاجَّ فَيَشْتَرِى الرَّوَاحِلَ فَيُغْلِى بِهَا ثُمَّ يُسْرِعُ السَّيْرَ فَيَسْبِقُ الْحَاجَّ فَاَفْلَسَ فَرُفِعَ اَمْرُهُ اِلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ اَمَّا بَعْدُ اَيُّهَا النَّاسُ فَاِنَّ الْاُسَيْفِعَ اُسَيْفِعَ جُهَيْنَةَ رَضِىَ مِنْ دِيْنِهِ وَ اَمَانَتِهِ بِاَنْ يُقَالَ سَبَقَ الْحَاجَّ اَلَا وَ اِنَّهُ قَدْدَانَ مُعْرِضًا فَاَصْبَحَ قَدْرِيْنَ بِهِ فَمَنْ كَانَ لَهُ عَلَيْهِ دَيْنٌ فَلْيَأْتِنَا بِالْغَدَاةِ نَقْسِمُ مَالَهُ بَيْنَهُمْ وَ اِيَّاكُمْ وَالدَّيْنَ فَاِنَّ اَوَّلَهُ هَمٌّ وَ آخِرَهُ حَرْبٌ۔

عبدالرحمٰن بن دلاف روایت کرتے ہیں کہ قبیلہ جہینہ کا ایک شخص آگے بڑھ کر، حاجیوں سے پہلے، مال لانے والے قافلوں سے ملتا، ان سے مال خرید کر اس کی قیمت گراں کرتا اور پھر تیزی سے آگے آ کر حاجیوں کو بے خبری میں مال بیچتا۔ آخر کار وہ دیوالیہ ہو گیا۔ اس کا مقدمہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اے لوگو! یہ اسیفع ہے، جہینہ والا اسیفع۔ اس نے اپنے دین اور اپنی امانت کے بجائے اس بات کو پسند کیا کہ لوگ کہیں کہ وہ حاجیوں پر سبقت کرتا رہا ہے۔ آگاہ رہو کہ اپنے اس اعراض کی وجہ سے قرضدار ہو گیا ہے۔ تو جس کا اس کے ذمہ کچھ قرض ہو وہ کل صبح ہمارے پاس حاضر ہو۔ ہم اس کا مال ان کے درمیان تقسیم کریں گے۔ اللہ کے بندو، اللہ سے ڈرو اور قرض سے بچو، اس کا آغاز غم اور انجام لڑائی ہے۔

وضاحت :

یہ روایت اگرچہ حدیث نہیں بلکہ صحابہ کا اثر ہے لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں مفلس کا حکم بیان ہوا ہے یعنی یہ کہ دیوالیہ ہونے پر کیا ہوگا۔ دیوالیہ سے متعلق روایات پہلے گزر چکی ہیں۔

اسیفع کے معنی ہیں کالے کلوٹے کے۔ عربیت کے قاعدے سے یہ اسفع کی تصغیر ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ دین اور اخلاق کے تقاضوں سے اعراض کے نتیجہ میں قرض دار ہو گیا ہے۔ قرض اس پر مسلط ہو گیا ہے۔ جس کا حق اس کے ذمہ ہو وہ آئے تو ہم اس کا مال حقداروں کے درمیان تقسیم کریں گے۔ یہ تقسیم کس بنیاد پر ہوگی؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ "علی سواء" کا طریقہ درست ہے۔ یعنی ایک نسبت سے سب اپنے حق کی وصولی کرلیں۔ میں ان لوگوں کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کو جیل بھیجنے کی بجائے موقع دینا چاہیے کہ جدوجہد کر کے کچھ کمائے اور لوگوں کا حق ادا کرے۔ موجودہ زمانے میں بھی یہی اصول ملحوظ ہے البتہ وہ اپنے مال میں تصرف کا مجاز نہیں رہتا۔ صرف بقدر شدید ضرورت ہی وہ تصرف کر سکتا ہے۔

مالکیہ کے نزدیک جو مال اس کے پاس موجود ہے، وہ جن مہاجنوں کا ہو وہ اس کو لے سکتے ہیں لیکن میرے نزدیک یہ ٹھیک نہیں۔ جو کچھ بھی اس کے پاس ہے اس میں سب حق داروں کا یکساں نسبت سے حصہ ہوگا۔

کتاب الحدود

مَاجَاء فِی الرَّجْمِ

رجم کے بارے میں روایات

حَدَّثَنَا مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّهُ قَالَ جَاءَ تِ الْیَهُوْدُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَذَكَرُوْا لَهُ اَنَّ رَجُلًا مِنْهُمْ وَامْرَاَةً زَنَيَا فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا تَجِدُوْنَ فِی التَّوْرَاةِ فِی شَاْنِ الرَّجْمِ فَقَالُوْا نَفْضَحُهُمْ وَ يُجْلَدُوْنَ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ كَذَبْتُمْ اِنَّ فِيْهَا آيَةَ الرَّجْمِ فَاَتَوْا بِالتَّوْرَاةِ فَنَشَرُوْهَا فَوَضَعَ اَحَدُهُمْ يَدَهُ عَلٰی آيَةِ الرَّجْمِ ثُمَّ قَرَاَ مَاقَبْلَهَا وَمَا بَعْدَهَا فَقَالَ لَهُ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ ارْفَعْ يَدَكَ فَرَفَعَ يَدَهُ فَاِذَا فِيْهَا آيَةُ الرَّجْمِ فَقَالُوْا صَدَقَ يَا مُحَمَّدُ فِيْهَا آيَةُ الرَّجْمِ فَاَمَرَ بِهِمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَرُجِمَا فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ فَرَاَيْتُ الرَّجُلَ يَحْنِیْ عَلَی الْمَرْاَةِ يَقِيْهَا الْحِجَارَةَ قَالَ مَالِكٌ يَعْنِیْ يَحْنِیْ يُكِبُّ عَلَيْهَا حَتّٰی تَقَعُ الْحِجَارَةُ عَلَيْهِ۔

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ یہود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور آپ کے سامنے بیان کیا کہ ان کے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کیا ہے۔ حضور نے فرمایا کہ تم تورات میں رجم کے بارے میں کیا پاتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم زانیوں کو رسوا کرتے ہیں اور ان کو کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ اس پر عبداللہ بن سلامؓ نے کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو۔ اس میں آیت رجم ہے۔ وہ لوگ تورات لے کر آئے اور اس کو کھولا۔ ان میں سے ایک نے آیت رجم پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کے پہلے اور بعد کا حصہ پڑھ دیا۔ عبداللہ بن سلامؓ نے کہا کہ اپنا ہاتھ اٹھاؤ۔ اس نے ہاتھ اٹھایا تو اس میں آیت رجم نکل آئی۔ تب انہوں نے کہا کہ اے محمد یہ ٹھیک کہتے ہیں، اس میں آیت رجم موجود ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں حکم دیا تو ان دونوں کو رجم کر دیا گیا۔ عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آدمی کو دیکھا کہ وہ عورت کے اوپر جھکا پڑتا تھا کہ پتھروں سے اس کو بچائے۔ امام مالک کہتے ہیں: مطلب یہ

ہے کہ آدمی عورت پر اس لیے جھکا پڑتا تھا کہ پتھر عورت کی بجائے اس پر پڑیں۔

وضاحت:

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جس کا قرآن مجید میں ذکر آتا ہے کہ اہل کتاب اگر تمہارے پاس کوئی مقدمہ لائیں تو ان کے معاملات میں آپ دخل دینے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ یہود آنحضرتؐ کے پاس اپنے مقدمات شرارت کے لیے لاتے تھے کہ اگر فیصلہ اپنی منشا کے مطابق ہوا تو مانیں گے، ورنہ گریز کر جائیں گے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مدینہ اور اس کے نواح میں اسلام کا انتظام حیثیت مجموعی تو قائم ہو گیا تھا لیکن ابھی بعض قبائل خصوصاً اہل کتاب اپنے معاملات اپنی مقامی عدالتوں میں ہی لے کر جاتے تھے اور ان پر پورے طور پر کنٹرول نہیں تھا۔ اس کو عبوری دور کی بات کہہ سکتے ہیں۔ یہ کامل غلبے سے پہلے کی بات ہے۔ یہود اس زمانے میں یہ مقدمہ اس لیے لائے ہوں گے کہ ممکن ہے ہمارے منشا کے مطابق فیصلہ ہو جائے۔ یہود تورات میں تحریف کر چکے تھے۔ معلوم ہوتا ہے وہ زانی کا منہ کالا کر کے یا کچھ پٹائی کر کے اس کی رسوائی کر دیتے تھے لیکن اس کو رجم نہیں کرتے تھے۔ دوسری صورت یہ بھی تھی کہ اگر کوئی صاحب عزت و جاہ مجرم ہوتا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے۔ آنحضرتؐ کے دریافت کرنے پر کہ کیا تورات میں زانی کے لیے رجم کا حکم نہیں ہے، یہودیوں نے انکار کر دیا تو عبداللہؓ بن سلام نے، جو یہودیت کو ترک کر کے مسلمان ہو چکے تھے اور ان کے گھر کے بھیدی تھے، ان کو دھر لیا اور یہود کی کتمان حق کی کوشش کے باوجود ثابت کیا کہ زانی کے لیے تورات میں رجم کا حکم ہے۔ آخر کار ان کو آنحضرتؐ کے سامنے اعتراف کرنا پڑا۔

تورات کا کتاب الٰہی ہونا مسلم تھا۔ اس معاملہ میں دونوں فریق یہودی تھے لہٰذا کوئی پیچیدگی بھی نہیں تھی۔ آنحضرتؐ نے فیصلہ تورات کے مطابق کر دیا۔ اور اس روایت سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ تورات میں زانی کے لیے رجم کا حکم تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس دور میں اپنے ہاں بھی لوگوں کو اس قانون کے تحت سزائیں دی ہوں۔ یہ دستور رہا ہے کہ جن معاملات میں شریعت اسلامی کا کوئی واضح حکم نہیں ہوتا تھا اس میں آپ اہل کتاب کے احکام پر عمل کرتے تھے۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ جب تک کوئی نص صریح وارد نہ ہوا ہو آپ زنا کے مجرموں کو رجم کرتے رہے ہوں۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّ رَجُلًا مِنْ أَسْلَمَ جَاءَ إِلَى أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ فَقَالَ لَهُ إِنَّ الْأَخِرَ زَنَى فَقَالَ لَهُ أَبُو بَكْرٍ هَلْ ذَكَرْتَ هَذَا لِأَحَدٍ غَيْرِي

فقال لا فقال لهُ ابوبکرٍ فتبْ الی اللهِ و استترْ بسترِ اللهِ فانَّ اللہ یقبلُ التوبۃ عن عبادہٖ فلم تقررْہُ نفسہٗ حتّٰی اتی عمرَ بنَ الخطابِ فقال لہٗ مثلَ ما قال لابی بکرٍ فقالَ لہٗ عمرُ مثلَ ماقال لہٗ ابوبکرٍ فلمْ تقررْہُ نفسہٗ حتّٰی جاءَ الی رسولِ اللہِ ﷺ فقال لہٗ انَّ الاٰخرَ زنی فقال سعیدٌ فاعرضَ عنہُ رسولُ اللہِ ﷺ ثلاثَ مرّاتٍ کُلُّ ذٰلک یعرضُ عنہُ رسولُ اللہِ ﷺ حتّٰی اذا اکثرَ علیہِ بعثَ رسولُ اللہِ ﷺ الی اھلہٖ فقال ایشتکی امْ بہٖ جنۃٌ فقالوا یا رسولَ اللہِ واللہِ انہٗ لصحیحٌ فقال رسولُ اللہِ ﷺ ابکرٌ ام ثیبٌ فقالوا بل ثیبٌ یا رسولَ اللہِ فامرَ بہٖ رسولُ اللہِ ﷺ فرُجمَ-

﴿سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ قبیلہ اسلم کا ایک شخص حضرت ابوبکر صدیق کی خدمت میں آیا- اس نے کہا کہ اس گنہ گار بندہ کمینہ سے زنا کا گناہ صادر ہوا ہے- حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کہ اس کا میرے سوا کسی اور سے بھی ذکر کیا ہے- اس نے کہا کہ نہیں- حضرت ابوبکرؓ نے کہا تو اللہ سے توبہ کر اور اللہ کے پردے میں چھپ کہ اللہ اپنے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے- لیکن اس کا اس پر دل نہ ٹھکا- پھر حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہی بات کہی جو حضرت ابوبکرؓ سے کہی تھی- حضرت عمرؓ نے بھی اس کو اسی طرح کا جواب دیا جو حضرت ابوبکرؓ نے دیا تھا- اس پر بھی اس کا دل نہ ٹھکا- یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور ان سے کہا کہ اس بندہ کمینہ نے زنا کیا ہے- سعید کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منہ پھیر لیا- تین مرتبہ اس نے کہا اور ہر مرتبہ حضورؐ اس سے منہ پھیر لیتے رہے- جب وہ بہت مصر ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے گھر والوں کے پاس آدمی بھیجا اور پوچھا کہ یہ شخص مریض تو نہیں یا اس کو جنون تو نہیں- گھر والوں نے کہا کہ یا رسول اللہ یہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے- رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کنوارہ ہے یا شادی شدہ؟ لوگوں نے کہا کہ شادی شدہ ہے- رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تو اس کو رجم کر دیا گیا-﴾

وضاحت :

محدثین نے "رجل من اسلم" کے الفاظ سے یہ سمجھا ہے کہ یہ روایت ماعز اسلمی سے متعلق ہے، لیکن موطا میں یہ وضاحت نہیں ہے۔ ان صاحب کے متعلق دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کو ماعز کے متعلق یہ شکایت ملی تھی کہ جب مسلمان جہاد کے لیے جاتے ہیں تو یہ آدمی مسلمانوں کی بہو بیٹیوں کا پیچھا کرتا ہے اور ان کے پیچھے بکروں کی طرح ممیاتا ہے۔ آنحضرت کو معلوم تھا کہ یہ شریر آدمی ہے لیکن زنا کا معاملہ ایسا ہے کہ جب تک کسی کے متعلق پوری بات محقق نہ ہو سزا دینے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا جاسکتا۔ ماعز کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ آنحضرتؐ کے علم میں یہ بات ہے، پھر ایک لونڈی کے ساتھ اس نے زنا کیا اور وہ حاملہ ہو گئی تو معاملہ کے راز رہنے کی کوئی شکل نہ رہی۔ جب ماعز کو یقین ہو گیا کہ اب اس کا جرم راز نہیں رہا تب اس نے لوگوں کے سامنے اعتبار قائم کرنے کے لیے اس طرح کہنا شروع کیا جیسا کہ روایت میں بیان ہوا ہے۔ یہ لوگ قاضی نہیں تھے اس لیے کہ مشورہ دیا کہ توبہ استغفار کرو، اللہ توبہ قبول کرے گا۔ لیکن اسے اس پر اطمینان نہیں ہوا۔ اس کے قبیلے والوں نے اس کو یہ بتایا کہ یہ معاملہ تو اب دینے والا نہیں، اب تم آنحضرت ﷺ کے پاس جاؤ۔ وہ اگر مہربانی کریں تو ان کے اختیار میں ہے۔ تب وہ آپ کے پاس گیا اور اپنے جرم کا اقرار کیا۔ یہ بات بھی ہے کہ جب آدمی سمجھ لیتا ہے کہ اب کوئی مفر نہیں تب اس کے اوپر اتنا بوجھ پڑ جاتا ہے کہ وہ نفسیاتی طور پر کہتا ہے کہ یہ معاملہ اب کسی طرح ختم ہونا چاہیے۔

جب ایک معاملہ قاضی کے سامنے پیش ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ تفتیش کے سارے طریقے اختیار کرے، اگرچہ وہ جانتا ہو کہ یہ شخص مجرم ہے۔ قاضی اپنے علم کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کرتا بلکہ شہادتوں کی بنیاد پر رائے قائم کرتا ہے۔ وہ گواہوں سے معلوم کرتا ہے کہ ملزم کس قسم کا آدمی ہے۔ شادی شدہ ہے یا کنوارا ہے۔ اس کو کوئی دماغی عارضہ تو نہیں۔ اس کو کوئی بیماری تو لاحق نہیں۔ یہ باتیں دریافت کرنا اس کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ اس لیے ماعز کے اقرار پر آنحضرتؐ نے فوراً فیصلہ نہیں کیا بلکہ ذاتی معلومات رکھنے کے باوجود اس کے خاندان والوں سے تحقیقات کی اور اس کے بعد سزا نافذ فرمائی۔

ماعز کے سلسلہ میں کچھ روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ وہ بہت متقی اور پارسا آدمی تھا۔ اگر دامن نچوڑ دیتا تو فرشتے وضو کرتے۔ اس کے خون سے اتنے لاکھ کی نجات ہو جائے گی۔ لوگوں کی ایک رائے یہ بھی رہی ہے۔ لیکن دوسری روایتوں کے مطابق آنحضرت نے ماعز کے رجم کے بعد تقریر فرمائی جس میں اس کی حرکتوں پر نہایت غم و

غصہ کا اظہار فرمایا اور اعلان کیا کہ اس طرح کے لوگوں کے ساتھ میں اسی طرح کا معاملہ کروں گا- آپ نے اس کے جنازے کی نماز بھی نہیں پڑھی- عقیدت مندی کا اظہار اپنی جگہ، لیکن ایک محقق کو سب باتیں سامنے رکھ کر تحقیق کر کے حقیقت کو متعین کرنا ہوتا ہے-

یہ روایت بالاتفاق مرسل ہے- زرقانی نے لکھا ہے کہ ہر جگہ یہ مرسل آئی ہے لیکن دوسری صحاح میں موصول بن گئی ہے اور ابن شہاب ہیں جنہوں نے اس کو موصول بنادیا ہے- ابن شہاب کے متعلق زرقانی کا تبصرہ یہ ہے کہ ان کے تو من کی موج ہے، وہ جس روایت کو چاہتے ہیں مرسل چھوڑ دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں موصول کر لیتے ہیں-

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّهُ قَالَ بَلَغَنِي اَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ لِرَجُلٍ مِنْ اَسْلَمَ يُقَالُ لَهُ هَزَّالُ يَا هَزَّالُ لَوْ سَتَرْتَهُ بِرِدَائِكَ لَكَانَ خَيْرًا لَكَ قَالَ يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ فَحَدَّثْتُ بِهٰذَا الْحَدِيثِ فِي مَجْلِسٍ فِيهِ يَزِيدُ بْنُ نُعَيْمِ بْنِ هَزَّالٍ الْاَسْلَمِي فَقَالَ يَزِيدُ هَزَّالُ جَدِّي وَهٰذَا الْحَدِيثُ حَقٌّ-

﴿سعید بن میتب سے روایت ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ اسلم کے ایک شخص ہزال نامی سے فرمایا تھا کہ اے ہزال، اگر تم اس کو اپنی چادر کے نیچے چھپا لیتے تو یہ بات تمہارے لیے بہتر ہوتی- یحییٰ بن سعید نے کہا کہ میں نے یہ حدیث ایک ایسی مجلس میں بیان کی جس میں یزید بن نعیم بن ہزال اسلمی موجود تھے- یزید نے کہا ہزال میرے جد امجد تھے اور یہ حدیث سچی ہے-﴾

وضاحت:

یہ روایت سعید بن میتب کے بلاغات میں سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہزال کو کہا کہ اگر تم اس بات کو اپنی چادر کے نیچے چھپاتے تو تمہارے لیے بہتر ہوتا- یہ بات خود اپنی جگہ پر ٹھیک ہے کہ کسی کو اپنے یا دوسرے کے گناہوں کا اشتہار دینے کا حق نہیں- اگر کوئی اپنے گناہوں کا اشتہار دیتا ہے تو وہ اپنی ہی شامت کو دعوت دیتا ہے- اللہ تعالیٰ کی صفت جب ستاری ہے تو ہم جو گناہ کرتے ہیں ان کو اپنے اور اپنے رب کے درمیان ہی رکھنا چاہیے- اس روایت سے معلوم ہوا کہ جب تک کوئی معاملہ پولیس کیس نہ بن جائے کسی شہری کو اس میں از خود مداخلت نہیں کرنی

چاہیے۔ اگر کوئی شخص اپنا گناہ بتانے کی غلطی کرے تو اس کو یہی تلقین کرنی چاہیے کہ آپ اس کا اشتہار نہ دو اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔ لیکن جب جرم آشکارا ہو جائے اور خود منادی کرنے لگے تو اس پر قانون کے مطابق کارروائی ہو گی۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ موجودہ زمانے میں جو لوگ اپنی خود نوشت سوانح عمریاں لکھتے ہیں وہ متکبرانہ انداز میں اپنے خانگی جرائم کا اشتہار دیتے ہیں۔ اس کی ان کو سزا بھی ملتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی رسوائی کا کافی سامان کر دیتا ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ماعز کے معاملہ میں ہزال نے جا کر رپورٹ کرائی تھی۔ اس پر آنحضرتؐ نے ان کو تنبیہ فرمائی۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّهُ أَخْبَرَهُ أَنَّ رَجُلًا اعْتَرَفَ عَلَى نَفْسِهِ بِالزِّنَا عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَشَهِدَ عَلَى نَفْسِهِ أَرْبَعَ مَرَّاتٍ فَأَمَرَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَرُجِمَ۔

﴿امام مالک نے بیان کیا کہ ابن شہاب نے ان کو خبر دی کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اپنے بارے میں چار مرتبہ زنا کا اعتراف کیا تو آپ کے حکم سے اس کو رجم کر دیا گیا۔﴾

وضاحت:

یہ روایت نہایت مختصر ہے جس سے مقدمہ کے کوائف معلوم نہیں ہو سکتے۔ اس بیان سے کوئی اصول وضع نہیں کیا جا سکتا۔ امام مالک اور ابن شہاب زہری کا یہ مذہب ہے کہ رجم کے لیے اعتراف زنا ہی کافی ہے لیکن دوسرے فقہاء حضرات یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ جرم شہادت سے ثابت ہونا چاہیے۔ بعض لوگوں کی رائے میں اعتراف دوسرے جرائم کو ثابت نہیں کرتا لیکن زنا کے ثبوت کے لیے خاص ہے۔ میرے نزدیک کسی جرم کو ثابت کرنے کے کئی ذریعے ہیں۔ ان میں سے ایک ذریعہ اعتراف بھی ہے۔ موجودہ زمانے میں اعتراف کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ یہ ایک کھلا ہوا فراڈ بھی ہو سکتا ہے۔ اور جو اعتراف پولیس کراتی ہے وہ تو سب کو معلوم ہے کہ اس کا کوئی وزن ہی نہیں رہا۔ اعتراف کرنے میں بعض اوقات ایسی باتیں مضمر ہوتی ہیں کہ آدمی اعتراف کرتا ہے لیکن وہ غلط ہوتا ہے۔ یہ بات شریعت کے اصول کے بھی خلاف ہے کہ جرم کے ثبوت کے لیے یہ شرط لگائی جائے کہ اگر ملزم اعتراف جرم کرے گا تب سزا ہو گی بلکہ شہادت کے لیے جو جو طریقے ہیں ان کی رو سے دیکھا جائے گا۔ اگر شہادت موجود ہو اور زانی اعتراف جرم نہ بھی کرے تب بھی سزا ہو گی۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَعْقُوبَ بْنِ زَيْدِ بْنِ طَلْحَةَ عَنْ أَبِيهِ زَيْدِ بْنِ طَلْحَةَ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِي مُلَيْكَةَ أَنَّهُ أَخْبَرَهُ أَنَّ امْرَأَةً جَاءَتْ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَأَخْبَرَتْهُ أَنَّهَا زَنَتْ وَهِيَ حَامِلٌ فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اذْهَبِي حَتَّى تَضَعِي فَلَمَّا وَضَعَتْ جَاءَتْهُ فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اذْهَبِي حَتَّى تُرْضِعِيهِ فَلَمَّا أَرْضَعَتْهُ جَاءَتْهُ فَقَالَ اذْهَبِي فَاسْتَوْدِعِيهِ قَالَ فَاسْتَوْدَعَتْهُ ثُمَّ جَاءَتْ فَأَمَرَ بِهَا فَرُجِمَتْ۔

﴿ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ ان کو خبر ملی کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ سے بیان کیا کہ اس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے اور وہ حاملہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ اور وضع حمل کے بعد آؤ۔ جب وہ وضع حمل کے بعد حاضر ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ بچے کو دودھ پلاؤ۔ جب وہ دودھ پلانے کے بعد حاضر ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ جاؤ بچے کو کسی کے حوالے کر دو۔ راوی کہتے ہیں کہ وہ حوالے کرنے کے بعد حاضر ہوئی تب آپؐ نے حکم دیا تو وہ رجم کر دی گئی۔﴾

وضاحت:

اس روایت سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس عورت سے متعلق ہے لیکن غالباً اس سے مراد غامدیہ ہے جس کے رجم کا واقعہ حدیث کی کتابوں میں ہے۔ مجھے یہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ غامدیہ کون تھی، اس کی شادی ہوئی تھی یا نہیں۔ اس کا کوئی خاندان بھی تھا یا نہیں۔ صحیح مسلم کی روایت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ماعز نے اسی کے ساتھ زنا کیا تھا لیکن کوئی بات یقین سے کہنا مشکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ایسی عورت تھی جس کا کنبہ یا خاندان نہیں تھا۔ چنانچہ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بچے کی کفالت کا مسئلہ پیدا ہوا تو ایک انصاری نے پیش کش کی کہ میں اس کی پرورش کروں گا چنانچہ بچہ اس کے حوالے کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر اس عورت کا کوئی کنبہ قبیلہ ہوتا تو بچے کو وہ لے جاتا۔

اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ زنا سے حاملہ ہو جانے والی عورت پر حمل و رضاعت کی مدت کے دوران حد کا نفاذ نہیں کیا جائے گا۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُودٍ عَنْ أَبِي

هُرَيْرَةَ وَزَيْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِيِّ أَنَّهُمَا أَخْبَرَاهُ أَنَّ رَجُلَيْنِ اخْتَصَمَا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ أَحَدُهُمَا يَا رَسُولَ اللَّهِ اقْضِ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللَّهِ وَ قَالَ الْآخَرُ وَهُوَ أَفْقَهُهُمَا أَجَلْ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَاقْضِ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللَّهِ وَ ائْذَنْ لِي فِي أَنْ أَتَكَلَّمَ فَقَالَ تَكَلَّمْ قَالَ إِنَّ ابْنِي كَانَ عَسِيفًا عَلَى هَذَا فَزَنَى بِامْرَأَتِهِ فَأَخْبَرَنِي أَنَّ عَلَى ابْنِي الرَّجْمَ فَافْتَدَيْتُ مِنْهُ بِمِائَةِ شَاةٍ وَبِجَارِيَةٍ لِي ثُمَّ إِنِّي سَأَلْتُ أَهْلَ الْعِلْمِ فَأَخْبَرُونِي أَنَّ مَا عَلَى ابْنِي جَلْدُ مِائَةٍ وَ تَغْرِيبُ عَامٍ وَ أَخْبَرُونِي أَنَّمَا الرَّجْمُ عَلَى امْرَأَتِهِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَمَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَأَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمَا بِكِتَابِ اللَّهِ أَمَّا غَنَمُكَ وَجَارِيَتُكَ فَرَدٌّ عَلَيْكَ وَجَلَدَ ابْنَهُ مِائَةً وَغَرَّبَهُ عَامًا وَ أَمَرَ أُنَيْسًا الْأَسْلَمِيَّ أَنْ يَأْتِيَ امْرَأَةَ الْآخَرِ فَإِنِ اعْتَرَفَتْ رَجَمَهَا فَاعْتَرَفَتْ فَرَجَمَهَا قَالَ مَالِكٌ وَالْعَسِيفُ الْأَجِيرُ۔

ابو ہریرہؓ اور خالد الجہنیؓ دونوں نے عبید اللہ کو خبر دی کہ دو آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مقدمہ لے کر آئے۔ ان میں سے ایک نے کہا یا رسول اللہ! ہمارے درمیان اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ فرمایئے۔ دوسرے نے جو دونوں میں زیادہ سمجھدار تھا کہا کہ ہاں یا رسول اللہ، ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمایئے اور مجھے اجازت دیجئے کہ پہلے میں بات کروں۔ آپؐ نے فرمایا کہو۔ اس نے کہا کہ میرا بیٹا اس شخص کے ہاں مزدور تھا۔ اس نے اس کی بیوی سے زنا کا ارتکاب کیا۔ اس نے مجھے خبر دی کہ میرے بیٹے کے لیے رجم کی سزا ہے تو میں نے اس کے فدیہ میں ایک سو بکری اور اپنی لونڈی دے دی۔ پھر میں نے اہل علم سے پوچھا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے کے اوپر سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی کی سزا ہے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس شخص کی بیوی پر رجم ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اس کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے، میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ تمہاری بکریاں اور تمہاری لونڈی تم کو واپس ہیں۔ آپؐ نے اس کے بیٹے کو سو کوڑے لگوائے اور ایک سال کے لیے جلاوطن کر دیا اور انیس اسلمی کو حکم دیا کہ وہ دوسرے شخص کی بیوی کے پاس جائیں۔ اگر وہ اعتراف کرے تو اس کو رجم کریں۔ اس عورت نے اعتراف کیا تو وہ

رجم کر دی گئی- امام مالک کہتے ہیں کہ عسیف مزدور کو کہتے ہیں-﴾

وضاحت :

اس روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی قسم کھائی کہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا- پھر فیصلہ جو کیا اس میں نوجوان کو ایک سو کوڑوں کی سزا دی جو سورہ نور کے مطابق ہے- اس کے علاوہ آپ نے اس کو ایک سال کی جلاوطنی کی سزا بھی دی جو سورہ نور میں نہیں ہے اور ہمارے فقہاء بھی اس کو منسوخ مانتے ہیں- یہاں قابل غور سوال یہ ہے کہ آنحضرت نے تغریب عام (یعنی سال بھر کی جلاوطنی) کا حکم کس بنیاد پر دیا- اگر سورہ مائدہ کی آیت ۳۳ کے تحت یہ حکم آپ نے دیا تو دوسری چیز جو الجھن پیدا کرتی ہے یہ ہے کہ ایک جرم پر دو مختلف سزائیں یک وقت کیسے جاری ہو گئیں- یہ بات عقل عام کے بھی خلاف ہے اور قرآن سے بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا-

میرے نزدیک زانی کی سزا سو کوڑے ہے جس کا حکم سورہ نور کی آیت ۲ میں ہے- اگر مجرم عادی قسم کا ہو یا اس کا جرم دوسرے جرائم کو بھی شامل ہو تو اس کو محاربین کے حکم کے تحت سورہ مائدہ کی آیت ۳۳ کی روشنی میں رجم بھی کیا جا سکتا ہے اور جلاوطنی کی سزا بھی دی جا سکتی ہے- لیکن اس آیت کے تحت دو سزائیں جمع نہیں کی جا سکتیں کیونکہ آیت میں حرف عطف "او" (یا) استعمال ہوا ہے- معلوم ہوتا ہے کہ روایت کے نقل کرنے میں کہیں غلطی ہو گئی ہے-

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ سُهَيْلِ بْنِ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ قَالَ لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَرَأَيْتَ لَوْ أَنِّي وَجَدْتُ مَعَ امْرَأَتِي رَجُلًا أُمْهِلُهُ حَتَّى آتِيَ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نَعَمْ-

﴿ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ سعد بن عبادہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ کسی آدمی کو پاؤں تو کیا میں اس سے اس وقت تک تعرض نہ کروں جب تک کہ میں چار گواہ نہ لا سکوں- آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ہاں-﴾

وضاحت :

یہ روایت پہلے گزر چکی ہے- میرے نزدیک اگر شوہر کو یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ بیوی کو کسی

مرد کے ساتھ حالت غیر میں دیکھتے ہی اس کی گردن اڑا دے تو اس سے بڑے فساد پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس معاملہ کو عدالت ہی میں ثابت کرنا ہوگا۔ اگر شوہر کے پاس چار گواہ نہ ہوں تو اس صورت میں اس کے سامنے لعان کا اختیار موجود ہے۔ اس طریقے سے وہ بے وفا بیوی سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک جہاں معاملہ اس درجے کا ثابت ہو جائے کہ وہ چار گواہوں کے برابر ہو جائے تب تو "حد" کی سزا ہوگی ورنہ تعزیر کے طور پر کم تر سزا دی جا سکتی ہے۔

□ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُودٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ يَقُوْلُ الرَّجْمُ فِی كِتَابِ اللّٰهِ حَقٌّ" عَلٰى مَنْ زَنٰى مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ اِذَا اُحْصِنَ اِذَا قَامَتِ الْبَيِّنَةُ اَوْ كَانَ الْحَبَلُ اَوِ الْاِعْتِرَافُ۔

﴿عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب کو فرماتے سنا کہ رجم کا حکم اللہ کی کتاب میں فی الواقع موجود ہے، ان کے لیے جو مردوں میں سے زنا کریں یا عورتوں میں سے، بشرطیکہ وہ محصن ہوں۔ یہ سزا دی جائے گی جب ان کے خلاف دلیل موجود ہو یا حمل پایا جائے یا اعتراف جرم ہو۔﴾

□ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ عَنْ اَبِی وَاقِدٍ اللَّيْثِیِّ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اَتَاهُ رَجُلٌ وَهُوَ بِالشَّامِ فَذَكَرَ لَهُ اَنَّهُ وَجَدَ مَعَ امْرَاَتِهِ رَجُلًا فَبَعَثَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اَبَا وَاقِدٍ اللَّيْثِیَّ اِلَى امْرَاَتِهِ يَسْاَلُهَا عَنْ ذٰلِكَ فَاَتَاهَا وَ عِنْدَهَا نِسْوَةٌ حَوْلَهَا فَذَكَرَ لَهَا الَّذِی قَالَ زَوْجُهَا لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ وَ اَخْبَرَهَا اَنَّهَا لَا تُؤَاخَذُ بِقَوْلِهِ وَجَعَلَ يُلَقِّنُهَا اَشْبَاهَ ذٰلِكَ لِتَنْزِعَ فَاَبَتْ اَنْ تَنْزِعَ وَتَمَّتْ عَلَى الْاِعْتِرَافِ فَاَمَرَ بِهَا عُمَرُ فَرُجِمَتْ

﴿ابو واقد الیثی سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب شام میں تھے کہ ان کے پاس ایک شخص آیا۔ اس نے ذکر کیا کہ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ ایک آدمی کو (غیر حالت میں) پایا ہے۔ حضرت عمرؓ نے ابو واقد الیثی کو اس کی بیوی کے پاس بھیجا کہ اس سے معاملہ دریافت کریں۔ وہ اس عورت کے پاس

آئے تو دوسری عورتیں اس کو گھیرے ہوئے تھیں۔ ابو واقد نے وہ ساری بات اس عورت کو بتائی جس کا ذکر حضرت عمرؓ سے اس کے شوہر نے کیا تھا۔ انھوں نے اس کو بتایا کہ محض شوہر کے قول پر وہ پکڑی نہیں جائے گی۔ وہ اس طرح کی باتیں کرتے رہے تاکہ وہ اپنے فعل سے منحرف ہو جائے لیکن عورت نے ایسا نہیں کیا اور اعتراف پر قائم رہی۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تو وہ رجم کر دی گئی۔﴾

وضاحت :

ان دو روایتوں سے معلوم ہوا کہ زنا کے جرم کے ثبوت کے لیے ضروری ہو گا کہ یا تو اس کے لیے شہادتیں موجود ہوں یا مجرم خود اپنے جرم کا اعتراف کرے۔ اگر مجرم ایک بے شوہر عورت ہو تو اس کا حمل بھی زنا کی واقعاتی شہادت پیش کرے گا۔ جرم ثابت ہونے پر مجرم پر حد زنا جاری کی جائے گی۔

جہاں تک رجم کی سزا کے قرآن میں بیان ہونے کا تعلق ہے تو یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہے۔ سورہ مائدہ کی آیت ۳۳ میں قتلوا تقتیلا کے الفاظ بیان ہوئے ہیں۔ ان میں تقتیل کا مفہوم ہے نہایت بری طرح قتل کرنا۔ ظاہر ہے کہ ایک مجرم کو سنگسار کر کے قتل کرنا اسی قبیل کی ایک سزا ہے۔ لیکن جہاں تک زنا کی حد کا تعلق ہے وہ سورہ نور کی آیت ۲ میں ہر زانی کے لیے سو کوڑے ہی بیان ہوئی ہے۔ نبی ﷺ نے اس کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ صحیح مسلم کتاب الحدود کے باب حد الزنا کی روایت ہے :-

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ كَانَ نَبِيُّ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ كُرِبَ لِذٰلِكَ وَ تَرَبَّدَ لَهُ وَجْهُهُ قَالَ فَاُنْزِلَ عَلَيْهِ ذَاتَ يَوْمٍ فَلُقِيَ كَذٰلِكَ فَلَمَّا سُرِّيَ عَنْهُ قَالَ خُذُوْا عَنِّيْ فَقَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا الثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ وَالْبِكْرُ بِالْبِكْرِ الثَّيِّبُ جَلْدُ مِائَةٍ ثُمَّ رَجْمٌ بِالْحِجَارَةِ وَالْبِكْرُ جَلْدُ مِائَةٍ ثُمَّ نَفْيُ سَنَةٍ (مسلم :باب حد الزنیٰ)

﴿عبادہ بن صامت فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ کو اس کی تکلیف محسوس ہوتی اور آپ کا چہرہ متغیر ہو جاتا۔ فرماتے ہیں ایک دن آپ پر وحی نازل ہوئی تو آپ کی یہی کیفیت ہوئی۔ جب اس کا اثر زائل ہوا تو آپ نے فرمایا مجھ سے حکم حاصل کرو، عورتوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے راہ نکال دی ہے۔ مجرم شادی شدہ ہوں یا کنوارے۔ شادی شدہ کے لیے سو کوڑے کی سزا ہے پھر رجم۔ کنواروں کے لیے سو کوڑوں کی سزا پھر ایک سال کی جلاوطنی۔﴾

اس روایت سے معلوم ہوا کہ شادی شدہ زانی کو بھی پہلے جرم پر تو سو کوڑوں کی سزا دی جائے گی لیکن اگر اس نے اپنی روش نہ بدلی تو جرم کے اعادہ پر اس کو رجم کر دیا جائے گا، جبکہ کنوارے مجرم کے لیے جرم کے اعادہ پر جلا وطنی کی سزا دی جائے گی، جس کی آج کل کے دور میں عملی شکل سال بھر کے لیے جیل بھیجنا ہے۔

میرے نزدیک احصان (شادی شدہ ہونا) مناط حکم نہیں ہے۔ نبی ﷺ نے جن لوگوں کو رجم کروایا ان میں سب سے زیادہ مفصل بیان ماعز کے رجم کا ہے۔ یہ معاملہ اتفاقی جرم زنا کا معاملہ نہیں تھا۔ چنانچہ آپ نے ماعز کو سورہ مائدہ کے حکم کے تحت ایک محارب کی سزا دی۔ افسوس ہے کہ روایات میں زنا کے دوسرے واقعات نہایت مجمل بیان ہوئے ہیں اس لیے ان مجرموں کے اصل حالات کے بارے میں کوئی بات یقین سے کہنا مشکل ہے۔

ابو واقد لیثی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو نہ صرف شوہر نے دوسرے مرد کے ساتھ حالت غیر میں دیکھ لیا تھا بلکہ یہ معاملہ دوسری عورتوں کے علم میں بھی تھا۔ ابو واقد نے جا کر اطمینان کیا کہ عورت نے واقعی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ انہوں نے اعتراف جرم کے نتائج سے بھی آگاہ کیا تا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ سزا سے بے خبر ہو اور اسے ایک معمولی معاملہ سمجھ رہی ہو۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّهُ سَمِعَهُ يَقُولُ لَمَّا صَدَرَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ مِنْ مِنًى أَنَاخَ بِالْأَبْطَحِ ثُمَّ كَوَّمَ كَوْمَةً بَطْحَاءَ ثُمَّ طَرَحَ عَلَيْهَا رِدَاءَهُ وَ اسْتَلْقَى ثُمَّ مَدَّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ فَقَالَ اللَّهُمَّ كَبِرَتْ سِنِّي وَضَعُفَتْ قُوَّتِي وَانْتَشَرَتْ رَعِيَّتِي فَاقْبِضْنِي إِلَيْكَ غَيْرَ مُضَيِّعٍ وَلَا مُفَرِّطٍ ثُمَّ قَدِمَ الْمَدِينَةَ فَخَطَبَ النَّاسَ فَقَالَ أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ سُنَّتْ لَكُمُ السُّنَنُ وَفُرِضَتْ لَكُمُ الْفَرَائِضُ وَ تُرِكْتُمْ عَلَى الْوَاضِحَةِ إِلَّا أَنْ تَضِلُّوا بِالنَّاسِ يَمِينًا وَ شِمَالًا وَضَرَبَ بِإِحْدَى يَدَيْهِ عَلَى الْأُخْرَى ثُمَّ قَالَ إِيَّاكُمْ أَنْ تَهْلِكُوا عَنْ آيَةِ الرَّجْمِ يَقُولُ قَائِلٌ لَا نَجِدُ حَدَّيْنِ فِي كِتَابِ اللَّهِ فَقَدْ رَجَمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَرَجَمْنَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ لَا أَنْ يَقُولَ النَّاسُ زَادَ عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ فِي كِتَابِ اللَّهِ تَعَالَى لَكَتَبْتُهَا الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ فَارْجُمُوهُمَا أَلْبَتَّةَ فَإِنَّا قَدْ قَرَأْنَاهَا۔

﴿ یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن مسیب کو کہتے سنا کہ حضرت عمرؓ جب منیٰ سے لوٹے تو ابطح

میں اونٹنی کو بٹھایا، پھر البطحاء میں کنکریوں کا ایک ڈھیر سا بنایا، پھر اس پر اپنی چادر ڈالی اور ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ پھر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور دعا کی اے رب! میں بوڑھا ہو گیا، میری قوت کمزور ہو گئی، رعایا بہت پھیل گئی، اب تو مجھے اٹھا لے اس حالت میں کہ میں ضائع کرنے والا نہ ہوں اور نہ ہی کوتاہی کرنے والا (یعنی میں کچھ پانے کا متوقع نہیں ہوں لیکن مجھے دینا نہ پڑ جائے) پھر مدینہ آئے تو آپ نے خطبہ دیا اور کہا، لوگو! تمہارے لئے سنتیں مقرر اور فرائض فرض کر دیئے گئے ہیں اور تم ایک واضح راستے پر چھوڑے گئے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تم داہنے بائیں مڑ کر لوگوں سمیت گمراہ ہو جاؤ۔ پھر انہوں نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مارا۔ پھر فرمایا خبردار، کہ تم رجم کی آیت سے غافل ہو جاؤ اور کہنے والا کہے کہ ہم تو دو "حدیں" کتاب اللہ میں نہیں پاتے۔ پھر انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا اور ہم نے رجم کیا اور قسم ہے اس ذات کی جس کی مٹھی میں میری جان ہے کہ اگر لوگ یہ نہ کہنے لگیں کہ عمر نے اللہ کی کتاب میں اضافہ کیا ہے تو میں اس آیت کو اس میں لکھ دیتا۔ "**الشیخ والشیخه فارجموها البتة**" (شیخ اور شیخہ کو لازماً پتھر مارو) کیونکہ ہم نے یہ آیت پڑھی ہے۔

وضاحت:

زانی کے لیے جرم کی سزا کا موقع و محل اوپر کی روایات کے تحت حضرت عبادہ بن صامتؓ والی حدیث کے حوالہ سے بیان ہو چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ سزا حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی زیر بحث آئی تو انہوں نے لوگوں کو تلقین فرمائی کہ فرائض و سنن واضح ہو چکے ہیں۔ ان کو مضبوطی سے تھامو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے۔

زیر بحث روایت کے آخری حصہ میں جو آیت رجم کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی نسبت حضرت عمرؓ کی طرف محل نظر ہے۔ اس کے اسباب حسب ذیل ہیں:۔

(۱) قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ جن آیات کا حکم کالعدم کر دیا گیا اور ان کی جگہ دوسری آیات نازل کر دی گئیں، ان کو بھی قرآن میں باقی رکھا گیا ہے۔ لیکن یہاں عجیب معاملہ ہے کہ جس آیت کا حکم باقی ہے اس کو نکال دیا گیا حتی کہ اکابرین امت کو یہ فکر لاحق ہو گئی کہ لوگ اس کے حکم کو کہیں بھول نہ جائیں۔ عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر ایک آیت نازل ہونے کے بعد منسوخ کر دی گئی تو یہ اس بات کا ثبوت ہوا کہ رجم کا حکم پہلے تھا پھر منسوخ کر دیا گیا،

ورنہ اس کو نکالنے کی مصلحت سمجھ میں نہیں آتی۔

(ب) اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا اس بات کی کوئی اور نظیر بھی ہے کہ کسی آیت کو ختم کرنے کے باوجود اس کا حکم برقرار رکھا گیا ہو تو جواب ملتا ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں۔ صرف یہی ایک آیت ہے کہ جس کو غیر متلو کر دیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا بڈھے زانیوں ہی کی یہ اہمیت تھی کہ ان کے بارے میں ایک خاص آیت نازل کر کے پھر غیر متلو کر دی گئی۔ جبکہ غیر متلو کر دینے میں یہ خطرہ بہرحال موجود ہے کہ اس میں کمی بیشی کر دی جائے، حالانکہ وحی متلو کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے اٹھایا ہے۔

(ج) قرآن مجید کے متعلق ہم سب کا ایمان ہے کہ یہ اپنی حجت میں سب سے کامل درجے پر ہے۔ اس کو اگر کوئی چیز منسوخ کر سکتی ہے تو وہ اسی کے پائے کی ہونی لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناسخ اور منسوخ دونوں کو قرآن میں رکھنا ضروری ہوا۔ اس نکالی ہوئی آیت کو آپ وحی غیر متلو بھی مان لیں تو یہ وحی متلو کے پائے کو ہرگز نہیں پہنچ سکتی۔ سوال یہ ہے کہ ایسی چیز قرآن کے حکم کی ناسخ کیسے مانی جا سکتی ہے؟

(د) کفار نے جب یہ موقف اختیار کیا کہ جب تک قرآن میں ان کی مرضی کی ترمیم نہیں کی جاتی وہ اس کو ماننے کے نہیں، تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی زبان سے کہلوایا کہ ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی (مجھے کیا حق ہے کہ میں اپنے جی سے اس کو بدل ڈالوں) اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے حکم کو منسوخ کرنے کا اختیار نبی ﷺ کو بھی نہیں تھا۔ پھر اگر یہ کتاب اللہ کی آیت تھی تو اس کو اس میں سے نکالا کس نے؟ اور جب نکال دی گئی تو اس کا حکم کس بنیاد پر باقی رہ گیا؟ جب نبی ﷺ قرآن میں ترمیم کا حق نہیں رکھتے تھے تو ان کے ایک امتی کو یہ حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ اس کی خواہش کرتے؟

(ہ) جس عبارت کو قرآن کی آیت کہا جاتا ہے اس کی زبان کو دیکھئے۔ کیا کوئی سلیم المذاق آدمی اس کو قرآن کی زبان کہہ سکتا ہے؟ اس کو تو قول رسول بھی نہیں مانا جا سکتا۔ یہ کسی ملا کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ لفظ شیخ کا اطلاق بڑے بوڑھے پر ہوتا ہے۔ قرآن میں ھذا بعلی شیخا (یہ میرے میاں تو بڑے بوڑھے ہیں) جس مفہوم کے اظہار کے لیے آیا ہے وہ یہ ہے کہ اس بڑی عمر میں مرد جنسی تعلق پر قادر ہی نہیں ہوتا۔ شیخہ کا استعمال بڑی بوڑھی کے لیے بے حد شاذ ہے۔ ان الفاظ سے از خود یہ مفہوم بھی نہیں نکلتا کہ وہ بوڑھے شادی شدہ بھی ہیں جبکہ روایت سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ شادی شدہ زانیوں پر رجم کی حد لاگو ہو گی۔ پھر عربی زبان کے اسلوب میں، البکر بالبکر اور الثیب بالثیب

کہیں گے، البکر بالبکرہ اور الثیب بالثیبہ نہیں کہیں گے-اس اسلوب پر یہاں بھی صحیح عبارت کا تقاضا یہ تھا کہ الشیخ بالشیخ آتا نہ کہ الشیخ بالشیخہ-

(و) اس وحی غیر متلو کا حال یہ ہے کہ اس کی عبارت پر راویوں کا اتفاق ہی نہیں-دوسری کتابوں میں جو روایت آئی ہے اس میں و اذا زنیا کے الفاظ زیادہ ہیں-موطا کی اس روایت میں یہ لفظ تک بھی نہیں آئے-

(ز) حد رجم کو اگر قرآن سے ثابت کرنا تھا تو اس کا حکم مطلق ہونا چاہیے تھا جس سے معلوم ہو سکتا کہ تمام شادی شدہ زانیوں کی سزا رجم ہے-اس عبارت میں رجم کو بڑے بوڑھوں کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے-اس سے رجم کے لیے عام حکم کیسے اخذ کیا جا سکتا ہے-

میرے نزدیک رجم کا حکم سورہ مائدہ میں ہے اور اس کو عادی زانیوں یا مرکب جرم کا ارتکاب کرنے والوں پر نافذ کیا جا سکتا ہے-زنا کی عام حد، کنوارے اور شادی شدہ دونوں قسم کے مجرموں کے لیے، سو کوڑے ہی ہیں-جہاں تک اس روایت کی 'آیت رجم' کا تعلق ہے، میرے نزدیک حضرت عمرؓ کے ساتھ اس کو منسوب کرنا ایک سازش کے تحت ہوا-شیعہ کا یہ مشن ہے کہ وہ قرآن مجید کی محفوظیت کو مشکوک ثابت کریں-اگر وہ اس میں کمی بیشی ثابت نہ کریں تو ان کا کام نہیں چلتا کیونکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات جو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے حق میں تھیں، ان کو حضرات ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ نے العیاذ باللہ کتاب اللہ سے نکال دیا تھا-

پھر یہ لوگ حضرت عمرؓ کو بھی متہم کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ کی نسبت لوگوں سے زیادہ ڈرنے والے تھے-وہ اگرچہ جانتے تھے کہ ایک آیت وہ پڑھتے رہے ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے رہے ہیں لیکن لوگوں کے ڈر سے انہوں نے اس کو قرآن میں لکھوانے کی جرأت نہ کی-

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ اُتِيَ بِامْرَاَةٍ قَدْ وَلَدَتْ فِي سِتَّةِ اَشْهُرٍ فَاَمَرَ بِهَا اَنْ تُرْجَمَ فَقَالَ لَهُ عَلِيُّ بْنُ اَبِي طَالِبٍ لَيْسَ ذٰلِكَ عَلَيْهَا اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى يَقُوْلُ فِي كِتَابِهٖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُوْنَ شَهْرًا وَقَالَ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ فَالْحَمْلُ يَكُوْنُ سِتَّةَ اَشْهُرٍ فَلَا رَجْمَ عَلَيْهَا فَبَعَثَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ فِي اَثَرِهَا فَوَجَدَهَا قَدْ رُجِمَتْ-

امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عثمانؓ کے سامنے ایک عورت کو پیش کیا گیا جس نے چھ ماہ میں

ایک بچے کو جنم دیا تھا- آپؓ نے حکم دیا کہ اس کو رجم کر دیا جائے- حضرت علیؓ نے کہا کہ اس پر رجم نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ بچے کا حمل اور دودھ چھڑانا تیس ماہ ہیں اور یہ کہ بچوں کی مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اس شخص کے لیے جو رضاعت کی تکمیل چاہتا ہو- اس طرح حمل کے صرف چھ ماہ بنتے ہیں لہٰذا اس عورت پر رجم نہیں- حضرت عثمانؓ نے اس عورت کے پیچھے آدمی بھیجا تو معلوم ہوا کہ وہ رجم کر دی گئی تھی-﴾

وضاحت :

یہ روایت امام مالکؒ کی بلاغات میں سے ہے اور ان کی اکثر بلاغات وہ ہیں جن کے پیچھے ابن شہاب چھپے ہوتے ہیں- امام مالکؒ ان سے حسن ظن رکھتے تھے لیکن وہ یہ جانتے تھے کہ ابن شہاب پر شیعیت کا شبہ کیا جاتا ہے اس لیے وہ ان کو اپنی بلاغات کے پردے میں چھپا لیتے تھے-

معلوم ہوتا ہے یہ روایت بھی حضرت عثمانؓ کے اوپر حضرت علیؓ کی فضیلت کی غرض سے گھڑی گئی ہے-

یہ بات قابل یقین نہیں کہ حضرت عثمانؓ بغیر تحقیق کے محض ہوا قفیت کی بنا پر ایک بے گناہ عورت کو رجم کرا دیں-

یہ ابن شہاب کی شرارت ہے جس کا مقصد حضرت عثمانؓ کو بدنام کرنا ہے-

مَا جَاءَ فِي مَنِ اعْتَرَفَ عَلَى نَفْسِهِ بِالزِّنَا

اس شخص کے بارے میں جس نے اپنے متعلق زنا کا اعتراف کر لیا

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ أَنَّ رَجُلًا اعْتَرَفَ عَلَى نَفْسِهِ بِالزِّنَا عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَدَعَا لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِسَوْطٍ فَأُتِيَ بِسَوْطٍ مَكْسُورٍ فَقَالَ فَوْقَ هَذَا فَأُتِيَ بِسَوْطٍ جَدِيدٍ لَمْ تُقْطَعْ ثَمَرَتُهُ فَقَالَ دُونَ هَذَا فَأُتِيَ بِسَوْطٍ قَدْ رُكِبَ بِهِ وَلَانَ فَأَمَرَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَجُلِدَ ثُمَّ قَالَ أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ آنَ لَكُمْ أَنْ تَنْتَهُوا عَنْ حُدُودِ اللَّهِ مَنْ أَصَابَ مِنْ هَذِهِ الْقَاذُورَاتِ شَيْئًا فَلْيَسْتَتِرْ بِسِتْرِ اللَّهِ فَإِنَّهُ مَنْ يُبْدِلَنَا صَفْحَتَهُ نُقِمْ عَلَيْهِ كِتَابَ اللَّهِ-

﴿ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کے زمانے میں اپنے متعلق زنا کا اعتراف کیا- رسول اللہ ﷺ نے

اس کے لیے کوڑا منگوایا تو ٹوٹا ہوا کوڑا لایا گیا- آپؐ نے فرمایا اس سے بہتر لاؤ- ایک نیا کوڑا لایا گیا جس کے پھل کی تیزی ابھی کند نہیں ہوئی تھی- آپ نے فرمایا اس سے کمتر لاؤ- پھر ایک کوڑا لایا گیا جس کو سواری میں استعمال کیا جا چکا تھا اور وہ نرم ہو گیا تھا- آپؐ نے حکم دیا تو آدمی کو اس کوڑے سے مارا گیا- پھر آپ نے فرمایا اے لوگو، اب تمہارے لیے وقت آگیا ہے کہ اللہ کی حدود کی خلاف ورزی سے باز رہو اور جو شخص اس طرح کی گندگی میں مبتلا ہو جائے تو وہ اللہ کے پردے میں اپنے آپ کو چھپائے- لیکن جو شخص اپنی گردن ہمارے سامنے تانے گا تو ہم اللہ کی حدود اس پر جاری کریں گے-»

وضاحت :

ایک بات تو اس روایت میں یہ ہے کہ کوڑا درمیانہ ہونا چاہیے- نہ بالکل نیا ہو اور نہ ہی زیادہ استعمال شدہ کہ ٹوٹنے کے قریب ہو- ہمارے ہاں جیلوں میں جو کوڑا استعمال ہوتا ہے وہ خاص طریقے کا بنوایا جاتا ہے- اس کو باقاعدہ تیل دیا جاتا ہے- اس روایت سے معلوم ہوا کہ ایسا کوڑا اسلام میں مطلوب نہیں ہے- عام کوڑا ہونا چاہیے- آنحضرتؐ نے کوڑا منگوایا تو وہ ٹوٹا ہوا تھا- آپؐ نے اس کو تسلیم نہیں کیا- دوسری دفعہ بالکل تازہ شاخ سے بنایا گیا کوڑا لایا گیا- جس طرح چاقو یا تلوار کی دھار کو پھل کہتے ہیں اسی طرح نئے کوڑے کی تیزی کو پھل کہتے ہیں- جوہری نے ثمر سے کوڑے کے کنارے کی گرہیں مراد لی ہیں- یہ گرہیں اس کی گانٹھ ہوتی ہیں- حافظ عبدالبرؒ نے جو وضاحت کی ہے وہ ٹھیک ہے کہ جس کوڑے کو استعمال نہ کیا گیا ہو اور وہ نرم بھی نہ ہوا ہو بلکہ تازہ دم کوڑا ہو اس کو آپ نے نہیں مانا اور ایسا کوڑا استعمال کیا جو بیچ کی راس کا تھا- یہ چابک گھوڑے پر استعمال ہو چکا تھا اور اس میں نرمی پیدا ہو گئی تھی-

دوسری بات یہ ہے کہ جیلوں میں جو لوگ کوڑے لگانے پر مامور ہیں وہ کوڑا زنی کی مشق کرتے ہیں، جس طرح کہ فوجی مشقیں کرتے ہیں- یہ چیز بھی شریعت کے خلاف ہے- کوڑا مارنے کے لیے کسی مشاق پہلوان کو نہیں بلایا جائے گا- حاکم یا سزا دینے کا ذمہ دار شخص کسی بھی آدمی کو جو سامنے موجود ہو اس کو حکم دے دے گا کہ تم مجرم کو اتنے کوڑے لگا دو- صدر اول میں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ مجرموں کو کوڑے لگاتے تھے لیکن انہوں نے اس کی کوئی ٹریننگ نہیں لی ہوئی تھی-

کوڑا لگانے کے بارے میں یہ ہدایت بھی ہے کہ مارتے وقت بغل نمایاں نہ ہو یعنی کوڑا زیادہ نہ اٹھایا جائے تاکہ متوسط درجے کی چوٹ ہی آسکے- یہ بات ایک دوسری روایت میں بیان ہوئی ہے-

جہاں تک اعتراف کرنے کا تعلق ہے تو سزا صرف اسی مجرم کے لیے نہیں جو گناہ کا اعتراف کرے بلکہ بینہ کا قائم ہو جانا اصل چیز ہے- ایسی شکلیں بھی ہو سکتی ہیں کہ اعتراف کے باوجود آپ کوڑے نہیں لگا سکتے کیونکہ بعض روایات میں ہے کہ آنحضرتؐ نے اعتراف کے باوجود مجرم کے بارے میں یہ پوچھا کہ وہ بیمار تو نہیں یا کیا اس کی ذہنی کیفیت درست نہیں- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالی اعتراف کوئی چیز نہیں- البتہ یہ ضرور ہے کہ اعتراف کے بعد زیادہ کریدنے کی ضرورت نہیں رہتی-

اس روایت میں رجم کا کوئی ذکر نہیں- معلوم ہوا کہ یہ سزا سورہ نور کی جلد والی آیت کے تحت دی گئی-

آنحضرت ﷺ کے یہ الفاظ کہ "ایها الناس قد ان لکم ان تنتهوا من حدود الله" بہت اہمیت رکھتے ہیں- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے جو کچھ ہوتا رہا وہ پرانی رسوم اور روایات کے تحت ہوتا رہا یا تورات کے احکام کے تحت ہوا ہوگا- آخر معاشرے میں کسی نہ کسی طریقے سے نظم تو قائم رکھنا ہوتا ہے لیکن جو قوانین جاری تھے وہ کسی مضبوط بنیاد پر نہ تھے- یہی قوانین جب قرآن میں واضح طریقے پر آگئے تب آپ نے فرمایا کہ وقت آگیا ہے کہ تم لوگ اللہ کے حدود سے باز رہو اور ان گندگیوں سے بچو- جو غلطی اس طرح سے ہو جائے تو اللہ کے پردے میں چھپنا چاہیے- دبے پاؤں اللہ کی طرف رجوع کر کے معافی مانگنی چاہیے لیکن اگر کوئی اپنی گردن دکھائے گا تو ہم اس پر کتاب اللہ کا حکم جاری کریں گے- حکم سے اشارہ سورہ نور کے سو کوڑوں کی سزا کی طرف ہے-

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ صَفِيَّةَ بِنْتَ اَبِي عُبَيْدٍ اَخْبَرَتْهُ اَنَّ اَبَابَكْرٍ الصِّدِّيقَ اُتِيَ بِرَجُلٍ قَدْ وَقَعَ عَلَى جَارِيَةٍ بِكْرٍ فَاَحْبَلَهَا ثُمَّ اعْتَرَفَ عَلَى نَفْسِهِ بِالزِّنَا وَلَمْ يَكُنْ اَحْصَنَ فَاَمَرَ بِهِ اَبُوبَكْرٍ فَجُلِدَ الْحَدَّ ثُمَّ نُفِيَ اِلَى فَدَكَ-

قَالَ مَالِكٌ فِي الَّذِي يَعْتَرِفُ عَلَى نَفْسِهِ بِالزِّنَا ثُمَّ يَرْجِعُ عَنْ ذٰلِكَ وَيَقُولُ لَمْ اَفْعَلْ وَ اِنَّمَا كَانَ ذٰلِكَ مِنِّي عَلَى وَجْهِ كَذَا وَ كَذَا لِشَيْءٍ يَذْكُرُهُ اِنَّ ذٰلِكَ يُقْبَلُ مِنْهُ وَلَا يُقَامُ عَلَيْهِ

الحدُّ وَذٰلِكَ اَنَّ الحدَّ الَّذِی هُوَ لِلّٰهِ لَا یُؤخَذُ اِلَّا بِاَحَدِ وَجْهَینِ اِمَّا بَیِّنَۃٍ عَادِلَۃٍ تُثْبِتُ عَلٰی صَاحِبِهَا وَ اِمَّا بِاعْتِرَافٍ یُقِیمُ عَلَیْهِ حَتّٰی یُقَامَ عَلَیْهِ الْحَدُّ فَاِنْ اَقَامَ عَلٰی اعْتِرَافِهٖ اُقِیمَ عَلَیْهِ الحدُّ قَالَ مَالِكٌ الَّذِی اَدْرَکْتُ عَلَیْهِ اَهْلَ الْعِلْمِ اَنَّهٗ لَا نَفْیَ عَلَی الْعَبِیْدِ اِذَا زَنَوْا۔

﴿حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے ایک کنواری لونڈی سے برا کام کیا اور وہ حاملہ ہو گئی۔ پھر اس نے زنا کا اعتراف کیا اور وہ شادی شدہ نہ تھا۔ حضرت ابو بکرؓ نے حکم دیا تو اس پر کوڑوں کی حد جاری کی گئی پھر اس کو فدک کو جلا وطن کر دیا گیا۔

امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص زنا کا اعتراف کرلے پھر اس سے لوٹ جائے اور کہے کہ میں نے ایسا نہیں کیا اور جو کچھ میں نے کہا اس کا یہ پہلو تھا (یعنی اس کی توجیہ کردے) تو اس کا عذر قبول ہو گا اور اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔ اس لیے کہ حد جو اللہ کے لیے جاری کی جاتی ہے وہ دو وجہوں میں سے کسی ایک پر جاری کی جاتی ہے۔ ایک تو یہ کہ کوئی واضح دلیل ہو جس سے زنا کا جرم ثابت ہو جائے یا ایسا اعتراف ہو جس پر ملزم حد نافذ ہونے تک قائم رہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اہل علم کو اسی پر پایا اور یہ بات بھی فرمائی کہ غلام جب زنا کریں تو ان پر جلا وطنی کی سزا نہیں۔﴾

وضاحت :

اس روایت میں خاص بات یہ ہے کہ کوڑوں کی سزا کے علاوہ جلاوطنی کا حکم بھی ہے۔ حالانکہ جلاوطنی کی سزا کو سب منسوخ مانتے ہیں۔ اگر حضرت ابو بکرؓ نے یہ سزا بھی دی تو اس کو منسوخ ماننے کی کوئی بنیاد ہونی چاہیے۔

امام صاحب کے فتویٰ سے بھی یہ بات معلوم ہوئی کہ محض اعتراف کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز بینہ یعنی دلیل ہے جو ملزم پر جرم ثابت کردے۔ آج کل بھی پولیس کے آگے لوگ اعتراف کر لیتے ہیں لیکن عدالت میں جا کر رجوع کر لیتے ہیں۔ لہٰذا جو آدمی اپنے اعتراف سے پھر جائے اس پر حد جاری نہیں ہو گی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ رجم بغیر اعتراف کے نہیں ہو سکتا تو یہ شیعوں کا مذہب ہے اور کسی کا نہیں۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ غلام پر جلاوطنی نہیں- حالانکہ آگے ایک روایت آرہی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک غلام کو جلاوطنی کی سزا دی- امام مالک کی یہ رائے خلیفہ راشد کے خلاف ہے-

جَامِعُ مَا جَاءَ فِي حَدِّ الزِّنَا

زنا کی سزا کے بارے میں جامع باب

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُودٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ وَ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ سُئِلَ عَنِ الْأَمَةِ إِذَا زَنَتْ وَلَمْ تُحْصَنْ فَقَالَ إِنْ زَنَتْ فَاجْلِدُوهَا ثُمَّ إِنْ زَنَتْ فَاجْلِدُوهَا ثُمَّ إِنْ زَنَتْ فَاجْلِدُوهَا ثُمَّ بِيعُوهَا وَلَوْ بِضَفِيرٍ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ لَا أَدْرِي أَبَعْدَ الثَّالِثَةِ أَوِ الرَّابِعَةِ .

﴿ابو ہریرہؓ اور زید بن خالد جہنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسی لونڈی کے لیے حکم پوچھا گیا جو زنا کی مرتکب ہوئی ہو جبکہ وہ محصنہ نہ ہو- آپؐ نے فرمایا کہ اگر زنا کرے تو کوڑے لگاؤ- اگر پھر زنا کرے تو کوڑے لگاؤ- پھر زنا کرے تو کوڑے لگاؤ پھر اس کو بیچ دو اگرچہ ایک رسی کے عوض- ابن شہاب کو معلوم نہیں تھا کہ بیچ دینے کا آپ نے تیسری مرتبہ کے بعد کہا یا چوتھی مرتبہ کے بعد-﴾

وضاحت :

اس روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپؐ نے کتنے کوڑے مارنے کا حکم دیا- لوگوں کا خیال یہ ہے کہ غلاموں کی سزا آزاد مجرموں سے نصف ہے تو پچاس کوڑے لگانے کا حکم دیا گیا ہوگا- یہ بات قابل ذکر ہے کہ دوبارہ یا سہ بارہ جرم کے ارتکاب پر بھی سزا وہی رکھی گئی ہے اور اس کے بعد فروخت کر دینے کا حکم دیا گیا ہے-

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ أَنَّ عَبْدًا كَانَ يَقُومُ عَلَى رَقِيقِ الْخُمُسِ وَ أَنَّهُ اسْتَكْرَهَ جَارِيَةً مِنْ ذٰلِكَ الرَّقِيقِ فَوَقَعَ بِهَا فَجَلَدَهُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَنَفَاهُ وَلَمْ يَجْلِدِ الْوَلِيدَةَ لِأَنَّهُ اسْتَكْرَهَهَا-

﴿مالک نافع سے روایت کرتے ہیں کہ ایک غلام غلاموں کی نگرانی پر مامور تھا- اس نے ان میں سے

ایک لونڈی کو مجبور کیا اور اس کے ساتھ بدکاری کی۔ حضرت عمرؓ نے اس کو کوڑے مارے اور جلاوطن کیا۔ لیکن لونڈی کو کوڑے نہیں مارے کیونکہ غلام نے اسے مجبور کیا تھا۔﴾

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّ سُلَيْمَانَ بْنَ يَسَارٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَيَّاشِ بْنِ أَبِي رَبِيعَةَ الْمَخْزُومِيَّ قَالَ أَمَرَنِي عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فِي فِتْيَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ فَجَلَدْنَا وَلَائِدَ مِنْ وَلَائِدِ الْإِمَارَةِ خَمْسِينَ خَمْسِينَ فِي الزِّنَا۔

﴿عبداللہ بن عیاش مخزومی سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے مجھے حکم دیا تو ہم نے قریش کے نوجوانوں کے معاملہ میں سرکاری لونڈیوں کو زنا کی سزا پچاس پچاس کوڑے لگائے۔﴾

وضاحت :

یہ روایت حضرت عمرؓ کے عمل سے متعلق ہے اور اس سے متصل پہلی روایت بھی ان ہی کا اثر ہے۔ لیکن دونوں میں سزا کا واضح فرق ہے۔ پہلی روایت میں کوڑوں کے ساتھ جلاوطنی کی سزا بھی ہے۔ یہ معلوم نہیں کوڑے پچاس مارے گئے یا ایک سو۔ دوسری روایت کے مطابق لونڈیوں کو پچاس پچاس کوڑے مارے گئے یعنی آزاد مجرموں کی سزا کا نصف۔ سورہ نساء کی آیت ۲۵ میں صرف محصنہ لونڈیوں کی سزا نصف بتائی ہے جبکہ غلام مردوں کا کوئی ذکر نہیں۔ سورہ نور والی سزا میں صرف زانی مرد اور عورتوں کی سزا مذکور ہے، آزاد یا غلام کی تمیز نہیں کی گئی۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زانی غلاموں کی سزا بھی سو کوڑے ہی ہے۔ صرف زانیہ محصنہ لونڈی کی سزا سورہ نساء کے تحت نصف ہو گی۔

امام مالک کا فتویٰ اس عورت کے بارے میں جو حاملہ پائی جائے جبکہ اس کا شوہر نہ ہو، یہ ہے کہ اگر وہ یہ کہے کہ وہ مجبور کی گئی تھی یا یہ کہے کہ اس نے شادی کی تھی تو یہ بات اس کی قبول نہیں کی جائے گی اور اس پر حد جاری کی جائے گی الا آنکہ اس کے نکاح کے دعویٰ پر کوئی دلیل ملے یا وہ اس بات کی دلیل دے کہ وہ مجبور کی گئی۔

امام مالک صاحب کا یہ فتویٰ ٹھیک ہے۔ اس میں بھی یہ ہے کہ مجرد انکار یا اعتراف کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز جرم کی دلیل اور اس کا ثبوت ہے۔

روایات پر تبصرہ :

کتاب الحدود کی زنا کے بارے میں تمام روایات اوپر گزر چکیں۔ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف موقعوں پر زنا میں ملوث ہونے والوں کو مختلف سزائیں دی گئیں۔زنا کی سزا کے بارے میں لوگوں میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے مسئلے کو واضح کیا جائے۔

قرآن مجید میں زانی مرد اور زانیہ عورت کو سو کوڑے لگانے کا حکم ہے۔قرآن مجید کے سوا اس سزا کو کوئی اور چیز باطل نہیں کر سکتی۔جہاں تک "الشیخ والشیخة فارجموھا البتة" کا قرآن مجید کی آیت ہونے کا تعلق ہے اس کو تو انتہائی بد مذاق شخص بھی قرآن مجید کی آیت نہیں مانے گا۔ایک چیز قرآن مجید کی ہو اور وہ اس میں موجود نہ ہو، اس کا حکم موجود ہو اور آیت قرآن مجید میں سے نکال دی گئی ہو، بالکل ہی نامعقول بات ہے۔پھر حضرت عمرؓ کو اس کے قرآن کی آیت ہونے پر اتنا جزم ہو لیکن وہ اس کو قرآن مجید میں داخل نہ کریں صرف اس ڈر سے کہ مسلمان کہیں گے کہ انہوں نے قرآن مجید میں اضافہ کر دیا، اس کا قطعاً کوئی امکان نہیں۔یہ بات صرف حضرت عمرؓ کو مطعون کرنے کے لیے گھڑی گئی ہے۔قرآن مجید کی کوئی آیت منسوخ نہیں کی جا سکتی، الا آنکہ خود قرآن مجید اس کو منسوخ کر دے۔اور ناسخ و منسوخ دونوں کا قرآن مجید میں ہونا لازمی ہے۔

میرے نزدیک قرآن مجید میں رجم کی سزا بھی ہے اور جلا وطنی کی سزا بھی۔لیکن یہ دونوں سزائیں عادی یا ہٹ دھرم مجرموں کے لیے ہیں۔

عبادہ بن صامت کی روایت بہترین طریقہ پر اس کی وضاحت کرتی ہے کہ الثیب بالثیب الجلد والرجم۔ البکر بالبکر الجلد والنفی یعنی شادی شدہ کے لیے کوڑے اور رجم، اور غیر شادی شدہ کے لیے کوڑے اور جلا وطنی۔اس پر سب لوگوں کا اتفاق ہے کہ دونوں حدیں ایک ساتھ نہیں جاری ہو سکتیں۔اس لیے فقہاء اس کو منسوخ مانتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ عربی نہ جاننے کی وجہ سے ہے۔اس لیے کہ واؤ جمع ہی کے لیے نہیں آتا تفریق کے لیے بھی آتا ہے۔اس میں پہلی سزا دونوں صورتوں میں جلد ہی ہے۔یعنی پہلی سزا ہر زانی کو قرآن کے مطابق جلد ہی کی دی جائے گی۔اور اگر وہ ہٹ دھرم ہے، شریر ہے، ضدی ہے اور پھر پکڑا جائے تو قاضی شادی شدہ کو رجم کی اور غیر شادی شدہ کو جلا وطنی کی سزا بھی دے سکتا ہے۔

اب آنحضرت ﷺ کے زمانے کے واقعات کو لیں۔ان میں خاص واقعہ ماعز اسلمی کا ہے۔ماعز کے متعلق

روایات میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے جب ماعزؓ کو رجم کیا تو اس کے بعد سرکاری بیان دیا۔ اس میں آپ نے صاف صاف یہ کہا کہ جب ہم فوج لے کر نکلتے ہیں تو ہمارے پیچھے یہ شخص ہماری بہو بیٹیوں کے پیچھے "ینب نبیب التیس" سانڈ کی طرح پھرتا۔ یہ تقریر آپ نے واقعہ کے فوراً بعد کی تو اسی واقعہ سے متعلق تھی۔ دوسری روایت میں نہایت واضح الفاظ میں یہ ہے کہ آنحضرت کو اس کی شرارتوں کا پہلے سے علم تھا لیکن کوئی ایسی بات ابھی ثابت نہیں ہو سکی تھی جس پر سخت قسم کی سزا ہو۔ اس کو بھی معلوم تھا کہ آنحضرتؐ اس کی حرکتوں پر نظر رکھتے ہیں۔ جب وہ زنا کے جرم کا مرتکب ہوا تو اس کے قبیلے والوں نے اس کو مشورہ دیا کہ اب اور کوئی شکل بچنے کی نہیں تم آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔ وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور پوچھا کہ آپ کو میرے متعلق کیا بات پہنچی ہے۔ لیکن آپ نے اس کو ٹال دیا کیونکہ آپ واقعہ کی پوری تحقیق کر لینا چاہتے تھے۔ وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے پاس گیا۔ انہوں نے یہی مشورہ دیا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس جاؤ یہ بات آپ کے نوٹس میں ہے۔ جب اس کو معلوم ہو گیا کہ اب بچنے کی کوئی صورت نہیں تب اس نے جا کر آنحضرت ﷺ کے سامنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ یہ اس نے خاندان اور قبیلے والوں کے مشورہ سے کیا۔ آنحضرت ﷺ کا اندازہ سمجھنا بے وقوفوں کا کام تو نہیں۔ آپؐ ٹالتے رہے تو اس سے اس کو گمان ہوا کہ معاف کر دیں گے۔ آنحضرت ﷺ کو اگرچہ معلوم تھا لیکن آپ اپنے علم کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کر سکتے تھے بلکہ آپ کو دلائل کی ضرورت تھی۔ اس لیے آپ نے تحقیق کی کہ اس کی شادی ہوئی ہے یا نہیں۔ اس کا دماغ ٹھیک ہے کہ نہیں۔ یہ سب باتیں قدیم ترین قانون کی رو سے چلی آ رہی تھیں اور آج تک چلی آ رہی ہیں۔ آخرکار جب آنحضرت ﷺ کو تحقیق ہو گیا کہ یہ شخص مجرم ہے تو آپ نے اس کو رجم کرنے کا حکم دے دیا۔ تب اس نے کہا کہ میری قوم نے مجھے مروا دیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس جاؤ وہ تمہارے ساتھ رعایت کریں گے۔

اس شخص کے بارے میں کچھ لوگوں نے اس قسم کے سخت فقرے کہے کہ اس کی شامت اعمال نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور وہ کتے کی موت مارا گیا۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب وہ کیفر کردار تک پہنچ گیا تو اب اس کے معاملے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ بعض لوگوں کے خیال میں چونکہ اس نے آنحضرتؐ کے پاس خود جا کر بار بار کہا کہ مجھے پاک کیجئے اس لیے وہ بڑا ولی اللہ تھا۔ عاقل یہ سمجھتا ہے کہ مجرم جب بے بس ہو جاتا ہے تو یہ طریقہ اختیار کرتا ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ اگر ایسی بات ہوتی تو آپؐ اس کا جنازہ پڑھ دیتے، لیکن روایات میں ہے کہ آپ نے

اس کے لیے نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ اگر وہ سزا پا کر اتنا ہی مقرب ہو گیا تھا تو آپؐ نے نماز جنازہ کیوں نہ پڑھی!

دوسرا واقعہ غامدیہ کا ہے۔ اس خاتون کے خاندان کا پتہ نہیں، اس کے شوہر کا پتہ نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ شادی شدہ تھی یا نہیں اور اس کے متعلق پوچھا بھی نہیں گیا۔ اس کا بچہ بھی کسی انصاری کے حوالے کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کال گرل تھی۔ جب حمل ہو گیا تو جرم ثابت ہو گیا اور اس میں کوئی ابہام بھی نہ رہا۔ ایسے لوگوں کا علاج ایک ہی تھا کہ ان کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ چنانچہ یہ غامدیہ بھی رجم کر دی گئی۔

یہ دو واقعات سنگین قسم کے مجرموں کے ہیں اس لیے ان کو سخت سزا دی گئی اور دونوں کو رجم کر دیا گیا۔

اَلحَدُّ فِي القَذفِ وَالنَّفيِ وَالتَّعرِيضِ

تہمت لگانے، باپ کا بیٹا ہونے کی نفی کرنے اور ایسا جملہ بولنے پر جس سے تہمت کا مفہوم پیدا ہوتا ہو، کیا حد جاری ہو گی

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ اَبِي الزِّنَادِ اَنَّهُ قَالَ جَلَدَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ العَزِيزِ عَبْدًا فِي فِرْيَةٍ ثَمَانِيْنَ قَالَ اَبُو الزِّنَادِ فَسَأَلْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَامِرِ بْنِ رَبِيعَةَ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ اَدْرَكْتُ عُمَرَ بْنَ الخَطَّابِ وَعُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ وَالخُلَفَاءَ هَلُمَّ جَرًّا فَمَا رَاَيْتُ اَحَدًا جَلَدَ عَبْدًا فِي فِرْيَةٍ اَكْثَرَ مِنْ اَرْبَعِيْنَ۔

﴿حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک غلام کو تہمت لگانے پر اسی کوڑے مارے۔ ابو الزناد کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عامر بن ربیعہ سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت عمر بن خطابؓ، عثمان بن عفانؓ اور سب خلفاء کو نہیں دیکھا کہ انہوں نے غلام کو تہمت لگانے کے جرم میں چالیس کوڑے سے زیادہ مارے ہوں۔﴾

وضاحت:

قذف صرف اسی شکل میں ہو گا جب الزام کی نوعیت کسی کے اصل ماں یا باپ ہونے کی نفی کی ہو یا زنا وغیرہ کی تہمت لگائی جائے۔ چوری، رشوت یا دوسرے جرائم کا الزام قذف میں نہیں آتا۔ الزام میں بھی ایک

تصریح کی شکل ہوتی ہے اور ایک تعریض کی، جیسے کہ آج کل مصنف لوگ اپنے متعلق بیان کر دیتے ہیں یا کالم نگار لوگ اپنے حریفوں کے متعلق فقرے لکھ دیتے ہیں جس سے تعریض کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ صریح قذف کی سزا اسی کوڑے ہے۔

اس روایت میں یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک غلام کو اسی کوڑے مارے جبکہ غلام کی سزا نصف ہے۔ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان بن عفانؓ سب کے سب خلفاء صرف چالیس کوڑے ہی لگاتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا شمار بھی خلفائے راشدین میں ہوتا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ ان کو اپنے پیشرو خلفاء کا اس بارے میں عمل اور فتویٰ معلوم نہ رہا ہو اور وہ اس کے خلاف عمل کریں۔ صرف ایک امکان یہ ہے کہ غلام آبق (بھاگا ہوا) رہا ہو۔ غلام آبق کے بارے میں ایک قوی مذہب یہ ہے کہ اس کے اوپر پوری حد جاری کی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آبق ہونے کی وجہ سے چاہے بے قاعدہ ہی سہی وہ غلامی سے نکل جاتا ہے۔ غلامی ایسی چیز نہیں کہ ہر جگہ اس کے ساتھ چمٹی رہے تو غلام آبق سے متعلق فقہا کی رائے ٹھیک ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی بھی یہ رائے رہی ہو اور انہوں نے اس غلام پر عبد آبق ہونے کی وجہ سے پوری حد جاری کر دی ہو۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ زُرَيْقِ بْنِ حَكِيمٍ الْأَيْلِيِّ أَنَّ رَجُلًا يُقَالُ لَهُ مِصْبَاحٌ اسْتَعَانَ ابْنًا لَهُ فَكَأَنَّهُ اسْتَبْطَأَهُ فَلَمَّا جَاءَهُ قَالَ لَهُ يَا زَانِي قَالَ زُرَيْقٌ فَاسْتَعْدَانِي عَلَيْهِ فَلَمَّا أَرَدْتُ أَنْ أَجْلِدَهُ قَالَ ابْنُهُ وَاللَّهِ لَئِنْ جَلَدْتَهُ لَأَبُوءَنَّ عَلَى نَفْسِي بِالزِّنَا فَلَمَّا قَالَ ذَلِكَ أَشْكَلَ عَلَيَّ أَمْرُهُ فَكَتَبْتُ فِيهِ إِلَى عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ وَهُوَ الْوَالِي يَوْمَئِذٍ أَذْكُرُ لَهُ ذَلِكَ فَكَتَبَ إِلَيَّ عُمَرُ أَنْ أَجِزْ عَفْوَهُ قَالَ زُرَيْقٌ وَكَتَبْتُ إِلَى عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ أَيْضًا أَرَأَيْتَ رَجُلًا افْتُرِيَ عَلَيْهِ أَوْ عَلَى أَبَوَيْهِ وَقَدْ هَلَكَا أَوْ أَحَدُهُمَا قَالَ فَكَتَبَ إِلَيَّ عُمَرُ إِنْ عَفَا فَأَجِزْ عَفْوَهُ فِي نَفْسِهِ وَإِنِ افْتُرِيَ عَلَى أَبَوَيْهِ وَقَدْ هَلَكَا أَوْ أَحَدُهُمَا فَخُذْ لَهُ بِكِتَابِ اللَّهِ إِلَّا أَنْ يُرِيدَ سِتْرًا قَالَ يَحْيَى سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُولُ وَذَلِكَ أَنْ يَكُونَ الرَّجُلُ الْمُفْتَرَى عَلَيْهِ يَخَافُ إِنْ كُشِفَ ذَلِكَ مِنْهُ أَنْ تَقُومَ عَلَيْهِ بَيِّنَةٌ فَإِذَا كَانَ عَلَى مَا وَصَفْتُ فَعَفَا جَازَ عَفْوُهُ

امام مالک زریق بن حکیم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص جس کا نام مصباح تھا اس نے اپنے بیٹے

سے کسی کام کے لیے کہا لیکن اس نے کچھ دیر لگا دی۔ جب وہ آیا تو اس نے کہا او زانی! زریق کہتے ہیں کہ اس نے اپنے والد کے خلاف مجھ سے مدد مانگی۔ جب میں نے چاہا کہ اس کو کوڑے لگاؤں تو اس کے بیٹے نے کہا کہ واللہ، اگر آپ نے میرے ابو کو کوڑا لگایا تو میں اپنے اوپر زنا کا اعتراف کر لوں گا۔ جب اس نے یہ کہا تو میں الجھن میں پڑ گیا۔ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو، جو اس وقت گورنر تھے، اس کے متعلق لکھا۔ انھوں نے مجھے لکھا کہ اس کی معافی جاری کر دو۔ زریق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو یہ بھی لکھا کہ بتائیے کہ اگر ایک شخص کی ذات پر یا اس کے والدین پر افترا کیا گیا ہو اور وہ دونوں کے دونوں یا ان میں سے ایک مر چکا ہو تو اس کا کیا حکم ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے لکھا کہ اگر وہ شخص معاف کر دے تو اس کی ذات کے لیے معافی جاری کر دو، اور اگر اس کے ماں باپ پر افترا کیا گیا ہو اور وہ دونوں یا ان میں سے ایک مر چکا ہے تو اس کے اوپر اللہ کی کتاب جاری کرو، الا آنکہ وہ اس پر پردہ ڈالنا چاہے۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے مالکؒ کو کہتے سنا کہ یہ ہو سکتا ہے کہ جس پر افترا کیا گیا ہے اس بات کا اندیشہ رکھتا ہو کہ اگر یہ چیز اس سے ظاہر ہو گئی تو اس پر دلیل قائم نہ ہو جائے۔ اگر ایسی صورت ہو اور وہ معاف کر دے تو اس کا معاف کرنا درست ہو گا۔

وضاحت:

یہ بات روایت سے ظاہر نہیں کہ کیا زریق صاحب اختیار تھے کہ وہ کوڑے لگانے پر تیار ہو گئے۔ اگر وہ صاحب اختیار نہیں تھے تو ان سے مدد چاہنا اور ان کا کوڑے لگانا سمجھ میں نہیں آتا۔ کوڑے لگانے کا معاملہ پرائیویٹ نہیں ہوتا۔ صرف قاضی یا صاحب امر ہی کوڑے لگا سکتا ہے۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ زریق صاحب امر تھے اسی لیے انھوں نے معاملہ گورنر کی طرف بھیجا۔ پہلے تو بیٹے نے باپ کے خلاف زریق کی مدد طلب کی۔ پھر جب دیکھا کہ باپ کو کوڑے لگنے والے ہیں تو اس نے کہا کہ میں اپنے آپ کو زانی ہی تسلیم کر لیتا ہوں، یعنی باپ کو مفتری نہیں بنانا چاہتا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کے جواب میں یہ لکھا کہ بیٹے کی معافی قبول کر لو۔ گویا مفتری علیہ کا معاف کر دینا درست ہے۔

زریق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو لکھا کہ بتایئے کہ اگر ایک شخص کے اپنے اوپر یا اس کے ماں باپ پر افترا کیا گیا ہو اور وہ دونوں کے دونوں یا ان میں سے ایک مر چکا ہے تو اس صورت میں کیا کیا جائے گا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے لکھا کہ اگر وہ معاف کر دے تو اس کی ذات کے لیے معافی کو جاری کر دو۔ اور اگر اس کے ماں باپ پر افترا کیا گیا ہے اور ان میں سے ایک یا دونوں مر چکے ہیں تو اس کے اوپر اللہ کا قانون جاری کروالا آنکہ وہ اس پر پردہ ڈالنا چاہے۔ روایت کا یہ حصہ مشکل ہے کیونکہ اس طرح کسی نے جرم کیا ہے تو جب معاملہ عدالت میں جا چکا ہے تب نہ مجرم کے حق میں سفارش کرنی چاہیے اور نہ ہی کسی کو جرم چھپانے کا مشورہ دینا چاہیے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ کے پاس آکر کہا کہ میں نے ملزم کو معاف کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ میرے پاس آنے سے پہلے معاف کیا ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ اب تو معاملہ عدالت میں آگیا وہی فیصلہ کرے گی۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ أَبِي الرِّجَالِ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ حَارِثَةَ بْنِ النُّعْمَانِ الْأَنْصَارِيِّ ثُمَّ مِنْ بَنِي النَّجَّارِ عَنْ أُمِّهِ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ أَنَّ رَجُلَيْنِ اسْتَبَّا فِي زَمَانِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ أَحَدُهُمَا لِلْآخَرِ وَاللّٰهِ مَا أَبِي بِزَانٍ وَلَا أُمِّي بِزَانِيَةٍ فَاسْتَشَارَ فِي ذٰلِكَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَقَالَ قَائِلٌ مَدَحَ أَبَاهُ وَ أُمَّهُ وَقَالَ آخَرُونَ قَدْ كَانَ لِأَبِيهِ وَأُمِّهِ مَدْحٌ غَيْرُ هٰذَا نَرَى أَنْ تَجْلِدَهُ الْحَدَّ فَجَلَدَهُ عُمَرُ الْحَدَّ ثَمَانِينَ قَالَ مَالِكٌ لَا حَدَّ عِنْدَنَا إِلَّا فِي نَفْيٍ أَوْ قَذْفٍ أَوْ تَعْرِيضٍ يُرَى أَنَّ قَائِلَهُ إِنَّمَا أَرَادَ بِذٰلِكَ نَفْيًا أَوْ قَذْفًا فَعَلَى مَنْ قَالَ ذٰلِكَ الْحَدُّ تَامًّا قَالَ مَالِكٌ الْأَمْرُ عِنْدَنَا أَنَّهُ إِذَا نَفَى رَجُلٌ رَجُلًا مِنْ أَبِيهِ فَإِنَّ عَلَيْهِ الْحَدَّ وَ إِنْ كَانَتْ أُمُّ الَّذِي نُفِيَ مَمْلُوكَةً فَإِنَّ عَلَيْهِ الْحَدَّ۔

﴿ عمرۃ بنت عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ کے زمانے میں دو آدمی آپس میں گالم گلوچ ہوئے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ نہ میرا باپ زانی ہے اور نہ میری ماں زانیہ۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے اس بارے میں مشورہ طلب کیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ اس نے اپنے ماں باپ کی تعریف کی ہے۔ دوسروں نے کہا کہ ماں باپ کی تعریف ہی کرنی تھی تو اس کے بہت سے دوسرے اسلوب موجود تھے۔ ہمارے خیال میں اس پر آپ کوڑوں کی حد جاری کریں۔ چنانچہ حضرت

عمرؓ نے اس پر اسی کوڑے کی حد جاری کی۔ امام مالک کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک حد صرف نفی یا قذف میں ہے یا پھر ایسی تعریض کی صورت میں جس کے بارے میں یہ رائے دی جائے کہ اس کا مقصد نفی یا قذف سے تھا۔ امام مالک کہتے ہیں کہ حد تب ہو گی جب کوئی شخص دوسرے کے باپ کی نفی کرے۔ اگر اس شخص کی ماں جس کی نفی کی گئی لونڈی بھی ہو جب بھی اس پر حد ہو گی۔

وضاحت:

یہ تعریض کی وہ شکل ہے جس میں مالکیہ حد مانتے ہیں کیونکہ اگر آدمی نے ماں باپ کی تعریف ہی کرنی تھی تو یہ کہہ سکتا تھا کہ میرا باپ بڑا متقی پرہیزگار آدمی تھا اور میری ماں بھی بڑی متقیہ تھی۔ جب اس نے اپنے ماں باپ کے متعلق یوں کہا کہ وہ زناکار نہ تھے تو گویا اس نے اپنے حریف کے ماں باپ پر زناکاری کا الزام لگایا۔ وہ اپنے ماں باپ کی تعریف نہیں بلکہ دوسرے کے ماں باپ پر تعریض کرنا چاہتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے مشورہ کے بعد اس شخص کو قذف کی سزا دی۔ حضرت عمرؓ کے اسی اثر پر مالکیہ کا عمل ہے لیکن احناف اور شوافع اس کے قائل نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حد صرف اسی صورت میں جاری ہو گی جب صریح الفاظ استعمال کیے جائیں۔ کوئی کسی پر قذف کرے کہ تیرا باپ زانی تھا یا تیری ماں فاحشہ تھی۔ اشارہ، کنایہ یا اخباری انداز میں کچھ کہنے سے حد جاری نہیں ہو گی۔ میرے نزدیک احناف کی رائے اس حد تک ٹھیک ہے کہ حد جاری نہیں ہو گی لیکن اگر کسی پر حد جاری کرنے کے لیے پورا مواد موجود نہ ہو تو اس کو یوں ہی چھوڑ نہیں دینا چاہیے بلکہ تعزیر ہونی چاہیے۔ جیسے چوری کا معاملہ ہو تو قطع ید تو تب ہو گا جب مال مسروقہ اتنا ہو جس پر چوری کا اطلاق ہو سکے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ چور کو چھوڑ دیا جائے کہ جاؤ یہ کام کرتے رہو۔ قطع ید سے کمتر سزا تو دی جا سکتی ہے۔

مَالَا حَدَّ فِيهِ

جس صورت میں حد نافذ نہیں ہو گی

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ اَبِي عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ لِرَجُلٍ خَرَجَ بِجَارِيَةٍ لِامْرَأَتِهِ مَعَهُ فِي سَفَرٍ فَأَصَابَهَا فَغَارَتِ امْرَأَتُهُ فَذَكَرَتْ ذٰلِكَ لِعُمَرَ ابْنِ

الخطَّابِ فَسَألَهُ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ وَهَبَتْهَا لِي فَقَالَ عُمَرُ لَتَأتِيَنِّي بِالْبَيِّنَةِ أوْ لَأرْمِيَنَّكَ بِالْحِجَارَةِ قَالَ فَاعْتَرَفَتِ امْرَأتُهُ أنَّهَا وَهَبَتْهَا لَهُ۔

﴿ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ ایک شخص سفر میں نکلا اور اس کے ساتھ اس کی بیوی کی لونڈی تھی۔ وہ اس لونڈی کے ساتھ مرتکب ہو گیا۔ بیوی کو غیرت لاحق ہوئی تو اس نے حضرت عمرؓ سے ذکر کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے شوہر سے پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ لونڈی میری بیوی نے مجھے ہبہ کر دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ثبوت لاؤ ورنہ میں تمہیں سنگسار کر دوں گا۔ کہتے ہیں کہ اس کی بیوی نے اعتراف کر لیا کہ اس نے لونڈی میاں کو ہبہ کر دی تھی۔﴾

وضاحت :

حضرت عمرؓ کو اگرچہ معلوم تھا کہ عورت نے جب دیکھا کہ شوہر کو رجم کر دیا جائے گا تو اس نے رحم کھا کر ہبہ کرنے کا اعتراف کیا ہے لیکن قانون کے آگے حاکم کچھ نہیں کر سکتا۔ پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ میں تو بہر حال دلائل پر فیصلہ کروں گا، اپنے علم پر تو نہیں کر سکتا۔ اگر تم میرے فیصلے کے ذریعے کوئی ایسا حق لے لو گے جو تمہارا نہیں تو جہنم میں جاؤ گے۔ عدالت کا کام شہادت پر فیصلہ کرنا ہے، خواہ قاضی پر بات کتنی ہی واضح ہو۔ از روئے فقہ اس آدمی پر حد جاری ہوتی لیکن حضرت عمرؓ نے چھوڑ دیا کیونکہ اس کی زوجہ نے لونڈی ہبہ کرنے کا اعتراف کر لیا اور حضرت عمرؓ کو معلوم بھی تھا کہ صرف شوہر کی جان بچانے کی خاطر عورت نے ایسا کیا ہے۔

مَا يَجِبُ فِيهِ الْقَطْعُ

کتنی مقدار کی چوری پر ہاتھ کاٹا جائے گا

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَطَعَ فِي مِجَنٍّ ثَمَنُهُ ثَلَاثَةُ دَرَاهِمَ۔

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ڈھال جس کی قیمت تین درہم تھی، کی چوری پر ہاتھ کاٹا ہے۔﴾

وضاحت:

چوری کا اطلاق ہر گری پڑی چیز کی چوری پر نہیں ہوتا بلکہ قدر و قیمت رکھنے والی چیز کی چوری پر ہوتا ہے۔اس زمانے کے تین درہم آج کل کے تین سو روپے سے کیا کم ہوں گے۔ مختلف روایات میں عدالتی فیصلوں کی روشنی میں فقہائے قطع ید کے لیے متعدد شرائط بیان کی ہیں۔ مثلاً مال کا محفوظ ہونا، مال میں شراکت کا نہ ہونا، چور کا غلام نہ ہونا، قحط وغیرہ نہ ہونا، مال محروز یعنی محفوظ ہونا چاہیے۔ مختلف اشیاء کے محروز ہونے کی شکل الگ ہے۔اگر مال اپنی معروف شکل میں محروز ہو اور چوری ہو جائے اور اس کی قیمت اتنی ہو جس پر چوری کا اطلاق ہوتا ہو تو چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِی حُسَيْنٍ الْمَكِّی اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا قَطْعَ فِی ثَمَرٍ مُعَلَّقٍ وَلَا فِی حَرِيْسَةِ جَبَلٍ فَاِذَا اٰوَاهُ الْمُرَاحُ اَوِ الْجَرِيْنُ فَالْقَطْعُ فِيْمَا يَبْلُغُ ثَمَنَ الْمِجَنِّ۔

﴿عبداللہ بن عبدالرحمٰن ابن ابی حسین المکی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہاتھ نہیں کاٹا جاسکتا شاخ پر لٹکے پھل توڑنے پر اور نہ کسی پہاڑ کے گوشے میں بیٹھے جانور کی چوری پر۔اور ہاتھ کاٹا جائے گا اس جانور کی چوری پر جو باڑے میں یا پھل خشک کرنے کے میدان میں ہو، جس کی قیمت ڈھال کی قیمت کے برابر ہو۔﴾

وضاحت:

درختوں پر لٹکے پھل مال محروز نہیں جب تک باغ کے گرد باڑ اور نگہبانی کا انتظام نہ ہو۔اسی طرح جب تک جانور اس جگہ پر نہ ہوں جہاں گلے ٹھہرائے جاتے ہیں تو وہ بھی مال محروز متصور نہیں ہوں گے۔روایت کا آخری حصہ راوی کا اپنا اضافہ ہے، اگرچہ اس مضمون کی روایت اوپر گزر چکی ہے۔

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِی بَكْرٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّ سَارِقًا سَرَقَ فِی زَمَانِ عُثْمَانَ اُتْرُجَّةً فَاَمَرَ بِهَا عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ اَنْ تُقَوَّمَ فَقُوِّمَتْ بِثَلَاثَةِ

دَرَاهِمَ مِنْ صَرْفِ اثْنَيْ عَشَرَ دِرْهَمًا بِدِينَارٍ فَقَطَعَ عُثْمَانُ يَدَهُ

﴿عمرہ بنت عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ایک چور نے ایک اترجہ چرا لیا۔ حضرت عثمان نے حکم دیا کہ اس کی قیمت لگائی جائے۔ ایک دینار کا صرف بارہ درہم مان کر قیمت لگائی گئی تو وہ تین درہم ہوئی۔ حضرت عثمانؓ نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔﴾

وضاحت:

اترجہ سے مراد خوشبو ڈالنے کے لیے سونے کا زیور لیا گیا ہے۔ اس کی قیمت تین درہم کے برابر ہونا سمجھ میں آتی ہے۔ ایک دینار میں بارہ درہم ہوتے تھے لیکن اگر درہم ٹوٹے ہوئے یا زیادہ گھسے ہوئے ہوتے یا بعض دوسرے عوامل کے تحت وہ ایک دینار کے عوض بارہ سے زیادہ بھی ہو سکتے تھے۔ حضرت عثمان نے قیمت لگوائی تو وہ اترجہ تین درہم کا نکلا۔ چنانچہ چور کو قطع ید کی سزا دی گئی۔ شاہ ولی اللہ نے اترجہ سے مراد لیموں شیریں لیا ہے تو اس کی قیمت کسی صورت میں بھی تین درہم نہیں ہو سکتی۔ اس لیے پہلا مطلب ہی درست معلوم ہوتا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهَا قَالَتْ مَا طَالَ عَلَيَّ وَمَا نَسِيتُ الْقَطْعُ فِي رُبْعِ دِينَارٍ فَصَاعِدًا۔

﴿حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرے اوپر زیادہ زمانہ بھی نہیں گزرا اور میں بھولی بھی نہیں ہوں کہ ہاتھ جو کاٹا جاتا تھا وہ ایک چوتھائی دینار اور اس سے زائد پر ہوتا تھا۔﴾

وضاحت:

یہ وہی بات ہے جو اوپر کی روایات میں بیان ہوئی کہ تین درہم سے کم قیمت پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ ربع دینار بھی تین درہم ہی بنتے ہیں جب ایک دینار میں بارہ درہم کا صرف ہو۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ أَبِي بَكْرِ بْنِ حَزْمٍ عَنْ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ أَنَّهَا قَالَتْ خَرَجَتْ عَائِشَةُ زَوْجُ النَّبِيِّ ﷺ إِلَى مَكَّةَ وَمَعَهَا مَوْلَاتَانِ لَهَا وَمَعَهَا غُلَامٌ لِبَنِي عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ فَبَعَثَتْ مَعَ الْمَوْلَاتَيْنِ بِبُرْدٍ مُرَجَّلٍ قَدْ خِيطَ عَلَيْهِ خِرْقَةٌ

خضراء قالت فاخذ الغلام البرد ففتق عنه فاستخرجه وجعل مكانه لبدا او فروة و خاط عليه فلماقدمت المولاتان دفعتا ذلك الی اهله فلما فتقوا عنه وجدوا فیه اللبد و لم یجدوا البرد فکلموا المراتین فکلمتا عائشة زوج النبی ﷺ او کتبتا الیها و اتهمتا العبد فسئل العبد عن ذلک فاعترف فامرت به عائشة زوج النبی ﷺ فقطعت یده وقالت عائشة القطع فی ربع دینار فصاعدا وقال مالک احب ما یجب فیه القطع الی ثلاثة دراهم و ان ارتفع الصرف او اتضع و ذلک ان رسول الله ﷺ قطع فی مجن قیمته ثلاثة دراهم و ان عثمان بن عفان قطع فی اترجة قومت بثلاثة دراهم و هذا احب ما سمعت الی فی ذلک۔

﴿عمرہ بنت عبدالرحمن بیان کرتی ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے تشریف لے گئیں تو ان کے ہمراہ ان کی دو آزاد کردہ لونڈیاں اور عبداللہ بن ابی بکر صدیق کے بیٹوں کا ایک غلام تھا۔ حضرت عائشہ نے ان دو لونڈیوں کے ہاتھ مخمل کی ایک چادر بھیجی جس پر کام کیا ہوا تھا اور اس کے اوپر سبز کپڑا غلاف کی شکل میں سلا ہوا تھا۔ غلام نے اسے لیا، کپڑے کو ادھیڑا، اس میں سے چادر نکال لی اور اس کی جگہ نمدہ یا موٹے کمبل کا ٹکڑا ڈال کر پھر سلائی کر دی۔ جب دونوں لونڈیاں آئیں تو انہوں نے امانت مالکوں کے حوالے کی۔ جب انہوں نے اس کو ادھیڑا تو اس میں چادر نہ پائی۔ اس کی جگہ نمدے کا ٹکڑا پایا۔ انہوں نے دونوں عورتوں سے بات کی تو انہوں نے حضرت عائشہ سے ذکر کیا یا ان کو لکھا اور غلام کے اوپر الزام لگایا۔ اس بارے میں غلام سے پوچھا گیا تو اس نے جرم کا اعتراف کر لیا۔ حضرت عائشہؓ نے حکم دیا تو اس غلام کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ حضرت عائشہ نے بتایا کہ ربع دینار یا اس سے زیادہ قیمت کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ میرے نزدیک قطع ید کے بارے میں پسندیدہ بات یہ ہے کہ مال مسروقہ کی قیمت تین درہم ہو، چاہے صرف کم ہو یا زیادہ۔ کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ڈھال جس کی قیمت تین درہم تھی، کی چوری پر ہاتھ کاٹا اور حضرت عثمان بن

عفان نے ایک اترجہ، جس کی قیمت تین درہم لگائی گئی تھی، پر ہاتھ کاٹا-﴾

وضاحت :

اس روایت میں بھی مال مسروقہ کی اصل قیمت ربع دینار یا تین درہم ہی بتائی گئی ہے- اس میں راوی کی یہ بات درست نہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا- آپ صاحب امر یا قاضی تو نہ تھیں- انہوں نے قاضی کے پاس بھیجا ہو گا اور اس نے فیصلہ کیا ہو گا کہ ہاتھ کاٹ دیا جائے-

میرے نزدیک امام مالک کی یہ بات غلط ہے کہ دینار اور درہم کے صرف کا بھاؤ چاہے زیادہ ہو یا کم، مال مسروقہ کی اصل قیمت تین درہم ہی ہونی چاہیے- یہ ان کی سادگی ہے- اگر دینار کا بھاؤ زیادہ ہو گا تو درہم زیادہ ہوں گے، جیسے کہ اب روپے کی قیمت ڈالر کے تابع ہے- اس کے لیے جو دلیل انہوں نے دی ہے اس میں صرف کے کم یا زیادہ ہونے سے متعلق کوئی بات نہیں کی گئی-

مَا جَاءَ فِي قَطْعِ الْآبِقِ وَالسَّارِقِ

مفرور غلام، جو چور ہو، کے ہاتھ کاٹنے سے متعلق روایات

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدًا لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ سَرَقَ وَهُوَ آبِقٌ فَاَرْسَلَ بِهِ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ اِلَى سَعِيدِ ابْنِ الْعَاصِ وَهُوَ اَمِيرُ الْمَدِيْنَةِ لِيَقْطَعَ يَدَهُ فَاَبَى سَعِيدٌ اَنْ يَقْطَعَ يَدَهُ وَ قَالَ لَا تُقْطَعُ يَدُ الْآبِقِ السَّارِقِ اِذَا سَرَقَ فَقَالَ لَهُ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ فِي اَيِّ كِتَابِ اللّٰهِ وَجَدْتَ هٰذَا ثُمَّ اَمَرَ بِهِ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ فَقُطِعَتْ يَدُهُ-

﴿نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ کے ایک غلام نے چوری کی اور وہ مفرور تھا- اس کو پکڑ کر عبداللہ بن عمر نے سعید بن عاص کے پاس بھیجا جو اس وقت مدینہ کے گورنر تھے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیں- سعید نے ہاتھ کاٹنے سے انکار کیا اور یہ کہا کہ مفرور غلام جو چوری کرے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا- عبداللہ بن عمر نے کہا کہ کس کتاب میں آپ نے یہ فتویٰ پڑھا ہے- پھر عبداللہ بن عمر نے حکم دیا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا-﴾

وضاحت :

سعید بن عاص نے شاید اس بنا پر انکار کیا ہو گا کہ غلام ہے اور غلام کا نہ ہاتھ اپنا ہوتا ہے اور نہ مال ہی اس کی ملکیت ہے۔ لیکن جب وہ آبق ہے تو نیم آزاد ہے جب تک کہ پھر غلام نہ ہو جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا مقام تو مفتی کی حیثیت سے بڑا ہے۔ اپنے وقت کے بہت بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے دوبارہ معاملہ اپنے فتوے کے ساتھ بھیجا ہو گا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے تو امیر مدینہ نے ان کی بات تسلیم کر لی اور ہاتھ کاٹ دیا۔

حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زُرَيْقِ بْنِ حَكِيمٍ أَنَّهُ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ أَخَذَ عَبْدًا آبِقًا قَدْ سَرَقَ قَالَ فَأَشْكَلَ عَلَيَّ أَمْرُهُ قَالَ فَكَتَبْتُ فِيهِ إِلَى عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ أَسْأَلُهُ عَنْ ذَلِكَ وَهُوَ الْوَالِي يَوْمَئِذٍ قَالَ فَأَخْبَرْتُهُ أَنَّنِي كُنْتُ أَسْمَعُ أَنَّ الْعَبْدَ الْآبِقَ إِذَا سَرَقَ وَهُوَ آبِقٌ لَمْ تُقْطَعْ يَدُهُ قَالَ فَكَتَبَ إِلَيَّ عُمَرُ بْنُ عَبْدِالْعَزِيزِ نَقِيضَ كِتَابِي يَقُولُ كَتَبْتَ إِلَيَّ أَنَّكَ كُنْتَ تَسْمَعُ أَنَّ الْعَبْدَ الْآبِقَ إِذَا سَرَقَ لَمْ تُقْطَعْ يَدُهُ وَ أَنَّ اللَّهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى يَقُولُ فِي كِتَابِهِ وَ السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ فَإِنْ بَلَغَتْ سَرِقَتُهُ رُبُعَ دِينَارٍ فَصَاعِدًا فَاقْطَعْ يَدَهُ۔

﴿امام مالکؒ زریق بن حکیم سے روایت کرتے ہیں کہ ان کو خبر دی گئی کہ ایک مفرور غلام پکڑا گیا ہے، اس نے چوری کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے اس کا معاملہ مشکل معلوم ہوا۔ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی طرف لکھا جو ان دنوں مدینہ کے گورنر تھے۔ میں نے ان کو خبر دی کہ میں نے سنا ہوا ہے کہ مفرور غلام اگر چوری کرے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مجھے جو جواب دیا وہ میرے خط کے مخالف تھا۔ انہوں نے کہا کہ تم نے لکھا ہے کہ مفرور غلام اگر چوری کرے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے کہ چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ اللہ کی طرف سے سزا اور عبرت ہے اور اللہ زبردست اور صاحب حکمت ہے۔ پس اگر مال مسروقہ کی قیمت ربع دینار یا اس سے زائد ہے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔﴾

وضاحت :

معاملہ مشکل اس وجہ سے ہوا کہ اگر غلام ہوتا تو حد جاری نہ ہوتی- مفرور ہونے کی وجہ سے وہ نہ غلام رہا اور نہ ہی آزاد- وہ نیم آزاد ہے اور جو مال وہ چرائے گا وہ اس کا اپنا مال ہو گا- حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یہ حکم دیا کہ اگر مال مسروقہ کی قیمت ربع دینار یا اس سے زائد ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے-

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ وَ سَالِمَ ابْنَ عَبْدِاللّٰهِ وَ عُرْوَةَ بْنَ الزُّبَيْرِ كَانُوا يَقُولُونَ اِذَا سَرَقَ الْعَبْدُ الْآبِقُ مَا يَجِبُ فِيهِ الْقَطْعُ قُطِعَ -

﴿امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ اور عروہ بن زبیر تینوں بزرگوں کا یہ فتویٰ تھا کہ مفرور غلام جب اتنے مال کی چوری کرے جس پر قطع ید کی سزا واجب ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے-﴾

وضاحت :

یہ بھی وہی بات ہے جو پچھلی روایت میں گزری- اس سے معلوم ہوا کہ مفرور غلام کے بارے میں حد جاری کرنے کا مسئلہ مختلف فیہ نہیں ہے- صرف غلام کے بارے میں اختلاف ہے کیونکہ اس کا مال اس کے مالک کا مال ہے- لیکن حضرت عائشہؓ کے متعلق جو روایت گزری ہے اس کے مطابق غلام کا ہاتھ کاٹ دیا گیا تھا-

تَرْكُ الشَّفَاعَةِ لِلسَّارِقِ اِذَا بَلَغَ السُّلْطَانَ

معاملہ صاحب امر تک پہنچ جائے تو چور کے حق میں سفارش نہیں کی جا سکتی

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنِ بْنِ شِهَابٍ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ صَفْوَانَ اَنَّ صَفْوَانَ بْنَ اُمَيَّةَ قِيلَ لَهُ اِنَّهُ اِنْ لَمْ يُهَاجِرْ هَلَكَ فَقَدِمَ صَفْوَانُ بْنُ اُمَيَّةَ الْمَدِينَةَ فَنَامَ فِى الْمَسْجِدِ وَتَوَسَّدَ رِدَاءَهُ فَجَاءَ سَارِقٌ فَاَخَذَ رِدَاءَهُ فَاَخَذَ صَفْوَانُ السَّارِقَ فَجَاءَ بِهِ اِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَاَمَرَ بِهِ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ تُقْطَعَ يَدُهُ فَقَالَ لَهُ صَفْوَانُ اِنِّى لَمْ اُرِدْ هٰذَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ هُوَ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَهَلَّا قَبْلَ اَنْ تَأْتِيَنِى بِهِ-

﴿صفوان بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ صفوان بن امیہ سے کہا گیا کہ اگر انہوں نے ہجرت نہ کی تو وہ ہلاک ہو گئے۔ اس پر صفوان بن امیہ مدینہ آئے اور مسجد میں سو گئے اور اپنی چادر کا تکیہ بنا لیا۔ ایک چور آیا تو اس نے چادر اڑا لی۔ صفوان نے اس کو پکڑ لیا اور اس کو لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ رسول اللہ نے چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ صفوان نے کہا حضور، میرا یہ ارادہ تو نہ تھا، میں یہ چادر اس کو صدقہ کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا تو نے میرے پاس اس کو لانے سے پہلے ایسا کیوں نہ کر دیا؟﴾

وضاحت:

سوتے ہوئے چادر کا تکیہ بنانے کا مطلب یہ ہوا کہ مال محروز تھا۔ مال محروز نہ ہو تو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ چور کے حق میں سفارش معاملہ عدالت میں پہنچ جانے کے بعد نہیں ہو سکتی۔ اگر چور کو معاف کرنا تھا یا چوری کا مال اس پر صدقہ کرنا تھا یا معاملہ نپٹانے کی کوئی اور شکل اختیار کرنی تھی تو مقدمہ عدالت میں نہ لے جایا جاتا۔ وہاں لے جانے کے بعد سب معاملات عدالت کے اختیار میں ہو جاتے ہیں۔ اس کے بغیر عدلیہ کا وقار ختم ہو جاتا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَنَّ الزُّبَيْرَ ابْنَ الْعَوَّامِ لَقِيَ رَجُلًا قَدْ أَخَذَ سَارِقًا وَهُوَ يُرِيدُ أَنْ يَذْهَبَ بِهِ إِلَى السُّلْطَانِ فَشَفَعَ لَهُ الزُّبَيْرُ لِيُرْسِلَهُ فَقَالَ لَا حَتَّى أَبْلُغَ بِهِ السُّلْطَانَ فَقَالَ الزُّبَيْرُ إِذَا بَلَغْتَ بِهِ السُّلْطَانَ فَلَعَنَ اللَّهُ الشَّافِعَ وَالْمُشَفِّعَ۔

﴿ربیعہ بن ابی عبدالرحمن سے روایت ہے کہ زبیر بن عوام ایک شخص سے ملے جس نے ایک چور کو پکڑ رکھا تھا۔ وہ اس کو عدالت میں لے جانا چاہتا تھا۔ زبیر نے اس کو چھوڑنے کی سفارش کی۔ اس نے کہا نہیں، جب تک میں اس کو عدالت میں نہ لے جاؤں۔ زبیر نے کہا جب تو اس کو لے کے عدالت میں پہنچ گیا تو شفاعت کرنے والے اور شفاعت کرانے والے دونوں پر اللہ کی لعنت۔﴾

وضاحت:

سلطان کا لفظ صاحب امر یعنی قاضی، حاکم یا عدالت کے لیے عام ہے۔ عدالت میں معاملہ پہنچ جانے کے

بعد کسی کی سفارش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا- جو سفارش کرے یا کرائے دونوں پر اللہ کی لعنت ہوگی-

جَامِعُ الْقَطْعِ

ہاتھ کاٹنے سے متعلق جامع باب

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ الْقَاسِمِ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَجُلًا مِنْ اَهْلِ الْيَمَنِ اَقْطَعَ الْيَدِ وَالرِّجْلِ قَدِمَ فَنَزَلَ عَلَى اَبِي بَكْرِ الصِّدِّيْقِ فَشَكَا اِلَيْهِ اَنَّ عَامِلَ الْيَمَنِ قَدْ ظَلَمَهُ فَكَانَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ فَيَقُوْلُ اَبُوْبَكْرٍ وَ اَبِيْكَ مَالَيْلُكَ بِلَيْلِ سَارِقٍ ثُمَّ اِنَّهُمْ فَقَدُوْا عِقْدًا لِاَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ امْرَاَةِ اَبِي بَكْرِ الصِّدِّيْقِ فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَطُوْفُ مَعَهُمْ وَيَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِمَنْ بَيَّتَ اَهْلَ هٰذَا الْبَيْتِ الصَّالِحِ فَوَجَدُوا الْحُلِيَّ عِنْدَ صَائِغٍ زَعَمَ اَنَّ الْاَقْطَعَ جَاءَهُ بِهِ فَاعْتَرَفَ بِهِ الْاَقْطَعُ اَوْ شُهِدَ عَلَيْهِ بِهِ فَاَمَرَبِهِ اَبُوْبَكْرِ الصِّدِّيْقُ فَقُطِعَتْ يَدُهُ الْيُسْرٰى وَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ وَاللّٰهِ لَدُعَاؤُهُ عَلَى نَفْسِهِ اَشَدُّ عِنْدِي عَلَيْهِ مِنْ سَرِقَتِهِ-

﴿عبد الرحمن بن القاسم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص اہل یمن میں سے آیا- اس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کاٹا گیا تھا- وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مہمان ہوا اور ان سے شکایت کی کہ آپ کے یمن کے گورنر نے میرے اوپر بڑا ظلم کیا ہے- یہ شخص رات کو تہجد پڑھتا تھا- حضرت ابوبکر فرماتے تھے کہ تیرے باپ کی قسم، تیری رات تو چور کی رات نہیں- اس کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت اسماء بنت عمیس زوجہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ہار گم ہے- لوگ تلاش کرنے لگے تو یہ آدمی بھی ان کے ساتھ گردش کرنے لگا- وہ یہ بددعا کرنے لگا کہ اے اللہ تیری لعنت اس کو پہنچے جس نے ایسے نیک گھرانے والوں پر ایسا اقدام کیا ہے- زیور ایک سنار کے ہاں ملا اور اس نے دعویٰ کیا کہ ایک ہاتھ پاؤں بریدہ شخص اس کو لایا تھا- تو اس شخص نے اعتراف کر لیا یا اس پر گواہی دی گئی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حکم دیا کہ اس کا بایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے- حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اللہ کی قسم، اس کی بددعا جو اس نے

اپنے بارے میں گی میرے نزدیک اس کی چوری سے زیادہ عبرت ناک ہے۔﴾

وضاحت :

اس میں پیچیدہ مسئلہ یہ ہے کہ اب تک چور کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹ چکے تھے۔ ایک ہاتھ رہ گیا تھا سو وہ بھی کاٹ دیا گیا۔ مالکیہ اور شافعیہ کا فتویٰ اسی پر ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا فتویٰ یہ ہے کہ ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹ جانے کے بعد کچھ اور نہیں کاٹا جائے گا۔ اب تعزیر ہو گی۔ اس کو جیل بھیج دیں گے یا کچھ اور سزا دیں گے۔ امام ابو حنیفہؒ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عمل کو جانتے تھے کہ انہوں نے اپنے عامل کی تصویب کی۔ یہ اثر تو بہت بڑا اثر ہے۔ قرآن مجید میں چور کے پاؤں کاٹنے کا ذکر نہیں۔ وہاں فاقطعوا ایدیھما (ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو) ہے۔ از روئے قیاس بار بار چوری پر پاؤں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ کی دلیل یہ رہی ہو گی کہ ہاتھ پاؤں کاٹنے کے بعد دوسرا ہاتھ کاٹنا اس کے وجود کو بالکل معطل کر دینا اور اس شخص کو امت پر مستقل بار بنا دینا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی قضائے حاجت سے بھی معذور ہو جائے۔ یہ شریعت کے منشا کے خلاف ہے۔ میرے خیال میں امام صاحب کا فتویٰ ٹھیک ہے۔ قطع ید کی سزا کے بعد اب صرف تعزیر ہو گی۔ لیکن یہ مسئلہ بہت قابل غور ہے۔

☐ قَالَ مَالِكٌ اَلْاَمْرُ عِنْدَنَا فِی الَّذِی یَسْرِقُ مِرَارًا ثُمَّ یُسْتَعْدٰی عَلَیْهِ اِنَّهٗ لَیْسَ عَلَیْهِ اِلَّا اَنْ تُقْطَعَ یَدُهٗ لِجَمِیْعِ مَنْ سَرَقَ مِنْهُ اِذَا لَمْ یَکُنْ اُقِیْمَ عَلَیْهِ الْحَدُّ فَاِنْ کَانَ قَدْ اُقِیْمَ عَلَیْهِ الْحَدُّ قَبْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ سَرَقَ مَا یَجِبُ فِیْهِ الْقَطْعُ قُطِعَ اَیْضًا۔

﴿امام مالک کا فتویٰ اس شخص کے بارے میں جس نے بار بار چوری کی ہے، پھر اس کے خلاف مقدمہ دائر ہوتا ہے یہ ہے کہ تمام چوریوں پر اس کا صرف ہاتھ کاٹا جائے گا، جب تک اس پر حد قائم نہ ہوئی ہو۔ اگر حد پہلے جاری ہو چکی ہو اور پھر اس نے چوری کی ہو جس پر قطع ید کی سزا ہو تو اس پر دوبارہ یہی حد جاری کر دی جائے گی۔﴾

وضاحت :

میری رائے یہ ہے کہ ایک چوری کے بعد ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ اس کے بعد اگر وہ معاشرے کے لیے

معیبت بن گیا ہے تو اس کو سورہ مائدہ کی آیت ۳۳ کے تحت سزا دی جائے گی- اس میں قاضی کو اختیار ہے- جو سزا چاہے وہ دے سکتا ہے بشرطیکہ اس چور نے امن وامان کا مسئلہ پیدا کر دیا ہو-

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ أَنَّ أَبَا الزِّنَادِ أَخْبَرَهُ أَنَّ عَامِلًا لِعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ أَخَذَ نَاسًا فِي حِرَابَةٍ وَلَمْ يَقْتُلُوا أَحَدًا فَأَرَادَ أَنْ يَقْطَعَ أَيْدِيَهُمْ أَوْ يَقْتُلَ فَكَتَبَ إِلَى عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ فِي ذَلِكَ فَكَتَبَ إِلَيْهِ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ لَوْ أَخَذْتَ بِأَيْسَرِ ذَلِكَ-

﴿امام مالک سے روایت ہے کہ ابوالزناد نے ان کو خبر دی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ایک عامل نے کچھ لوگوں کو ڈکیتی میں پکڑا لیکن انہوں نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا- عامل نے چاہا کہ ان کے ہاتھ کاٹ دیں یا قتل کر دیں- اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اس کے متعلق لکھا تو انہوں نے لکھا کہ اس سے ہلکا طریقہ اختیار کرتے تو بہتر تھا-﴾

وضاحت :

روایت میں لفظ حرابہ استعمال ہوا ہے، سرقہ استعمال نہیں ہوا- حرابہ اور سرقہ میں فرق ہے- سرقہ تو خاہر ہے کہ چوری ہے اور حرابہ علی الاعلان چوری ہے جسے ڈکیتی کہتے ہیں- اس میں قتل یا زخمی کرنے کا امکان بھی ہوتا ہے جب کہ چوری نقب ہے- حرابہ میں میری رائے وہی ہے جس کا مائدہ ۳۳ میں حکم ہے- چوری امن وامان کا مسئلہ نہیں پیدا کرتی جبکہ حرابہ میں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے-

حرابہ کی نوعیت کیا تھی یہ معلوم نہیں- ظاہر ہے کہ معاملے کی نوعیت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے علم میں رہی ہو گی تبھی تو انہوں نے لکھا کہ اس سے نرم کارروائی کرو- وہی اس معاملہ میں حکم دے سکتے تھے- سزا زیادہ یا کم بھی کر سکتے تھے-

مَالَا قَطْعَ فِيْهِ

جس میں قطع ید کا جواز نہیں

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيَى بْنِ حَبَّانَ أَنَّ

عَبْدًا سَرَقَ وَدِيًّا مِنْ حَائِطِ رَجُلٍ فَغَرَسَهُ فِي حَائِطِ سَيِّدِهِ فَخَرَجَ صَاحِبُ الْوَدِيِّ يَلْتَمِسُ وَدِيَّهُ فَوَجَدَهُ فَاسْتَعْدَى عَلَى الْعَبْدِ مَرْوَانَ بْنَ الْحَكَمِ فَسَجَنَ مَرْوَانُ الْعَبْدَ وَ أَرَادَ قَطْعَ يَدِهِ فَانْطَلَقَ صَاحِبُ الْعَبْدِ إِلَى رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ فَسَأَلَهُ عَنْ ذٰلِكَ فَأَخْبَرَهُ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ لَا قَطْعَ فِي ثَمَرٍ وَلَا كَثَرٍ وَالْكَثَرُ الْجُمَّارُ فَقَالَ الرَّجُلُ فَإِنَّ مَرْوَانَ بْنَ الْحَكَمِ أَخَذَ غُلَامًا لِي وَهُوَ يُرِيدُ قَطْعَ يَدِهِ وَ أَنَا أُحِبُّ أَنْ تَمْشِيَ مَعِيَ إِلَيْهِ فَتُخْبِرَهُ بِالَّذِي سَمِعْتَ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَمَشَى مَعَهُ رَافِعٌ إِلَى مَرْوَانَ بْنِ الْحَكَمِ فَقَالَ أَخَذْتَ غُلَامًا لِهٰذَا فَقَالَ نَعَمْ فَقَالَ مَا أَنْتَ صَانِعٌ بِهِ قَالَ أَرَدْتُ قَطْعَ يَدِهِ فَقَالَ لَهُ رَافِعٌ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ لَا قَطْعَ فِي ثَمَرٍ وَلَا كَثَرٍ فَأَمَرَ مَرْوَانُ بِالْعَبْدِ فَأُرْسِلَ۔

﴿یحییٰ بن حبان سے روایت ہے کہ ایک غلام نے کھجوروں کی قلمیں چرائیں اور لے جا کر اپنے مالک کے باغ میں لگا دیں۔ قلموں کا مالک تلاش کرتا ہوا نکلا تو ان کو اس باغ میں پایا۔ اس نے مروان بن حکم کے پاس باغ کے مالک کے خلاف استغاثہ کر دیا۔ مروان نے غلام کو قید کر لیا اور چاہا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دے۔ غلام کا مالک رافع بن خدیج کے پاس اس کا حکم پوچھنے گیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ باغ میں لٹکتے ہوئے پھل اور جڑوں سے نکلی ہوئی شاخوں کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اس آدمی نے کہا کہ مروان نے میرا غلام پکڑا ہے اور وہ اس کا ہاتھ کاٹنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ اس کے پاس چلیں اور جو کچھ آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے اس کو بتائیں۔ رافع اس کے ساتھ مروان کے پاس گئے اور پوچھا، کیا آپ نے غلام کو اسی جرم میں پکڑا ہے۔ انہوں نے کہا جی۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ اس کو کون سی سزا دینے والے ہیں۔ مروان نے کہا کہ میں اس کا ہاتھ کاٹنے والا ہوں۔ اس پر رافع نے مروان سے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ پھل اور قلم کی چوری میں قطع ید نہیں۔ اس پر مروان نے غلام کو چھوڑنے کا حکم دے دیا۔﴾

وضاحت :

جڑوں سے جو شاخیں نکلتی ہیں ان کو 'کثر' کہتے ہیں۔ 'جمار' کا مطلب کھجور کے تنے سے نکلنے والی شاخیں ہیں۔ ان کو ودی بھی کہتے ہیں۔ یہ شاخیں قلم کا کام دیتی اور خاصی قیمتی ہوتی ہیں۔ بہر حال اگر ربع دینار سے زائد بھی ان کی قیمت ہو تب بھی اس میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اسی طرح درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کی چوری پر بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ البتہ اگر پھل توڑ کر محفوظ کر لیے گئے ہوں اور وہ چوری ہو جائیں تو چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا بشرطیکہ مسروقہ پھل کی قیمت ربع دینار سے زائد ہو۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَمْرِو بْنِ الْحَضْرَمِيِّ جَاءَ بِغُلَامٍ لَهُ اِلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ لَهُ اقْطَعْ يَدَ غُلَامِي هٰذَا فَاِنَّهُ سَرَقَ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ مَاذَا سَرَقَ فَقَالَ سَرَقَ مِرْآةً لِامْرَاَتِي ثَمَنُهَا سِتُّوْنَ دِرْهَمًا فَقَالَ عُمَرُ اَرْسِلْهُ فَلَيْسَ عَلَيْهِ قَطْعٌ'' خَادِمُكُمْ سَرَقَ مَتَاعَكُمْ۔

﴿سائب بن یزید سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن حضرمی ایک لڑکے کو پکڑ کر حضرت عمر بن خطابؓ کی خدمت میں لائے اور کہا کہ میرے اس لڑکے کا ہاتھ کاٹ دیں کیونکہ اس نے چوری کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کیا چیز چوری کی ہے۔ اس نے کہا میری بیوی کا آئینہ جس کی قیمت ساٹھ درہم ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اس کو چھوڑ دو۔ اس میں قطع ید کی سزا نہیں۔ یہ نوکر بھی تمہارا ہے اور اس نے مال بھی تمہارا ہی چرایا ہے (گویا اس معاملہ میں کوئی دوسرا فریق مقدمہ نہیں ہے)﴾

وضاحت :

قطع ید کی سزا محفوظ مال پر ہے۔ گھر کے افراد سے حفاظت کرنا ممکن نہیں ہوتا، وہ طوافین ہیں۔ اس لیے ان کے ساتھ چوری کا معاملہ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس سے نوکروں کو حوصلہ ہو گا لیکن حقیقت یہی ہے کہ صاحب خانہ کو خود ہی حفاظت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ کمرے میں تالا لگا کر رکھیں یا دوسرے طریقوں سے پوری احتیاط کریں۔ قطع ید سے یہ رعایت غلامی کی بنا پر نہیں بلکہ نوکری کی وجہ سے ہے۔ اس کی علت گھر کا فرد ہونا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّ مَرْوَانَ بْنَ الْحَكَمِ أُتِيَ بِإِنْسَانٍ قَدِ اخْتَلَسَ مَتَاعًا فَأَرَادَ قَطْعَ يَدِهِ فَأَرْسَلَ إِلَى زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ فَقَالَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ لَيْسَ فِي الْخِلْسَةِ قَطْعٌ۔

﴿ابن شہاب سے روایت ہے کہ مروان بن حکم کے پاس ایک آدمی کو لایا گیا جس نے مال اچک لیا تھا۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیں۔ لہذا زید بن ثابتؓ سے اس کے متعلق مسئلہ دریافت کرنے کے لیے پیغام بھیجا۔ زید بن ثابت نے کہا کہ مال اچکنے میں قطع ید نہیں۔﴾

وضاحت:

زید بن ثابتؓ مدینہ کے مفتی تھے۔ ان کا یہ فتویٰ ہے کہ مال اچکنے میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی اور سزا بھی نہیں دی جائے گی۔ ہاتھ کاٹنے میں بہت زیادہ رسوائی بھی ہے اور آدمی معذور بھی ہو جاتا ہے۔ اس لیے مال اچکنے پر تعزیر ہو گی۔ تعزیر اگر سخت بھی ہو تب بھی جسمانی اسلحہ تو محفوظ رہتے ہیں۔

کتاب الاشربہ

اَلْحَدُّ فِی الْخَمْرِ

شراب خوری کی حد

"حد" کی تعریف :

کسی جرم کی وہ سزا حد کہلاتی ہے جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے مقرر کی ہو- اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی- اجماع خلفائے راشدین سے جو سزا مقرر کی گئی ہو وہ بھی "حد" ہے- کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین- یعنی میری اور خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے پکڑو- کوئی دوسرا شخص حد قائم کرنے کا مجاز نہیں- فقہا کے اجتہاد سے کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی اگرچہ اس پر فقہاء کا اجماع بھی ہو جائے-

◻ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنِ السَّائِبِ ابْنِ يَزِيدَ اَنَّهُ اَخْبَرَهُ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ خَرَجَ عَلَيْهِمْ فَقَالَ اِنِّی وَجَدْتُ مِنْ فُلَانٍ رِيحَ شَرَابٍ فَزَعَمَ اَنَّهُ شَرَابُ الطِّلَا وَ اَنَا سَائِلٌ عَمَّا شَرِبَ فَاِنْ كَانَ يُسْكِرُ جَلَدْتُهُ فَجَلَدَهُ عُمَرُ الْحَدَّ تَامًّا-

﴿ابن شہاب سے روایت ہے کہ سائب بن یزید نے ان کو خبر دی کہ حضرت عمر بن خطابؓ ایک دن نکلے تو کہا کہ میں نے فلاں شخص کے منہ سے شراب کی بو محسوس کی ہے- ان کا خیال تھا کہ یہ شراب طلا کی قسم والی شراب ہے- انہوں نے کہا کہ میں اس کے بارے میں پوچھوں گا کہ وہ کیا چیز ہے- اگر وہ مسکر ہوگی تو اس کو کوڑے ماروں گا- تو حضرت عمرؓ نے اس پر پوری حد جاری کی-﴾

وضاحت :

طلا اس شراب کو کہتے ہیں جو گاڑھے شیرے سے بنائی جائے- لیکن آج کی اور اس زمانے کی شرابوں کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ دونوں کا مقابلہ مشکل ہے- اس زمانے میں زیادہ تر شراب جو کی یا گندم کی ہوتی یا پھر کھجور کی مختلف اقسام کو ملا کر شراب بناتے تھے- انگور کی شراب بہت کم بلکہ نایاب تھی-

شراب کے بارے میں احناف کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی- ان کے نزدیک خمر کا اطلاق صرف انگوری شراب پر ہوتا ہے- یہ بات درست نہیں۔ عربی زبان کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں اس بات پر مطمئن ہوں کہ خمر کا اطلاق ہر قسم کی شراب پر ہوتا ہے- مزید براں انگوری شراب ان کے ہاں قلیل و کثیر دونوں مقداروں میں حرام ہے اور اس پر کوڑوں کی سزا ہوگی، لیکن انگور کے علاوہ جو شرابیں بنتی ہیں وہ اگر اتنی مقدار میں پی جائیں جس سے نشہ ہو جائے تب تو کوڑے مارے جائیں گے لیکن اگر نشہ نہ ہو تو حد جاری نہیں کی جائے گی-

روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے طلا کے بارے میں تحقیقات کروائی اور اس کے پینے پر اس کے مسکر ہونے کی وجہ سے پوری حد جاری کی- پوری حد کا مطلب ہے اسی کوڑے- باقی رہ گیا کہ وہ فلاں کون صاحب تھے تو حافظ عبدالبر کی تحقیق یہ ہے کہ وہ حضرت عمرؓ کے بیٹے تھے- بہر حال انہوں نے تحقیق کے بعد ان پر حد جاری کی-

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ ثَوْرِ بْنِ زَيْدِ الدِّيلِيِّ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اسْتَشَارَ فِى الْخَمْرِ يَشْرَبُهَا الرَّجُلُ فَقَالَ لَهُ عَلِيُّ ابْنُ اَبِى طَالِبٍ نَرَى اَنْ تَجْلِدَهُ ثَمَانِيْنَ فَاِنَّهُ اِذَا شَرِبَ سَكِرَ وَ اِذَا سَكِرَ هَذَى وَ اِذَا هَذَى افْتَرَى اَوْ كَمَا قَالَ فَجَلَدَ عُمَرُ فِى الْخَمْرِ ثَمَانِيْنَ-

﴿ثور بن زید سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا کہ اگر کوئی شخص شراب پیے تو کیا سزا دی جائے- حضرت علیؓ نے کہا کہ اس کو اسی کوڑے لگانے چاہئیں کیونکہ جب وہ شراب پیے گا تو نشہ میں ہوگا اور جب نشے میں ہوگا تو بکواس کرے گا اور جب بکواس کرے گا تو افترا کرے گا (یا انہوں نے جو کچھ کہا) تو حضرت عمرؓ نے شراب پینے کے جرم میں اسی کوڑوں کی سزا دی-﴾

وضاحت:

اس روایت میں چند باتیں قابل غور ہیں- ایک یہ کہ حضرت عمرؓ نے مشورہ تو اجل صحابہ، جن میں فقاہت تھی، سب سے طلب کیا تھا لیکن روایت میں صرف حضرت علیؓ کے مشورہ کا ذکر ہے- دوسرے حضرت علیؓ کا مشورہ بھی محل نظر ہے- یہ اسی طرح کی بات ہے کہ "ممّی کو باغ میں جانے نہ دیجو، کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا"- یہ بات درست ہے کہ شراب پیے گا تو نشہ میں ہوگا- نشہ ہوگا تو بکواس کرے گا، بکواس کرے گا تو افترا کرے گا، لیکن یہ تو

ضروری نہیں کہ اس کی بجواس کی نوعیت قذف کی ہو جس کی سزا اسی کوڑے ہے- جب آدمی بدمست ہوتا ہے تو اس سے سنگین قسم کے واقعات بھی سرزد ہوتے ہیں- بہن بیٹی میں تمیز نہیں کرتا- قتل تک کے واقعات ہو جاتے ہیں- شرابی جب پھنکارنے پر آتے ہیں تو نہ جانے کیا کیا بجواس کرتے ہیں- قذف تو شراب نوشی کا ایک ضمنی سا جرم ہے- بادی النظر میں تو یہ نکتہ بڑا عارفانہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی حیثیت بس ایک لطیفے سے زیادہ نہیں-

تیسری بات یہ ہے کہ خود حضرت علیؓ نے اس حد پر عمل نہیں کیا- حضرت عثمانؓ کے زمانے میں انہوں نے لبید کو چالیس کوڑے مارے اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہی کیا اور یہی حضرت ابوبکر صدیق نے کیا اور یہی میں کرتا ہوں- یعنی جس نکتے کی بڑی دھوم تھی اس نکتہ پر خود انہوں نے عمل نہیں کیا-

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خالدؓ نے امیر المومنین کو لکھا کہ شراب کے پینے کی سزا بالکل معمولی ہے لہذا اس کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے- اس کے تدارک کی فکر کرنی چاہیے- تب حضرت عمرؓ نے صحابہ سے مشورہ کیا تو اجل صحابہ نے یہ مشورہ دیا کہ اقل حد اس پر جاری کر دی جائے جو قذف کی حد ہے- یہ فلسفہ ان کا معقول تھا- حضرت عمرؓ نے اس امر کے پیش نظر کہ فتنہ بڑھتا جا رہا ہے اور ایک ذمہ دار آدمی نے اس کے روکنے کے لیے کہا ہے یہ فیصلہ فقیہ صحابہ کے مشورہ سے کیا-

آنحضرت ﷺ سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص شراب پی کر آیا- آپؐ نے فرمایا کہ اس کو مارو- کسی نے تھپڑ مارا، کسی نے گھونسا مارا، کسی نے جوتا کھینچ مارا، کسی نے اپنی چادر کا کوڑا بنا کر مارا- اس کے بعد اس کو چھوڑ دیا گیا- تخمینہ لگایا گیا کہ کتنی مار پڑی ہو گی تو لوگوں نے کہا کہ چالیس کوڑے کے قریب- بس یہ تخمینہ ہی تھا- حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہی مسلک ہے اور یہی مسلک حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا ہے- لیکن اس پر اجماع نہیں- اگر حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسی کوڑوں کی سزا پر اجماع ہو جاتا تو حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اس کے خلاف کیسے عمل کرتے؟ گویا شرابی کی سزا کا معاملہ حد کا نہیں بلکہ تعزیر کا ہے- اللہ تعالیٰ اور نبی ﷺ نے کوئی حد مقرر نہیں فرمائی- ان کے سوا کوئی دوسرا حد مقرر نہیں کر سکتا- تعزیر کا معاملہ اجتہادی ہے- امیر اپنی رائے یا مشاورت سے حالات کے مطابق سزا دے سکتا ہے- فقہاء حالات کے مطابق جو فیصلہ کریں وہ کر سکتے ہیں-

☐ حدّثنی عن مالك عن ابن شهاب انّه سئل عن حدّ العبد فی الخمر فقال بلغنی انّ علیه نصف حدّ الحرّ فی الخمر و انّ عمر بن الخطّاب و عثمان بن عفّان و عبد اللّٰہ بن عمر قد جلدوا عبیدھم نصف حدّ الحرّ فی الخمر۔

﴿ابن شہاب سے پوچھا گیا کہ اگر غلام نے شراب پی ہو تو اس پر کیا سزا ہو گی تو انہوں نے کہا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ غلام کی سزا آزاد سے آدھی ہے اور حضرت عمر بن خطابؓ، حضرت عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے غلاموں کو آزاد سے نصف سزا دی۔﴾

وضاحت :

اس اثر میں بڑا جھگڑا یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے ہاں شرابی کی سزا اسی کوڑے ہے جبکہ حضرت عثمان کے ہاں چالیس کوڑے، تو کس سزا کا نصف ہو گا؟ اللہ کا شکر ہے کہ اب غلامی کا معاملہ ختم ہو گیا ہے۔ اب یہ ہمارا موضوع نہیں رہا۔

☐ حدّثنی عن مالك عن یحیٰی بن سعید انّه سمع سعید بن المسیّب یقول ما من شیءٍ الّا یحبّ اللّٰہ ان یعفی عنه مالم یکن حدًّا۔

﴿یحیٰی بن سعید کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن المسیب سے سنا۔ وہ کہتے تھے کہ کوئی شے ایسی نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو معافی زیادہ پسند نہ ہو جب تک کہ وہ حد نہ ہو۔﴾

وضاحت :

سعید بن مسیب مدینہ کے فقہا میں سے تھے۔ یہ ان کا قول ہے۔ حد صرف اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ ہی متعین کر سکتے ہیں اور اگر خلفائے راشدین کا اجماع ہو تو وہ اجتہادی حد سب سے زیادہ قوی ہے۔ حدوں کے علاوہ دوسری تعزیرات سے حتی الامکان درگزر پسندیدہ ہے۔

مَا يُنْهَى اَنْ يُنْبَذَ فِيهِ

کن برتنوں میں نبیذ بنانا ممنوع ہے

نبیذ کا اہل عرب میں بہت رواج تھا- یہ ایک مقوی مشروب تھا- کھجور میں پانی، کچھ انگور اور مزید کچھ چیزیں ملا کر اس کو خمیر اٹھنے تک رکھ دیا جاتا پھر اس کو پی لیتے- بعض حالات میں اس میں جوش (Fermentation) بھی آجاتا ہوگا- بہر حال وہ ایک مقوی اور نشاط انگیز چیز بن جاتی تھی- نبیذ کو اگر زیادہ دیر کے لیے رکھ دیا جاتا تو وہ شراب کے حکم میں آجاتی تھی- جب شراب کی حرمت کا حکم ہوا تو سوال پیدا ہوا کہ کیا نبیذ پینے والے پر بھی حد جاری کر دی جائے گی تاکہ جن چیزوں میں نشہ کا اندیشہ ہو ان سے بھی بچا جائے-

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ خَطَبَ النَّاسَ فِي بَعْضِ مَغَازِيهِ فَقَالَ عَبْدُاللَّهِ بْنُ عُمَرَ فَاَقْبَلْتُ نَحْوَهُ فَانْصَرَفَ قَبْلَ اَنْ اَبْلُغَهُ فَسَاَلْتُ مَا ذَا قَالَ فَقِيلَ نَهَى اَنْ يُنْبَذَ فِي الدُّبَّاءِ وَالْمُزَفَّتِ

﴿ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ کسی غزوہ کے موقع پر خطبہ دیا- میں آگے بڑھا تاکہ سنوں لیکن میرے پہنچنے سے پہلے آپؐ نے خطبہ ختم کر دیا- میں نے لوگوں سے پوچھا کہ آپ نے کیا فرمایا تو لوگوں نے بتایا کہ آپؐ نے نبیذ کو دبا اور مزفت میں بنانے سے منع فرمایا ہے- ﴾

وضاحت:

دبا تو کدو کو کہتے ہیں- وہ جب خشک ہو جاتا ہے تو اس کے اوپر کا چھلکا سخت اور چکنا ہو جاتا ہے- اس میں نبیذ تیار کرنے سے جوش جلدی پیدا ہو جاتا ہے-

مزفت اس مٹکے کو کہتے ہیں جس کے اوپر تارکول یا کوئی ایسی چیز مل دیں جس سے اس کے مسام بند ہو جائیں- اس میں بھی خمیر جلد اٹھتا ہے- دبا اور مزفت کا استعمال نبیذ بنانے میں معروف تھا- جب شراب حرام کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ نبیذ دبا اور مزفت قسم کے برتنوں میں نہ بنائی جائے کیونکہ ان برتنوں میں تیار کردہ نبیذ نشہ آور

ہو جاتی ہے۔یہ حکم سدذریعہ کے طور پر تھا تاکہ شراب خوری کی راہ مسدود ہو جائے۔

مَا يُكْرَهُ اَنْ يُنْبَذَ جَمِيعًا

کن چیزوں کو ملا کر نبیذ بنانی مکروہ ہے

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى اَنْ يُنْبَذَ الْبُسْرُ وَالرُّطَبُ جَمِيعًا وَالتَّمْرُ وَالزَّبِيبُ جَمِيعًا۔

﴿عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کچی کھجور کو تقریباً تیار کھجور کے ساتھ ملا کر، اور خشک کھجور کے ساتھ منقے ملا کر، نبیذ بنانے سے منع فرمایا۔﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ الثِّقَةِ عِنْدَهُ عَنْ بُكَيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْاَشَجِّ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ الْحُبَابِ الْاَنْصَارِيِّ عَنْ اَبِي قَتَادَةَ الْاَنْصَارِيِّ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى اَنْ يُشْرَبَ التَّمْرُ وَالزَّبِيبُ جَمِيعًا وَالزَّهْوُ وَالرُّطَبُ جَمِيعًا۔

﴿ابو قتادہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خشک کھجور اور منقے کی ایک ساتھ اور کچی کھجور اور تقریباً تیار کھجور کی ایک ساتھ ملا کر تیار کردہ نبیذ پینے سے منع فرمایا۔﴾

وضاحت :

نبیذ کی چند ایک قسمیں تھیں۔ایک تو مفرد ہوتی یعنی صرف کھجور کو پانی میں بھگو کر نبیذ تیار کر لیتے۔ دوسری مرکب کہ کھجور کے ساتھ منقے شامل کر لیتے یا پختہ کھجور کے ساتھ کچی کھجور ملا دیتے۔اس طرح ایک چیز دوسری چیز کو جوش دلانے میں مددگار ہو جاتی اور مشروب میں تیزی پیدا ہو جاتی تھی۔آپؐ نے مرکب نبیذ سے منع فرمایا۔یہ حکم بھی سدذریعہ کی نوعیت کا تھا۔بعد میں جب لوگوں پر اس کی حکمت واضح ہو گئی اور اس کا اندیشہ نہ رہا کہ لوگ شراب اور نبیذ میں تمیز نہ کریں گے تو آپؐ نے فرمایا کہ میں نے فلاں فلاں قسم کی نبیذ سے روکا تھا اب تمہیں اس کی اجازت ہے۔

امر، زہو، رطب، تمر کھجور کے معنی میں ہیں- چونکہ فصل کی تیاری کئی مراحل میں ہوتی ہے اس لیے ہر مرحلہ کے الگ نام ہیں- کھجور کچی بھی قابل استعمال ہوتی ہے وہ امر ہے- اس پر سرخی آجائے تو زہو ہے- تقریباً پک جائے تو رطب ہے اور خشک کھجور کو تمر کہتے ہیں-

تَحْرِيمُ الْخَمْرِ

شراب کی حرمت

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ أَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهَا قَالَتْ سُئِلَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْبِتْعِ فَقَالَ كُلُّ شَرَابٍ أَسْكَرَ فَهُوَ حَرَامٌ

﴿حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بتع کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ہر مشروب جو نشہ آور ہو، وہ حرام ہے-﴾

وضاحت :

بتع خاص اہل یمن کی شراب تھی جو وہ شہد سے بناتے تھے- شہد یا اس کا شربت پینے میں کوئی حرج نہیں لیکن جب اس کا خمیر اٹھا لیا جائے اور وہ نشہ آور ہو جائے تو اس کا پینا حرام ہے- مشروبات میں اصل یہی ہے کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے، خواہ اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر-

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ سُئِلَ عَنِ الْغُبَيْرَاءِ فَقَالَ لَا خَيْرَ فِيهَا وَنَهَى عَنْهَا قَالَ مَالِكٌ فَسَأَلْتُ زَيْدَ بْنَ أَسْلَمَ مَا الْغُبَيْرَاءُ فَقَالَ هِيَ الْأَسْكَرْكَةُ-

﴿عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے غبیراء کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا اس میں خیر نہیں- اس کے پینے سے آپ نے منع کر دیا- امام مالک کہتے ہیں کہ میں نے زید بن اسلم

سے پوچھا کہ غبیراء کیا ہوتی ہے؟ انہوں نے کہا کہ وہ اسکرکہ ہوتی ہے۔﴾

وضاحت :

غبیراء یا اسکرکہ کے متعلق دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ باجرے کی شراب ہوتی تھی۔ دوسرا یہ کہ اس کو چاول سے بناتے تھے۔ آپؐ نے اس کے پینے سے منع فرمادیا۔

اللہ تعالیٰ پیغمبر کو ایسا علم عطا کرتے ہیں کہ وہ ہر چیز کے متعلق پوری قطعیت کے ساتھ رائے دیتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کو وہ ذاتی معلومات کی روشنی میں جانچے ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک شعبہ ہی میں نہیں بلکہ ہر شعبہ میں ان کا علم ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہاں تو کھانے پینے کا ذکر ہے۔ اخلاقیات میں، سیاسیات میں، اجتماعیات میں، ہر معاملہ میں پوچھئے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کو ذاتی تجربہ ہے۔ نبوت کے خاص منصب کی خصوصیات ہی سے اس علم کی توجیہ ہو سکتی ہے۔ پیغمبر اپنی ذات میں اتنا مکمل اور کامل ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کی اس اونچی سطح پر ہوتا ہے جس تک علماء اور حکماء کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔

☐ **حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ لَمْ يَتُبْ مِنْهَا حُرِمَهَا فِي الْآخِرَةِ۔**

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے دنیا میں شراب پی پھر اس سے توبہ نہ کی تو وہ اس پر آخرت میں حرام ہو گئی۔﴾

وضاحت :

جنتیوں کو جس شراب طہور کی بشارت دی گئی ہے دنیا کے شرابی اس سے محروم رہیں گے اور عین ممکن ہے شرابی جنت میں داخل ہی نہ ہو سکیں۔ شراب ام الخبائث ہے۔ تمام اخلاق و کردار کو تباہ کر دیتی ہے۔ وہ پینے والے کو جنت میں جانے کے قابل ہی کہاں چھوڑتی ہے۔ آپؐ کے فرمان کا اشارہ اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔

جَامِعُ تَحْرِيْمِ الْخَمْرِ

شراب کی حرمت سے متعلق جامع باب

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنِ ابْنِ وَعْلَةَ الْمِصْرِيِّ اَنَّهُ سَاَلَ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَبَّاسٍ عَمَّا يُعْصَرُ مِنَ الْعِنَبِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اَهْدٰى رَجُلٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ رَاوِيَةَ خَمْرٍ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهَا قَالَ لَا فَسَارَّهُ رَجُلٌ اِلٰى جَنْبِهِ فَقَالَ لَهُ ﷺ بِمَ سَارَرْتَهُ فَقَالَ اَمَرْتُهُ اَنْ يَبِيْعَهَا فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الَّذِيْ حَرَّمَ شُرْبَهَا حَرَّمَ بَيْعَهَا فَفَتَحَ الرَّجُلُ الْمَزَادَتَيْنِ حَتّٰى ذَهَبَ مَا فِيْهِمَا۔

﴿ابن وعلہ مصری سے روایت ہے کہ انہوں نے عبداللہ بن عباسؓ سے پوچھا کہ انگور کا رس نچوڑ کر جو شراب بنائی جاتی ہے، اس کے متعلق کیا حکم ہے۔ابن عباس نے کہا کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کو ایک اونٹ شراب لادے ہوئے ہدیہ کیا۔رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کر دیا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔تو ایک شخص نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔آنحضرتؐ نے اس سے پوچھا کہ آپ نے کیا سرگوشی فرمائی؟ اس نے کہا کہ میں نے مشورہ دیا کہ اس کو بیچ دے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس ذات نے اس کا پینا حرام کیا ہے اس نے اس کی بیع بھی حرام کی ہے۔تو اس شخص نے دونوں مشکیزوں کے منہ کھول دیے اور ان کے اندر جو کچھ تھا وہ بہہ گیا۔﴾

وضاحت:

اس روایت میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس شخص نے آنحضرت ﷺ کو شراب کا تحفہ کیوں دیا۔ جبکہ آپ نے دور جاہلیت میں بھی کبھی شراب نہیں پی۔ہو سکتا ہے عام قبائلی سرداروں کی خدمت میں لوگ اس طرح کے تحفے پیش کرتے رہے ہوں۔

اس روایت سے یہ حکم نکلا کہ شراب کا پینا ہی حرام نہیں بلکہ اس کا کاروبار کرنا بھی ممنوع ہے۔کاروبار کی

ممانعت سد ذریعہ کے طور پر ہے۔

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِی طَلْحَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّهُ قَالَ كُنْتُ اَسْقِی اَبَا عُبَيْدَةَ بْنَ الْجَرَّاحِ وَ اَبَا طَلْحَةَ الْاَنْصَارِیَّ وَ اُبَیَّ بْنَ كَعْبٍ شَرَابًا مِنْ فَضِيْخٍ وَتَمْرٍ قَالَ فَجَاءَهُمْ آتٍ فَقَالَ اِنَّ الْخَمْرَ قَدْ حُرِّمَتْ فَقَالَ اَبُو طَلْحَةَ يَا اَنَسُ قُمْ اِلٰى هٰذِهِ الْجِرَارِ فَاكْسِرْهَا قَالَ فَقُمْتُ اِلٰى مِهْرَاسٍ لَنَا فَضَرَبْتُهَا بِاَسْفَلِهٖ حَتّٰى تَكَسَّرَتْ

﴿انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ میں ابو عبیدہ بن جراح، ابو طلحہ انصاری اور ابی بن کعب تینوں کو پھٹی ہوئی کچی کھجور اور خشک کھجور کی شراب پلاتا تھا۔ ان کے ہاں ایک شخص آیا اور بتایا کہ شراب حرام کر دی گئی ہے۔ ابو طلحہ نے کہا، اے انس، اٹھو اور یہ سبو جتنے ہیں ان کو توڑ دو۔ انس کہتے ہیں میں اٹھا، ایک پتھر لیا اور ان کے پیندوں پر مارا تو وہ چکنا چور ہو گئے۔﴾

وضاحت:

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب پینے کا رواج عام رہا ہو گا لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم آنے کے بعد سب نے فوری طور پر شراب پینا ترک کر دی۔ یہاں حضرات ابو عبیدہ بن الجراحؓ، ابو طلحہ انصاریؓ اور ابی بن کعبؓ کے جذبہ اطاعت کا حوالہ ہے کہ انھوں نے کس طرح فی الفور حکم پر عمل کیا۔ یہ تینوں اجل اور فقیہ صحابہ میں سے تھے۔

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ دَاوٗدَ بْنِ الْحُصَيْنِ عَنْ وَاقِدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ اَنَّهُ اَخْبَرَهُ عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِيْدٍ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ حِيْنَ قَدِمَ الشَّامَ شَكَا اِلَيْهِ اَهْلُ الشَّامِ وَبَاءَ الْاَرْضِ وَ ثِقَلَهَا وَ قَالُوْا لَا يُصْلِحُنَا اِلَّا هٰذَا الشَّرَابُ فَقَالَ عُمَرُ اشْرَبُوْا هٰذَا الْعَسَلَ قَالُوْا لَا يُصْلِحُنَا الْعَسَلُ فَقَالَ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْاَرْضِ هَلْ لَكَ اَنْ نَجْعَلَ لَكَ مِنْ هٰذَا الشَّرَابِ شَيْئًا لَا يُسْكِرُ قَالَ نَعَمْ فَطَبَخُوْهُ حَتّٰى ذَهَبَ مِنْهُ الثُّلُثَانِ وَ بَقِیَ الثُّلُثُ فَاَتَوْا بِهٖ عُمَرَ فَاَدْخَلَ فِيْهِ عُمَرُ اِصْبَعَهٗ ثُمَّ رَفَعَ يَدَهٗ فَتَبِعَهَا يَتَمَطَّطُ فَقَالَ هٰذَا الطِّلَا هٰذَا مِثْلُ طِلَاءِ الْاِبِلِ

فَاَمَرَهُمْ عُمَرُ اَنْ يَشْرَبُوهُ فَقَالَ لَهُ عُبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ اَحْلَلْتَهَا وَاللّٰهِ فَقَالَ عُمَرُ كَلَّا وَاللّٰهِ اَللّٰهُمَّ اِنِّي لَا اُحِلُّ لَهُمْ شَيْئًا حَرَّمْتَهُ عَلَيْهِمْ وَلَا اُحَرِّمُ عَلَيْهِمْ شَيْئًا اَحْلَلْتَهُ لَهُمْ-

﴿محمود بن لبید انصاری سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ جب شام کے دورے پر آئے تو اہل شام نے شکایت کی کہ ہمارا ملک بڑا وبائی ہے- اس کی ہوا میں بڑی ثقالت ہے- اور ہمارا مزاج شراب کے بغیر درست نہیں ہوتا- حضرت عمرؓ نے کہا کہ یہ شہد پیا کرو- انہوں نے کہا شہد سے مزاج درست نہیں ہوتا- علاقے کے ایک شخص نے کہا کہ اگر میں آپ کے لیے شراب کو غیر مسکر بنادوں تو آپ خواہش کریں گے- آپ نے فرمایا ہاں- تو اس نے انگور کی شراب کو اتنا پکایا کہ دو ثلث اس کے ختم کر دیے اور ایک ثلث باقی رہ گیا- لوگ اس کو حضرت عمرؓ کے پاس لائے- انہوں نے اپنی انگلی اس میں ڈالی- نکالی تو اس کا تار چپکا ہوا تھا- حضرت عمرؓ نے کہا یہ تو روغن ہے، ایسا روغن اونٹ کو ملتے ہیں- آپ نے لوگوں کو اس کے پینے کی اجازت دی- عبادہ بن صامتؓ نے کہا کہ واللہ، آپ نے ان کے لیے شراب حلال کر دی- حضرت عمرؓ نے کہا ہرگز نہیں- اللہ کی قسم- اے اللہ میں نے ان کے لیے کوئی ایسی چیز حلال نہیں کی جو تو نے ان پر حرام کی ہے اور نہ وہ چیز حرام کی ہے جو تو نے ان کے لیے حلال کی ہے-﴾

وضاحت:

حضرت عمرؓ کا فتویٰ درست ہے- شراب کو ابال کر اس کا اگر سرکہ بنا لیا جائے اور وہ مسکر نہ رہے تو وہ حلال ہے، اگرچہ ایک مرحلے میں وہ شراب ہی تھا- اس فتویٰ کو بعض حضرات نہیں مانتے- وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہ فتویٰ واپس لے لیا تھا- اسی لیے انہوں نے اپنے بیٹے کو طلا پینے پر سزا دی تھی- حالانکہ جو کچھ ان کے بیٹے نے پیا وہ اور طلا رہا ہوگا جو مسکر ہوگا- یہ طلا جو اس شخص نے بنا کر پیش کیا وہ مسکر نہیں تھا- شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک مثلث یعنی وہ شراب جو پکنے کے بعد ایک تہائی رہ جائے حلال ہے لیکن زرقانی یہ نہیں مانتے- وہ یہی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنی رائے واپس لے لی تھی- لیکن رائے واپس لینے کی کیا وجہ تھی یہ ان کو معلوم نہیں- میرے نزدیک یہ موقف صحیح ہے کہ جب کوئی چیز مسکر نہ رہے تو وہ جائز ہے اگرچہ کسی مرحلہ میں وہ شراب رہی ہو- ظاہر ہے تو عیت بدل جانے پر

وہ شراب کے حکم میں نہیں رہتی۔ جب مسکر نہیں رہی تو حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

□ حدَّثنی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ اَنَّ رِجَالًا مِنْ اَهْلِ الْعِرَاقِ قَالُوا لَهُ يَا اَبَاعَبْدِالرَّحْمٰنِ اِنَّا نَبْتَاعُ مِنْ ثَمَرِ النَّخْلِ وَالْعِنَبِ فَنَعْصِرُهُ خَمْرًا فَنَبِيعُهَا فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ اِنِّی اُشْهِدُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ وَ مَلَائِكَتَهُ وَ مَنْ سَمِعَ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِّی لَا آمُرُكُمْ اَنْ تَبِيعُوْهَا، وَلَا تَبْتَاعُوْهَا، وَلَا تَعْصِرُوْهَا، وَلَا تَشْرَبُوْهَا، وَ لَا تَسْقُوْهَا فَاِنَّهَا رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ۔

اہل عراق میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ اے ابو عبدالرحمٰن، ہم کھجوروں اور انگوروں کی خرید و فروخت کرتے ہیں اور ان کو شراب بنانے کے لیے نچوڑ لیتے اور شراب فروخت کرتے ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا میں اللہ کو، اس کے فرشتوں کو اور تمام جن وانس کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں تمہیں اجازت نہیں دیتا کہ تم اس کو بیچو، اس کی خرید و فروخت کرو، یا اس کو نچوڑ کر شراب بناؤ اور اس کو پیو اور پلاؤ۔ یہ سب رجس اور شیطان کا عمل ہے۔

وضاحت :

یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں، وہ اس سے کم کیا کہہ سکتے تھے۔ حرام چیز کی تجارت کو ذریعہ معاش بنانا بھی حرام ہے۔ باب کے شروع میں روایت گزر چکی ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس ذات نے اس کا پینا حرام کیا ہے اسی نے اس کی خرید و فروخت بھی حرام کی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہی اس کی فروخت حرام کی ہے۔

کتاب العقول

کتاب القسامہ

عقول کا مطلب

عقول کے معنی باندھنے کے ہیں۔ یہ لفظ دیت کے لیے معروف ہے جو جان کے بدلے جان دینے کی بجائے مال کی صورت میں مقتول کے ورثا کو دی جاتی ہے۔ عقال اونٹ کا گھٹنا باندھنے کی رسی کو کہتے ہیں۔ دیت کے لیے لفظ عقول کے استعمال کی وجہ یہ ہے کہ جس پر دیت واجب ہوتی تھی وہ مقررہ تعداد میں اونٹ یا بکریاں لے جا کر مقتول کے صحن میں باندھ دیتا تھا۔ چنانچہ دیت کو عقول سے تعبیر کرنے لگے۔

ذِكْرُ الْعُقُولِ

دیت کا بیان

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي بَكْرِ ابْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ عَنْ اَبِيهِ اَنَّ فِي الْكِتَابِ الَّذِي كَتَبَهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لِعَمْرِو بْنِ حَزْمٍ فِي الْعُقُولِ اَنَّ فِي النَّفْسِ مِائَةً مِنَ الْاِبِلِ وَ فِي الْاَنْفِ اِذَا اُوعِيَ جَدْعًا مِائَةٌ مِنَ الْاِبِلِ وَ فِي الْمَامُومَةِ ثُلُثُ الدِّيَةِ وَ فِي الْجَائِفَةِ مِثْلُهَا وَفِي الْعَيْنِ خَمْسُونَ وَ فِي الْيَدِ خَمْسُونَ وَ فِي الرِّجْلِ خَمْسُونَ وَ فِي كُلِّ اُصْبُعٍ مِمَّا هُنَالِكَ عَشْرٌ مِنَ الْاِبِلِ وَ فِي السِّنِّ خَمْسٌ وَ فِي الْمُوضِحَةِ خَمْسٌ۔

﴿ عبداللہ بن ابی بکر بن محمد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو خط عمرو بن حزم کو دیت کے بارے میں لکھا تھا اس میں جان کی دیت سو اونٹ، ناک کی اگر پوری کاٹ دی گئی ہو سو اونٹ، ایسی چوٹ کی جو دماغ تک پہنچتی ہو ایک ثلث دیت اور جو پیٹ کے اندر تک کی چوٹ ہو اس کی ایک ثلث، ایک آنکھ کی پچاس اونٹ، ایک ہاتھ کی پچاس، ایک پاؤں کی پچاس اور ہر ایک انگلی کی دس اونٹ، دانت کی پانچ اونٹ اور ایسے زخم کی جس سے ہڈی ننگی ہو جائے پانچ اونٹ تھی۔ ﴾

وضاحت:

دیت کے بارے میں یہ خط بنیادی دستاویز ہے کیونکہ اسے نبی ﷺ نے خود لکھوایا۔ یہ صرف دیت کے

متعلق ہی ہے- اس خط کے ضمن میں بہت شکیں ہیں- اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری روایات میں اس میں کچھ اضافے ہیں اور تیسری جگہ مزید اضافے ہیں- اس وجہ سے یہ متعین کرنا خاصا مشکل ہو گیا ہے کہ خط کا کتنا حصہ اصل کی حیثیت سے قابل اعتماد ہے اور کتنا حصہ ایسا ہے جو اس میں اضافہ ہے- اس میں تحقیق کی ضرورت ہے- بہر حال اصل حیثیت تو اس خط ہی کی ہے- باقی فقہا کے اجتہادات ہیں-

اس روایت میں تین اصطلاحات نقل ہوئی ہیں- "مامومہ" - اس چوٹ کو کہتے ہیں جو دماغ تک پہنچ جائے مثلاً وہ ہڈی ٹوٹ جائے جو دماغ کو محفوظ کرتی ہے- 'جائفہ' وہ چوٹ جو پیٹ کے اندر تک چلی جائے اور "موضحہ" ایسی چوٹ جو گوشت کو ادھیڑ دے اور ہڈی نظر آنے لگے-

دیت کے جو احکام اس زمانے میں دیے گئے وہ اونٹوں کی تعداد کے حساب سے دیے گئے- اب اونٹوں اور بکریوں کا زمانہ نہیں ہے لہٰذا اب تقویم ہو گی یعنی سکہ رائج الوقت کے مطابق قیمت ٹھہرائی جائے گی-

اس سے بھی زیادہ پیچیدہ یہ چیز ہے کہ ایک شخص نے زخم لگایا ہے، آنکھ پھوڑ دی ہے، چہرہ بگاڑ دیا ہے، سر کچل دیا ہے، دماغ ماؤف کر دیا ہے، ٹانگ توڑ دی ہے تو اس میں صحیح عدل کا تقاضا کیا ہو گا؟ دیت ہو گی یا عیناً وہی کچھ کرنا ہو گا جو اس کے ساتھ کیا گیا ہے- اگر وہی کچھ کرنے کا اختیار دے دیا جائے تو اس سے عدل کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے- اگر ضرب زیادہ لگ گئی تو کون ذمہ دار ہو گا اور کس شکل میں نقصان پورا ہو گا- میرے نزدیک دیت کا معاملہ خاصا پیچیدہ ہے اور موجودہ قانون میں شامل کرنے کے لیے اس پر کافی تحقیق اور غور و فکر کی ضرورت ہے-

اَلْعَمَلُ فِی الدِّیَةِ

دیت پر عمل کس طریقہ سے ہو گا

□ حَدَّثَنِی مَالِكٌ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَوَّمَ الدِّیَةَ عَلٰی اَهْلِ الْقُرٰی فَجَعَلَهَا عَلٰی اَهْلِ الذَّهَبِ اَلْفَ دِینَارٍ وَ عَلٰی اَهْلِ الْوَرِقِ اثْنَیْ عَشَرَ اَلْفَ دِرْهَمٍ قَالَ مَالِكٌ فَاَهْلُ الذَّهَبِ اَهْلُ الشَّامِ وَ اَهْلُ مِصْرَ وَ اَهْلُ الْوَرِقِ اَهْلُ الْعِرَاقِ-

امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے شہریوں کے لیے دیت کی تقویم کرائی- پھر آپ نے یوں مقرر کیا کہ سونے کا سکہ جن کے ہاں رائج ہے ان کے لیے دیت ایک ہزار دینار ہو گی

اور جن کے ہاں چاندی کا سکہ رائج ہے وہاں بارہ ہزار درہم ہو گی۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اہل شام اور اہل مصر سونے کے سکے والے اور اہل عراق چاندی کے سکے والے ہیں۔

وضاحت :

اونٹوں کی صورت میں دیت کی ادائیگی بڑی مشکلات پیدا کرتی ہے۔ خصوصاً شہریوں کے لیے بڑی تعداد میں جانور حاصل کرنا خاصا دشوار کام ہے۔ لہذا اونٹوں کی قیمت نقد میں متعین کرنا ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہی تقویم کی ضرورت پڑ گئی۔ انہوں نے لوگوں کی سہولت کے لیے رائج الوقت سکہ دینار اور درہم میں قیمت مقرر کر دی۔ معلوم ہوتا ہے اس وقت ایک اونٹ کی قیمت 10 دینار تھی اور دینار میں 12 درہم تھے لہذا دیت کی رقم ایک ہزار دینار یا بارہ ہزار درہم مقرر کی گئی۔ موجودہ زمانے میں سو اونٹ کی قیمت آج کل کے رائج سکہ میں مقرر کرنا ہو گی تاکہ لوگ آسانی سے دیت ادا کر سکیں۔

امام مالک کے فتوے :

امام مالک کہتے ہیں کہ دیت تین یا چار سالانہ اقساط میں لی جائے گی۔ تین سال کی قسطیں میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں متفق علیہ بات یہ ہے کہ شہریوں سے دیت میں اونٹ نہیں قبول کیے جائیں گے، نہ اہل عمود کی طرف سے سونا یا چاندی، نہ سونے والوں سے چاندی اور نہ چاندی والوں سے سونا۔ اہل عمود سے مراد صحرا میں خیموں میں رہنے والے لوگ ہیں۔

میرے نزدیک "اونٹ قبول کرنا" کی بجائے "اونٹ وصول کرنا" کے الفاظ کا استعمال زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ حکومت دیت وصول کرے گی۔ حدود و تعزیرات وغیرہ حکومت کے واسطے سے جاری ہوتی ہیں۔ حکومت ہی دیت وصول کر سکتی یا کوڑے لگا سکتی یا ہاتھ کاٹ سکتی ہے۔ قاضی جو فیصلہ کرے گا حکومت اس کو نافذ کرے گی۔ امام صاحب کی یہ تجاویز سہولت کے لیے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک کوئی جس شکل میں دیت ادا کرتا ہے تو قبول کرنی چاہیے۔

مَا جَاءَ فِي دِيَةِ الْعَمْدِ اِذَا قُبِلَتْ وَجِنَايَةِ الْمَجْنُوْنِ

قتل عمد کی دیت جب ورثا اس کا دینا قبول کر لیں اور مجنون کی سزا

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ اَنَّ ابْنَ شِهَابٍ كَانَ يَقُولُ فِي دِيَةِ الْعَمْدِ اِذَا قُبِلَتْ خَمْسٌ وَ عِشْرُونَ بِنْتَ مَخَاضٍ وَ خَمْسٌ وَ عِشْرُونَ بِنْتَ لَبُونٍ وَ خَمْسٌ وَ عِشْرُونَ حِقَّةً وَ خَمْسٌ وَ عِشْرُونَ جَذَعَةً۔

﴿امام مالکؒ روایت کرتے ہیں کہ ابن شہاب کہتے تھے کہ اگر قتل عمد میں ورثا دیت قبول کر لیں تو پچیس اونٹ دو سالہ، پچیس تین سالہ، پچیس چار سالہ اور پچیس پانچ سالہ ہوں گے۔﴾

وضاحت :

یہ روایت حدیث نہیں بلکہ ابن شہاب کی اپنی رائے ہے۔ اس میں نہ رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے نہ صحابہ کا اثر بیان ہوا ہے۔ اگر خلفائے راشدین اس قسم کا فتویٰ دیتے تب تو اس کی اہمیت تھی۔ ابن شہاب کو اونٹوں کی عمریں متعین کرنے کا حق کس نے دیا؟ یہ صرف امام مالک کی سادہ لوحی ہے کہ ابن شہاب کی ایک رائے کو اپنی کتاب میں جگہ دے دی۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ اَنَّ مَرْوَانَ بْنَ الْحَكَمِ كَتَبَ اِلَى مُعَاوِيَةَ بْنِ اَبِي سُفْيَانَ اَنَّهُ اُتِيَ بِمَجْنُونٍ قَتَلَ رَجُلًا فَكَتَبَ اِلَيْهِ مُعَاوِيَةُ اَنِ اعْقِلْهُ وَلَا تُقِدْ مِنْهُ فَاِنَّهُ لَيْسَ عَلَى مَجْنُونٍ قَوَدٌ۔

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ مروان بن حکم نے امیر معاویہؓ کو لکھا کہ ایک مجنون میرے پاس لایا گیا ہے جس نے ایک شخص کو قتل کر دیا ہے۔ امیر معاویہؓ نے لکھا کہ اس سے دیت لو۔ قصاص نہیں لے سکتے۔ مجنون قصاص میں قتل نہیں ہو سکتا۔﴾

وضاحت :

یہ حضرت امیر معاویہؓ کا فتویٰ ہے کہ مجنون کے اوپر قتل کی ذمہ داری نہیں ہاں اس سے دیت لی جائے۔ یہ

بات قابل غور ہے کہ اگر قصاص نہیں لیا جاسکتا تو دیت لینے کی کیا جواز ہے ؟ جو عذر قصاص میں مانع ہے وہی عذر دیت میں بھی مانع ہونا چاہیے۔ قبیلہ ایک مجنون کی کہاں تک نگرانی کر سکتا اور اس کی ذمہ داری قبول کر سکتا ہے ؟

دوسرا مسئلہ قابل غور یہ ہے کہ اتنی بڑی رقم عاقلہ (یعنی قبیلہ کے وہ افراد جو مال جمع کر کے قاتل کی طرف سے دیت ادا کریں گے) پر پڑے گی۔ ہمارے ہاں عاقلہ کا سسٹم نہیں ہے۔ یہ نظام قبائلی زندگی کے ساتھ وابستہ تھا، اب ختم ہو گیا۔ قبائلی زندگی کی وجہ سے وہاں ہر ایک کو دوسرے کے غم اور مصیبت میں اور حقوق وحدود میں شرکت کرنا لازم ہوتا تھا۔ اس لیے اب یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے کہ اس زمانہ میں عاقلہ کا بدل کیا ہوگا۔

امام مالکؒ کا ایک فتویٰ یہ ہے کہ اگر ایک بالغ اور ایک کمسن دونوں مل کر ایک شخص کو قتل کر دیں تو بڑے کو تو قصاص میں قتل کیا جائے گا اور کمسن پر نصف دیت ہوگی۔ یہ بات نہ حدیث میں آئی ہے نہ صحابہ کے اثر میں۔ اگر کوئی ایسا واقعہ فی زمانہ پیش آجائے تو فیصلہ کرنے کے لیے اس سے کچھ رہنمائی لی جا سکتی ہے۔

دِيَةُ الْخَطَاءِ فِي الْقَتْلِ

غلطی سے قتل ہو جائے تو اس کی دیت

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عِرَاكِ بْنِ مَالِكٍ وَ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ رَجُلًا مِنْ بَنِي سَعْدِ بْنِ لَيْثٍ أَجْرَى فَرَسًا عَلَى أُصْبُعِ رَجُلٍ مِنْ جُهَيْنَةَ فَنُزِيَ مِنْهَا فَمَاتَ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لِلَّذِي ادُّعِيَ عَلَيْهِمْ أَتَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ خَمْسِيْنَ يَمِينًا مَامَاتَ مِنْهَا فَأَبَوْا وَ تَحَرَّجُوا وَ قَالَ لِلْآخَرِينَ أَتَحْلِفُونَ أَنْتُمْ فَأَبَوْا فَقَضَى عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ بِشَطْرِ الدِّيَةِ عَلَى السَّعْدِيِّينَ قَالَ مَالِكٌ وَ لَيْسَ الْعَمَلُ عَلَى هٰذَا۔

﴿ عراک بن مالکؒ اور سلیمان بن یسارؒ سے روایت ہے کہ قبیلہ سعد بن لیث کے ایک آدمی نے اپنا گھوڑا دوڑایا۔ اس نے قبیلہ جہینہ کے ایک آدمی کی انگلی روند دی جس سے اس کا خون نکل گیا اور وہ مر گیا۔ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں سے جن پر دعویٰ کیا گیا تھا کہا کہ کیا تم پچاس قسم کھاؤ گے کہ وہ اس سے نہیں مرا۔ انہوں نے انکار کیا اور اس کو احتیاط کے خلاف سمجھا۔ پھر مدعیوں سے پوچھا کہ کیا تم لوگ

قسم کھاتے ہو کہ وہ اس سے مرا ہے تو انہوں نے بھی انکار کیا۔ حضرت عمرؓ نے قبیلہ سعد کے خلاف نصف دیت کا فیصلہ کیا۔ مالک کہتے ہیں کہ اس پر عمل نہیں ہے۔﴾

وضاحت:

اس روداد سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کو قسامہ کا واقعہ قرار دیا۔ لیکن قسامہ کی شکل یہ ہوتی ہے کہ کسی علاقے میں قتل ہو جائے اور قاتلوں کا سراغ نہ لگتا ہو تو وہاں کے سربر آوردہ لوگوں کو بلا کر ان سے قسم لی جاتی ہے کہ انہیں قاتلوں کا کوئی علم نہیں۔ روایت میں بیان کردہ پچاس قسموں کی بھی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ قسم کے بارے میں یہ قانون بھی ہے کہ البمین علی من انکر، قسم انکار کرنے والے پر ہے۔ مدعی سے قسم لینے کی کوئی وجہ نہیں۔ قسم کمزور کا ہتھیار ہے۔ مدعا علیہ کے پاس اگر کوئی دلیل نہیں تو اس سے قسم لی جا سکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ پوری تفصیل سے نقل نہیں ہوا۔ جس طرح نقل ہوا ہے اس سے بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس پر عمل نہیں۔ یہ نہیں بتایا کہ کیوں اس پر عمل نہیں۔ غالباً انہی وجوہ کی بناء پر جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں وہ اس کو ناقابل فہم پاتے ہوں۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ أَنَّ ابْنَ شِهَابٍ وَ سُلَيْمَانَ بْنَ يَسَارٍ وَ رَبِيعَةَ بْنَ أَبِي عَبْدِالرَّحْمٰنِ كَانُوا يَقُولُونَ دِيَةُ الْخَطَاءِ عِشْرُونَ بِنْتَ مَخَاضٍ وَ عِشْرُونَ بِنْتَ لَبُونٍ وَعِشْرُونَ ابْنَ لَبُونٍ ذَكَرًا وَ عِشْرُونَ حِقَّةً وَعِشْرُونَ جَذَعَةً۔

﴿مالک سے روایت ہے کہ ابن شہاب، سلیمان بن یسار اور ربیعہ بن ابی عبد الرحمٰن کہا کرتے تھے کہ قتل خطاء کی دیت بیس دو سالہ اونٹنیاں، بیس تین سالہ، بیس چار سالہ بالکل جوان اونٹ، بیس چار سالہ اور بیس پانچ سالہ اونٹنیاں ہیں۔﴾

وضاحت:

اس سے پہلے ابن شہاب کا یہ فتویٰ نقل ہوا ہے کہ دیت میں چار مختلف عمروں کے پچیس پچیس اونٹ دینے ہوں گے۔ یہ فقہاء حضرات کے فتوے ہیں، کوئی حدیث یا اثر نہیں جن کی کچھ اہمیت ہو۔

امام مالک کے فتوے :

امام مالک کہتے ہیں کہ متفق علیہ بات ہمارے ہاں یہ ہے کہ بچوں کے قتل کے معاملے میں قصاص نہیں ہو گا۔ اور ان کا عمداً قتل کرنا خطا ہی تصور ہو گا جب تک کہ ان کے اوپر حدود واجب نہ ہو جائیں اور وہ بلوغت کو نہ پہنچ جائیں۔ اور اگر کوئی بچہ قتل کر دے گا تو وہ خطا ہی شمار ہو گا اور اگر ایک بچہ اور ایک بڑا دونوں کسی آزاد شخص کو غلطی سے قتل کر دیں تو ہر ایک کی عاقلہ پر نصف دیت ہو گی۔

امام مالک کا یہ فتویٰ بچوں کی حد تک تو ٹھیک ہے کہ ان کا کوئی فعل عمداً نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایک بچہ اور ایک بڑا جب کسی آزاد کو قتل کر دیتے ہیں یعنی ان کے کسی فعل کے نتیجے میں قتل ہو جاتا ہے تو امام صاحب ہر ایک کی عاقلہ پر نصف دیت مقرر کرتے ہیں حالانکہ بچہ اگر وہاں معصوم ہے تو یہاں کیوں نہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔

امام مالک کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک متفق علیہ بات یہ ہے کہ غلطی سے اگر زخم لگ جائے تو اس کی دیت نہیں ہو گی جب تک کہ مجروح ٹھیک نہ ہو جائے۔ اگر کسی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو یا ہاتھ یا پاؤں ٹوٹ گیا ہو یا جسم پر کوئی اور چوٹ آئی ہو تو اگر وہ صحیح ہو جائے اور اپنی اصلی حالت پر لوٹ آئے تو اس میں دیت نہیں ہو گی۔ اور اگر کوئی نقص پیدا ہو گیا تو اس میں نقص کے حساب سے دیت ہو گی۔

امام مالک کہتے ہیں کہ اگر ہڈی ان ہڈیوں میں سے ہو جن کے بارے میں دیت نبی ﷺ نے معین فرمائی ہو تو اسی حساب سے لی جائے گی لیکن اگر اس بارے میں نبی ﷺ سے کوئی معین دیت مروی نہیں اور نہ اس بارے میں کوئی سنت ہے تو اس میں اجتہاد کیا جائے گا۔

اس میں سنت سے مراد صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کا عمل ہے۔ فقہا کے قول کو سنت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ اس صورت میں جب کوئی حکم سنت سے ثابت نہ ہو، اجتہاد کیا جائے گا۔

عَقْلُ الْمَرْاَةِ

عورت کی دیت

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِ ابْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّهُ كَانَ يَقُولُ تُعَاقِلُ الْمَرْاَةُ الرَّجُلَ اِلَى ثُلُثِ الدِّيَةِ اِصْبَعُهَا كَاِصْبَعِهِ وَسِنُّهَا كَسِنِّهِ وَ مُوضِحَتُهَا

كَمُوضِحَتِهِ وَ مُنَقِّلَتُهَا كَمُنَقِّلَتِهِ۔

□ و حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ وَ بَلَغَهُ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ أَنَّهُمَا كَانَا يَقُولَانِ مِثْلَ قَوْلِ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ فِي الْمَرْأَةِ أَنَّهَا تُعَاقِلُ الرَّجُلَ إِلَى ثُلُثِ دِيَةِ الرَّجُلِ فَإِذَا بَلَغَتْ ثُلُثَ دِيَةِ الرَّجُلِ كَانَتْ إِلَى النِّصْفِ مِنْ دِيَةِ الرَّجُلِ قَالَ مَالِكٌ وَ تَفْسِيرُ ذَلِكَ أَنَّهَا تُعَاقِلُهُ فِي الْمُوضِحَةِ وَالْمُنَقِّلَةِ وَ مَا دُونَ الْمَأْمُومَةِ وَالْجَائِفَةِ وَ أَشْبَاهِهِمَا مِمَّا يَكُونُ فِيهِ ثُلُثُ الدِّيَةِ فَصَاعِدًا فَإِذَا بَلَغَتْ ذَلِكَ كَانَ عَقْلُهَا فِي ذَلِكَ عَلَى النِّصْفِ مِنْ عَقْلِ الرَّجُلِ۔

﴿سعید بن مسیب فتویٰ دیتے تھے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر رہے گی ایک تہائی دیت تک کیونکہ اس کی انگلی مرد کی انگلی کی طرح، اس کے دانت مرد کے دانت کی طرح، کھلی ہوئی چوٹ مرد کی چوٹ کی طرح اور ہڈی اکھڑنا مرد کی ہڈی اکھڑنے کی طرح ہے۔

امام مالک ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں اور ان کو یہ بات عروہ بن زبیر سے بھی پہنچی کہ وہ دونوں سعید بن مسیب کے فتوے کی طرح ہی فتویٰ دیتے تھے۔ یعنی یہ کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر ہو گی ایک تہائی دیت تک اور جب اس کی دیت مرد کی ثلث دیت تک پہنچ جائے گی تو اس سے آگے عورت کی دیت مرد کی نصف دیت کے برابر ہو گی۔ امام مالک اس کی تفسیر کرتے ہیں کہ موضحہ اور منقلہ میں اور ماموںہ اور جائفہ سے کم نقصان کی صورت میں جب تک مرد کی ثلث دیت کے برابر تک دیت ہو گی تو اس میں عورت کی دیت مرد کے برابر ہی ہو گی لیکن ماموںہ اور جائفہ میں جب وہ اس حد کو عبور کر لیتی ہے تو عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف کر دی جائے گی۔﴾

وضاحت :

موضحہ، ایسا زخم جس سے ہڈی ننگی ہو جائے۔ منقلہ، سر کا زخم جس میں ہڈی کو نقصان ہو۔ ان چوٹوں کی دیت پانچ اونٹ ہے۔

ماموںہ ایسی چوٹ جس کا اثر دماغ تک پہنچ جائے۔ جائفہ ایسی چوٹ جس کا اثر پیٹ کے اندر تک چلا

جائے- ان چوٹوں کی دیت کل دیت کا ایک تہائی ہوتی ہے- سعید بن مسیب کے فتوئ کی بنیاد کسی مرفوع روایت پر نہیں- اگر یہ ان کا اجتہاد ہے تو کس بنیاد پر ہے، یہ واضح نہیں- عجیب بات یہ ہے کہ ایک ثلث تک تو عورت کی دیت مرد کے برابر قرار دیتے ہیں لیکن جب چوٹ زیادہ ہو تو دیت مرد سے نصف مقرر کرتے ہیں کیونکہ عورت کی دیت کو مرد کے نصف رکھنا ہے- اس میں چوٹ یا زخم کے بڑا ہونے کا کوئی لحاظ نہیں-

میرے نزدیک جب چند چھوٹے چھوٹے اعضاء میں عورت کی دیت مرد کے برابر ہے تو بڑے اعضاء میں بھی برابر ہونی چاہیے- نیز جب مرد اور عورت کے قصاص جانی میں کوئی فرق نہیں تو دیت میں فرق کیونکر ہو سکتا ہے- النفس بالنفس کا قانون اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے اور نبی ﷺ سے بھی کوئی قول اور فعل ایسا نہیں جو اس کی تبیین کرتا ہو- نبی ﷺ کا ارشاد تو ایک طرف، سعید بن مسیب کے فتوے کی بنیاد حضرات ابو بکر صدیقؓ، عمر بن خطابؓ اور علیؓ کے اثر پر بھی نہیں ہے- معلوم یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے عرب کے قدیم رواج پر فتوئ دے دیا جو پہلے سے چلا آ رہا تھا-

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ سَمِعَ ابْنَ شِهَابٍ يَقُولُ مَضَتِ السُّنَّةُ اَنَّ الرَّجُلَ إِذَا أَصَابَ امْرَاَتَهُ بِجُرْحٍ اَنَّ عَلَيْهِ عَقْلَ ذٰلِكَ الْجُرْحِ وَلَا يُقَادُ مِنْهُ-

امام مالکؒ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ابن شہاب کو فتوئ دیتے سنا کہ عمل اس پر ہے کہ شوہر اگر بیگم کی پٹائی کرتے ہوئے زخم لگا دے تو اس پر اس زخم کی دیت ہوگی، قصاص نہیں لیا جائے گا-

وضاحت :

حدیث میں یہ ہے کہ بیوی کو ایسی مار نہیں ماری جائے گی جو اپنا اثر چھوڑ دے تو اس پر دیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا- لیکن ابن شہاب نے قاعدہ ہی یہ بنا دیا کہ شوہر اگر بیوی کی ٹانگ توڑ دے، آنکھ پھوڑ دے یا اس طرح کی کوئی اور چوٹ لگا دے تو دیت دینا ہوگی-

عَقْلُ الْجَنِينِ

حمل کے بچے کی دیت

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ امْرَاَتَیْنِ مِنْ هُذَیْلٍ رَمَتْ اِحْدَاهُمَا الْاُخْرٰی فَطَرَحَتْ جَنِیْنَهَا فَقَضٰی فِیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِغُرَّةٍ عَبْدٍ اَوْ وَلِیْدَةٍ۔

﴿ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ ہذیل کی دو عورتوں نے ایک دوسرے کو پتھر مارا تو ایک نے اپنا جنین ڈال دیا (یعنی اس کا حمل ساقط ہو گیا) رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں ایک لونڈی یا غلام کی دیت کا فیصلہ کیا۔﴾

وضاحت :

مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پتھر مارنے والی عورت یا تو ایک لونڈی یا غلام دیت میں ادا کرے یا ان میں سے کسی کی قیمت لگا کر وہ ادا کرے۔ آپؐ نے جنین کو نفس پر ہی محمول کیا اور اس کی دیت ایک نفس غلام یا لونڈی مقرر فرمائی۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَضٰی فِی الْجَنِیْنِ یُقْتَلُ فِی بَطْنِ اُمِّهٖ بِغُرَّةٍ عَبْدٍ اَوْ وَلِیْدَةٍ فَقَالَ الَّذِی قُضِیَ عَلَیْهِ کَیْفَ اَغْرَمُ مَالَا شَرِبَ وَلَا اَکَلَ وَلَا نَطَقَ وَلَا اسْتَهَلَّ وَ مِثْلُ ذٰلِكَ بَطَلَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّمَا هٰذَا مِنْ اِخْوَانِ الْکُهَّانِ

﴿سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جنین کے بارے میں جو اپنی ماں کے پیٹ میں قتل ہو گیا ہو، ایک لونڈی یا غلام کا فیصلہ دیا۔ جس کے خلاف آپ نے فیصلہ کیا اس نے کہا کہ میں اس وجود کا کیسے تاوان ادا کروں جس نے نہ کھایا نہ پیا، نہ بولا نہ چیخا۔ اس طرح کے وجود کا معاملہ باطل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ کاہنوں کا بھائی معلوم ہوتا ہے۔﴾

وضاحت :

آنحضرت ﷺ نے اپنا فیصلہ برقرار رکھا اور اس کے اعتراض کو مناسب خیال نہیں کیا۔ اس زمانے میں لونڈی یا غلام تاوان میں دیے جاتے تھے۔ اب تقویم کا قاعدہ چلے گا۔ موجودہ حالات میں کچھ رقم ادا کی جائے گی۔

آدمی نے جو اعتراض کیا اس کی عبارت میں ہم قافیہ الفاظ استعمال کیے۔ کاہنوں کا کلام اسی طرح کا ہوتا تھا اس لیے حضور نے فرمایا کہ یہ شخص کاہنوں کا بھائی معلوم ہوتا ہے۔

❑ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ أَبِي عَبْدِالرَّحْمٰنِ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ الْغُرَّةُ تُقَوَّمُ بِخَمْسِينَ دِينَارًا أَوْ سِتِّمِائَةِ دِرْهَمٍ وَدِيَةُ الْمَرْأَةِ الْحُرَّةِ الْمُسْلِمَةِ خَمْسُمِائَةِ دِينَارٍ أَوْ سِتَّةُ آلَافِ دِرْهَمٍ۔

﴿امام مالکؒ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فتویٰ دیتے تھے کہ ایک نفر غلام کی قیمت لگائی جائے گی پچاس دینار یا چھ سو درہم اور ایک آزاد مسلمہ عورت کی دیت ہو گی پانچ سو دینار یا چھ ہزار درہم۔﴾

وضاحت :

یہ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن نے اپنے زمانے کے لحاظ سے تقویم کر دی ہے کہ اگر قیمت دینا ہو گی تو اتنے دینار یا درہم ادا کرنے ہوں گے۔

مَا فِيهِ الدِّيَةُ كَامِلًا

جس میں کامل دیت ہو گی

❑ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ فِي الشَّفَتَيْنِ الدِّيَةُ كَامِلَةً فَإِذَا قُطِعَتِ السُّفْلَى فَفِيهَا ثُلُثُ الدِّيَةِ۔

﴿ابن شہاب سعید بن میسب سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فتوے دیتے تھے کہ دونوں ہونٹوں کی دیت کامل ہو گی اور اگر نیچے کا ہونٹ کٹا ہے تو دیت ایک تہائی حصہ ہو گا۔﴾

وضاحت :

یہ بھی سعید بن میسب کا فتویٰ ہے۔ کوئی مرفوع حدیث نہیں ہے۔

مَاجَاءَ فِي عَقْلِ الْعَيْنِ اِذَا ذَهَبَ بَصَرُهَا

آنکھ کی دیت جب اس کی بینائی جاتی رہے

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ كَانَ يَقُولُ فِي الْعَيْنِ الْقَائِمَةِ اِذَا طُفِئَتْ مِائَةُ دِينَارٍ

﴿سلیمان بن یسار سے روایت ہے کہ زید بن ثابت فتویٰ دیتے تھے اس آنکھ کے بارے میں جو شکلا تو قائم ہو لیکن اس کا نور ختم کر دیا جائے کہ اس کی دیت ایک سو دینار ہو گی۔﴾

مَاجَاءَ فِي عَقْلِ الشِّجَاجِ

سر اور چہرہ پر زخم کی دیت کیا ہو گی

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّهُ قَالَ كُلُّ نَافِذَةٍ فِي عُضْوٍ مِنَ الْاَعْضَاءِ فَفِيهِ ثُلُثُ عَقْلِ ذٰلِكَ الْعُضْوِ

﴿سعید بن مسیب کا فتویٰ ہے کہ اگر اعضاء میں سے کسی عضو میں سوراخ ہو جائے تو اس عضو کی ایک تہائی دیت ہو گی۔﴾

وضاحت :

زخموں کے مختلف نام ہیں جن میں ہمارے لیے یہ متعین کرنا ہی مشکل ہے کہ زخم کی نوعیت اور مقدار کیا ہے۔اب ایسے تمام معاملات کسی ماہر ڈاکٹر کی نگرانی میں دیے جائیں گے۔ڈاکٹر ہی ان کو ناپے گا۔وہی دیکھے گا اور اس کی رپورٹ کے مطابق فیصلہ ہو گا۔وہی بتائے گا کہ اس میں صحیح طور پر جسمانی قصاص لینا ممکن ہے یا نہیں۔عدالت اس کی رپورٹ کی روشنی میں فیصلہ کرے گی۔

دیت کے معاملات کی بنیاد نبی ﷺ کا وہ نامہ ہے جو آپ نے ابن حزم کے نام لکھا۔اس کے سوا یہ سب چیزیں اجتہادی کی ہیں۔اصحاب علم اس میں فیصلہ کریں گے۔امام مالک بتاتے ہیں کہ اس بارے میں مدینہ کے اہل

علم کے درمیان کوئی امر طے شدہ نہیں ہے۔

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ أَبِي عَبْدِالرَّحْمٰنِ أَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ الزُّبَيْرِ أَقَادَ مِنَ الْمُنَقِّلَةِ۔

﴿امام مالک ربیعہ بن عبدالرحمٰن سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیرؓ نے منقلہ میں قصاص دلوایا۔﴾

وضاحت :

سر کی ہڈی کے اوپر جو کھال ہوتی ہے وہ اتر جائے تو اس زخم کو منقلہ کہتے ہیں۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے اس چوٹ پر قصاص دلوایا۔ مالکیہ کا فتویٰ یہ ہے کہ اس میں قصاص نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں کمی بیشی کا خطرہ ہے، عدل ممکن نہیں۔ اس لیے دیت ہوگی۔ میرے نزدیک اس صورت میں دیت ہی بہتر صورت ہے۔

مَاجَاءَ فِي عَقْلِ الْأَصَابِعِ

انگلیوں کی دیت کیا ہوگی

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ أَبِي عَبْدِالرَّحْمٰنِ أَنَّهُ قَالَ سَأَلْتُ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ كَمْ فِي إِصْبَعِ الْمَرْأَةِ فَقَالَ عَشْرٌ مِنَ الْإِبِلِ فَقُلْتُ كَمْ فِي إِصْبَعَيْنِ قَالَ عِشْرُونَ مِنَ الْإِبِلِ فَقُلْتُ كَمْ فِي ثَلَاثٍ فَقَالَ ثَلَاثُونَ مِنَ الْإِبِلِ فَقُلْتُ كَمْ فِي أَرْبَعٍ قَالَ عِشْرُونَ مِنَ الْإِبِلِ فَقُلْتُ حِينَ عَظُمَ جُرْحُهَا وَاشْتَدَّتْ مُصِيبَتُهَا نَقَصَ عَقْلُهَا فَقَالَ سَعِيدٌ أَعِرَاقِيٌّ أَنْتَ فَقُلْتُ بَلْ عَالِمٌ مُتَثَبِّتٌ أَوْ جَاهِلٌ مُتَعَلِّمٌ فَقَالَ سَعِيدٌ هِيَ السُّنَّةُ يَا ابْنَ أَخِي۔

﴿ربیعہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن مسیب سے پوچھا عورت کی انگلی کی دیت کیا ہے تو انہوں نے کہا دس اونٹ۔ دو انگلیوں کا پوچھا تو انہوں نے کہا کہ بیس اونٹ۔ تین انگلیوں کا پوچھا تو انہوں نے کہا تیس اونٹ۔ پھر چار انگلیوں کا پوچھا تو انہوں نے کہا کہ بیس اونٹ۔ میں نے کہا عجیب

بات ہے زخم بھاری، مصیبت بڑی اور دیت کم! تو سعید نے کہا تم عراقی معلوم ہوتے ہو- میں نے کہا آپ مجھے ایک عالم تحقیق کرنے والا فرض کرلیں یا ایک جاہل علم سیکھنے والا- تو سعید نے کہا میرے بھتیجے سنت یہی ہے-

وضاحت:

یہ سعید بن مسیب کا فتویٰ ہے- عراقی اس زمانے میں طنزیہ استعمال ہوتا تھا ان لوگوں کے لیے جو دین میں عقل کو دخل دیتے تھے- عراق فقہ حنفی کا مرکز تھا اور عقلیت کے لیے مشہور تھا- یہ اسی طرح کی بات ہے جس طرح اس زمانے میں کسی حدیث پر تنقید کریں تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ جہمی ہے، یعنی دین میں عقل کو دخل دیتا ہے-

تیس اونٹ تک عورت کی دیت مرد کے برابر ہے- لیکن جیسے ہی چالیس ہوئی مرد کی دیت سے آدھی رہ گئی اور بیس ہو گئی- اس پر ربیعہ نے کہا کہ حضرت یہ کیا کہ مصیبت زیادہ اور دیت کم ہو گئی- سعید سے جواب نہ بن پڑا اور عراقی ہونے کا طعنہ دیا تو ربیعہ نے کہا نہیں میں تو تحقیق کرنے والا عالم ہوں یا جاہل علم حاصل کرنے والا- یہ آپ کس اصول پر کہتے ہیں کہ عورت کی دیت ایک ثلث تک تو مرد کے برابر ہے، ثلث سے زیادہ ہو تو گرا دیں گے تاکہ عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف کے برابر رہ جائے-

معلوم ہوتا ہے کہ ربیعہ بن عبدالرحمٰن کا معارضہ درست تھا جس کا سعید کوئی معقول جواب نہ دے سکے- اور یہ کہا کہ سنت یہی ہے- حالانکہ یہ سنت تو نہیں بلکہ ان کا فتویٰ ہے اور ربیعہ نے اس کا مذاق اڑایا ہے-

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں احناف کے متعلق عقلیت کا اعتراف تھا- بعد میں اس نے طنز کی شکل اختیار کرلی اور احناف اس بارے میں متہم رہے کہ عقلی گدے لگاتے ہیں- بعض لوگوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ حدیث کی پروا نہیں کرتے- اصل بات یہ ہے کہ وہ عموم بلویٰ کے معاملات میں جن کا تعلق عام زندگی سے ہے وہ اخبار احاد کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور یہ کہتے ہیں کہ ایسے معاملات میں روایت بہت سے طریقوں سے ہونی چاہیے- اسی طرح مالکیہ بھی عمل اہل مدینہ کو اخبار احاد پر ترجیح دیتے ہیں- ان کا کہنا یہ ہے کہ مدینہ تمام علماء کا مرکز رہا ہے- علمائے مدینہ کا اگر ایک مسئلے پر اتفاق ہے تو اس کے مقابلے میں خبر واحد کی کیا حیثیت ہے- یہ دلیل بڑی قوی

ہے۔اگرچہ مالکیہ اور حنفیہ دونوں عقلیت کے مجرم ہیں، لیکن عقلیت کا الزام زیادہ احناف پر آیا کیونکہ ان کی فقہ کو خاص طریقے پر زیادہ فروغ حاصل ہوا۔

جَامِعُ عَقْلِ الْأَسْنَانِ

دانتوں کی دیت کے بارے میں جامع باب

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ مُسْلِمِ بْنِ جُنْدُبٍ عَنْ أَسْلَمَ مَوْلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَضَى فِي الضِّرْسِ بِجَمَلٍ وَ فِي التَّرْقُوَةِ بِجَمَلٍ وَ فِي الضِّلَعِ بِجَمَلٍ۔

﴿حضرت عمرؓ کے آزاد کردہ غلام اسلم روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے چوپڑ کے دانت کی دیت میں ایک اونٹ کا فیصلہ کیا۔ پچھلے دانت کا بھی ایک اونٹ اور پسلی کا بھی ایک اونٹ۔﴾

وضاحت :

یہ روایت حضرت عمرؓ کا اثر ہے۔ کسی فقیہ کا فتویٰ نہیں۔ فی زمانہ ایک اونٹ کی قیمت لگا کر دیت ادا کی جائے گی۔

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّهُ سَمِعَ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ يَقُولُ قَضَى عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فِي الْأَضْرَاسِ بِبَعِيرٍ وَ قَضَى مُعَاوِيَةُ بْنُ أَبِي سُفْيَانَ فِي الْأَضْرَاسِ بِخَمْسَةِ أَبْعِرَةٍ۔

﴿سعید بن مسیب بتاتے تھے کہ حضرت عمرؓ نے چوپڑ کے دانتوں کی دیت کے بارے میں ایک اونٹ کا فیصلہ کیا اور حضرت معاویہؓ نے انہی کے بارے میں پانچ اونٹ کا فیصلہ کیا۔﴾

وضاحت :

امام مالکؒ امیر معاویہؓ کے فتوے بھی نقل کرتے ہیں اور مروان بن حکم کے بھی۔ وہ ان لوگوں کو نظر انداز

نہیں کرتے بلکہ اہمیت دیتے ہیں۔ چونکہ دانتوں کی دیت نبی ﷺ نے متعین نہیں فرمائی اس لیے مقدمے کا فیصلہ وقت کے حالات کی رعایت سے کیا گیا ہو گا جس کے نتیجہ میں اختلاف واقع ہوا۔

اَلْعَمَلُ فِي عَقْلِ الْاَسْنَانِ
دانتوں کی دیت کے بارے میں عمل

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ دَاوُدَ بْنِ الْحُصَيْنِ عَنْ اَبِي غَطَفَانَ بْنِ طَرِيفٍ الْمُرِّيِّ اَنَّهُ اَخْبَرَهُ اَنَّ مَرْوَانَ بْنَ الْحَكَمِ بَعَثَهُ اِلَى عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ يَسْاَلُهُ مَاذَا فِي الضِّرْسِ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عَبَّاسٍ فِيهِ خَمْسٌ" مِنَ الْاِبِلِ قَالَ فَرَدَّنِي مَرْوَانُ اِلَى عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ فَقَالَ اَتَجْعَلُ مُقَدَّمَ الْفَمِ مِثْلَ الْاَضْرَاسِ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عَبَّاسٍ لَو لَمْ تَعْتَبِرْ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْاَصَابِعِ عَقْلُهَا سَوَاءٌ۔

﴿ابو غطفان بن طریف مری روایت کرتے ہیں کہ مروان بن حکم نے ان کو عبداللہ بن عباس کے پاس بھیجا تاکہ ان سے چوپڑ کے دانتوں کی دیت کے بارے میں پوچھے تو عبداللہ بن عباس نے کہا کہ ان میں پانچ اونٹ کی دیت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مروان نے مجھے پھر عبداللہ بن عباس کی طرف لوٹایا اور یہ پیغام دیا کہ کیا آپ منہ کے اگلے حصہ کو چوپڑ کے دانتوں کے برابر رکھتے ہیں تو عبداللہ بن عباس نے کہا کہ اگر آپ کو اس کا اعتبار نہیں تو انگلیوں پر قیاس کر لو کہ ان کی دیت بھی یہی ہے۔﴾

وضاحت :

حضرت ابن عباسؓ کی بات کا مفہوم یہ ہے کہ یہ تعین نہیں ہو سکتا کہ ایک دانت اور دوسرے دانت میں کیا فرق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دانت میں گوشت کی کمی ہو لیکن اس کا نکل جانا آپ کا چہرہ ہی بگاڑ دے لہذا مختلف دانتوں کی دیت یکساں ہے۔

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيهِ اَنَّهُ كَانَ يُسَوِّي بَيْنَ الْاَسْنَانِ

فِی الْعَقْلِ وَلَا یُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ.

ہشام بن عروہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ تمام دانتوں کو برابر ہی رکھتے تھے- ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتے تھے-

وضاحت :

یہی مذہب امام مالک کا بھی ہے- وہ سامنے کے دانتوں، داڑھوں اور چوڑے کے دانتوں کو یکساں اہمیت دیتے اور ان کی دیت برابر ٹھہراتے ہیں-

مَاجَاءَ فِی دِیَةِ جِرَاحِ الْعَبْدِ

غلاموں کے زخموں کی دیت

اس باب میں نہ کوئی مرفوع روایت ہے اور نہ خلفائے راشدین کا کوئی اثر- اب غلامی کا مسئلہ ختم ہو چکا اور ہم اس سے بری ہیں- غلاموں کے ساتھ مال اسباب کا سا معاملہ کرنا قرآن مجید کے بالکل خلاف ہے- قرآن غلاموں کو انسان مانتا ہے اور اسی بنا پر ان کے حقوق اور ذمہ داریاں ہیں لیکن لوگوں نے اس کا لحاظ نہیں کیا-

مَاجَاءَ فِی دِیَةِ أَهْلِ الذِّمَّةِ

ذمیوں کی دیت

☐ حَدَّثَنِی یَحْیَی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِیزِ قَضَی اَنَّ دِیَةَ الْیَهُودِیِّ اَوِ النَّصْرَانِیِّ اِذَا قُتِلَ اَحَدُهُمَا مِثْلُ نِصْفِ دِیَةِ الْحُرِّ الْمُسْلِمِ قَالَ مَالِكٌ اَلْاَمْرُ عِنْدَنَا اَنْ لَا یُقْتَلَ مُسْلِمٌ بِکَافِرٍ اِلَّا اَنْ یَقْتُلَهُ مُسْلِمٌ قَتْلَ غِیلَةٍ فَیُقْتَلُ بِهِ-

امام مالک کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فیصلہ کیا کہ یہودی یا نصرانی اگر قتل ہو جائے تو اس کی دیت آزاد مسلم کی دیت کے نصف کے برابر ہو گی- امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک فتویٰ یہ ہے کہ کوئی مسلم کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا الا یہ کہ

مسلمان نے اس کو دھوکہ دے کر قتل کیا ہو- تب وہ اس کے بدلے میں قتل ہو گا-﴾

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى ابْنِ سَعِيدٍ اَنَّ سُلَيْمَانَ بْنَ يَسَارٍ كَانَ يَقُولُ دِيَةُ الْمَجُوسِي ثَمَانَمِائَةِ دِرْهَمٍ قَالَ مَالِكٌ وَهُوَ الْأَمْرُ عِنْدَنَا-

﴿یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ سلیمان بن یسار فتویٰ دیتے تھے کہ مجوسی کی دیت 800 درہم ہے-امام مالک کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک بھی یہی فتویٰ ہے-﴾

وضاحت :

امام مالک نے جو کچھ نقل کیا ہے وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا اثر ہے- خلفائے راشدین میں سے کسی کا بھی عمل نہیں- مالکیہ کا یہی مذہب ہے لیکن احناف کے نزدیک ذمی اور مسلمان کی دیت برابر برابر ہی ہوگی- وہ النفس بالنفس کے قانون کی بناء پر ایسے کہتے ہیں- مالکیہ حضرات ان حکموں میں تخصیص مانتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ تخصیص کی نوعیت کیا ہے- کیا کوئی قول یا روایت قرآن مجید کے حکم کو کسی معین طبقہ کے لیے خاص کر سکتا ہے- احناف کے سامنے بھی یہ روایتیں تھیں تو وہ ان روایتوں کو مخصص ہونے کا درجہ کیوں نہیں دیتے-

نیز یہ بات بھی ہے کہ اہل ذمہ کے جان، مال اور ناموس کی حفاظت کی ذمہ داری حکومت کی ہے- جب اہل ذمہ کا آدمی قتل کردے تو وہ قصاص میں قتل ہوگا لیکن جب مسلمانوں کا آدمی کسی اہل ذمہ کو قتل کر دے تب اگر وہ قتل نہیں ہوگا تو اہل ذمہ کی حفاظت کی ذمہ داری تو پوری نہ ہوئی- اس لحاظ سے بھی مالکیہ کا نقطہ نظر صحیح نہیں ہے- اس زمانے میں رائج تصورات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو کسی جمہوریت میں اس کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ رعایا کے اندر فوجداری قوانین میں اس طرح کا فرق ہو کہ اقلیت کا آدمی قتل کرے گا تو قتل ہوگا لیکن اکثریت سے تعلق رکھنے والا قاتل ہوگا تو وہ قتل نہیں ہوگا- کوئی جمہوریت اس کو مان نہیں سکتی-

نیز یہ بات بین الاقوامی قانون کے بھی خلاف ہے- وہ ملک آج دنیا میں ملعون کر رہ جائے گا جس کے قانون میں ایسا امتیاز روا رکھا جائے گا- میرے نزدیک مالکیہ اور شوافع کا مذہب کمزور ہے- احناف کا مذہب مضبوط ہے- یہ مسئلہ بھی ان چیزوں میں سے ہے جنہوں نے احناف کے مذہب کو دوسرے مذاہب کے مقابلے میں تقویت دی ہے- حقیقت یہ ہے کہ اگر احناف میں لکیر کے فقیر فقہاء نہ پیدا ہو گئے ہوتے تو یہ مذہب زمانے کے قوانین کے مقابلے

میں بہت اعلیٰ سطح پر پیش کیا جا سکتا تھا۔

مَا يُوجِبُ الْعَقْلَ عَلَى الرَّجُلِ فِي خَاصَّةِ مَالِهِ

ایسی صورتیں جن میں آدمی کی دیت خاص اسی کے مال سے دی جائے گی

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيهِ اَنَّهُ كَانَ يَقُولُ لَيْسَ عَلَى الْعَاقِلَةِ عَقْلٌ فِي قَتْلِ الْعَمَدِ اِنَّمَا عَلَيْهِمْ عَقْلُ قَتْلِ الْخَطَاءِ۔

﴿ہشام بن عروہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ عاقلہ کے اوپر قتل عمد کے بارے میں دیت نہیں۔صرف قتل خطا میں عاقلہ پر دیت کی ذمہ داری ہے۔﴾

وضاحت:

"عاقلہ" سے مراد آدمی کے اہل عصبہ ہیں۔اہل عصبہ میں وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جن کو وراثت ملتی ہے۔دوسرے اعزہ و اقربا اس میں شامل نہیں۔حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں ایک دفتر قائم کیا تھا جس میں ہر آدمی کے عاقلہ میں جو لوگ شریک تھے ان کا اندراج ہو جاتا تھا تاکہ وقت پر کوئی ملزم بھاگ نہ سکے۔قبائلی نظام میں یہ ایک ناگزیر چیز تھی اس لیے کہ ان کے ہاں اکثر مار دھاڑ ہوتی رہتی تھی۔اس لیے انہوں نے خود ہی اپنی سہولت کے پیش نظر یہ نظام قائم کر لیا تھا۔ان کے ہاں عصبہ کا نظام تو خیر فطرت کا تقاضا تھا"ولاء"کا نظام بھی اتنا محکم تھا کہ اس میں بھی کبھی فرق نہیں آیا تھا۔ہمارے ہاں عاقلہ اور ولاء دونوں کا تصور نہیں ہے۔

امام مالکؒ نے ہشام کے والد کا فتویٰ نقل کیا ہے کہ عاقلہ کے اوپر اس قتل کی دیت نہیں ہو گی جو کسی نے جان بوجھ کر کیا ہو گا۔اس صورت میں مجرم کو قصاص میں قتل کیا جائے گا اور اگر مقتول کے وارثوں نے دیت لینی قبول کر لی ہے تو اس شکل میں دیت صرف مجرم کے مال سے دی جائے گی۔یہ بات عقل کے مطابق ہے۔ہاں اگر کسی شخص سے خطاً قتل ہو جاتا ہے اور وہ محتاج بھی ہے تو اس کی مدد کی جائے گی۔اعزہ و اقربا کا فرض ہے کہ اس کی مدد کریں۔یہ بات بھی عقل کے مطابق ہے۔امام صاحب نے اس فتویٰ کی تائید میں آگے ابن شہاب اور یحییٰ بن سعید کی رائے بھی نقل کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس بارے میں یہی سنت چلی آرہی ہے۔

امام مالکؒ کا فتویٰ یہ ہے کہ عاقلہ کے اوپر دیت اس وقت تک واجب نہیں ہو گی جب تک اس کی مقدار

ثلث یا اس سے زیادہ نہ ہو۔ اس سے کم مقدار میں عاقلہ کو تکلیف نہیں دی جائے گی بلکہ صرف جارح کے مال میں سے ہی دیت ادا کی جائے گی۔

یہ امام مالکؒ نے نیا نکتہ پیدا کیا ہے لیکن بات بالکل معقول ہے کہ دیت کا بوجھ اگر زیادہ ہو تب تو عاقلہ کو شریک ہونا چاہیے لیکن اگر تھوڑی سی دیت ہے تو دوسروں پر کیوں بوجھ ڈالا جائے۔

مَاجَاءَ فِي مِيرَاثِ الْعَقْلِ وَالتَّغْلِيظِ فِيهِ

دیت کی میراث اور اس میں سختی کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ نَشَدَ النَّاسَ بِمِنًى مَنْ كَانَ عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الدِّيَةِ أَنْ يُخْبِرَنِي فَقَامَ الضَّحَّاكُ بْنُ سُفْيَانَ الْكِلَابِيُّ فَقَالَ كَتَبَ إِلَيَّ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ أُوَرِّثَ امْرَأَةَ أَشْيَمَ الضِّبَابِيِّ مِنْ دِيَةِ زَوْجِهَا فَقَالَ لَهُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ ادْخُلِ الْخِبَاءَ حَتَّى آتِيَكَ فَلَمَّا نَزَلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ أَخْبَرَهُ الضَّحَّاكُ فَقَضَى بِذَلِكَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ وَكَانَ قَتْلُ أَشْيَمَ خَطَأً۔

﴿ابن شہاب راوی ہیں کہ عمر بن خطابؓ نے منیٰ میں لوگوں سے مطالبہ کیا کہ جس کے پاس دیت کے بارے میں کچھ علم ہو تو وہ مجھے خبر کرے۔ ضحاک بن سفیان کلابی کھڑے ہوئے اور کہا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے لکھا تھا کہ میں اشیم الضبابی کی بیوی کو اس کے شوہر کی دیت میں سے وارث بناؤں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ خیمہ میں چلو، میں آتا ہوں۔ جب حضرت عمرؓ آئے تو ضحاک نے ان کو اس واقعہ کی خبر دی تو حضرت عمرؓ نے اس کے مطابق فیصلہ کیا۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ اشیم کا قتل قتل خطا تھا﴾

وضاحت:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیت کی وراثت بیوی کو بھی پہنچے گی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو لوگ جائداد میں وارث ہوتے ہیں وہ دیت میں بھی وارث ہوں گے۔ یہ بات تو معقول ہے لیکن تحقیق کی ضرورت غالباً اس لیے پڑی ہوگی کہ معاملہ دیت کا تھا اور سوال یہ تھا کہ وراثت کے قانون ہی کے مطابق اس میں فیصلہ ہوگا یا اس میں کچھ

مختلف ہو گا۔ اشیم کا قتل قتل خطا تھا اس لیے اس کی دیت جو ملی تو اس میں حضرت عمرؓ نے سب ورثاء کو شریک کیا۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ" عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ اَنَّ رَجُلًا مِنْ بَنِي مُدْلِجٍ يُقَالُ لَهُ قَتَادَةُ حَذَفَ ابْنَهُ بِالسَّيْفِ فَاَصَابَ سَاقَهُ فَنُزِيَ فِي جُرْحِهِ فَمَاتَ فَقَدِمَ سُرَاقَةُ بْنُ جُعْشُمٍ عَلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ اعْدُدْ عَلَى مَاءِ قُدَيْدٍ عِشْرِيْنَ وَمِائَةَ بَعِيرٍ حَتّٰى اَقْدَمَ عَلَيْكَ فَلَمَّا قَدِمَ اِلَيْهِ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اَخَذَ مِنْ تِلْكَ الْاِبِلِ ثَلَاثِيْنَ حِقَّةً وَثَلَاثِيْنَ جَذَعَةً وَاَرْبَعِيْنَ خَلِفَةً ثُمَّ قَالَ اَيْنَ اَخُو الْمَقْتُولِ قَالَ هَا اَنَا ذَا قَالَ خُذْهَا فَاِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَيْسَ لِقَاتِلٍ شَيْءٌ"

﴿عمرو بن شعیب راوی ہیں کہ بنو مدلج کے ایک شخص نے، جس کا نام قتادہ تھا، تلوار پھینک ماری تو وہ اس کے بیٹے کو پنڈلی میں لگی جس سے اس کا خون بہہ گیا اور وہ مر گیا۔ سراقہ بن جعشم حضرت عمر بن خطابؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس واقعہ کا ذکر کیا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ جاؤ اور قدید کے چشمے پر ایک سو بیس اونٹ جمع کرو، میں آتا ہوں۔ حضرت عمرؓ آئے تو انہوں نے اونٹوں میں سے تیس حقہ، تیس جذعہ اور چالیس خلفہ لیے۔ پھر پوچھا کہ مقتول کا بھائی کہاں ہے۔ اس نے کہا میں حاضر ہوں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ یہ لے لو اس لیے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ قاتل کے لیے کچھ نہیں۔﴾

وضاحت:

"حقہ" وہ اونٹ جس کی عمر دو سال سے زیادہ لیکن تین سال سے کم ہو۔

"جذعہ" وہ اونٹ جس کی عمر تین سال اور چار سال کے درمیان ہو۔

"خلفہ" تین سال اور چار سال کے درمیان دودھ دینے والی اونٹنی کو کہتے ہیں۔

اس روایت میں یہ مسئلہ بتایا ہے کہ قاتل کو کچھ نہیں ملے گا اگرچہ وہ وراثت کے حقداروں میں سے ہو۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے مقتول کے بھائی کو وارث بنایا اور باپ چونکہ قاتل تھا، اس کو بالکل محروم کر دیا۔

حضرت عمرؓ نے اونٹ تو 120 جمع کرنے کا حکم دیا لیکن دیت میں 100 ہی دیئے۔ صرف خلفہ کی تعداد

بڑھادی- چونکہ قاتل نے باپ ہو کر حماقت کی تھی، اس لیے آپ نے خلفہ کی تعداد بڑھائی تاکہ سزا زیادہ سخت ہو- اسی طرح اگر حالت احرام میں یا شہر حرم میں قتل ہو تو اونٹوں کی صفات میں اضافہ کیا جا سکتا ہے- بشرطیکہ کل تعداد ایک سو ہی رہے-

❏ حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ وَسُلَيْمَانَ بْنَ يَسَارٍ سُئِلَا اَتُغَلَّظُ الدِّيَةُ فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ فَقَالَا لَا وَلٰكِنْ يُزَادُ فِيهَا لِلْحُرْمَةِ فَقِيلَ لِسَعِيدٍ هَلْ يُزَادُ فِي الْجِرَاحِ كَمَا يُزَادُ فِي النَّفْسِ فَقَالَ نَعَمْ قَالَ مَالِكٌ اَرَاهُمَا اَرَادَا مِثْلَ الَّذِي صَنَعَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فِي عَقْلِ الْمُدْلِجِيِّ حِينَ اَصَابَ ابْنَهُ-

﴿امام مالک کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ سعید بن میتب اور سلیمان بن یسار سے پوچھا گیا کہ کیا دیت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے، اگر جرم محترم مہینوں میں کیا گیا ہو- دونوں نے فتویٰ دیا کہ نہیں البتہ حرمت کی بناء پر اس میں اضافہ ہوگا- سعید سے کہا گیا کہ کیا زخموں کے بارے میں بھی یہ بات ہو سکتی ہے جیسا کہ نفس کے بارے میں ہے تو انہوں نے کہا ہاں- امام مالک کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ ان کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح حضرت عمرؓ نے اونٹوں کی صفات میں اس وقت اضافہ کیا تھا جب مدلجی نے اپنے بیٹے کو مار ڈالا تھا، اسی طرح کا اضافہ ہو سکتا ہے-﴾

وضاحت :

مدلجی کے بیٹے کے قتل کی دیت دلاتے وقت حضرت عمرؓ نے تعداد سو ہی رکھی تھی، صرف اونٹوں کی عمروں میں اضافہ کیا تھا اسی طرح محترم مہینوں کی حرمت کے لحاظ کرتے ہوئے اونٹوں کی صفات میں اضافہ ہو سکتا ہے- لیکن تعداد سو ہی رہے گی-

❏ حَدَّثَنِي مَالِكٌ" عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ اَنَّ رَجُلًا مِنَ الْاَنْصَارِ يُقَالُ لَهُ اُحَيْحَةُ بْنُ الْجُلَاحِ كَانَ لَهُ عَمٌّ" صَغِيرٌ" هُوَ اَصْغَرُ مِنْ اُحَيْحَةَ وَ كَانَ عِنْدَ اَخْوَالِهِ فَاَخَذَهُ اُحَيْحَةُ فَقَتَلَهُ فَقَالَ اَخْوَالُهُ كُنَّا اَهْلَ ثُمِّهِ وَرُمِّهِ حَتّٰى اِذَا اسْتَوٰى عَلٰى عُمَمِهِ غَلَبَنَا حَقُّ امْرِئٍ

فِی عَمِّهِ قَالَ عُرْوَةُ فَلِذٰلِکَ لَا یَرِثُ قَاتِلُ مَنْ قَتَلَ قَالَ مَالِکٌ الْاَمْرُ الَّذِی لَا اخْتِلَافَ فِیهِ عِنْدَنَا اَنَّ قَاتِلَ الْعَمْدِ لَا یَرِثُ مِنْ دِیَةِ مَنْ قَتَلَ شَیْئًا۔

﴿عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ ایک انصاری احیحہ بن جلاح کا ایک چچا اس سے عمر میں چھوٹا تھا- وہ اپنے ماموؤں کے پاس رہتا تھا- اس کو احیحہ نے پکڑا اور قتل کر دیا- اس کے ماموؤں نے کہا کہ اس کے پوتڑے دھونے اور پالنے پوسنے کے لیے ہم تھے اور جب وہ جوانی کو پہنچا تو چچاؤں میں آدمی کا حق ہم پر غالب آ گیا- عروہ کہتے ہیں کہ اسی لیے مقتول کا قاتل اس کی دیت کا وارث نہیں ہوتا- امام مالک کہتے ہیں کہ جس نے قتل عمد کیا اس کو دیت میں سے کچھ نہیں ملے گا- اس مسئلہ میں ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں-﴾

وضاحت :

دیت میں ماموں شریک نہیں ہوتے- جب مقتول کی دیت ملی ہو گی تو ماموؤں کو اس میں سے کچھ نہیں ملا ہو گا اس لیے انہوں نے کہا کہ دیکھ بھال تو ہم کرتے رہے اور دیت دوسرے یعنی اسکے چچا زاد بھائی لے گئے-

جَامِعُ الْعَقْلِ

دیت کے بارے میں جامع باب

☐ حَدَّثَنِی یَحْیَی عَنْ مَالِکٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِیدِ ابْنِ الْمُسَیَّبِ وَ اَبِی سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ جَرْحُ الْعَجْمَاءِ جُبَارٌ وَالْبِئْرُ جُبَارٌ وَالْمَعْدِنُ جُبَارٌ وَ فِی الرِّکَازِ الْخُمُسُ قَالَ مَالِکٌ وَ تَفْسِیرُ الْجُبَارِ اَنَّهُ لَا دِیَةَ فِیهِ وَ قَالَ مَالِکٌ الْقَائِدُ وَالسَّائِقُ وَالرَّاکِبُ کُلُّهُمْ ضَامِنُونَ لِمَا اَصَابَتِ الدَّابَّةُ اِلَّا اَنْ تَرْمَحَ الدَّابَّةُ مِنْ غَیْرِ اَنْ یُفْعَلَ بِهَا شَیْءٌ تَرْمَحُ لَهُ وَ قَدْ قَضَی عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فِی الَّذِی اَجْرَی فَرَسَهُ بِالْعَقْلِ قَالَ مَالِکٌ فَالْقَائِدُ وَالرَّاکِبُ وَالسَّائِقُ اَحْرَی اَنْ یَغْرَمُوا مِنَ الَّذِی اَجْرَی فَرَسَهُ۔

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جانوروں کا لگایا ہوا زخم ہدر ہے، کنویں میں گرنے کا نقصان ہدر ہے، کانوں میں پیش آنے والا حادثہ ہدر ہے اور کان سے نکلنے والی معدنیات کا پانچواں حصہ بیت المال کا ہوگا- مالک کہتے ہیں کہ ہدر کا مطلب یہ ہے کہ ان صورتوں میں دیت نہیں ہوگی- مالک کہتے ہیں کہ سواری کو چلانے والا، اس کو ہانکنے والا اور اس کا سوار سب کے سب اس نقصان کے ضامن ہوں گے جو ان کا جانور دوسرے کو پہنچائے گا، بجز اس صورت کے کہ جانور بدک جائے، بغیر کسی ایسے فعل کے جو بدکانے والا ہو- حضرت عمرؓ نے اس شخص سے دیت دلوائی جس نے اپنا گھوڑا دوڑا دیا تھا- امام مالک کہتے ہیں کہ جب گھوڑا دوڑانے والے کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا تو گاڑی چلانے والا اور سوار اور ڈرائیور تو بدرجہ اولی نقصان کے ذمہ دار ہوں گے-﴾

وضاحت :

آنحضرت ﷺ کا فرمانا تو یہ ہے کہ جانور کا لگایا ہوا زخم ہدر ہے، یعنی اس کی ذمہ داری کسی پر نہیں ہوگی کہ دیت ولائی جائے لیکن امام مالک کا فتویٰ بظاہر اس کے خلاف ہے- وہ کہتے ہیں کہ جانور کی سواری کرنے والا نقصان کا ضامن ہوگا اور اس کے لیے جیاد وہ حضرت عمرؓ کے اثر کو بتاتے ہیں کہ انہوں نے اس شخص سے دیت دلوائی جس نے اپنا گھوڑا دوسرے پر دوڑا کر اس کو زخمی کر دیا تھا- ہاں اگر جانور از خود بدک کر کسی کو نقصان پہنچا دے تو مالک پر دیت نہیں ہوگی جب تک کہ اس نے کوئی بدکانے والا کام نہ کیا ہو- میرے نزدیک نبی ﷺ کے فرمان کا مقصد یہ ہے کہ جب جانور اپنے مالک کے کنٹرول میں نہ ہو یا کنویں پر متنبہ کرنے والا کوئی نہ ہو یا کان کسی وقت بیٹھ جائے اور جانی نقصان ہو جائے تو ان صورتوں میں غیر حاضر مالکوں کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جائے گا- حضرت عمرؓ کا اثر اس صورت کے لیے ہے جب جانور پر کوئی شخص سوار ہو اور وہ اس پر قابو رکھتا ہو- آج کل مشینی سواری آگئی ہے جس کو ڈرائیور کنٹرول کر رہا ہوتا ہے- اس کو پابند کیا جانا ضروری ہے کہ ایسے ہی غیر ذمہ داری میں لوگوں کو روندتا نہ پھرے- کسی کی جان لینے سے بہتر ہے کہ گاڑی کو روک لے- اگر نہیں روکتا تو اس پر دیت کی ذمہ داری ہونی چاہیے- اس کی عاقلہ کا معاملہ البتہ غور طلب ہے-

مَاجَاءَ فِي الْغِيلَةِ وَالسِّحْرِ

دھوکے سے قتل کرنے اور جادو کرنے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَتَلَ نَفَرًا خَمْسَةً اَوْ سَبْعَةً بِرَجُلٍ وَاحِدٍقَتَلُوْهُ قَتْلَ غِيلَةٍ وَقَالَ عُمَرُ لَوْ تَمَالَأَ عَلَيْهِ اَهْلُ صَنْعَاءَ لَقَتَلْتُهُمْ جَمِيعًا-

﴿سعید بن میب سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک پوری پارٹی کے آدمیوں کو جو پانچ یا سات تھے، ایک شخص کے بدلے میں قتل کر دیا، اس لیے کہ انھوں نے دھوکہ سے اس کو قتل کیا تھا- حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر اس قتل میں صنعا کی پوری آبادی نے سازش کی ہوتی تو میں ان سب کو قتل کر دیتا-﴾

وضاحت:

دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قتل یمن کے شہر صنعاء میں ایک خاتون کے ایما پر ہوا تھا- اس میں کچھ لوگوں نے مقتول کو قتل کرنے کی سازش کی ہوگی، کسی نے دھوکہ سے مقتول کو کہیں بلایا ہوگا، کسی نے سواری مہیا کی ہوگی، کسی نے بہانے سے کچھ کھلایا پلایا ہوگا اور دوسروں نے قتل میں مدد کی ہوگی- حضرت عمرؓ نے تمام لوگوں کو دھر لیا اور یہ بھی فرمایا کہ اگر صنعاء کے تمام شہری اس سازش میں شریک ہوتے تو میں سب کو قتل کرنے سے دریغ نہ کرتا- اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی قتل کی سازش میں جتنے لوگ شریک ہوں گے وہ سب مجرم ہیں- صرف وہی شخص قصاص میں قتل نہیں ہوگا جس نے براہ راست قتل کیا، گلا گھونٹا، تلوار چلائی یا بندوق داغی بلکہ سازش کرنے والا پورا طائفہ مجرم گردانا جائے گا- یہ بات قانون اور عقل کے مطابق ہے-

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ سَعْدِبْنِ زُرَارَةَ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ

حَفْصَةَ زَوْجَ النَّبِیِّ ﷺ قَتَلَتْ جَارِيَةً لَهَا سَحَرَتْهَا وَ قَدْ كَانَتْ دَبَّرَتْهَا فَأَمَرَتْ بِهَا فَقُتِلَتْ قَالَ مَالِكٌ السَّاحِرُ الَّذِی یَعْمَلُ السِّحْرَ وَلَمْ یَعْمَلْ ذٰلِكَ لَهُ غَیْرُهُ هُوَ مَثَلُ الَّذِی قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی فِی كِتَابِهٖ: وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَالَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ. فَأَرٰی أَنْ یُقْتَلَ ذٰلِكَ إِذَا عَمِلَ ذٰلِكَ هُوَ نَفْسُهٗ۔

﴿محمد بن عبد الرحمٰن بن سعد بن زرارہ کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ نبی ﷺ کی زوجہ حضرت حفصہؓ نے ایک لونڈی کو جس نے ان پر جادو کیا تھا، حالانکہ انہوں نے اس لونڈی کو مدبر کر رکھا تھا، قتل کر دیا۔ انہوں نے حکم دیا تو وہ قتل کر دی گئی۔

امام مالک کہتے ہیں کہ ساحر وہ ہے جو خود سحر کا عمل کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی دوسرا اس کے لیے یہ کام کرے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا کہ "ان کو یہ علم تھا کہ جس نے اس کو (جادو کو) اختیار کیا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں"۔ امام مالک کہتے ہیں کہ میری رائے یہ ہے کہ جو کوئی خود یہ عمل کرے تو اس کو قتل کیا جائے گا۔﴾

وضاحت :

اس روایت میں ایک مشکل ہے۔ راوی صاحب یہ کہتے ہیں کہ حضرت حفصہؓ نے لونڈی کو قتل کر دیا یا ان کے حکم سے وہ قتل کر دی گئی۔ ظاہر ہے کہ حضرت حفصہؓ خود تو قتل نہیں کر سکتیں۔ انہوں نے قاضی یا حاکم کے آگے معاملہ پیش کیا ہو گا جس نے تحقیق کر کے قتل کا حکم دیا ہو گا۔ راوی صاحب نے واقعہ کو بیان کرنے میں معاملہ کی تفصیلات لپیٹ دی ہیں۔ میں نے بہت سی روایات دیکھی ہیں جن میں راوی حضرات اس طرح کی بے احتیاطی کر جاتے ہیں۔ ایسی روایات کو موقع کے لحاظ سے سمجھنا چاہیے۔

مدبر اس غلام یا لونڈی کو کہتے ہیں جس کو اس کا مالک یہ کہے کہ میرے مرنے کے بعد تم آزاد ہو گے۔ اس لونڈی نے سوچا ہو گا کہ معلوم نہیں مالکن کب تک زندہ رہے۔ اس نے حضرت حفصہؓ پر جادو کر دیا۔ معلوم یہ ہوتا

ہے کہ حضرت حفصہؓ کو اس جادو سے کچھ نقصان نہیں پہنچا لیکن اس کے باوجود معاملہ حاکم کے سپرد کر دیا جس نے اس لونڈی کو قتل کروادیا- ظاہر ہے اس نے مجرد حضرت حفصہؓ کے کہنے پر تو قتل کا حکم نہیں دیا ہوگا- قانون کے مطابق تحقیق کی ہوگی- بہر حال یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجرد کسی پر جادو کرنا موجب قتل ہے-

امام مالکؒ نے بقرہ کی آیت نمبر 102 نقل کر کے یہ استدلال کیا ہے کہ جو کوئی جادو کا عمل کرے وہ موجب قتل ہے- بہر حال یہ ان کی رائے یا ان کا فتویٰ ہے- آیت کے الفاظ میں یہ بات نہیں ہے۔

مَا يَجِبُ فِي الْعَمْدِ

قتل عمد کے بارے میں حکم

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عُمَرَ بْنِ حُسَيْنٍ مَوْلَى عَائِشَةَ بِنْتِ قُدَامَةَ اَنَّ عَبْدَالْمَلِكِ بْنَ مَرْوَانَ اَقَادَ وَلِيَّ رَجُلٍ مِنْ رَجُلٍ قَتَلَهُ بِعَصًا فَقَتَلَهُ وَلِيُّهُ بِعَصًا قَالَ مَالِكٌ وَالْاَمْرُ الْمُجْتَمَعُ عَلَيْهِ الَّذِي لَا اخْتِلَافَ فِيهِ عِنْدَنَا اَنَّ الرَّجُلَ اِذَا ضَرَبَ الرَّجُلَ بِعَصًا اَوْ رَمَاهُ بِحَجَرٍ اَوْ ضَرَبَهُ عَمْدًا فَمَاتَ مِنْ ذٰلِكَ فَاِنَّ ذٰلِكَ هُوَ الْعَمْدُ وَ فِيهِ الْقِصَاصُ قَالَ مَالِكٌ فَقَتْلُ الْعَمْدِ عِنْدَنَا اَنْ يَعْمِدَ الرَّجُلُ اِلَى الرَّجُلِ فَيَضْرِبُهُ حَتّٰى تَفِيضَ نَفْسُهُ وَ مِنَ الْعَمْدِ اَيْضًا اَنْ يَضْرِبَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِي النَّائِرَةِ تَكُونُ بَيْنَهُمَا ثُمَّ يَنْصَرِفُ عَنْهُ وَهُوَ حَيٌّ فَيُنْزَى فِي ضَرْبِهِ فَيَمُوتُ فَتَكُونُ فِي ذٰلِكَ الْقَسَامَةُ قَالَ مَالِكٌ الْاَمْرُ عِنْدَنَا اَنَّهُ يُقْتَلُ فِي الْعَمْدِ الرِّجَالُ الْاَحْرَارُ بِالرَّجُلِ الْحُرِّ الْوَاحِدِ وَالنِّسَاءُ بِالْمَرْاَةِ كَذٰلِكَ وَالْعَبِيدُ بِالْعَبِيدِ كَذٰلِكَ-

عمر بن حسین جو عائشہ بنت قدامہ کے آزاد کردہ غلام ہیں روایت کرتے ہیں کہ عبدالملک بن مروان نے ایک شخص کے ولی کو دوسرے شخص کے بدلے میں، جس کو اس نے لاٹھی سے قتل کر دیا تھا، قصاص دلوایا تو اس کے ولی نے اس شخص کو لاٹھی سے قتل کر دیا- امام مالک کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک

متفق بات یہ ہے، اور اس میں اہل مدینہ میں کوئی اختلاف نہیں، کہ اگر کوئی شخص دوسرے کو عمداً ڈنڈے سے مارے یا پتھر یا چوٹ لگائے اور وہ اس سے مر جائے تو وہ بھی قتل عمد ہی ہوگا اور اس میں قصاص ہوگا۔ امام مالک کا فتویٰ یہ بھی ہے کہ اگر ایک شخص دوسرے کو مارنے کا قصد کرے اور اتنا مارے کہ اس کی جان نکل جائے تو یہ بھی قتل عمد ہی ہوگا۔ قتل عمد کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ایک شخص دوسرے کو کسی ہنگامے میں جو ان دونوں کے درمیان ہو گیا پیٹے، پھر وہ لوٹ جائے جبکہ دوسرا شخص ابھی زندہ ہو، پھر اس کا خون اس کی مار کی وجہ سے بہہ جائے اور اس معاملہ میں قسامہ ہو۔ امام مالک کا فتویٰ یہ بھی ہے کہ قتل عمد میں ایک آزاد آدمی کے بدلے میں کئی آزاد آدمی اور ایک عورت کے بدلے میں کئی عورتیں قتل کیے جاسکتے ہیں۔ غلاموں کے بارے میں بھی یہی قانون ہوگا۔

وضاحت:

ایک شخص دوسرے کو تلوار سے قتل کردے یا لاٹھی کی ضرب سے ماردے یا اوپر سے نیچے گرا کر ماردے یہ سب قتل عمد ہی ہوگا۔ مالکیہ کا فتویٰ یہی ہے لیکن احناف کے نزدیک جب تک قتل کے لیے دھار دار آلہ استعمال نہ کیا جائے اس وقت تک اس کو قتل عمد نہیں کہتے۔ مثلاً دو فریقوں کی لڑائی میں اگر کسی نے لاٹھی ماری یا پتھر مار دیا تو وہ اس کو قتل عمد میں شامل نہیں کرتے۔ اس فتویٰ سے قصاص کی شکل بدل جاتی ہے۔ قتل عمد میں تو قصاص میں جان لی جاتی ہے اور اگر عمد نہ ہو تو اس میں دیت ہو سکتی ہے۔ نقطہ نظر کے اسی اختلاف کو اس روایت میں واضح کیا گیا ہے۔

میرے نزدیک احناف کا مسلک کمزور ہے کیونکہ قتل عمد میں اس بات کا تو لحاظ نہیں ہوتا کہ مارنے کا آلہ کیا ہے۔ بلکہ واقعہ کا ہوتا ہے۔ پیچھے ایک روایت گزر چکی ہے کہ باپ نے تلوار پھینک ماری اور وہ بیٹے کی پنڈلی میں لگی۔ اس کا سارا خون بہہ گیا اور وہ مر گیا، لیکن اس میں دیت ہی ہوئی۔ حالانکہ مارنے کا آلہ دھار دار تھا۔ احناف کے فتویٰ کے لحاظ سے یہ قتل عمد کا معاملہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن باپ بیٹے کا معاملہ ہونے کی وجہ سے اس کو قتل عمد قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ میرے نزدیک جس شکل میں بھی موت واقع ہو جائے، خواہ وہ پتھر یا ڈنڈے سے ہو یا کسی اور چیز سے یہ قتل

عمد ہی ہو گا- اس زمانے میں تو جوڈو کراٹے میں گرانے سے بھی موت واقع ہو سکتی ہے اور بعض شکلیں ایسی بھی ہیں کہ پتہ بھی نہ چلے اور ایک شخص دوسرے کو مسل کر مار دے- پھر آج کل بندوق، پستول اور کلاشنکوف بھی اس معنی میں دھار دار تو نہیں جن سے قتل پر احناف قتل عمد کا اطلاق کر سکیں- تو واضح بات یہی ہے کہ جس طریقے سے بھی قتل ہو قتل عمد ہی ہو گا الا یہ کہ واقعات اس کے خلاف ہوں-

اگر کسی جھگڑے میں مارپیٹ ہوئی، ہنگامی جوش اور دنگا فساد کی وجہ سے کوئی ایسا واقعہ ہو گیا کہ ایک شخص کو چوٹ لگی، وہ گھر واپس آیا تو خون بہہ گیا، طبی امداد نہ مل سکنے کے باعث مر گیا تو اس شکل میں کیا یہ قتل عمد ہو گا یا نہیں- امام مالک کہتے ہیں کہ اس میں قسامہ ہو گا- قسامہ یہ کہ اولیاء مقتول جن کو ملزم قرار دیں گے ان سے پچاس قسمیں لیں گے کہ یہ مقتول ان کی لاٹھی سے نہیں مرا اور اسی طرح اولیائے مقتول پچاس قسمیں کھائیں گے کہ مقتول ملزم لوگوں کے ہاتھوں مرا- اگر ایک فریق قسم کھانے سے انکار کر دے تو فیصلہ قسم کھانے والے فریق کے حق میں ہو گا-

قتل عمد میں ایک آزاد آدمی کے بدلے میں بہت سے قتل ہو سکتے ہیں- پیچھے حضرت عمرؓ کا اثر گزر چکا جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ اگر پوری بستی کے لوگ قتل کی سازش میں شریک ہوتے تو میں سب کو قصاص میں قتل کروا دیتا- ایک شخص کا قتل ان تمام لوگوں کو شامل کر لیتا ہے جو اس واردات میں ملوث پائے جائیں- یہ عدالت کا کام ہے کہ دیکھے کہ تلوث کس نوعیت کا ہے- عورتوں اور غلاموں کے بارے میں بھی یہی ہو گا-

اَلْقِصَاصُ فِی الْقَتْلِ
قتل کے قصاص کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ مَرْوَانَ ابْنَ الْحَكَمِ كَتَبَ اِلٰی مُعَاوِيَةَ بْنِ اَبِی سُفْيَانَ يَذْكُرُ اَنَّهُ اُتِیَ بِسَكْرَانَ قَدْ قَتَلَ رَجُلًا فَكَتَبَ اِلَيْهِ مُعَاوِيَةُ اَنِ اقْتُلْهُ بِهٖ

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی ہے کہ مروان بن حکم نے معاویہ بن ابی سفیانؓ کو لکھا کہ میرے پاس ایک شرابی کو لایا گیا ہے جس نے ایک شخص کو قتل کر دیا ہے۔ تو معاویہؓ نے ان کو جواب دیا کہ شرابی کو قصاص میں قتل کر دیں۔﴾

وضاحت :

یہ امام مالکؒ کی بلاغات میں سے ہے، کوئی مرفوع روایت نہیں۔ اس میں حضرت معاویہؓ کا وہ فیصلہ بیان ہوا ہے جو انہوں نے اپنے ایک عامل مروان بن حکم کے استفسار پر صادر کیا۔

کتاب القسامہ

قسامہ

قسامہ کا مطلب قسما قسمی ہے۔ جب ایک علاقے میں قتل ہو جائے اور قاتل کا پتہ نہ چل رہا ہو تو ظاہر ہے کہ قسما قسمی کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ علاقے کے لوگوں سے قسم لی جائے گی اور اس کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ اس کی کیا شکلیں ہیں، یہ آگے آرہا ہے۔

تَبدِئَةُ أهلِ الدَّمِ في القَسامَةِ

قسامہ کا آغاز مدعیوں سے کیا جائے گا

□ حدثني يحيى عن مالك عن ابن ابي ليلى بن عبدالله بن عبد الرحمن بن سهل عن سهل بن ابي حثمة انه اخبره رجال من كبراء قومه ان عبدالله بن سهل و محيصة خرجا الى خيبر من جهد اصابهم فأتي محيصة فأخبر ان عبدالله بن سهل قد قتل وطرح في فقير بئر او عين فأتى يهود فقال انتم والله قتلتموه فقالوا والله ما قتلناه فأقبل حتى قدم على قومه فذكر لهم ذلك ثم اقبل هو و اخوه حويصة وهو اكبر منه و عبد الرحمن فذهب محيصة ليتكلم وهو الذي كان بخيبر فقال له رسول الله ﷺ كبر كبر يريد السن فتكلم حويصة ثم تكلم محيصة فقال رسول الله ﷺ اما ان يدوا صاحبكم و اما ان يأذنوا بحرب فكتب اليهم رسول الله ﷺ في ذلك فكتبوا انا والله ما قتلناه فقال رسول الله ﷺ لحويصة و محيصة و عبدالرحمن اتحلفون وتستحقون دم صاحبكم فقالوا لا قال افتحلف لكم يهود قالوا ليسوا بمسلمين فوداه رسول الله ﷺ من عنده فبعث اليهم بمائة ناقة حتى ادخلت عليهم الدار قال سهل لقد ركضتني منها ناقة حمراء۔

سہل بن ابی حثمہ سے روایت ہے کہ ان کو ان کی قوم کے بعض بڑوں نے خبر دی کہ عبداللہ بن سہل

اور محیصہ اپنی کسی مشکل کی وجہ سے، جس میں مبتلا ہو گئے تھے، خیبر گئے- محیصہ کے پاس کسی نے آکر خبر دی کہ عبداللہ بن سہل قتل کر دیئے گئے ہیں اور ان کو ایک کنوئیں کی تہ میں یا ایک چشمے کے اندر ڈال دیا گیا ہے- وہ یہود کے پاس آئے اور کہا کہ خدا کی قسم، تم لوگوں نے اس کو قتل کیا ہے- انہوں نے کہا خدا کی قسم، ہم نے اس کو قتل نہیں کیا- محیصہ اپنی قوم کے پاس آئے اور ان سے اس کا ذکر کیا- پھر وہ، ان کے بھائی حویصہ جو ان سے عمر میں بڑے تھے اور عبدالرحمن مل کر گئے- محیصہ بات کرنے لگے اور وہی خیبر میں بھی تھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بڑے کو موقع دو، بڑے کو موقع دو- تو حویصہ نے بات شروع کی- پھر محیصہ نے بات کی- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اب دو ہی شکلیں ہیں- یا تو وہ تمہارے ساتھی کی دیت دیں یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جائیں- یہ بات یہود کی طرف رسول اللہ ﷺ نے لکھی تو انہوں نے جواب دیا کہ خدا کی قسم، ہم نے ان کو قتل نہیں کیا- تب آپ نے محیصہ، حویصہ اور عبدالرحمن سے فرمایا کہ آپ لوگ قسم کھانے کو تیار ہو تاکہ اپنے بھائی کے خون کے مستحق بن سکو- انہوں نے کہا کہ ہم قسم نہیں کھا سکتے- آپ نے فرمایا کہ اگر یہود قسم کھائیں تب- تو انہوں نے کہا کہ وہ تو مسلمان نہیں- تب رسول اللہ ﷺ نے اپنے پاس سے دیت دے دی اور ان کے پاس سو اونٹ بھیجے یہاں تک کہ وہ ان کے گھر میں داخل کر دیے گئے- سہل نے کہا کہ ان میں سے ایک سرخ اونٹنی نے ان کے پاؤں کو دبا دیا تھا-

☐ قَالَ يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ بُشَيْرِ بْنِ يَسَارٍ اَنَّهُ اَخْبَرَهُ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ ابْنَ سَهْلٍ الْاَنْصَارِيَّ وَ مُحَيِّصَةَ بْنَ مَسْعُوْدٍ خَرَجَا اِلٰى خَيْبَرَ فَتَفَرَّقَا فِي حَوَائِجِهِمَا فَقُتِلَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَهْلٍ فَقَدِمَ مُحَيِّصَةُ فَاَتٰى هُوَ وَ اَخُوْهُ حُوَيِّصَةُ وَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ ابْنُ سَهْلٍ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَذَهَبَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ لِيَتَكَلَّمَ لِمَكَانِهِ مِنْ اَخِيْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كَبِّرْ كَبِّرْ فَتَكَلَّمَ حُوَيِّصَةُ وَ مُحَيِّصَةُ فَذَكَرَا شَاْنَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَهْلٍ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَتَحْلِفُوْنَ خَمْسِيْنَ يَمِيْنًا وَ تَسْتَحِقُّوْنَ دَمَ صَاحِبِكُمْ اَوْ قَاتِلِكُمْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَمْ نَشْهَدْ وَلَمْ نَحْضُرْ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَتُبْرِئُكُمْ يَهُوْدُ بِخَمْسِيْنَ يَمِيْنًا فَقَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ

كَيفَ نَقبَلُ اَيمَانَ قَومٍ كُفَّارٍ قَالَ يَحيَى بنُ سَعِيدٍ فَزَعَمَ بُشَيرُ بنُ يَسَارٍ اَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ وَدَاهُ مِن عِندِهِ-

﴿بشیر بن یسار سے روایت ہے کہ عبداللہ بن سہل انصاری اور محیصہ بن مسعود خیبر کو گئے اور دونوں الگ ہو کر اپنے اپنے کاموں میں نکل گئے- عبداللہ بن سہل قتل کر دیے گئے تو محیصہ آئے- وہ، ان کا بھائی حویصہ اور عبدالرحمٰن بن سہل نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے- عبدالرحمٰن نے چاہا کہ اپنے بھائی کے تعلق سے وہ خود بات کریں لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بڑے کو موقع دو، بڑے کو موقع دو- اس پر حویصہ اور محیصہ نے بات کی اور عبداللہ بن سہل کا معاملہ پیش کیا- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم پچاس قسمیں کھاتے ہو تاکہ اپنے بھائی کے خون کی دیت لو یا اپنے قاتل کو لو- انھوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! ہم نے دیکھا نہیں، ہم موجود نہیں تھے- رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا تو پھر یہود پچاس قسمیں کھا کر تم کو سبکدوش کر دیں گے- انھوں نے کہا کہ کافر لوگوں کی قسم کا ہم کیا اعتبار کریں- یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ بشیر بن یسار کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے پاس سے ان کو دیت دی-﴾

وضاحت :

قسامہ میں یہ ہوتا ہے کہ پہلے مدعیوں سے قسم لی جائے گی حالانکہ عام طریقہ یہ ہے کہ البینة للمدعی والیمین لمن انکر یعنی مدعی کے اوپر ثبوت فراہم کرنے کی ذمہ داری ہوگی اور مدعا علیہ قسم کھا سکتا ہے- لیکن قسامہ میں الٹا معاملہ ہے- اس میں یہ چیز ہے کہ اگر مدعی قسم کھا کے کہیں کہ فلاں لوگوں نے قتل کیا ہے تب مقدمہ آگے چلتا ہے-

عبداللہ بن سہل کے قتل میں مدعیوں نے قسم کھانے سے انکار کیا کیونکہ وہ موقع پر موجود تو تھے نہیں کہ قسم کھائیں- انھوں نے یہود پر صرف شک کا اظہار کیا تھا- شک کے اوپر قسم نہیں کھائی جا سکتی- قسم تو قطعی بات پر کھائی جا سکتی ہے- اس پر آنحضرتؐ نے یہود کے متعلق کہا کہ اگر وہ قسم کھالیں تو قضیہ کا فیصلہ ہو جاتا ہے- لیکن مدعیوں نے اس کو نہیں مانا اور کہا کہ ہم کافروں کی قسم کیسے باور کریں- نتیجہ یہ ہوا کہ مقدمہ عدالت سے خارج ہو گیا اور قتل کی دیت سرکاری خزانے سے دلوا دی گئی-

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مدعی کے قسم کھا لینے سے بھی مقدمہ بن سکتا ہے- اس روایت

میں اس کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ مالکیہ کا مذہب تو یہی ہے جو ان روایات میں بیان ہوا۔ شوافع کے ہاں قدیم رائے یہی تھی لیکن پھر بدل گئی۔ ان کے ہاں قدیم اور جدید کا جھگڑا ہے۔ احناف کے متعلق زرقانی اور شاہ ولی اللہ نے کچھ نہیں لکھا۔ البتہ قاضی ابو یوسفؒ نے کتاب الآثار میں حضرت عمرؓ کا اثر نقل کیا ہے کہ ان کو یمن کے گورنر نے لکھا کہ یہاں ایک قتل ہو گیا ہے لیکن قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تو اس صورت میں کیا کیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ مقتول کی جگہ سے سب سے قریب جو آبادی ہے اس آبادی کے پچاس آدمیوں سے قسم لو۔ وہ برات کا کہیں تب بھی قسم کھائیں اور اگر اعتراف کریں تب بھی قسم کھائیں۔ اور اگر قسم نہ کھائیں تو پھر کسی پر الزام نہیں البتہ دیت کی ادائیگی کے وہ ضامن ہوں گے۔ یہ اس لیے کہ ان کے علاقے میں قتل ہوا ہے۔ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ منقول ہے۔

قسم کے متعلق یہ بات ہے کہ وہ صرف ذمے دار لوگوں سے ہی لی جائے گی اور ایک آدمی ایک قسم کھائے گا۔ اگر قریب کی آبادی میں پچاس سے کم آدمی ہوں تو جتنے ہوں ان کی قسم ہی کافی ہو گی۔

حضرت عمرؓ کا مسلک تورات کے موافق ہے اور اس کے متعلق شارحین لکھتے ہیں کہ یہی طریقہ جاہلیت میں رائج تھا۔ اسی پر آنحضرتؐ نے عمل کیا۔ اگر آنحضرتؐ نے جاہلیت کے کسی قانون پر عمل کیا تو وہ اسلام کا حصہ ہو گیا۔ آنحضرتؐ کا یہ معمول رہا کہ جس معاملے میں اسلام کا قانون نہیں آتا تھا تو اس میں آپؐ اہل کتاب کی پیروی کرتے۔ اہل کتاب کے ہاں یہ ہوتا تھا کہ قریب کی آبادی کے سرغنوں کو بلا کر ان سے قسم لی جاتی تھی اور یہ بات بھی تھی کہ قربانی کر کے اس کا خون مقتول پر چھڑک کر قسم لیتے تھے تاکہ قسم کو زیادہ مقدس کیا جائے لیکن قسم کا طریقہ یہی تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ طریقہ آنحضرتؐ کے زمانے میں رائج ہو چکا تھا تو حضرت عمرؓ نے اس کو کیوں اختیار نہ کیا۔ یہ اختلاف کوئی معمولی بات نہیں۔ میرے نزدیک انہوں نے اس کو اس لیے نہیں مانا کہ روایت میں بیان کردہ واقعہ میں آنحضرتؐ نے بیچ کے آدمی کے طور پر معاملہ رفع کر دیا اور مدعیان کو بیت المال سے دیت دلا دی۔ اس کو اسلامی قانون کا حصہ نہیں بنایا۔ حضرت عمرؓ نے یمن کی واردات میں خلیفہ راشد کی حیثیت سے تورات کا طریقہ جاری کیا۔ حضرت عمرؓ کے اسی اثر پر احناف کا مسلک یہ ہے کہ قریب کی آبادی والوں سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ قسم کھائیں کہ وہ نہیں جانتے یا جانتے ہیں۔ اگر وہ قسم کھا لیں تو قتل سے بری ہو جائیں گے لیکن دیت دینی پڑے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس علاقے میں قتل کا واقعہ ہو اس کی ذمہ داری علاقے کے لوگوں پر ہوتی ہے تاکہ ان میں یہ احساس ہو کہ اگر ایسا واقعہ ان کے علاقے میں ہوا تو سب اس کو بھگتیں گے۔ یہ ذمہ داری اس لیے بھی ضروری ہے کہ قتل اور ڈکیتی جیسے جرائم کا سدباب ہو سکے۔ احناف کا مذہب زیادہ معقول ہے۔

کتاب الجامع

الدُّعَا لِلْمَدِيْنَةِ وَ اَهْلِهَا

مدینہ اور اس کے لوگوں کے لیے دعا

□ حَدَّثَنِی مَالِكُ ابْنُ اَنَسٍ عَنْ اِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِی طَلْحَةَ الْاَنْصَارِی عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِی مِكْيَالِهِمْ وَبَارِكْ لَهُمْ فِی صَاعِهِمْ وَمُدِّهِمْ يَعْنِی اَهْلَ الْمَدِيْنَةِ.

﴿انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ برکت ڈال ان کے پیمانوں میں، ان کے صاع میں اور ان کے مُد میں۔ آپ کا اشارہ اہل مدینہ کی طرف تھا۔﴾

وضاحت:

مکیال، صاع اور مد وزن کرنے کے پیمانے ہیں۔ ان میں برکت ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں میں برکت ڈال دے جو ان پیمانوں سے ناپی جاتی یا وزن کی جاتی ہیں۔ یہ بات دوسری زبانوں میں بھی ہے کہ ظرف بول کر مظروف کو مراد لیتے ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ اس زمین میں برکت ڈال تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس زمین کی پیداوار میں برکت دے۔ نبی ﷺ نے بھی یہاں ظرف بول کر مظروف مراد لیا ہے۔ آگے والی روایت سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ایسی دعائیں تو ہم بھی کرتے ہیں، آنحضرت ﷺ تو تمام دنیا کے لیے رحمت و برکت تھے تو اس شہر کے لیے کیوں دعا نہ کرتے جو آپ کا دار الہجرت تھا۔

□ حَدَّثَنِی يَحْيٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ سُهَيْلِ بْنِ اَبِی صَالِحٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ اَنَّهٗ قَالَ كَانَ النَّاسُ اِذَا رَاَوْا اَوَّلَ الثَّمَرِ جَاؤُا بِهٖ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَاِذَا اَخَذَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِی ثَمَرِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِی مَدِيْنَتِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِی صَاعِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِی مُدِّنَا اَللّٰهُمَّ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ عَبْدُكَ وَ خَلِيْلُكَ وَ نَبِيُّكَ وَ اِنِّی عَبْدُكَ وَ نَبِيُّكَ وَ اِنَّهٗ دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَ اِنِّی اَدْعُوْكَ لِلْمَدِيْنَةِ بِمِثْلِ مَا دَعَاكَ بِهٖ لِمَكَّةَ وَ مِثْلَهٗ مَعَهٗ ثُمَّ يَدْعُوْ اَصْغَرَ وَلِيْدٍ يَرَاهُ فَيُعْطِيْهِ ذٰلِكَ الثَّمَرَ.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگوں کا حال یہ تھا کہ جب فصل کا پہلا پھل آتا تو

اس کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آتے۔ جب رسول اللہ ﷺ اس کو قبول کرتے تو دعا کرتے کہ اے رب ہمارے پھلوں میں برکت دے اور ہمارے شہر میں برکت دے اور ہمارے صاع میں اور مد میں برکت دے۔ اور اے اللہ! ابراہیم تیرے بندے، تیرے دوست اور تیرے نبی تھے اور میں بھی تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں۔ انہوں نے مکہ کے لیے دعا کی اور میں بھی ایسی ہی دعا مدینہ کے لیے کرتا ہوں جیسی انہوں نے مکہ کے لیے کی، اور اسی کی مانند اور بھی۔ یہ دعا کرنے کے بعد آپ وہ پھل سب سے چھوٹے بچے کو، جو سامنے ہوتا، دے دیتے۔ ☆

وضاحت:

موسم کا پہلا پھل بزرگوں کو پیش کرنا ہمیشہ سے روایت رہی ہے، البتہ اب ہم لوگ بخیل ہو گئے ہیں۔ پہلا پھل کسی بزرگ کے پاس لے جانا چاہیے اور ایسا کرنے کا نقصان نہیں ہوتا۔ دیکھیے آنحضرت ﷺ نے اس پر کتنی دعا فرمادی اور آنحضرتؐ کی دعا کوئی عام چیز تو نہیں، بڑی ہی برکت والی چیز ہے۔ اس دعا میں آنحضرتؐ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا جو حوالہ دیا ہے وہ ان کی وہ دعا ہے جس کا حوالہ قرآن مجید میں ان الفاظ میں آتا ہے فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ.

مدینہ کے لیے یہ دعا کرنا آپ کا حق تھا۔ یہیں پر آپ نے ہجرت کی تھی۔ بیشتر صحابہ یہیں رہ رہے تھے اور سب کو رزق اسی مرکز سے مل رہا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت ابراہیمؑ کے لیے خلیل اللہ کا لفظ استعمال کیا لیکن اپنے لیے نہیں کیا، اگرچہ آپ بھی خلیل اللہ تھے۔ ایسا آپ نے تواضع کی خاطر کیا۔ حضورؐ پہلا پھل چھوٹے بچے کو اس لیے دیتے کہ وہ معصوم ہے تو سب سے پہلے وہی اس کو چکھے۔

مَاجَاءَ فِی سُكْنَى الْمَدِینَةِ وَالْخُرُوْجِ مِنْهَا

مدینہ کی رہائش اور اس سے نکلنے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِی یَحْیَی عَنْ مَالِكٍ عَنْ قَطَنِ بْنِ وَهْبِ بْنِ عُمَیْرِ بْنِ الْاَجْدَعِ اَنَّ یُحَنَّسَ مَوْلَى

الزُّبَيْرِ بْنِ الْعَوَّامِ اَخْبَرَهُ اَنَّهُ كَانَ جَالِسًا عِنْدَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فِی الْفِتْنَةِ فَاَتَتْهُ مَوْلَاةٌ" لَهُ تُسَلِّمُ عَلَيْهِ فَقَالَتْ اِنِّی اَرَدْتُ الْخُرُوْجَ يَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اشْتَدَّ عَلَيْنَا الزَّمَانُ فَقَالَ لَهَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ اقْعُدِیْ لَكَعُ فَاِنِّی سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ لَا يَصْبِرُ عَلٰی لَاْوَائِهَا وَشِدَّتِهَا اِحَدٌ" اِلَّا كُنْتُ لَهُ شَفِيْعًا اَوْ شَهِيْدًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

﴿قطن بن وھب سے روایت ہے کہ ان کو یحنّس نے، جو زبیر بن عوام کے آزاد کردہ غلام تھے، خبر دی کہ جب مدینہ کے فتنہ کے زمانہ میں وہ عبداللہ بن عمرؓ کے پاس بیٹھے تھے تو ان کی آزاد کردہ لونڈی سلام کرنے آئی اور اس نے کہا کہ اے ابو عبدالرحمٰن، میں نے یہاں سے نکل جانے کا ارادہ کیا ہے، ہمارے اوپر زمانہ بہت سخت ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ نے اس سے کہا کہ اے بھولی بھالی عورت! بیٹھی رہ۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، آپ فرماتے تھے کہ اس شہر کی شدت پر اور اس کے مصائب پر جو صبر کرے گا تو میں اس کے لیے قیامت کے دن شفیع یا شہید ہوں گا۔﴾

وضاحت:

فتنہ سے مراد غالباً وہ دور ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے زمانے میں مکہ اور مدینہ میں خوراک وغیرہ کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

لونڈی کے الفاظ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا گزارہ مشکل ہو گیا ہوگا۔ شاید آزاد کردہ لونڈی ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ لکع یا لکاع سے مراد بے وقوف، بد ھو، بھولی بھالی ہے۔

شفیعا اور شہیدا سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راوی کو شک ہے کہ آنحضرتؐ نے ان میں سے کون سا لفظ استعمال کیا لیکن محدثین حضرات کہتے ہیں کہ اس روایت کی سند بہت مضبوط ہے، اس لیے شک کی گنجائش نہیں، لہذا دونوں الفاظ کو سامنے رکھ کر ان کی توجیہ کرنی پڑے گی۔

قرآن مجید میں جس شفاعت اور شہادت کا ذکر ہے یہ اسی کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں سورہ مائدہ 109 میں ہے یَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَا اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ. (جس دن اللہ رسولوں کو جمع کرے گا اور ان سے پوچھے گا کہ آپ کو کیا جواب دیا گیا تو وہ کہیں گے ہم کو کیا علم۔ تو غیب

کا جاننے والا ہے)۔

اس گواہی میں انبیاء علیہم السلام اپنی زندگی کے دوران اپنی تعلیمات اور لوگوں کے رویہ کی شہادت دیں گے جب کہ بعد والوں کے بارے میں وہ صاف کہہ دیں گے کہ بعد میں انہوں نے کیا کیا، ہمیں اس کی خبر نہیں۔ اسی موقع پر انبیاء کی شفاعت کی نوعیت بھی بیان کر دی گئی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے بیان ہوا ہے کہ وہ اپنی امت کی شفاعت ان الفاظ میں کریں گے: اے اللہ! اگر آپ ان کو عذاب دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر ان کو بخش دیں تو آپ عزیز و حکیم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ معاملہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ خدا کے سپرد کر دیں گے۔ ایسی ہی شفاعت نبی ﷺ اپنی امت کے لیے کریں گے۔

میرے نزدیک آنحضرتؐ کے شفیع اور شہید ہونے کی توجیہ یہ ہو گی کہ اہل مدینہ میں سے جن لوگوں کی بڑی بڑی خدمات رہی ہوں گی، جنہوں نے سر فروشی سے ساتھ دیا ہو گا ان کے لیے حضور شفاعت اور شہادت دیں گے، مثلاً احد کے شہداء کے متعلق آپ نے فرمایا کہ میں ان کے حق میں قیامت میں شہادت دوں گا۔

❐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ اَنَّ اَعْرَابِيًّا بَايَعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى الْاِسْلَامِ فَاَصَابَ الْاَعْرَابِيَّ وَعْكٌ بِالْمَدِينَةِ فَاَتَى رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَقِلْنِي بَيْعَتِي فَاَبَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثُمَّ جَاءَهُ فَقَالَ اَقِلْنِي بَيْعَتِي فَاَبَى ثُمَّ جَاءَهُ فَقَالَ اَقِلْنِي بَيْعَتِي فَاَبَى فَخَرَجَ الْاَعْرَابِيُّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّمَا الْمَدِينَةُ كَالْكِيْرِ تَنْفِي خَبَثَهَا وَيَنْصَعُ طِيْبُهَا.

﴿جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ایک بدو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس نے اسلام پر آپ سے بیعت کی۔ بدو کو مدینے میں وبائی بخار نے پکڑ لیا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میری بیعت فسخ کر دیجیے۔ آپ نے انکار کر دیا۔ پھر آیا اور بیعت فسخ کرنے کو کہا۔ آپ نے پھر انکار کر دیا۔ پھر آیا اور درخواست کی کہ میری بیعت فسخ کر دیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے پھر انکار کر دیا۔ پھر وہ خود ہی مدینے سے چلا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مدینے کی مثال بھٹی کی ہے جو کھوٹ کو دور کر دیتی اور خالص کو باقی رکھتی ہے۔﴾

وضاحت :

اس بدو نے بیعت صرف اسلام پر کی تھی۔ مدینے میں جب اس کو بخار آگیا تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ جناب میری بیعت فسخ کر دیں۔ بیعت فسخ کرنے سے جو اس کا مطلب تھا وہ حضور ﷺ نے سمجھ لیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اسلام سے دستبردار ہوا بلکہ وہ مدینہ سے جانا چاہتا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ بیعت کا مطلب یہ ہے کہ وہ لازماً مدینہ میں ہی رہے۔ چونکہ اس کی ہجرت ہو گئی تھی، اس کے بعد اس کے لیے مدینہ کو چھوڑنا ٹھیک نہیں تھا۔ مہاجرین کسی اشد ضرورت کے تحت تو مدینہ سے نکل سکتے تھے لیکن بغیر ضرورت کے نہیں جا سکتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد لوگوں کو آزادی تھی کہ چھوڑنا چاہیں تو مدینہ چھوڑ دیں۔ اس سے قبل ہجرت کرنے کے بعد ضروری تھا کہ لوگ آنحضرتؐ کے ساتھ مدینے میں رہیں، برکت حاصل کریں اور جہاد میں اور دوسری مہمات میں شریک ہوں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ مہاجرین کے حق میں دعا کیا کرتے کہ اے اللہ تو میرے صحابہ کی ہجرت کو مکمل کر۔ عملاً ہجرت کے بعد اگر کوئی واپس لوٹ جاتا تو اس کو برگشتہ ہی سمجھا جاتا تھا۔ بدو کے چلے جانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مدینہ ایک بھٹی ہے کہ اگر اس کے اندر لوہا ڈالا جائے تو لوہے کا سارا کھوٹ دور کر دیتی ہے۔ صرف خالص بچ رہتا ہے۔ اس زمانے میں مدینے کا قیام بہت پر آزمائش تھا۔ تمام لوگ ہجرت کر کے آ رہے تھے جب کہ ذرائع و وسائل محدود تھے۔ فتوحات کا ابھی آغاز نہیں ہوا تھا۔ دشمنوں کی نظر بھی مدینے پر تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر مسلمان یہاں جمع ہو کر اپنی جڑیں جمانے میں کامیاب ہو گئے تو بہت بڑا خطرہ ہے۔ پھر یہ بھی تھا کہ نئے آنے والوں کو مدینہ کی آب و ہوا بھی راس نہیں آتی تھی۔ اکثر وبائی امراض کا شکار ہو جاتے۔ اس لیے آپ نے مدینہ کو بھٹی سے تشبیہ دی اور فرمایا کہ اس میں وہی رہیں گے جو خالص ہیں۔ آگے اور روایات بھی آئیں گی کہ جن لوگوں نے مدینے سے جانے کی اجازت چاہی ان کو روکا گیا تاکہ ہجرت کا اصل منشا پورا ہو اور یہ بات بھی مد نظر تھی کہ اس کسوٹی پر وہ لوگ پرکھ لیے جائیں جو خالص ہیں۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا الْحُبَابِ سَعِيدَ بْنَ يَسَارٍ يَقُولُ سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ أُمِرْتُ بِقَرْيَةٍ تَأْكُلُ الْقُرَى يَقُولُونَ يَثْرِبُ وَهِيَ الْمَدِينَةُ تَنْفِي النَّاسَ كَمَا يَنْفِي الْكِيرُ خَبَثَ الْحَدِيدِ.

﴿ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ مجھے ایسے قریہ کی طرف

ہجرت کا حکم ہوا جو تمام دوسرے قریوں کو ہڑپ کر جائے گا۔ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں لیکن ہے وہ مدینہ، جو لوگوں کے کھوٹ کو اس طرح دور کردے گا جس طرح بھٹی لوہے سے کھوٹ کو دور کر دیتی ہے۔﴾

وضاحت:

ہجرت کا دور، جیسا کہ اوپر والی روایت میں ہے، امتحان کا دور تھا۔ اس دور میں مدینہ کو قریوں یعنی آبادیوں کو ہڑپ کرنے والا کہا گیا ہے کیونکہ جب وہ ہجرت کا مرکز بن گیا تو لوگ کھنچ کھنچ کر اس کی طرف آنے لگے۔ پھر جب فتوحات کا آغاز ہوا تو مسلمانوں نے ملکوں کو فتح کر لیا۔ مدینہ کے دارالسلطنت بننے پر اس کے اندر بڑی کشش پیدا ہو گئی۔ جب کوئی شہر دارالحکومت بن جائے تو لوگ وہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ قریوں کو ہڑپ کرنے میں یہ مفہوم بھی مدنظر ہے۔ دورِ جاہلیت میں مدینہ کا نام یثرب تھا۔ اس کا مطلب الزام ہے۔ آنحضرتؐ نے اس کو مدینہ سے موسوم کر دیا۔ جن ناموں میں معنی و مفہوم کی خرابی کی کوئی جھلک ہوتی تھی، حضور ان کو بدل کر ایسے نئے نام رکھ دیا کرتے تھے جن میں قباحت کا پہلو نہ ہوتا۔ یثرب کا نام بھی اسی لیے بدلا گیا۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا يَخْرُجُ أَحَدٌ مِنَ الْمَدِينَةِ رَغْبَةً عَنْهَا إِلَّا أَبْدَلَهَا اللَّهُ خَيْرًا مِنْهُ.

﴿ہشام بن عروہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مدینہ سے بے زار ہو کر اسے کوئی نہیں چھوڑے گا مگر یہ کہ اللہ اس شہر کو اس سے بہتر باسی دے دے گا۔﴾

وضاحت:

مدینہ ایسی بابرکت جگہ ہے کہ اگر کوئی شخص بغیر کسی اہم سبب کے اس کو چھوڑے تو یہ اس کی نالائقی ہے۔ ایسی بابرکت جگہ کے لیے تو لوگ ٹوٹ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول اللہ کا دارالہجرت بننے کے بعد مدینہ ایک ایسا مرکز تھا کہ جو تمام مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ تھا۔ وہاں ایک ایک شخص کی موجودگی بے حد اہم تھی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ کسی کے یہاں سے چلے جانے سے مدینہ کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ مدینہ کو اس سے بہتر لوگ مل جائیں گے۔ یہ سنتِ الٰہی ہے کہ بہتر آدمی کا ساتھ جو لوگ چھوڑتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس آدمی کو ان کا نعم البدل بھی

عطا فرمادیتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف حضورؐ نے توجہ دلائی۔

□ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الزُّبَیْرِ عَنْ سُفْیَانَ بْنِ اَبِی زُهَیْرٍ اَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ یُفْتَحُ الْیَمَنُ فَیَاْتِی قَوْمٌ یَبُسُّوْنَ فَیَتَحَمَّلُوْنَ بِاَهْلِیْهِمْ وَ مَنْ اَطَاعَهُمْ وَالْمَدِیْنَةُ خَیْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ وَ یُفْتَحُ الشَّامُ فَیَاْتِی قَوْمٌ یَبُسُّوْنَ فَیَتَحَمَّلُوْنَ بِاَهْلِیْهِمْ وَ مَنْ اَطَاعَهُمْ وَالْمَدِیْنَةُ خَیْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ وَ یُفْتَحُ الْعِرَاقُ فَیَاْتِی قَوْمٌ یَبُسُّوْنَ فَیَتَحَمَّلُوْنَ بِاَهْلِیْهِمْ وَمَنْ اَطَاعَهُمْ وَالْمَدِیْنَةُ خَیْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ.

﴿سفیان بن ابی زہیر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپؐ فرماتے تھے کہ یمن فتح ہو گا اور کچھ لوگ آئیں گے اپنے اونٹوں کو ہنکاتے ہوئے اور لاد کر لے جائیں گے ان پر اپنے اہل و عیال کو اور ان کو، جو ان کا ساتھ دیں گے، حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر جگہ ہے اگر وہ جانتے۔ شام فتح ہو گا اور لوگ اپنی سواریوں کو لیے ہوئے آئیں گے اور اپنے اہل و عیال کو اور ان کو، جو ان کے ماننے والے ہوں گے، ان پر لاد کر چل دیں گے حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر ہو گا اگر وہ اس کی قدر و قیمت جانیں۔ عراق فتح ہو گا اور لوگ اپنی سواریوں پر اپنے اہل و عیال کو اور ان لوگوں کو، جو ان کے ماننے والے ہوں گے، لاد کر چل دیں گے حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر ہے اگر وہ جانیں۔﴾

وضاحت:

یہ مدینہ منورہ کی فضیلت ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا دارالہجرت بنا اور مسلمانوں کو اس شہر کی طرف ہجرت کا حکم ہوا۔ چنانچہ ہر طرف سے مسلمان کھنچے ہوئے اس کی طرف آئے اور اس شہر نے سب کو جمع کر لیا۔ لیکن جب فتوحات کا دور آیا تو فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں پر مدینہ کی طرف ہجرت کی پابندی ختم ہو گئی۔ لہٰذا اب ان کے لیے ممکن ہو گیا کہ اگر وہ چاہیں تو یمن، شام اور عراق کے بہت زرخیز اور سرسبز علاقوں میں جا بسیں۔ اسی بارے میں آنحضرتؐ نے پیشگوئی فرمائی کہ یمن فتح ہو گا تو فاتحین میں سے کچھ لوگ وہاں کی آب و ہوا اور زرخیزی کو دیکھ کر

کہیں گے کہ وہاں چلو۔ اپنے اونٹ لائیں گے اور ان لوگوں کو جو ان کی بات مانیں گے ساتھ لے کر چل دیں گے حالانکہ بہتر یہ ہے کہ وہ مدینہ ہی میں رہیں کیونکہ مدینہ اپنی خیر و برکت کی وجہ سے بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ دنیوی وسائل و ذرائع کی فکر میں اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ شام اور عراق فتح ہوں گے تو کچھ لوگ اسی طرح اپنی سواریوں پر اپنے اہل و عیال اور اپنے ہم خیال لوگوں کو لاد کر وہاں چلے جائیں گے، حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر ہوگا۔ یہ گویا حضورؐ نے پیشگوئی فرمائی کہ مدینہ کو ایک دفعہ تو اتنی رونق ملے گی کہ تمام شہروں کو جمع کرے گا اور مرکزی حیثیت اختیار کرے گا لیکن فتوحات کے بعد اس کا زوال شروع ہوگا کیونکہ اس کی آبادی تقسیم ہونا شروع ہو جائے گی۔ اس کے باوجود یہی شہر بہترین شہر ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شہر علم دین کا اور صحابہ کرام کا مرکز اور تمام خیر و برکت کا منبع ہوگا۔ آنحضرتؐ کی یہ پیشگوئی پوری ہوئی اور عراق، شام اور مصر فتح ہوئے تو دارالحکومت تک بھی پہلے کوفہ اور پھر دمشق کو منتقل ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ دارالحکومت بہت سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا کرتا ہے۔ اس لیے مدینہ منورہ سے آبادی کا انخلا کافی تعداد میں ہوا۔

□ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ حِمَاسٍ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَتُتْرَكَنَّ الْمَدِیْنَةُ عَلٰی اَحْسَنِ مَا كَانَتْ حَتّٰی یَدْخُلَ الْكَلْبُ اَوِ الذِّئْبُ فَیُغَذِّی عَلٰی بَعْضِ سَوَارِی الْمَسْجِدِ اَوْ عَلَی الْمِنْبَرِ فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَلِمَنْ تَكُوْنُ الثِّمَارُ ذٰلِكَ الزَّمَانَ قَالَ لِلْعَوَافِی الطَّیْرِ وَالسِّبَاعِ۔

﴿حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مدینہ کو چھوڑا جائے گا جبکہ اس کے شباب کا دور ہوگا۔ پھر یہ حالت ہو جائے گی کہ کتے یا بھیڑیے اس میں داخل ہو کر مسجد کے بعض ستونوں پر یا منبر پر پیشاب کریں گے۔ لوگوں نے پوچھا کہ اس زمانے میں مدینے کے پھل کون کھائے گا تو آپؐ نے فرمایا کہ آوارہ پرندے اور درندے۔﴾

وضاحت:

اس روایت کے متعلق اختلاف ہے کہ یہ پیشگوئی ہے جو قیامت کے قریب ظاہر ہوگی یا یہ ایک واقعہ ہے جو قریب ہی میں گزر چکا۔ اوپر والی روایت میں تو یہ ہے کہ جب فتوحات کا دور ہوگا اس وقت مدینہ کی جمعیت میں

انتشار پیدا ہو گا اور لوگ وہاں سے چلے جائیں گے۔ فی الواقع سب سے زیادہ انتشار اس وقت ہوا جب دارالحکومت کوفہ اور پھر دمشق کو منتقل ہو گیا۔ تمام کشش وہاں پیدا ہو گئی۔ جتنے لوگ جا سکتے تھے وہاں چلے گئے۔ نیز بہت سے لوگوں کو حاکموں نے بلا لیا۔ لہٰذا مرکزیت رکھنے والے تمام لوگ وہاں سے چلے گئے۔ مدینہ میں صرف امام مالکؒ کی قد آور شخصیت رہ گئی۔ ان کے اندر مدینہ کی خاص عصبیت موجود ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ روایت میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ مستقبل قریب میں پیش آنے والی صورت حال کا تذکرہ اس روایت میں ہے۔ واقعات و حالات سے متعلق جو پیشنگوئیاں ہوتی ہیں وہ مجاز کے رنگ میں بیان ہوتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مدینہ اس طرح اجڑ جائے گا کہ مسجد نبوی کی اہمیت رہے گی نہ کسی اور چیز کی۔ کتے یہاں گھومتے پھریں گے۔ لوگوں نے پوچھا کہ پھلوں کا کیا ہو گا تو آپؐ نے فرمایا کہ آوارہ درندے اور پرندے ان کو کھائیں گے کیونکہ لوگ تو چلے جائیں گے۔ بڑے شہروں پر اس طرح کے دور گزرتے رہے ہیں۔ اسی طرح کا دور دہلی، قرطبہ اور غرناطہ پر بھی گزرا ہے۔ آدمیوں کی ساری رونق ہوتی ہے۔ اگر آدمی نہ ہوں تو مثل مشہور ہے۔ خانہ خالی را دیو می گیرد۔ گھر میں آدمی نہ ہوں تو شیطان اور بھوت پریت اپنے ڈیرے جما لیتے ہیں۔ مدینہ پر یہ دور اس وقت آیا جب مدینہ دارالحکومت نہ رہا۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عُمَرَ ابْنَ عَبْدِ الْعَزِيزِ حِينَ خَرَجَ مِنَ الْمَدِينَةِ الْتَفَتَ إِلَيْهَا فَبَكَى ثُمَّ قَالَ يَا مُزَاحِمُ أَتَخْشَى أَنْ نَكُونَ مِمَّنْ نَفَتِ الْمَدِينَةُ.

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب مدینہ سے نکلے تو انہوں نے خاص طور پر شہر پر نظر ڈالی اور رونے لگے۔ پھر انہوں نے (اپنے آزاد کردہ غلام) مزاحم سے پوچھا کہ کیا تم اندیشہ رکھتے ہو کہ ہم بھی ان لوگوں میں سے ہیں جن کو مدینہ نے نکال باہر کیا ہے؟﴾

وضاحت:

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی بات کا مفہوم یہ ہے کہ ہمارے مدینہ سے نکلنے کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم یہاں سے جائیں اور ہمارا جانا اللہ کی مرضی کے مطابق ہو۔ اور دوسرا یہ کہ ہم کو مدینہ نے نکال دیا ہو۔ یعنی آنحضرتؐ کے ارشاد کے مطابق کہ مدینہ ایک بھٹی کی مانند ہے ہم کھوٹ کی طرح نکالے جا رہے ہوں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اپنے دل میں جو اندیشہ تھا وہ انہوں نے اپنے ساتھی پر ظاہر کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا تمہارے

اندر بھی یہ اندیشہ ہے۔ تمہارے دل کا کیا حال ہے۔ اس پر وہ خاموش رہے۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو مدینہ سے کس درجہ کی انسیت تھی۔ ان کے دل میں رسول اللہ ﷺ کے دارالہجرت کی کتنی قدر تھی۔ اس سے ان کا لگاؤ تھا جس کا اظہار انہوں نے ان الفاظ میں کیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم مدینہ سے محروم کیے جا رہے ہوں۔

مَا جَاءَ فِي تَحْرِيمِ الْمَدِينَةِ

مدینہ کی حرمت کے بارے میں

□ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَمْرٍو مَوْلَى الْمُطَّلِبِ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ طَلَعَ لَهُ أُحُدٌ فَقَالَ هَذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَ نُحِبُّهُ اللَّهُمَّ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَ أَنَا أُحَرِّمُ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا.

﴿انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب احد کا پہاڑ نظر آیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ اے اللہ، ابراہیمؑ نے مکہ کو محترم قرار دیا اور میں اس شہر کی دو پہاڑیوں کے درمیان کے علاقے کو حرم بناتا ہوں۔﴾

وضاحت:

"لابۃ" پہاڑ کی گھاٹی کو بھی کہتے ہیں اور پتھریلی زمین کو بھی۔ پہاڑیوں پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ ہر آدمی کو اپنے وطن کے پہاڑ ٹیلے، وادیاں، مرغزار، چراگاہیں اور نشیب و فراز محبوب ہوتے ہیں۔ طویل قیام کی وجہ سے وطن کی ان چیزوں سے ہر شخص کے دل میں ایک درجہ انسیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ ایک فطری اور جذباتی بات ہوتی ہے۔ کوہ احد کے متعلق نبی ﷺ نے اپنے جذبات کا اظہار فرمایا۔ پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے، یہ مجازاً کہا گیا ہے۔ یہ بات آپؐ نے خیبر سے واپسی پر فرمائی جیسا کہ اسامہ بن زید کی روایت میں آیا ہے۔ اس کے مطابق جب آپ نے احد کو دیکھا تو فرمایا کہ مدینہ سے نکل کر ایک شخص جب سفر کرتا اور اس کے بعد گھر کو لوٹتا ہے تو اس کو مدینہ کے قریب سنتری کی طرح کھڑے کوہ احد کے سوا کون ہوگا جو بشارت دے گا کہ آیئے آپ کا گھر آ گیا۔ اگرچہ یہ جذبہ شاعرانہ

ہے لیکن انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ علامہ اقبال نے کوہ ہمالیہ کے بارے میں کہا تھا 'ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا'۔ اس شعر میں بھی ایسا ہی جذبہ کار فرما ہے۔

آنحضرت کا یہ فرمانا کہ مکہ کو حضرت ابراہیمؑ نے محترم قرار دیا تو میں ان دو پہاڑوں یا سنگلاخ کنکریلی زمین کے درمیان کے علاقے کو محترم قرار دیتا ہوں، اس معنی میں نہیں ہو سکتا کہ اس حرم اور حرم مکہ کی ایک حیثیت ہو جائے گی، اس لیے کہ مکہ کے حرم کی نوعیت دوسری ہے۔ اس کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس کو محترم قرار دے دیا اور اس کی حرمت کے احکام قرآن مجید میں موجود ہیں۔ نبی ﷺ نے وہاں کے درخت کاٹنے اور شکار کرنے سے منع فرمایا۔ مکہ کا اپنا مقام ہے۔ وہ تمام دنیا جہان والوں کا مرکز ہے۔ وہاں اللہ کا گھر اور مسجد حرام ہے جو تمام مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ مدینہ کا اپنا مقام ہے۔ یہ آنحضرتؐ کی جائے ہجرت اور آپ کا مدفن ہے۔ یہاں آنحضرتؐ کی مسجد ہے، یہ صحابہ کا مرکز ہے، یہ اس کی برکتیں ہیں۔ لیکن ایسی کوئی روایت موجود نہیں کہ آنحضرتؐ نے یہاں کے درخت کاٹنے یا شکار سے منع فرمایا ہو۔ حنفیہ ان احکام کو جو حرم مکہ کے لیے ہیں مدینہ پر نافذ نہیں کرتے، اس لیے کہ حرم مکہ کی تمام چیزیں آنحضرتؐ کے اپنے ذریعے سے منصوص ہیں جب کہ حرم مدینہ کی یہ حیثیت نہیں۔ اس لیے جو لوگ حرم مدینہ کو حرم مکہ پر ترجیح دیتے ہیں میرے نزدیک ان کی رائے غلو پر مبنی ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ لَوْ رَأَيْتُ الظِّبَاءَ بِالْمَدِينَةِ تَرْتَعُ مَا ذَعَرْتُهَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا حَرَامٌ.

﴿سعید بن مسیب روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ یہ کہا کرتے تھے کہ اگر میں ہرنوں کو مدینہ میں چرتا پاؤں گا تو ان کو وحشت زدہ نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پہاڑیوں کے درمیان جو کچھ ہے وہ محترم ہے۔﴾

وضاحت:

یہ حضرت ابو ہریرہؓ کا جذبہ ہے اور اس میں کوئی چیز قابل اعتراض نہیں ہے۔ اس کے حق میں وہ یہ دلیل دیتے تھے کہ مدینہ کو محترم قرار دیا گیا ہے۔ لیکن خود آنحضرت ﷺ سے اس بارے میں کوئی روایت نہیں کہ یہاں کے جانور کو کوئی نہ مارے یا درخت کو کوئی نہ کاٹے۔ جبکہ آپ نے حرم مکہ کے متعلق خود فرمایا کہ یہاں کی کسی چیز کو نہ

کاٹا جائے اور نہ ہی جانوروں کا شکار کیا جائے۔

☐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ یُونُسَ بْنِ یُوسُفَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ یَسَارٍ عَنْ اَبِی اَیُّوبَ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّهٗ وَجَدَ غِلْمَانًا قَدْ اَلْجَئُوا ثَعْلَبًا اِلٰی زَاوِیَةٍ فَطَرَدَهُمْ عَنْهُ.

﴿ابو ایوب انصاریؓ فرماتے تھے کہ میں نے بچوں کو دیکھا کہ وہ ایک لومڑی کو ایک گوشے میں گھیر کر اس کے درپے ہو گئے ہیں تو میں نے بچوں کو اس لومڑی سے ہٹا دیا۔﴾

وضاحت :

یہ بھی ابو ایوب انصاریؓ کا ایک مستحسن جذبہ ہے، آنحضرت ﷺ کا ارشاد نہیں۔

☐ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَجُلٍ قَالَ دَخَلَ عَلَیَّ زَیْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَ اَنَا بِالْاَسْوَافِ قَدِ اصْطَدْتُ نُهَسًا فَاَخَذَهٗ مِنْ یَدِی فَاَرْسَلَهٗ.

﴿امام مالک ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ زید بن ثابت میرے ہاں آئے جب میں اسواف میں تھا۔ میں نے نہس نام کا پرندہ شکار کر رکھا تھا۔ انہوں نے اس پرندے کو میرے ہاتھ سے لے لیا اور آزاد کر دیا۔﴾

وضاحت :

یہ بھی زید بن ثابت کا عمل ہے۔ آنحضرت ﷺ سے اس بارے میں کچھ منقول نہیں۔

مَاجَاءَ فِي وَبَاءِ الْمَدِينَةِ

مدینہ کی وبا کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِیهِ عَنْ عَائِشَةَ اُمِّ الْمُؤْمِنِینَ اَنَّهَا قَالَتْ لَمَّا قَدِمَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ الْمَدِینَةَ وُعِكَ اَبُوبَكْرٍ وَ بِلَالٌ قَالَ فَدَخَلْتُ عَلَیْهِمَا فَقُلْتُ یَا اَبَتِ كَیْفَ تَجِدُكَ وَ یَا بِلَالُ كَیْفَ تَجِدُكَ قَالَتْ فَكَانَ اَبُوبَكْرٍ اِذَا اَخَذَتْهُ الْحُمّٰی یَقُولُ :

كُلُّ امْرِئٍ مُصَبَّحٌ فِي أَهْلِهِ   وَالْمَوْتُ أَدْنَى مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ

وَكَانَ بِلَالٌ إِذَا أُقْلِعَ عَنْهُ يَرْفَعُ عَقِيرَتَهُ فَيَقُولُ:

أَلَا لَيْتَ شِعْرِي هَلْ أَبِيتَنَّ لَيْلَةً   بِوَادٍ وَ حَوْلِي إِذْخِرٌ وَ جَلِيلُ

وَهَلْ أَرِدَنْ يَوْمًا مِيَاهَ مَجَنَّةٍ   وَ هَلْ يَبْدُوَنْ لِي شَامَةُ وَ طَفِيلُ

قَالَتْ عَائِشَةُ فَجِئْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ فَأَخْبَرْتُهُ فَقَالَ اللّٰهُمَّ حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِينَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ وَ صَحِّحْهَا وَ بَارِكْ لَنَا فِي مُدِّهَا وَ صَاعِهَا وَانْقُلْ حُمَّاهَا فَاجْعَلْهَا بِالْجُحْفَةِ.

﴿حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو حضرت ابوبکرؓ اور بلالؓ بخار میں مبتلا ہو گئے۔ وہ کہتی ہیں کہ وہ دونوں کے پاس گئیں۔ میں نے پوچھا ابا جان اب کیسا محسوس کر رہے ہیں اور بلال تمہاری طبیعت کیسی ہے ؟ ابوبکرؓ کا حال یہ تھا کہ جب بخار چڑھتا تو وہ یہ شعر پڑھتے :

''آدمی کو گھر میں صبح بخیر کہا جاتا ہے حالانکہ موت اس کے جوتے کے تسمے سے بھی قریب تر ہے''

اور بلال کا یہ حال تھا کہ جب بخار ذرا ٹوٹتا تو بلند آواز سے یہ شعر پڑھتے :

'کاش میں جان پاتا کہ وہ رات کبھی آئے گی جو میں اس وادی میں بسر کروں گا جس کے ارد گرد اذخر اور جلیل کی خوشبوئیں اڑ رہی ہوں گی اور کبھی وہ دن بھی ہو گا کہ میں مجنہ کے چشمے پر اتروں گا اور شامہ اور طفیل کی پہاڑیاں مجھے نظر آئیں گی''۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے جا کر نبی کریم ﷺ کو ان کا حال بتایا تو آپؐ نے دعا کی کہ اے اللہ! ہم سب کے لیے مدینہ کو محبوب کر دے جیسا کہ مکہ کو محبوب کیا ہے یا اس سے بھی زیادہ۔ اور اس کو صحت بخش مقام بنا دے اور اس کے مد اور صاع میں برکت ڈال دے۔ اے اللہ اس کا بخار یہاں سے اٹھا کر جحفہ میں پھینک دے۔﴾

وضاحت :

اذخر اور جلیل دو قسم کے گھاس تھے جو نہایت خوشبودار تھے اور صرف وادی مکہ میں پیدا ہوتے تھے۔ ہر شخص اپنے مقام کے لحاظ سے بات کرتا اور اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ بیماری میں حضرت ابو بکرؓ کے جذبات یہ تھے کہ لوگ تو آکر مزاج پوچھتے اور صبحك الله بالخیر کی دعا دیتے اور وہ اپنی حالت یوں محسوس کرتے کہ جیسے موت ان کے جوتے کے تسمے کے ساتھ لگی کھڑی ہے۔ اس کے برعکس حضرت بلالؓ کو وادی مکہ کی یاد ستاتی اور وہ وہاں کی راتوں اور دنوں کو اور وہاں کی وادیوں، پہاڑیوں اور گھاس کو یاد کرتے۔ آدمی بخار میں کمزور ہو جاتا ہے تو اس کے اوپر جذبات کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اس کے اس وقت کے جذبات عام جذبات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے محسوس فرمایا کہ میرے ساتھی مکہ کو نہیں بھولتے۔ اس لیے آپ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ ہمارے لیے مدینہ کو بھی اتنا ہی یا اس سے زیادہ محبوب بنا دے جتنا کہ مکہ محبوب ہے۔ ساتھ ہی اس کی پیداوار میں برکت کی دعا فرمائی اور یہ کہ اس شہر کو صحت افزا مقام بنا دے اور اس کے بخار کو جحفہ کی وادی میں پھینک دے۔ جحفہ یہود کی ایک بستی تھی۔

اس روایت سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی کمسنی کی بھی نفی ہوتی ہے۔ یہ انداز روایت کسی بچی کا نہیں ہو سکتا۔

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نُعَیْمِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْمُجْمِرِ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰی اَنْقَابِ الْمَدِیْنَةِ مَلَائِكَةٌ" لَا یَدْخُلُهَا الطَّاعُوْنُ وَلَا الدَّجَّالُ.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مدینہ کی گلیوں کے ناکوں پر فرشتے مقرر ہیں۔ اس میں طاعون اور دجال داخل نہیں ہو سکتے۔﴾

وضاحت :

یہ روایت جس طرح موطا میں آئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خبر ہے اور آنحضرت ﷺ کی خبر آفاقی شہادت ہوتی ہے۔ ایسی خبر جب واقعات سے سچی ثابت ہو جائے تو وہ حضورؐ کی نبوت کی صداقت کی دلیل ہو گی۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے انشاء اللہ بھی فرمایا۔ تو ایک خوش آئند بشارت ہو گی۔ اگر اس کے خلاف بھی ہو تب بھی اس کی نفی نہیں ہوتی۔ انشاء اللہ تو ایک مشروطیت ہوتی ہے یعنی اگر طاعون آجائے تو آجائے۔

مَا جَاءَ فِي إِجْلَاءِ الْيَهُودِ مِنَ الْمَدِينَةِ

یہود کے مدینہ سے جلاوطن کرنے کی روایات

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ إِسْمٰعِيلَ بْنِ أَبِي حَكِيمٍ أَنَّهُ سَمِعَ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيزِ يَقُولُ كَانَ مِنْ آخِرِ مَا تَكَلَّمَ بِهِ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ قَالَ قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارٰى اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ لَا يَبْقَيَنَّ دِينَانِ بِأَرْضِ الْعَرَبِ.

﴿اسمٰعیل بن ابی حکیم کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے سنا، وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو آخری ارشادات فرمائے ان میں یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو معبد بنالیا۔ عرب کی سرزمین میں دو دین باقی نہیں رہیں گے۔﴾

وضاحت :

حدیث کے یہ دونوں ٹکڑے معنوی طور پر کچھ بے ربط سے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیچ میں کچھ باتیں حذف کردی گئی ہیں۔ موقع کی بات جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمائی تو اس میں صرف دو باتوں کا ذکر کیا ہے۔

پہلی یہ کہ آپ نے یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائی کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا۔ ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ نصاریٰ میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوا کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا تو اس سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ بسا اوقات عام لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور علیٰ سبیل التغلیب اس میں اوروں کو شامل کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی نبیوں کا لفظ اولیاء و صلحاء پر بھی حاوی کردیں تو معنا یہ بات صحیح ہو جاتی ہے۔ نصاریٰ نے حضرت مریمؑ اور اپنے نیک لوگوں کے بت بھی بنائے، وہ ان کی پوجا بھی کرتے ہیں اور ان کی قبروں پر انہوں نے گرجے بھی تعمیر کیے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ جزیرہ عرب میں دو دین نہیں رہیں گے۔ یہ بات ہے تو خبر یہ جملہ لیکن مسلمانوں کو نصیحت و وصیت کے طور پر ہے۔ اس حکم کی تعمیل حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں کی اور یہود کو ملک سے نکال باہر کیا۔ یہ بات کہ عرب میں دو دین نہیں رہیں گے اور یہ کہ کوئی غیر مسلم نہیں رہے گا دو مختلف باتیں ہیں اور ان میں

فرق ہے۔ اسلام سے پہلے یہودیت اور نصرانیت دونوں دین عرب میں خاصے باوقار اور بااختیار تھے۔ ان کے اثر کے اپنے اپنے دائرے تھے۔ مذکور حکم میں ان کی اس حیثیت کی نفی ہے۔ فرمایا ہے کہ ان کی یہ حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ جماعتی حیثیت سے ان دونوں گروہوں کا وہاں سے خاتمہ کر دیا جائے گا۔ باقی رہ گئی یہ بات کہ غیر مسلموں کے بارے میں کیا حکم ہے تو وہ ملک میں آ جا سکتے ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ یہود کی جلاوطنی اور عرب میں مختلف ادیان کو جمع کرنے کی ممانعت دونوں حضور کی حیات مبارکہ کے آخری دور کی ہدایات ہیں۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَجْتَمِعُ دِيْنَانِ فِي جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ قَالَ مَالِكٌ، قَالَ ابْنُ شِهَابٍ فَفَحَصَ عَنْ ذٰلِكَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ حَتّٰى اَتَاهُ الثَّلْجُ وَالْيَقِيْنُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَجْتَمِعُ دِيْنَانِ فِي جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ فَاَجْلٰى يَهُوْدَ خَيْبَرَ.

«امام مالک ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جزیرۃ العرب میں دو دین جمع نہیں رہیں گے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ ابن شہاب کا قول ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس قول کی پوری تحقیق کی یہاں تک کہ ان کو پورا اطمینان قلب ہو گیا کہ یہ بات آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ جزیرہ عرب میں دو دین جمع نہیں ہوں گے تو انھوں نے یہود خیبر کو جلاوطن کر دیا۔»

وضاحت:

ایک طرف یمن اور دوسری طرف شام کے کنارے تک جزیرۃ العرب کا علاقہ ہے جس کے متعلق آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا۔ اس کی بنیادی وجہ حرم شریف کا تحفظ ہے۔ جس طرح علاقائی سمندر ہوتا ہے کہ اس کے بغیر آپ کے ساحل اور آپ کے ملک کی حفاظت نہیں ہو سکتی تو اسی طریقہ سے حرم کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ جس علاقے میں حرم واقع ہے اس علاقے کو دور دور تک غیر لوگوں سے پاک رکھا جائے۔

باقی رہا دو دین جمع نہ کرنے کا معاملہ تو ایسا ہر مملکت میں ہوتا ہے۔ بااختیار تو ایک دین ہی ہوتا ہے۔ امریکہ اور برطانیہ وغیرہ میں بھی ایسا ہے اور پاکستان و ایران میں بھی ایسا ہی ہے۔ کئی دین بیک وقت بااختیار نہیں ہو سکتے لہذا

اس ہدایت پر تعجب کی کوئی بات نہیں۔

حضرت عمرؓ نے اس حکم پر یوں عمل کیا کہ فدک اور خیبر کے یہودیوں کو شام کی طرف جلاوطن کر دیا۔ خیبر کے یہود وہاں سے نکل گئے تو نہ ان کا پھل میں کچھ حصہ رہا نہ زمین میں۔ رہے یہود فدک تو ان کے لیے نصف پھل اور نصف زمین کا وعدہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے اسی بنیاد پر مصالحت کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے نصف پھل، نصف زمین اور یہود کے تمام سامان کی قیمت لگوا کر ان کو ادا کر دی۔ چونکہ وہ اہل صلح تھے اس لیے معاہدے کی رو سے ان سے ٹھیک ٹھیک انصاف کیا گیا۔

جَامِعُ مَا جَاءَ فِي أَمْرِ الْمَدِينَةِ

مدینہ کے بارے میں جامع باب

❑ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ طَلَعَ لَهُ أُحُدٌ فَقَالَ هَذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَ نُحِبُّهُ.

﴿ہشام بن عروہؒ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے احد آیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔﴾

وضاحت:

یہ روایت اوپر گزر چکی ہے۔ اس کی وضاحت وہاں دیکھی جائے۔ یہ خیبر سے واپسی کا واقعہ ہے۔ اپنے علاقے کی وادی یا پہاڑ یا ندی سے محبت ہونا فطری بات ہے، اور یہ بات کہ پہاڑ محبت کرتا ہے مجازی معنوں میں ہے۔

❑ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ الْقَاسِمِ أَنَّ أَسْلَمَ مَوْلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ زَارَ عَبْدَاللَّهِ بْنَ عَيَّاشٍ الْمَخْزُومِيَّ فَرَأَى عِنْدَهُ نَبِيذًا وَهُوَ بِطَرِيقِ مَكَّةَ فَقَالَ لَهُ أَسْلَمُ إِنَّ هَذَا الشَّرَابَ يُحِبُّهُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَحَمَلَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَيَّاشٍ قَدَحًا عَظِيمًا فَجَاءَ بِهِ إِلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَوَضَعَهُ فِي يَدَيْهِ فَقَرَّبَهُ عُمَرُ إِلَى فِيهِ ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ فَقَالَ عُمَرُ إِنَّ هَذَا لَشَرَابٌ طَيِّبٌ فَشَرِبَ مِنْهُ ثُمَّ نَاوَلَهُ رَجُلًا عَنْ يَمِينِهِ فَلَمَّا أَدْبَرَ

عَبْدُاللّٰهِ نَادَاهُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَقَالَ أَ أَنْتَ الْقَائِلُ لَمَكَّةُ خَيْرٌ مِنَ الْمَدِينَةِ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ فَقُلْتُ هِيَ حَرَمُ اللّٰهِ وَ أَمْنُهُ وَ فِيهَا بَيْتُهُ فَقَالَ عُمَرُ لَا أَقُولُ فِي بَيْتِ اللّٰهِ وَلَا فِي حَرَمِهِ شَيْئًا ثُمَّ قَالَ عُمَرُ أَأَنْتَ الْقَائِلُ لَمَكَّةُ خَيْرٌ مِنَ الْمَدِينَةِ قَالَ فَقُلْتُ هِيَ حَرَمُ اللّٰهِ وَ أَمْنُهُ وَ فِيهَا بَيْتُهُ فَقَالَ عُمَرُ لَا أَقُولُ فِي حَرَمِ اللّٰهِ وَلَا فِي بَيْتِهِ شَيْئًا ثُمَّ انْصَرَفَ.

﴿عبدالرحمٰن بن قاسم کہتے ہیں کہ اسلم نے، جو حضرت عمرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، خبر دی کہ انہوں نے مکہ کے راستے میں عبداللہ بن عیاش مخزومی سے ملاقات کی تو ان کے پاس نبیذ دیکھی۔ اسلم نے بتایا کہ اس مشروب کو حضرت عمرؓ بہت پسند فرماتے ہیں۔ اس پر عبداللہ بن عیاشؓ ایک بڑا پیالہ لے کر حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور اس کو ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ حضرت عمرؓ اسے اپنے منہ کے قریب لے گئے، پھر سر اٹھالیا اور فرمایا کہ یہ مشروب بڑا پاکیزہ ہے۔ انہوں نے اس میں سے پیا اور پھر اپنے داہنے والے ایک شخص کو پکڑا دیا۔ جب عبداللہ پلٹے تو حضرت عمرؓ نے ان کو پکارا اور پوچھا کہ کیا آپ یہ کہتے ہیں کہ مکہ مدینہ سے بہتر ہے؟ عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ وہ اللہ کا حرم اور دارالامن ہے اور اس میں اللہ کا گھر ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں بیت اللہ اور حرم کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ حضرت عمرؓ نے پھر پوچھا کہ کیا آپ واقعی یہ کہتے ہیں کہ مکہ مدینہ سے بہتر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ وہ اللہ کا حرم اور دارالامن ہے اور اس میں اللہ کا گھر ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں بیت اللہ اور حرم کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ پھر وہ چلے گئے۔﴾

وضاحت :

یہ روایت امام مالک نے اس لیے نقل کی ہے کہ وہ اس سے اس بات کی تائید چاہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا رجحان مکہ پر مدینہ کی ترجیح کی طرف تھا، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے علم میں یہ بات آئی کہ لوگوں میں یہ بحث چل رہی ہے کہ مکہ اور مدینہ میں سے کون سا شہر افضل ہے۔ بعض لوگ مکہ کو ترجیح دے رہے ہیں اور بعض مدینہ کو۔ حضرت عبداللہ بن عیاش کا نام ان لوگوں میں رہا ہوگا جو مکہ کو ترجیح دیتے

تھے۔ ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کو خود ایسی واضح بات کے بارے میں کوئی اشتباہ نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے چاہا کہ عبداللہؓ سے ان کے موقف کی تصدیق کر لی جائے۔ جب لوگوں کے اندر کسی بات کا چرچا ہو رہا ہو اور اس سے بظاہر عصبیت جاہلیت کے ابھرنے کا اندیشہ ہو تو حاکم کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس کی تحقیق کرے اور اس کے بارے میں لوگوں کے موقف کو سمجھے۔ حضرت عمرؓ کا یہ فرض تھا کہ جب قضیہ چل پڑا ہے تو معلوم کریں کہ لوگ کس طریقے سے سوچ رہے ہیں اور ان کے دلائل کیا ہیں۔ ان جیسے مدبر سے یہ توقع بھی تھی کہ وہ صورت حال کا اندازہ کر لیں اور بلاضرورت پارٹی نہ بنیں۔ انہوں نے یہی تحقیق کرنی چاہی لیکن اپنا کوئی رجحان ظاہر نہیں کیا۔ عبداللہؓ نے جوبات کہی اس کو مان لیا۔ دوبارہ پوچھنے کا مقصد بھی تفتیش ہی تھا۔ عبداللہؓ نے اپنے موقف کے حق میں دلائل واضح کر دیے۔ انہوں نے مکہ کو ترجیح دینے کی بنیاد قرآن مجید پر رکھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرم قرار دیا ہے۔ جو شخص اس میں داخل ہو وہ مامون ہوتا ہے اور اس شہر میں اللہ کا گھر ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی مقام کو شرف تو اللہ تعالیٰ کے دینے ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ کو عبداللہؓ کی بات سن کر اور ان کے دلائل سے واقف ہو کر اطمینان ہو گیا کہ ان کی سوچ درست ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر خاموشی اختیار کی۔

مَاجَاءَ فِی الطَّاعُوْنِ

طاعون کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عَبْدِ الْحَمِیدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ زَیْدِ بْنِ الْخَطَّابِ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ الْحَارِثِ بْنِ نَوْفَلٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ خَرَجَ اِلَی الشَّامِ حَتّٰی اِذَا كَانَ بِسَرْغَ لَقِیَهُ اُمَرَاءُ الْاَجْنَادِ اَبُو عُبَیْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ وَاَصْحَابُهُ فَاَخْبَرُوهُ اَنَّ الْوَبَاءَ قَدْ وَقَعَ بِاَرْضِ الشَّامِ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ ادْعُ لِی الْمُهَاجِرِیْنَ الْاَوَّلِیْنَ فَدَعَاهُمْ فَاسْتَشَارَهُمْ وَ اَخْبَرَهُمْ اَنَّ الْوَبَاءَ قَدْ وَقَعَ بِالشَّامِ فَاخْتَلَفُوا فَقَالَ بَعْضُهُمْ قَدْ خَرَجْتَ لِاَمْرٍ وَلَا نَرٰی اَنْ تَرْجِعَ عَنْهُ وَقَالَ بَعْضُهُمْ مَعَكَ بَقِیَّةُ النَّاسِ وَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَلَا نَرٰی اَنْ تُقْدِمَهُمْ عَلٰی هٰذَا الْوَبَاءِ فَقَالَ عُمَرُ

ارْتَفِعُوا عَنِّی ثُمَّ قَالَ ادْعُ لِی الْاَنْصَارَ فَدَعَوْتُهُمْ فَاسْتَشَارَهُمْ فَسَلَكُوا سَبِيلَ الْمُهَاجِرِينَ وَاخْتَلَفُوا كَاخْتِلَافِهِمْ فَقَالَ ارْتَفِعُوا عَنِّی ثُمَّ قَالَ ادْعُ لِی مَنْ كَانَ هَاهُنَا مِنْ مَشْيَخَةِ قُرَيْشٍ مِنْ مُهَاجِرَةِ الْفَتْحِ فَدَعَوْتُهُمْ فَلَمْ يَخْتَلِفْ عَلَيْهِ مِنْهُمْ رَجُلَانِ فَقَالُوا نَرَى اَنْ تَرْجِعَ بِالنَّاسِ وَلَا تُقْدِمَهُمْ عَلَى هٰذَا الْوَبَاءِ فَنَادٰى عُمَرُ فِی النَّاسِ اِنِّی مُصَبِّحٌ عَلٰى ظَهْرٍ فَاَصْبِحُوا عَلَيْهِ فَقَالَ اَبُو عُبَيْدَةَ اَفِرَارًا مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ فَقَالَ عُمَرُ لَوْ غَيْرُكَ قَالَهَا يَا اَبَا عُبَيْدَةَ نَعَمْ نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ اِلٰى قَدَرِ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ لَوْ كَانَ لَكَ اِبِلٌ فَهَبَطَتْ وَادِيًا لَهُ عُدْوَتَانِ اِحْدَاهُمَا مُخْصِبَةٌ وَالْاُخْرٰى جَدْبَةٌ اَلَيْسَ اِنْ رَعَيْتَ الْمُخْصِبَةَ رَعَيْتَهَا بِقَدَرِ اللّٰهِ وَ اِنْ رَعَيْتَ الْجَدْبَةَ رَعَيْتَهَا بِقَدَرِ اللّٰهِ فَجَاءَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ وَ كَانَ غَائِبًا فِی بَعْضِ حَاجَتِهِ فَقَالَ اِنَّ عِنْدِی مِنْ هٰذَا عِلْمًا سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ اِذَا سَمِعْتُمْ بِهِ بِاَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوا عَلَيْهِ وَ اِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَ اَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوا فِرَارًا مِنْهُ قَالَ فَحَمِدَ اللّٰهَ عُمَرُ ثُمَّ انْصَرَفَ.

عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ شام تشریف لے گئے۔ جب آپ سرغ کے مقام پر تھے تو سپہ سالاروں، ابو عبیدہ بن الجراحؓ اور ان کے ساتھیوں نے ان سے ملاقات کی اور یہ اطلاع دی کہ ملک شام میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی ہے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ ابتدائی مہاجرین کو میرے پاس لایا جائے۔ آپ نے ان کو بلایا، ان سے مشورہ کیا اور ان کو بتایا کہ شام میں وبا پھوٹ پڑی ہے (اس صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟) اس پر یہ لوگ مختلف الرائے تھے۔ بعض نے تو یہ کہا کہ آپ ایک مقصد سے تشریف لائے ہیں۔ ہماری رائے میں اس کو پورا کیے بغیر آپ کو واپس نہیں جانا چاہیے۔ دوسروں نے کہا آپ کے ہمراہ سرکردہ لوگ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھی ہیں۔ ہمارے خیال میں آپ کو انہیں وبا کے علاقہ میں نہیں لے جانا چاہیے۔ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو رخصت کر دیا کہ آپ لوگ تشریف لے جائیں۔ پھر فرمایا کہ اب میرے پاس انصار کو لاؤ۔ امرائے لشکر ان کو لے آئے، آپ نے ان سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی مہاجرین ہی کا موقف اختیار

کیا۔ ان کی رایوں میں بھی اسی طرح کا اختلاف تھا۔ آپ نے ان کو بھی رخصت کر دیا۔ پھر فرمایا کہ فتح مکہ سے پہلے کے مہاجرین میں سے قریشی سرداروں میں سے جو یہاں ہوں ان کو بلایا جائے۔ امرائے لشکر نے ان کو طلب کر لیا تو ان میں سے کوئی دو آدمی بھی مختلف الرائے نہیں تھے۔ سب کا کہنا یہ تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس چلے جائیں اور اس وبا میں ان کو نہ لے جائیں۔ تب حضرت عمرؓ نے لوگوں میں اعلان کر دیا کہ میں صبح اپنی سواری پر واپس جا رہا ہوں، آپ لوگ بھی تیار رہیں۔ اس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے سوال کیا، کیا اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا، اگر آپ کے سوا کوئی اور یہ سوال کرتا تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔ ابو عبیدہ! ہاں، ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر ہی کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ اگر آپ کے کچھ اونٹ ہوں اور وہ کسی ایسی وادی میں جا اتریں کہ جس کی دو اطراف میں سے ایک سرسبز و شاداب ہو اور دوسری بنجر، تو کیا یہ بات نہیں ہوتی کہ اگر آپ اونٹوں کو شاداب حصے میں چرائیں تو یہ بات اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوگی اور اگر بنجر حصہ میں چرائیں تب بھی آپ اللہ کی تقدیر کے مطابق عمل کر رہے ہوں گے۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ آئے جو کسی ضرورت سے پہلے موقع پر موجود نہیں تھے۔ تو انہوں نے کہا کہ میرے پاس اس بارے میں کچھ معلومات ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا، جب کسی علاقے میں اس وبا کی خبر سنو تو اس علاقے میں نہ آؤ۔ اور جب کسی علاقے میں تمہاری موجودگی میں وبا پھوٹ پڑے تو اس سے بھاگ کر وہاں سے نہ نکلو۔ اس پر حضرت عمرؓ نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ پھر واپس تشریف لے گئے۔

وضاحت:

یہ روایت اس زمانے سے تعلق رکھتی ہے جب اسلامی لشکر اردن، شام اور فلسطین کے علاقے میں رومیوں سے برسرپیکار تھے۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ ان کے سپہ سالار تھے اور حضرت عمرؓ نے ان کی دعوت پر اس علاقے کا دورہ رکھ لیا۔ جب آپ مقام سرغ میں پہنچے، جو حجاز اور شام کی سرحد پر ایک قصبہ تھا، تو امرائے لشکر ان کے

استقبال کے لیے آئے اور یہ اطلاع دی کہ شام کے علاقے میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہو گیا کہ کیا حضرت عمرؓ کو وبا زدہ علاقے میں داخل ہونا چاہیے یا مدینہ منورہ واپس لوٹ جانا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے آپ کے ہمراہ سرکردہ صحابہ کرام کا ایک وفد بھی تھا۔ حضرت عمرؓ نے ایک خلیفہ راشد کی حیثیت سے وبا کے علاقے میں داخل ہونے کے بارے میں شرعی حکم کے تعین کے لیے مشاورت کا فیصلہ کیا اور اس کی شکل یہ اختیار کی کہ سب سے پہلے وہاں موجود قدیم الاسلام مہاجرین سے مشاورت کی۔ پھر انصار کو بلایا اور اس کے بعد ان قریشی سرداروں کو بلایا جو فتح مکہ سے پہلے اور معاہدہ حدیبیہ کے بعد مدینہ ہجرت کر چکے تھے۔ اول الذکر دونوں گروہوں نے کوئی متفقہ رائے نہیں دی۔ بعض چاہتے تھے کہ حضرت عمرؓ جس مقصد سے آئے ہیں اس کو پورا کیے بغیر واپس نہ جائیں۔ دوسرے یہ کہتے تھے کہ رسول اللہ کے بلند مرتبہ ساتھیوں کی ایک جماعت کو وبا زدہ علاقے میں لے جا کر خطرہ سے دوچار کرنا مناسب نہیں۔ البتہ قریشی سرداروں کا موقف ایک ہی تھا کہ مدینہ کو لوٹ جانا ہی مناسب ہے۔ مشاورت کے نتیجہ میں حضرت عمرؓ نے واپس کوچ کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے اعتراض کیا کہ ایسا کرنا اللہ کی تقدیر سے فرار اختیار کرنے کے مترادف ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے ان کی اس منفی آفرینی کو ان کے مرتبہ سے کمتر محسوس کیا اور فرمایا کہ کاش، تمہارے سوا کوئی اور شخص یہ بات کرتا تو مجھے اس پر حیرت نہ ہوتی۔ پھر ایک مثال سے ان کو سمجھایا کہ جب آپ کے لیے دو راستے یکساں کھلے ہوں تو آپ جس راستے کو بھی اختیار کریں گے تو اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوگا، خواہ آپ سہل راستہ اختیار کریں یا مشکل۔ لہٰذا ہم نے اگر اپنے لیے واپسی کا راستہ اختیار کیا ہے تو اس میں بھی ہم اللہ کی تقدیر ہی کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ اس موقع پر حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کہیں سے آ نکلے۔ انہوں نے جب سنا کہ وبا کے مسئلہ پر مشاورت ہوئی ہے اور لوگ مختلف الرائے ہو رہے ہیں تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث سنائی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ اگر سنو کہ کسی علاقہ میں وبا پھیلی ہوئی ہے تو اس میں نہ جاؤ، لیکن جب تمہارے وہاں ہوتے ہوئے وبا پھوٹ پڑے تو اس علاقہ سے فرار اختیار نہ کرو۔ حضرت عمرؓ نے جب یہ حدیث سنی تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ مشاورت کے نتیجہ میں اپنے اجتہاد سے وہ جس نتیجہ تک پہنچے تھے وہ حدیث کے ساتھ مطابقت رکھتا تھا۔

اس روایت سے ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ اجتہادی امور میں خلفائے راشدین مشاورت کو کس قدر اہمیت دیتے تھے۔ اس مشاورت میں وہ صحابہ کرامؓ کے مختلف طبقات کی رائے لیتے جس میں یہ بات ملحوظ ہوتی کہ

سبقت فی الاسلام اور اسلام کی خاطر قربانیوں میں ان کا حصہ نمایاں ہو۔ بلاشبہ یہ اجتہاد کی سب سے اعلیٰ شکل تھی۔ دوسرے مسئلہ زیر بحث میں دین کا مزاج یہ سامنے آیا کہ وبازدہ علاقہ سے دوسرے علاقوں میں منتقل ہونا مناسب نہیں لیکن جو لوگ اس علاقے سے باہر ہوں انہیں اس علاقہ میں داخل ہونے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ جدید معلومات کی روشنی میں وبازدہ علاقہ سے منتقل ہونے والا شخص اس وبا کو دوسرے علاقہ میں پھیلانے کا باعث بن سکتا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اس ترقی یافتہ زمانہ میں چونکہ آمدورفت کے ذرائع بہت وسعت اختیار کر گئے ہیں اس لیے وبائیں بسا اوقات کئی کئی ملکوں بلکہ مختلف براعظموں میں پھیل جاتی ہیں۔

جہاں تک تقدیر کا تعلق ہے آدمی ہر جگہ اس کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ جب کسی علاقے میں وبا پھوٹتی ہے تو آخر پہلا شخص جو اس کے پھیلانے کا باعث بنا اس کی بیماری کا سبب مرض کا متعدی ہونا تو نہ تھا۔ وہ اللہ کی تقدیر ہی سے اس بیماری سے متاثر ہوا۔ پھر کتنے ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مریضوں کی تیمارداری اور علاج پر متعین ہوتے ہیں اور وبا سے متاثر افراد کے ساتھ رہنے کے باوجود ان پر بیماری کا حملہ نہیں ہوتا۔ یہ بھی اللہ کی تقدیر ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ وَعَنْ سَالِمِ بْنِ اَبِي النَّضْرِ مَوْلَى عُمَرَ بْنِ عُبَيْدِاللّٰهِ عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدِ بْنِ اَبِي وَقَّاصٍ عَنْ اَبِيهِ اَنَّهُ سَمِعَهُ يَسْأَلُ اُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ مَا سَمِعْتَ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فِي الطَّاعُونِ فَقَالَ اُسَامَةُ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ الطَّاعُونُ رِجْزٌ اُرْسِلَ عَلَى طَائِفَةٍ مِنْ بَنِي اِسْرَائِيلَ اَوْ عَلَى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ فَاِذَا سَمِعْتُمْ بِهِ بِاَرْضٍ فَلَا تَدْخُلُوا عَلَيْهِ وَاِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَاَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوا فِرَارًا مِنْهُ۔

﴿عامر بن سعد روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے والد سعد بن ابی وقاصؓ کو حضرت اسامہ بن زیدؓ سے یہ سوال کرتے سنا کہ آپ نے طاعون کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کیا کچھ سنا ہے۔ اسامہ نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ طاعون ایک عذاب ہے جو بنی اسرائیل کے ایک گروہ پر یا تم سے پہلے کسی قوم پر بھیجا گیا۔ اس لیے جب کسی علاقے میں تم اس کے حملہ کی خبر سنو تو اس میں داخل نہ ہوا کرو لیکن اگر یہ کسی سرزمین میں پھوٹ پڑے جبکہ تم وہاں موجود ہو تو اس بیماری سے بھاگ کر علاقہ سے نہ نکلو۔﴾

وضاحت:

ہر آفت اور مصیبت جو کسی قوم پر آتی ہے اس کی حکمت الگ الگ ہوتی ہے۔ مثلاً وہ لوگوں کے امتحان کے لیے ہو سکتی ہے یا اس کی نوعیت قوم کے لیے ایک تنبیہی عذاب کی ہو سکتی ہے تاکہ وہ اپنی اصلاح کرے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ تیسری شکل ایک تباہ کن عذاب کی ہو سکتی ہے جو کسی ناہنجار قوم کو ملیامیٹ کرنے کے لیے آتا ہے۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ طاعون کی بیماری قبل از اسلام کسی قوم پر عذاب کے طور پر بھیجی گئی۔ مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس بیماری کا نقطہ آغاز وہ عذاب رہا۔ بعد میں مختلف ادوار میں اس وبا کا ظہور جو ہوا تو اس کے مقاصد الگ الگ ہو سکتے ہیں۔

طاعون زدہ علاقہ میں داخلہ کے بارے میں حکم کی وضاحت اوپر کی روایت میں ہو چکی ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ خَرَجَ اِلَى الشَّامِ فَلَمَّا جَاءَ سَرْغَ بَلَغَهُ اَنَّ الْوَبَاءَ قَدْوَقَعَ بِالشَّامِ فَاَخْبَرَهُ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ اِذَا سَمِعْتُمْ بِهٖ بِاَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوْا عَلَيْهِ وَ اِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَ اَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوْا فِرَارًا مِنْهُ فَرَجَعَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ مِنْ سَرْغَ

﴿عبداللہ بن عامر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ شام تشریف لے گئے۔ جب آپ سرغ کے مقام پر پہنچے تو اطلاع ملی کہ شام میں وبا پھیل گئی ہے تو عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے انہیں بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب کسی علاقہ میں اس بیماری کے حملہ کا سنو تو وہاں نہ جاؤ اور جب کسی علاقہ میں وبا پھوٹ پڑے جبکہ تم وہاں مقیم ہو تو بیماری سے بھاگ کر اس علاقہ سے مت نکلو۔ چنانچہ حضرت عمر بن الخطابؓ سرغ سے لوٹ گئے۔﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللهِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اِنَّمَا رَجَعَ بِالنَّاسِ مِنْ سَرْغَ عَنْ حَدِيْثِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ.

﴿سالم بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی بیان کردہ حدیث کے

مطابق سرغ سے لوگوں کو لے کر واپس لوٹے۔﴾

وضاحت :

اس روایت کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ یہاں راوی نے مختصر الفاظ میں مذکورہ بالا واقعہ کا حوالہ دیا ہے۔

اَلنَّهْیُ عَنِ الْقَوْلِ بِالْقَدَرِ

تقدیر پر کلام کی ممانعت

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ تَحَاجَّ آدَمُ وَ مُوسٰی فَحَجَّ آدَمُ مُوسٰی قَالَ لَهُ مُوسٰی اَنْتَ آدَمُ الَّذِی اَغْوَیْتَ النَّاسَ وَ اَخْرَجْتَهُمْ مِنَ الْجَنَّةِ فَقَالَ لَهُ آدَمُ اَنْتَ مُوسٰی الَّذِی اَعْطَاهُ اللّٰهُ عِلْمَ كُلِّ شَیْءٍ وَ اصْطَفَاهُ عَلَی النَّاسِ بِرِسَالَتِهِ قَالَ نَعَمْ قَالَ اَفَتَلُوْمُنِی عَلٰی اَمْرٍ قَدْ قُدِّرَ عَلَیَّ قَبْلَ اَنْ اُخْلَقَ.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حضرت آدمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے مابین حجت ہوئی تو آدمؑ نے موسیٰ کو لاجواب کر دیا۔ موسیٰؑ نے ان سے کہا، آپ وہی آدم ہیں جنھوں نے لوگوں کو بھٹکایا اور ان کو جنت سے نکالا؟ اس پر آدمؑ نے انھیں جواب دیا، آپ وہی موسیٰؑ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا علم دیا اور رسالت سے سرفراز فرما کر تمام انسانوں پر فضیلت بخشی۔ موسیٰؑ نے کہا ہاں۔ تو آدمؑ نے کہا: کیا آپ مجھے ایک ایسی بات پر ملامت کر رہے ہیں جو میری تخلیق سے قبل ہی مجھ پر لکھ دی گئی تھی۔﴾

وضاحت :

حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے مابین یہ حجت کب اور کہاں ہوئی اس کے بارے میں روایت خاموش ہے۔ ہو سکتا ہے اسے عالم مثال کے ایک واقعہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہو اور اس کا مقصد ان لوگوں کی اصلاح ہو جو آدم علیہ السلام کو مورد الزام سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی نسل کو جنت سے نکلوایا۔ دوسری بات یہ ہو

سکتی ہے کہ اس کا تعلق اسرائیلیات سے ہو۔ یہود میں اس طرح کی بہت سی کہانیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کرۂ زمین پر ایک بااختیار مخلوق بسانے کا فیصلہ تو پہلے ہو چکا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فیصلے سے فرشتوں کو آگاہ بھی کر دیا تھا۔ اس مخلوق کو نیکی اور بدی کے ارتکاب اور اطاعت اور نافرمانی دونوں کی صلاحیت دی جانی مقصود تھی۔ آدم علیہ السلام کو جنت میں امتحان کے لیے رکھا گیا اور جب ان سے شجر ممنوعہ کا پھل کھانے کی خطا سرزد ہوئی تو ان کو زمین پر اسی فیصلے کے مطابق بھیجا گیا جس سے فرشتوں کو پہلے آگاہ کیا جا چکا تھا۔ آدم علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو یہی حقیقت بتا کر لاجواب کر دیا۔

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَبِي أُنَيْسَةَ عَنْ عَبْدِ الْحَمِيدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ زَيْدِ بْنِ الْخَطَّابِ أَنَّهُ أَخْبَرَهُ عَنْ مُسْلِمِ بْنِ يَسَارٍ الْجُهَنِيِّ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ سُئِلَ عَنْ هَذِهِ الْآيَةِ وَ إِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ أَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يُسْأَلُ عَنْهَا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى خَلَقَ آدَمَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ بِيَمِينِهِ حَتَّى اسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هَؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وَ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ يَعْمَلُونَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هَؤُلَاءِ لِلنَّارِ وَ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ يَعْمَلُونَ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَفِيمَ الْعَمَلُ قَالَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ إِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلْجَنَّةِ اسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتَّى يَمُوتَ عَلَى عَمَلٍ مِنْ أَعْمَالِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُدْخِلَهُ رَبُّهُ الْجَنَّةَ وَ إِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلنَّارِ اسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتَّى يَمُوتَ عَلَى عَمَلٍ مِنْ أَعْمَالِ أَهْلِ النَّارِ فَيُدْخِلَهُ رَبُّهُ النَّارَ.

۞ مسلم بن یسار جہنی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ سے آیت وَ إِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ الخ (اور یاد کرو جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے ...... ان کی پیٹھوں سے ...... ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ بولے

ہاں تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے) کی بابت سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں جب سوال کیا گیا تو میں نے وہ سنا تھا۔ رسول اللہؐ نے اس کا جواب یہ دیا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا، پھر اپنا ہاتھ ان کی کمر پر پھیرا یہاں تک کہ ان کی کچھ ذریت اس میں سے نکال لی اور فرمایا کہ ان لوگوں کو میں نے جنت کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ جنتیوں کے عمل کریں گے۔ پھر اس نے آدم کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کچھ ذریت نکالی اور فرمایا کہ ان لوگوں کو میں نے دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ دوزخیوں کے کام کریں گے۔ اس پر ایک آدمی نے سوال کیا، یارسول اللہ، پھر عمل کی کیا وقعت رہی۔ تو رسول اللہؐ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے ایک بندے کو جنت کے لیے پیدا کیا تو وہ اس سے جنتیوں کے کام کرواتا ہے یہاں تک کہ اس کی موت جنتیوں کے کسی عمل پر واقع ہوتی ہے تو اس کا رب اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے اور جب خدا کسی بندے کو دوزخ کے لیے پیدا کرتا ہے تو اس سے دوزخیوں کے کام کرواتا ہے یہاں تک کہ اس کی موت دوزخیوں کے کسی عمل پر واقع ہوتی ہے تو اس کا رب اس کو دوزخ میں داخل کر دیتا ہے۔

وضاحت :

وہ آیت جس کے بارے میں حضرت عمرؓ سے سوال کیا گیا سورہ اعراف کی آیت ۱۷۲ ہے۔ اس میں قریش کو وہ عہد فطرت یاد دلایا ہے جو تمام بنی آدم سے اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید و ربوبیت کا لیا۔ اور اس کو بنیاد قرار دے کر ان پر حجت قائم کی ہے کہ کل کو خدا کے حضور میں تم یہ عذر نہیں کر سکو گے کہ تم اس چیز سے بے خبر تھے۔ اس کے بعد آگے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ ہم نے ان جن و انس کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے جن کو ہم نے دل عطا فرمائے لیکن انہوں نے اس سے سمجھنے کا کام نہ لیا، ان کو آنکھیں عطا فرمائیں لیکن ان کی مدد سے انہوں نے حقیقت کو دیکھا نہیں، ان کو کان عطا کیے لیکن ان کی مدد سے انہوں نے پیغمبر کی بات نہ سنی۔ ان لوگوں نے جانوروں کی مانند زندگی گزار دی اور دل و دماغ کی صلاحیتوں اور سمع و بصر کی قوتوں کو کام میں نہ لائے۔

قرآن مجید میں عہد فطرت کا جو بیان ہے اس کے مطابق اس عہد کا تقاضا یہ ہے کہ تمام لوگ اپنی عقل، اپنے شعور اور اپنے حواس کو کام میں لاتے ہوئے اپنے رب کی اطاعت پر قائم رہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو جہنم میں ان کا ٹھکانا ہوگا۔ اس کی وضاحت میں قرآن مجید میں مفصل بحثیں ملتی ہیں۔ اس کے برعکس اس روایت میں یہ تو بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم کے لیے ان لوگوں کو پیدا کیا جو جہنمیوں کے کام کریں گے اور جنت کے لیے ان لوگوں کو پیدا کیا جو جنتیوں کے عمل کریں گے لیکن اس اہم حقیقت کا بیان اس میں نہیں ہے کہ جنت اور جہنم کا سامان وہ قدرت کی طرف سے عطا کردہ قوتوں اور صلاحیتوں کے صحیح یا غلط استعمال کے نتیجہ میں کریں گے۔ لہٰذا روایت نامکمل معلوم ہوتی ہے اور یہ تاثر دیتی ہے جیسے انسانوں کو پہلے ہی سے جنتی یا جہنمی بنا کر دنیا میں بھیج دیا گیا ہے۔

صحیح مسلم میں اس ضمن کی بہت سی روایتیں جمع کی گئی ہیں لیکن زیر بحث روایت اس میں نہیں لی گئی۔ جبکہ دیگر روایات میں صورت واقعہ نہایت واضح طور پر بیان ہوئی ہے۔ مثلاً حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ بقیع کے قبرستان میں کسی جنازہ کے ساتھ تھے کہ نبی ﷺ تشریف لائے اور لوگوں میں بیٹھ گئے۔ آپ سر جھکا کر اپنی چھڑی سے زمین کریدنے لگے۔ پھر فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص کا مقام جنت یا جہنم میں مقرر کر دیا گیا ہے اور یہ بات واجب کر دی گئی ہے کہ وہ خوش بخت ہوگا یا بد بخت۔ اس پر ایک شخص نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ، پھر ہم عمل کو چھوڑ کر اپنے لکھے ہوئے پر ہی کیوں نہ قانع ہو جائیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ خوش بخت آدمی سعادت مندوں کا عمل اختیار کرے گا اور جو بد بخت ہوگا وہ بد بختوں ہی کا عمل اختیار کرے گا۔ لہٰذا تم عمل کرو۔ دونوں قسم کے لوگوں کے لیے عمل کی راہ ہموار کی جائے گی۔ سعادت مند لوگوں کو سعادت مندوں ہی کے عمل کی توفیق عطا کی جائے گی اور بد بختوں کے لیے بد بختوں کے عمل ہی کی راہ ہموار کی جائے گی۔ پھر آپ نے یہ آیات پڑھیں:

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی وَ اَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی (جس شخص نے مال دیا، پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ جانا اس کو تو ہم اہل بنائیں گے راحت کی منزل کا اور جس نے بخل کیا، بے پروائی کی اور اچھے انجام کو جھٹلایا تو ہم اس کو ڈھیل دیں گے کٹھن منزل کے لیے) اس سے معلوم ہوا کہ بندہ جس عمل کو اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ کا اس سے یہ وعدہ ہے کہ اسی عمل کی راہ اس کے لیے ہموار کرے گا اور اسی سے اس کی تقدیر وجود میں آئے گی۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ تَرَكْتُ فِیْكُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا

مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللّٰهِ وَ سُنَّةَ نَبِيِّهِ.

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے تم میں دو چیزیں ایسی چھوڑی ہیں جن کو تم اگر مضبوطی سے تھامو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت۔﴾

وضاحت:

اللہ کی کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے اور سنت نبی سے مراد رسول اللہ ﷺ کا وہ طریقہ ہے جو آپ نے بطور معلم شریعت اور حیثیت کامل نمونہ کے احکام و مناسک کے ادا کرنے اور زندگی کو اللہ تعالیٰ کی پسند کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے لوگوں کو بتایا اور سکھایا۔ قرآن اور سنت میں تعلق روح اور قالب کا ہے۔ قرآن مجید میں جو روح ہے اس کو سنت رسول اللہ ﷺ سے قالب نصیب ہوتا ہے۔ ان دونوں کی باہمی ترکیب سے دین کا نظام کھڑا ہوتا ہے اور اگر کسی ایک کو الگ کر لیجیے تو سارا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا۔

امام صاحب اس روایت کو تقدیر کے باب میں لائے ہیں۔ اس سے شاید یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ انسان اپنی دنیاوی زندگی میں نیکوں یا بدوں کے اعمال کرنے کا اختیار رکھتا ہے لیکن اگر قرآن مجید اور سنت رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں چلے تو وہ کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا اور اپنے لیے جنت کی راہ ہموار کر سکتا ہے۔

دیکھا جائے تو یہ مان لینے کے بعد کہ جنت یا دوزخ کا مقام انسانوں کے لیے پہلے ہی سے طے کر دیا گیا ہے، نہ سلسلۂ انبیاء کی ضرورت رہتی نہ آسمانی صحیفوں کی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجنے کا سلسلہ جاری کیا اور وحی کی رہنمائی انسانوں کو مہیا کی تو ظاہر ہے کہ انسان تربیت پانے کا اہل ہے اور تربیت پا کر اپنی اصلاح کرنے اور جنت میں اپنا مقام بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ رہی یہ بات کہ انسان نیکی کی راہ اختیار کرے گا یا بدی کی، تو یہ اللہ تعالیٰ کے محیط کل علم میں ہے۔ لیکن یہ علم اس کا سبب نہیں بنا اور نہ ہی انسان کو مجبور کر کے نیکی یا بدی کی راہ پر لگایا گیا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زِيَادِ بْنِ سَعْدٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ مُسْلِمٍ عَنْ طَاوُسٍ الْيَمَانِيِّ أَنَّهُ قَالَ أَدْرَكْتُ نَاسًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُونَ كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ قَالَ طَاوُسٌ وَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعَجْزِ وَالْكَيْسِ أَوِ الْكَيْسِ وَالْعَجْزِ.

﴿طاؤس یمانی کا قول ہے کہ میں نے اصحاب رسول اللہ ﷺ میں سے بہت سے لوگوں کو پایا جو اس کے قائل تھے کہ ہر چیز تقدیر سے ہے، اور میں نے عبداللہ بن عمرؓ کو بیان کرتے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر چیز تقدیر سے ہے، یہاں تک کہ بلادت اور زیرکی بھی، یا زیرکی اور بلادت بھی۔﴾

وضاحت:

صحابہ کرامؓ کے اس قول اور آنحضرتؐ کے ارشاد میں تھوڑی سی تشریح ہے۔ ایک بلادت، سفاہت اور بے وقوفی، یا زیرکی، ہوشیاری اور فہم تو وہ ہے جس کو انسان علم، محنت، غور و فکر اور تربیت سے خود ترقی دیتا ہے۔ اور ایک وہ ہے جو خلقی ہے مثلاً کوئی پیدا ہی ہوا ہے بے وقوف یا مادر زاد اندھا۔ اس طرح کے لوگ جو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے کوئی نقص لے کر پیدا ہوتے ہیں ان کا معاملہ تو بالکل صاف ہے اور ان کا انعام بھی بہت بڑا ہے۔ قیامت کے روز لوگ ان پر رشک کریں گے اور کہیں گے کہ کاش ہم فقیر ہوتے، کاش ہم سڑک پر پھرنے والے دیوانے ہوتے۔ اس دنیا کے پیچھے پڑ کے ہم نے اپنی زندگی تباہ کر لی۔ یہ ناقص الخلقت لوگ خدائی ڈیوٹی پر ہیں۔ یہ سڑک پر لگے ہوئے پتھر ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ یہ مادر زاد اندھے کیوں پیدا کیے گئے تو آپ نے فرمایا تاکہ آنکھ والوں کو بھائی دے۔ ان کو بھی نظر آئے کہ خدا ہم کو بھی ایسا بنا سکتا تھا۔ اور اس طرح اپنی سلامتی پر اللہ کا شکر ادا کریں۔

رہے وہ لوگ جو خلقی اعتبار سے اچھے خاصے پیدا ہوتے ہیں، اگر ان کے ماں باپ نے بچپن میں ان کی کوئی تربیت نہ بھی کی ہو تب بھی یہ ہوش سنبھالنے پر اپنی تربیت کی صلاحیت و نشو و نما کی عقل رکھتے ہیں، ایسے لوگوں کو اچھے لوگوں میں بیٹھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسی طرح اگر کسی کو علم و فن حاصل کرنے کا موقع ہے تو خالی دنیا ہی کا فن سیکھنے کی کوشش نہ کرے بلکہ وسیع دائرے میں ترقی کرنے کی کوشش کرے۔ یہ چیزیں ان کے اختیار میں ہیں اور انتخاب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر آپ اچھے گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں، کالجوں کی تعلیم حاصل کی ہے، آپ نے ایک چالاک اور ہوشیار آدمی بننے کی کوشش کی ہے، نیک بننے کی کوئی کوشش نہیں کی، تو آپ اس کے مسئول ہیں۔ لہٰذا جہاں تک بلادت اور زیرکی کا تعلق فطری صلاحیت سے ہے تو وہ خدا کی طرف سے ہے۔ بقیہ میں کسی نہ کسی پر ذمہ داری ضرور آئے گی۔ اگر ماں باپ اس قابل تھے کہ تربیت کرتے اور انہوں نے نہیں کی تو ان پر اس ذمہ داری کا بوجھ ہوگا اور اگر آپ نے خود جد و جہد نہیں کی تو آپ پر بھی ذمہ داری آئے گی۔ ذمہ داری یہ کہ کر ٹالی نہیں جا سکتی کہ یہ تو

تقدیر تھی۔ ساری زندگی خود مطلب بنے رہے تو اس کے نتائج کا خواہ مخواہ اللہ تعالیٰ پر الزام نہیں رکھا جا سکتا۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زِيَادِ بْنِ سَعْدٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ دِينَارٍ أَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ الزُّبَيْرِ يَقُولُ فِي خُطْبَتِهِ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْهَادِي وَالْفَاتِنُ.

﴿عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن زبیرؓ کو خطبے میں یہ کہتے سنا کہ اللہ ہی ہدایت دینے والا ہے اور وہی فتنے میں ڈالنے والا ہے۔﴾

وضاحت:

یہ بات ٹھیک ہے لیکن اس میں بھی تھوڑی سی شرح ہے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے اور فتنے میں ڈالنا بھی اس کے اختیار میں ہے لیکن یہ سب کچھ اس کی سنت کے تحت ہوتا ہے۔ وہ ہدایت اس کو دیتا ہے جو ہدایت کے طالب بنتے ہیں۔ فتنوں میں ان کو ڈالتا ہے جو فتنے میں پڑنے میں بے باک ہوتے ہیں۔ اس روایت کے حوالے سے یہ بات بھی یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جو افعال منسوب ہوتے ہیں ان افعال سے اللہ کی صفت بنانا درست نہیں۔ اسمائے صفات وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق خود استعمال کیے ہیں۔ لفظ فاتن خدا کے اسمائے صفات میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے سنت الٰہی باطل ہوتی ہے اور فتنہ میں پڑنے میں آدمی کا اپنا رول سامنے نہیں آتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کو فاتن کہنا درست نہیں۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَمِّهِ أَبِي سُهَيْلِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّهُ قَالَ كُنْتُ أَسِيرُ مَعَ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ فَقَالَ مَا رَأْيُكَ فِي هَؤُلَاءِ الْقَدَرِيَّةِ فَقُلْتُ رَأْيِي أَنْ تَسْتَتِيبَهُمْ فَإِنْ قَبِلُوا وَإِلَّا عَرَضْتَهُمْ عَلَى السَّيْفِ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ وَذَلِكَ رَأْيِي قَالَ مَالِكٌ وَذَلِكَ رَأْيِي.

﴿امام مالک اپنے چچا ابو سہیل سے روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ساتھ چل رہا تھا کہ انہوں نے پوچھا کہ تمہاری رائے ان قدریہ کے بارے میں کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ آپ ان سے توبہ کا مطالبہ کریں۔ اگر توبہ کر لیں تو فبہا ورنہ ان کو تلوار کے حوالہ کریں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا کہ میری رائے بھی یہی ہے۔ مالک کہتے ہیں کہ یہی میری رائے ہے۔﴾

وضاحت :

اس روایت میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قدریہ سے مراد کون لوگ ہیں۔ ظاہر ہے کہ تقدیر کو ماننے والے مراد نہیں ہو سکتے کہ ان کو واجب القتل ٹھہرایا جائے۔ قدریہ وہ لوگ ہونے چاہیں جو تقدیر پر معترض ہوں، جو بندے کو قادر مطلق سمجھتے اور اس کے افعال کا خالق خود اسی کو سمجھتے ہوں۔ کیونکہ یہی نقطہ نظر قرآن مجید کی تصریحات کے خلاف ہے۔

خود تقدیر کے مسئلہ میں بھی لوگ واضح نہیں ہیں۔ اس کے ماننے والے اس کی تعبیر اس طریقہ سے کر دیتے ہیں کہ جس سے آدمی کی بدی اور گمراہی کا الزام بھی اللہ تعالیٰ پر آتا ہے۔ ان کے نزدیک ہر فعل کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ جبکہ قرآن مجید میں ہے کہ :

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى (اللیل ۵-۱۰)

(سو جس نے انفاق کیا اور پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ جانا اس کو تو ہم اہل بنائیں گے راحت کی منزل کا اور جس نے بخالت کی اور بے پرواہ ہوا اور اچھے انجام کو جھٹلایا اس کو ہم ڈھیل دیں گے کٹھن منزل کے لیے)

اس سے معلوم ہوا کہ جتنی نیکیاں انسان کرتا ہے ان کی توفیق اللہ تعالیٰ دیتا ہے اور جتنی برائیوں کا وہ ارتکاب کرتا ہے ان کو بھی وہ اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ڈھیل نہ ملے۔ کسی عمل کی توفیق ملنے اور ڈھیل حاصل ہونے میں اور خدا کے اس عمل کا خالق ہونے میں جو فرق ہے وہ نہایت واضح ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیت آپ کو دی ہے اسی کے لحاظ سے آپ سے گواہی لی ہے اور نیکی اور بدی کا امتیاز بخشا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو بھیجا تاکہ آپ کو یاد دہانی کرا دیں۔ تذکیر کریں تاکہ آپ کی صلاحیتیں ابھریں۔ چنانچہ آپ نیکی یا بدی کا ارادہ کر سکتے ہیں، اس کے لیے تدبیر کر سکتے ہیں، اس کے لیے اقدام اور جدوجہد کر سکتے ہیں۔ لیکن اس ارادہ کو بروئے کار لانا اللہ کے اختیار میں ہے۔ آپ کے اندر جنت حاصل کرنے کی صلاحیت ہے۔ اگر آپ اس کے خلاف چلتے ہیں تو اپنی صلاحیت کی ناقدری کرتے ہیں۔ آپ کے اندر اصل صلاحیت خیر کی ودیعت کی گئی ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ آپ اس کو اختیار کریں۔ انسان کے اندر ارادہ کے پیدا کرنے میں بہت سی چیزوں کو دخل ہوتا ہے۔ یہ اس کے افعال کا محرک بنتی ہیں۔ ارادہ میں جذبات و خواہشات کو بھی دخل ہے اور ضروریات کو بھی۔

لالچ، حوصلہ، غصہ، نفس امارہ بالسوء یہ سب محرک ہیں۔ اس کے علاوہ انسان کے اندر روحانی قوت اور ملکہ بھی ہے جو اس کے ارادے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس بات کی تمیز دی ہے کہ ہم اپنے ہر فعل پر حکم لگا سکیں کہ اس کا محرک ہماری روح ملکوتی ہے یا حیوانی خواہشات۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ غلط محرک کے آگے رکاوٹ کھڑی کر دے۔ اگر وہ ایسا نہ کر پائے گا تو وہ صبر میں کمزور ہے۔ وہ اپنے نفس کو لگام نہیں دے پاتا۔ اگر وہ غلط محرک کو روک دیتا ہے تو یہ اس کے عزم وہمت پر دلیل ہے۔ اسی چیز میں انسان کا امتحان ہے اور اسی پر جزا یا سزا مترتب ہوگی۔

قرآن مجید میں یہ جو آتا ہے کہ مَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَ مَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے) تو یہ آپ کے اختیار کی تعبیر ہے۔ یعنی آپ کو ایمان اور کفر دونوں کا اختیار ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ آپ ایمان لائیں اور ہدایت کا راستہ اختیار کریں۔ وہ بالجبر کسی پر کوئی چیز نہیں ٹھونستا۔ یہ جو آتا ہے کہ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ یا يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ اس کو خدا کے پسند کرنے کے معنی میں لینا درست نہیں۔ بلکہ اس سے اس کی مشیت کا مطلق ہونا مراد ہے اور یہ اس کی تعبیر کے لیے آتا ہے۔ جن چیزوں کو وہ چاہتا ہے اس کی مشیت ان کی ڈھیل دے دیتی ہے لیکن وہ ان چیزوں کو بھی ڈھیل دے دیتا ہے جن کو وہ نہیں چاہتا۔ اگر خداوند نہ چاہے تو بڑے سے بڑا فرعون بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن چاہنے کے معنی پسند کرنے کے ہرگز نہیں ہیں۔ یشاء کے معنی پسند کرنا لے کر امت کے کئی فرقوں نے بات کو کچھ کا کچھ بنا دیا ہے جس سے تقدیر کا مسئلہ الجھ کر رہ گیا ہے۔

اب ایک سوال باقی ہے کہ کیا مسئلہ تقدیر میں غلطی کی بنا پر لوگوں کو توبہ کی مہلت دی جائے گی اور رجوع نہ کرنے پر قتل کر دیا جائے گا، تو امام مالک کا مذہب یہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حوالے سے ان کا جو مسلک سامنے آتا ہے تو اس کے مطابق انہوں نے اپنے دور حکومت میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ شاید معاملہ رائے ہی تک محدود رہا اور اسی پر ختم ہو گیا۔

تقدیر کی بحث میں ایک سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ کیا یہ بات اللہ تعالیٰ نے لکھ دی ہے کہ فلاں شخص جنت میں جائے گا اور فلاں شخص دوزخ میں، تو یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ ایک شخص فلاں عمل کر کے جنت یا دوزخ میں جائے گا۔ گویا دوزخ یا جنت میں جانے کا ذریعہ انسان کے اپنے اعمال ہوں گے۔ باقی رہ گیا خدا کا علم تو وہ ہر چیز پر محیط ہے۔ لہٰذا وہ ہر انسان کے انجام کو بھی محیط ہے۔ لیکن خدا کا علم کسی کو جنت یا دوزخ میں لے جانے کا سبب نہیں بنے گا۔ سبب انسان کے اعمال ہی ہوں گے۔

جَامِعُ مَاجَاءَ فِي أَهْلِ الْقَدَرِ

اہل قدر کے بارے میں جامع باب

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا تَسْأَلِ الْمَرْأَةُ طَلَاقَ أُخْتِهَا لِتَسْتَفْرِغَ صَحْفَتَهَا وَلْتَنْكِحْ فَإِنَّمَا لَهَا مَا قُدِّرَ لَهَا .

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی عورت اپنی بہن کی طلاق کا مطالبہ نہ کرے تاکہ اس کے حصے کی روٹی پر قبضہ کرلے اور نکاح کرلے۔ اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس کو وہی ملے گا جو اللہ نے اس کے لیے مقدر کر رکھا ہے۔﴾

وضاحت :

مطلب یہ ہے کہ کسی عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مرد سے یہ کہے کہ اگر تم اپنی موجودہ بیوی کو طلاق دے دو تو میں تم سے نکاح کرلوں گی۔ یہ نہایت ہی دناءت کی بات ہے کہ وہ دوسری عورت کی رکابی یا اس کے حصے کی روٹی پر قبضہ کرلے اور اس کے شوہر کو اس سے جدا کر کے اس سے خود نکاح کرلے۔ اس کی دلیل حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمائی کہ اس کو ملے گا وہی جو اللہ تعالیٰ نے مقدر کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ عمر مقدر ہے، رزق مقدر ہے، صحت مقدر ہے، اولاد مقدر ہے، جب یہ سب چیزیں مقدر ہیں تو آدمی کو کم ظرفی اور دناءت کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہو گا وہی جو خدا کو منظور ہو گا۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَزِيدَ بْنِ زِيَادٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ كَعْبٍ الْقُرَظِيِّ قَالَ قَالَ مُعَاوِيَةُ بْنُ أَبِي سُفْيَانَ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّهُ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَى اللّٰهُ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعَ اللّٰهُ وَلَا يَنْفَعُ ذَالْجَدِّ مِنْهُ الْجَدُّ مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ ثُمَّ قَالَ مُعَاوِيَةُ سَمِعْتُ هٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ عَلَى هٰذِهِ الْأَعْوَادِ .

﴿محمد بن کعب قرظی کہتے ہیں کہ معاویہؓ بن ابو سفیان نے، جب وہ منبر پر تھے، کہا اے لوگو! کوئی اس چیز کو روک نہیں سکتا جو اللہ دینا چاہے اور کوئی دے نہیں سکتا جس کو اللہ روک دے۔ اور کسی زور آور کا زور

اللہ کے مقابل اس کے کام نہیں آسکتا۔ اللہ جس کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے اس کو دین کا فہم عطا کر دیتا ہے۔ پھر معاویہ نے کہا کہ میں نے یہ شاندار باتیں رسول اللہ ﷺ سے اس منبر پر سنیں۔﴾

وضاحت :

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ جس کو دینا چاہے اسے کون روک سکتا ہے اور اگر اللہ روک لے تو کون دے سکتا ہے۔ آپ کتنے ہی زور آور ہوں، بخت آور ہوں لیکن یہ چیز اللہ سے جا نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے گا ہاتھ ڈال لے گا اور کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اللہ جس کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے اس کو دین کا فہم عطا کر دیتا ہے۔ اس جملہ میں خاص مفہوم یہ ہے کہ دنیا کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے آدمی خواہ مخواہ میں کیوں ہراساں اور پریشان ہو۔ اللہ تعالیٰ سے وہ نعمت چاہے جس کو کوئی چھین نہیں سکتا۔ سب سے بڑی نعمت دین کی سمجھ ہے۔ یہ گویا چھوٹی باتوں کی جائے بڑی دولت کی طرف اشارہ کر دیا۔ آج کے ماحول میں یہی بات یوں کہی جا سکتی ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ چھوڑ دیتا ہے اس کو موجودہ زمانے کی وزارت و صدارت دے دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسا آدمی متروک و مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ کی عنایت سے بالکل محروم ہو جاتا ہے۔ لیکن دین کے فہم کی قدر یہ لوگ کہاں جانتے ہیں!۔

پھر معاویہؓ نے کہا کہ یہ شاندار باتیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس منبر پر سنیں۔ ھؤلاء کا ترجمہ میں نے شاندار کیا ہے اس لیے کہ ھؤلاء کا اشارہ مذکر کے لیے آتا ہے اور یہاں مؤنث کے لیے آیا ہے۔ عربیت میں یہ ایک قاعدہ ہے کہ ضمیریں اور اشارے استعمال کر کے گویا ایک چیز کی شان بڑھا دی جاتی ہے۔ جیسے قرآن مجید میں فرشتوں اور حضرت آدم کے قصہ میں ہے کہ مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ (باسماء ھؤلاء) اگر تم سچے ہو۔ تو اس وقت فرشتوں سے جن ناموں کے متعلق پوچھا گیا تو اصل میں کچھ جلیل القدر لوگوں کی طرف اشارہ تھا۔

❑ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّهُ كَانَ يُقَالُ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ كَمَا يَنْبَغِي الَّذِي لَا يَعْجَلُ شَيْءٌ أَنَاهُ وَ قَدَّرَهُ حَسْبِيَ اللَّهُ وَ كَفَى سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ دَعَا لَيْسَ وَرَاءَ اللَّهِ مَرْمَى.

﴿امام مالک کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ یوں دعا کی جاتی رہی ہے کہ اس اللہ کا شکر ہے جس نے پیدا کیا جیسا کہ چاہیے تھا۔ وہ اللہ کہ کوئی چیز جو اس کے پاس آئی ہے اور جس کو اس نے مقدر کیا ہے وہ اس

سے عجلت نہیں کرتی۔ اللہ میرے لیے کافی ہے۔ اللہ نے اس کی سن لی جس نے اس سے دعا کی۔ اللہ کے علاوہ آدمی کے لیے کوئی ہدف نہیں۔﴾

وضاحت :

یہ روایت امام مالک کے بلاغات میں سے ہے۔ امام مالک کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مرسل، موقوف، منقطع سب ہی قسم کی روایات لے لیتے ہیں۔ وہ بات کو دیکھتے ہیں۔ اگر وہ بات رسول اللہ ﷺ فرما سکتے ہیں تو وہ لے لیتے ہیں۔ سند کی پروا نہیں کرتے۔ روایت میں بات دیکھی جاتی ہے۔ اگر وہ آنحضرت ﷺ کے فرمانے کی ہے تب زیادہ سند کی کھوج کی ضرورت نہیں اور اگر ایسی بات ہے جو آنحضرت ﷺ سے منسوب نہیں کی جا سکتی تو پھر چاہے بے حد مضبوط ہو، رد کر دی جائے گی۔ یہی بات امام مالک کے عمل سے نکلتی ہے۔ وہ عمل اہل مدینہ کے مقابل میں سند یا روایت کو اہمیت نہیں دیتے۔ یہ بات بھی ان کے قاعدے کے مطابق ہے، اس لیے کہ مدینہ صحابہ کرام کا مرکز تھا۔ بڑے علماء وہی لوگ تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کو خبر نہ ہو اور ان کا عمل آنحضرت ﷺ کے عمل سے الگ ہو۔ یہ بات دل کو اپیل کرتی ہے۔

اب اس روایت کو لیں۔ یہ دعا انھوں نے کسی کو پڑھتے سن لی ہو گی اور نقل کر دی۔ الفاظ صاف معلوم ہوتا ہے کہ غیر مرتب ہیں۔ فقرے اور عبارت شستہ نہیں۔ اگر چہ جتنے بھی ٹکڑے ہیں اسلامی عقائد کے مطابق ہیں۔ امام صاحب کا ظن غالب یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات فرمائی ہو گی۔ لیکن میرا ظن غالب یہ ہے کہ یہ بات آنحضرت ﷺ نے نہیں فرمائی۔ حضور کی دعاؤں کا مزاج اور ان کے الفاظ اتنے اعلیٰ اور ان کی ترکیب اتنی چست ہوتی ہے کہ معجزہ ہوتی ہے۔ کوئی بھی دعا ہو وہ بے حد بلیغ اور جامع ہوتی ہے۔ اس سے اوپر بس قرآن ہی کی زبان ہوتی ہے۔ اس روایت کی دعا میں وہ بلاغت اور شستگی نہیں جو نبی ﷺ کی دعاؤں کا خاصہ ہے اور اس کی ترتیب بھی ویسی نہیں۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّهُ كَانَ يُقَالُ اِنَّ اَحَدًا لَنْ يَمُوتَ حَتّٰى يَسْتَكْمِلَ رِزْقَهُ فَاَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ.

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ یہ کہا جاتا رہا ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک کہ وہ

اپنا رزق مکمل نہ کر لے۔ تو رزق کی طلب میں خوبصورت طریقہ اختیار کرو۔﴾

وضاحت :

جو رزق مقدر ہے اور اللہ تعالیٰ نے لکھ رکھا ہے وہ تو مل کر رہے گا۔ آپ کا کام یہ ہے کہ آپ خوبصورت طریقے سے اس کو طلب کریں۔ اس میں ایک بات تو یہ ہے کہ رزق مقدر ہونے کے باوجود یہ فرمایا کہ طلب آپ کو ہی کرنا ہے۔ اس لیے کہ آپ کے ارادے اور جدوجہد کا امتحان تو خدا کرے گا ہی، ارادے کو بروئے کار لانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ جتنا اس نے مقدر کیا ہے وہ دے گا اتنا ہی۔ اب اگر ایک شخص کا عقیدہ یہ ہے کہ جو رزق اللہ نے میرے لیے لکھ رکھا ہے وہ تو مجھے ملے گا ہی، تو وہ جدوجہد کرنے میں چوری، بے ایمانی، رشوت یا اس قسم کی دوسری حرکتیں نہیں کرے گا۔ بلکہ جو صحیح راستہ ہے وہ اختیار کرے گا۔

یہ روایت بھی امام مالکؒ کے بلاغات میں سے ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے الفاظ ہیں۔ عبارت کی چستی اور الفاظ میں معنی کا عجز بیکراں ہے کہ جس کی شرح نہیں ہو سکتی۔

مَاجَاءَ فِي حُسْنِ الْخُلُقِ

حسن اخلاق کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ قَالَ آخِرُ مَا اَوْصَانِي بِهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حِيْنَ وَضَعْتُ رِجْلِي فِي الْغَرْزِ اَنْ قَالَ اَحْسِنْ خُلُقَكَ لِلنَّاسِ يَا مُعَاذُ بْنَ جَبَلٍ.

﴿معاذ بن جبلؓ نے بیان کیا کہ آخری بات، جس کی رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس وقت نصیحت فرمائی جس وقت میں نے رکاب میں اپنا پاؤں رکھا، یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک رکھنا، اے معاذ بن جبل﴾

وضاحت :

اس روایت میں انقطاع ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک کو اصل مطلب بات سے ہے۔ سند کو وہ زیادہ اہمیت نہیں دے رہے ہیں اور یہ بات بھی نبی ﷺ کے اپنے الفاظ میں معلوم ہوتی ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اس موقع کی ہے جب معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجا گیا۔ چونکہ ان کو وہاں گورنری کے

عہدہ پر بھیجا گیا تھا تو سب سے اہم نصیحت ان کو اس موقع پر یہی کی جا سکتی تھی کہ لوگوں کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آئیں۔ نبی ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے سامنے کوئی معاملہ آئے تو کیسے فیصلہ کرو گے۔ انہوں نے کہا کہ کتاب اللہ کی روشنی میں فیصلہ کروں گا۔ اگر کتاب اللہ سے رہنمائی نہ ملی تو سنت رسول سے مدد لوں گا۔ اگر وہاں بھی کچھ نہ پایا تو اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔ نبی ﷺ نے اس جواب پر معاذ کی تحسین فرمائی اور وہ آخری ہدایت دی جو اس روایت میں ہے۔

یہ ہدایت بہت اہم ہے اس لیے کہ اعلیٰ اخلاق یوں تو سب کے لیے بے حد ضروری ہے لیکن خاص کر حکمرانوں کا اخلاق تو بہت اچھا اور بے حد شریفانہ ہونا چاہیے تاکہ عوام اپنے مسائل ان کے آگے بلا خوف پیش کر سکیں اور انصاف حاصل کر سکیں۔ لیکن بالعموم ہوتا یہ ہے کہ حکمران عرش پر چڑھ جاتے ہیں اور کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔ آنحضرت ﷺ کی نصیحت حکمرانوں کے لیے نہایت برمحل ہے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهَا قَالَتْ مَا خُيِّرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي أَمْرَيْنِ قَطُّ إِلَّا أَخَذَ أَيْسَرَهُمَا مَالَمْ يَكُنْ إِثْمًا فَإِنْ كَانَ إِثْمًا كَانَ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ وَمَا انْتَقَمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِنَفْسِهِ إِلَّا أَنْ تُنْتَهَكَ حُرْمَةُ اللَّهِ فَيَنْتَقِمُ لِلَّهِ بِهَا.

﴿حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جب ایسی صورت آتی کہ جس میں دو پہلو ہوتے تو آپ اس پہلو کو اختیار کرتے جو دونوں میں سے آسان تر ہوتا، بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہوتا۔ اگر وہ گناہ ہوتا تو آپ لوگوں میں سب سے زیادہ گناہ سے دور تر رہتے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنی ذات کا انتقام نہیں لیا۔ ہاں اگر دین کی بے حرمتی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کی خاطر اس کا انتقام لیتے تھے۔﴾

وضاحت:

اگر کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو جس میں آپ کو فیصلہ کرنا ہو اور اس میں دو پہلو ہوں جن میں سے کسی بھی پہلو کو اختیار کرنے میں آپ آزاد ہوں تو وہ پہلو اختیار کرنا چاہیے جو سہل تر ہو۔ دین کے ہر معاملہ میں صحیح بات یہی ہے کہ وہ پہلو اختیار کریں جو آسان ہو اس لیے کہ اگر آپ سختی میں آ کر یہ کریں کہ میں تو سخت پہلو ہی اختیار کروں گا

تو مار کھا جائیں گے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص دین کے ساتھ دھینگا مشتی کرے گا تو دین اس کو پچھاڑ دے گا اور وہ شخص اپنے ارادے کو پورا کرنے میں ناکام ہو جائے گا۔ نبی ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کسی معاملہ میں دو پہلو ممکن ہوتے تو آپ اس میں سے وہ پہلو اختیار کر لیتے جو سہل تر ہوتا، بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔ اگر گناہ کا شائبہ تک بھی ہوتا تو آپ اسے اختیار نہیں کرتے تھے۔

دوسری بات یہ تھی کہ آپؐ اپنی ذات کے لیے کبھی انتقام نہ لیتے۔ آپ کو گالی دی گئی اور توہین کی گئی۔ آپ نے یہ سب کچھ برداشت کر لیا کیونکہ یہ آپ کی ذات کا معاملہ تھا۔ لیکن اللہ کے دین کی حرمت کو جن لوگوں نے نقصان پہنچایا تو ان سے آخر آپ نے جنگ بھی کی۔ اسی طرح اگر کسی نے دین کی بے حرمتی کی تو اس کو آپؐ نے سزا بھی دی۔ کسی نے کوئی حق تلفی کی تب بھی آپ نے مظلوم کو اس کا حق دلایا۔ لیکن اپنی ذات کے معاملہ میں آپ لوگوں کے لیے بے حد فیاض، کریم النفس اور درگزر فرمانے والے تھے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ.

﴿علی بن حسینؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے یہ ہے کہ وہ اس چیز کو چھوڑ دے جو اس کے متعلق نہ ہو۔﴾

وضاحت:

مطلب یہ ہے کہ جیسے آپ کہتے ہیں کہ اس چیز سے میرا کیا واسطہ، یہ میرا Concern نہیں، تو یہ اسلام کی خوبیوں میں سے ہے۔ اسلام کے بہت سے درجے ہیں۔ اسلام کو اگر کوئی شخص بہترین طریقے پر اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مقصد زندگی سے غیر متعلق باتوں میں نہ پڑے۔ یہاں منہیات کا سوال نہیں ہے۔ ان سے بچنا تو واجبات دین میں سے ہے۔ یہاں مراد وہ چیزیں ہیں جو جائز ہیں لیکن مقصد زندگی کے لحاظ سے کچھ اہمیت نہیں رکھتیں۔ آنحضرت کا یہ ارشاد بہت بڑی حکمت کی بات ہے۔ اس حدیث کے متعلق لوگوں نے کہا ہے کہ یہ ان تین بڑی حدیثوں میں سے ایک ہے جو اصولی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی حکمت بیان نہیں ہو سکتی۔

جو چیزیں زندگی میں جائز ہیں ان میں سے ہر چیز کو تو اختیار کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ آپ اپنی زندگی کے لیے کوئی ایک لائن اختیار کریں گے تو اس لائن سے جو چیزیں موافقت رکھتی ہیں، جو چیزیں مقصد میں مددگار ہو سکتی ہیں

اور آپ کے لیے بابرکت ہو سکتی ہیں صرف وہی آپ کو اختیار کرنی چاہییں۔ باقی دوسری چیزوں میں خواہ مخواہ میں چونچیں لڑانا اور ہر میدان کا غازی بننے کی کوشش کرنا ایک غیر مفید کام ہوتا ہے۔ یہ اصول سیاست میں، مذہب میں، تحقیق میں، غرض سب چیزوں میں کار آمد ہے۔ دنیا میں جتنے بھی قابل ذکر لوگ گزرے ہیں ان کی یہ حالت نہیں تھی کہ خدائی فوجدار کی طرح ہر چیز میں ٹانگ اڑاتے پھریں۔ بلکہ انہوں نے ایک لائن اختیار کی اور مضبوطی سے اس پر جمے رہے اور تمام غیر متعلق چیزوں کو انہوں نے نظر انداز کیا۔

اس بات کو یوں بھی سمجھ لیں کہ اپنی زندگی کو صحیح رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے جو فرائض متعین کیے ہیں وہ بجا لائیں۔ مثلاً یہ فرمایا کہ "کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ" تم میں سے ہر ایک راعی بنایا گیا ہے اور اس سے اس کے گلے کے متعلق پوچھا جائے گا۔ تو اپنے گلے کی فکر کریں۔ اگر اپنے گلے کو چھوڑ کر دوسروں کے گلوں کی چرواہی کرتے پھریں تو یہ حماقت ہے۔ فرض کریں کہ ایک شخص ہے۔ اس کا مقدم فریضہ ہے کہ اپنے خاندان کو، اپنے بچوں کو سنبھالے۔ یہ جواب اس کے لیے ٹھیک نہ ہوگا کہ میں تو خلق خدا کی تربیت پر لگا رہا۔ میرے بچے گمراہ ہو گئے تو میں کیا کرتا۔ یہ جواب آپ کو بچا نہ سکے گا۔ علیٰ ھذا القیاس آپ کے پڑوس سے متعلق آپ کی ذمہ داری ہے۔ آپ اس کی فکر کریں۔ آپ ساری دنیا کی فکر تو نہیں کر سکتے۔ اسی طرح یہ ذمہ داری بھی ہے کہ جو کوئی برائی دیکھے تو اس کی اصلاح کرے۔ اگر طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے ورنہ زبان سے روکے، اور یہ بھی نہ ہو تو دل میں برا جانے۔ یہ کمزور ترین ایمان ہے۔ اصلاح کا یہ کام آپ کی زندگی کی مہمات میں سے ہے۔ اس سے زیادہ کے لیے آپ کے پاس فرصت ہے تو کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر غیر ضروری معاملات میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ زندگی کے جو اصل فرائض ہیں انسان اگر ان کو ہی صحیح طور پر ادا کرنا چاہے تو یہ واقعہ ہے کہ ان کو بھی صحیح طور پر ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب انہی کو انجام دینا مشکل ہے تو غیر ضروری پرائے جھگڑے آپ اپنے سر پر کیوں لیں۔

اگر آپ کو خدمت خلق کا شوق ہے لیکن گھر کی خبر نہیں اور باہر کے تمام لوگوں کے لیے بھاگے پھرتے ہیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرہ تباہ ہو کے رہ جائے گا۔ اچھے لوگ، قابل لوگ، ذمہ دار لوگ اور قوم و ملت کی خدمت کرنے والے وہی لوگ ہوں گے جو اپنی زندگی اس اصول کے تحت گزاریں کہ میں ایک مسلم ہوں۔ مسلم کی حیثیت سے مجھے اپنی زندگی کا نصب العین مقرر کر لینا ہے۔ اور جو چیزیں اس سے لگا کھاتی ہیں صرف ان کو لینا ہے اور جو ان

سے بے جوڑ ہیں ان سے احتراز کرتا ہے۔ آپ لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ نہ معلوم کتنا وقت کرکٹ کھیلنے اور دیکھنے میں گزار دیتے ہیں۔ جو بات اپنے سروکار کی نہ ہو اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ ہر وقت اپنے نصب العین کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ یہ روایت بہت شاندار ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهَا قَالَتْ اسْتَأْذَنَ رَجُلٌ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ قَالَتْ عَائِشَةُ وَ اَنَا مَعَهُ فِي الْبَيْتِ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بِئْسَ ابْنُ الْعَشِيْرَةِ ثُمَّ اَذِنَ لَهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ قَالَتْ عَائِشَةُ فَلَمْ اَنْشَبْ اَنْ سَمِعْتُ ضَحِكَ النَّبِيِّ ﷺ مَعَهُ فَلَمَّا خَرَجَ الرَّجُلُ قُلْتُ يَارَسُولَ اللّٰهِ قُلْتَ فِيهِ مَا قُلْتَ ثُمَّ لَمْ تَنْشَبْ اَنْ ضَحِكْتَ مَعَهُ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ مِنْ شَرِّ النَّاسِ مَنِ اتَّقَاهُ النَّاسُ لِشَرِّهِ.

﴿حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے آنے کی اجازت مانگی۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں گھر میں آپ کے ساتھ تھی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ قبیلے کا برا آدمی ہے۔ پھر اس کو اجازت دے دی۔ زیادہ دیر نہ گزری کہ میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ اس کے ساتھ ہنس رہے ہیں۔ جب وہ شخص نکل گیا تو میں نے کہا یا رسول اللہ! آپ نے اس کے بارے میں جو بات کہی وہ تو کہی اور پھر میں نے آپ کو دیکھا کہ زیادہ دیر نہیں گزری کہ آپ اس کے ساتھ ہنس کر باتیں کر رہے ہیں، یہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بدترین آدمی وہ ہے کہ جس کے شر کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا جلنا ترک کر دیں۔﴾

وضاحت :

آدمی سے ملاقات کے دوران آنحضرت ﷺ نے ہنس ہنس کر باتیں کیں تو یہ حقیقت میں آداب گفتگو اور آداب ملاقات میں سے ہے۔ ملنے والا دوست ہو یا دشمن، آدمی کو ملاقات اور گفتگو کے معاملے میں سیاسی ہونا چاہیے۔ یہ مناسب نہیں ہوتا کہ آپ ہر وقت لٹھ لیے بات کریں کہ تو کافر ہے، مرتد ہے، جاہل ہے، میں تجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ جو بھی آئے اس سے بات قرینے سے کریں، دلیل سے کریں، مہذب اور شائستہ طریقے سے

کریں۔ یہ آداب گفتگو میں سے ہے۔

آنحضرتؐ نے اس شخص کے متعلق جو یہ فرمایا کہ بئس ابن العشیرۃ اس پر لوگ بحث کرتے ہیں کہ آپ نے یہ غیبت کیوں کر جائز کرلی۔ میرے نزدیک نہ یہ غیبت تھی اور نہ آنحضرتؐ نے غیبت کو جائز کرلیا۔ غیبت وہ ہوتی ہے جس میں کسی کو بدنام کرنا مقصود ہو اور آدمی یہ کام اس کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر کر رہا ہو۔ رستہ چلتے کسی کے بارے میں رائے دینا اس ذیل میں نہیں آتا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ جو لوگ پبلک زندگی گزارنے کے مدعی ہیں، وہ ہمارے لیڈر اور امام بن کر سامنے آتے ہیں، لوگوں سے وفاداری اور سمع و طاعت کا اقرار لینے کی جدوجہد کرتے ہیں تو ان کی زندگی پبلک ہوتی ہے۔ آپ ان پر ہر جگہ تنقید کر سکتے ہیں، بحث کر سکتے ہیں، اخباروں میں لکھ سکتے ہیں، ان کی ایک ایک چیز پر ان کے لتے لے سکتے ہیں، اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے متعلق کچھ کہنا غیبت نہیں۔ جن لوگوں نے اس کو غیبت سمجھا ہے میں نہیں جانتا کہ انھوں نے غیبت کا مفہوم کیا سمجھا ہے۔ جو لوگ پبلک میں نہیں جاتے، کوئی دعویٰ نہیں کرتے اور اپنی توفیق کے مطابق جو خدمت بن آئے وہ کرتے ہیں، اس قسم کے لوگوں کے متعلق اگر کوئی شخص پس پردہ بات کرے اور وہ بات ایسی ہو کہ اس کی خواہش یہ ہو کہ وہ متعلقہ آدمی نہ جاننے پائے تو یہ غیبت ہے، چاہے بات جائے خود صحیح ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو دوسرے کے منہ پر کہنے کا تو حق حاصل ہے تاکہ اس کو نصیحت ہو لیکن پس پردہ کہنے کا کیا فائدہ! اس نے اپنے آپ کو پبلک میں تو پیش نہیں کیا ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک آنحضرت ﷺ کی اس بات کو غیبت کہنا غلط ہے۔

❏ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَمِّهِ أَبِي سُهَيْلِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ كَعْبِ الْأَحْبَارِ أَنَّهُ قَالَ إِذَا أَحْبَبْتُمْ أَنْ تَعْلَمُوا مَا لِلْعَبْدِ عِنْدَ رَبِّهِ فَانْظُرُوا مَاذَا يَتْبَعُهُ مِنْ حُسْنِ الثَّنَاءِ.

﴿ابو سہیل بن مالک اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ کعب احبار نے کہا کہ جب تم یہ جاننا چاہو کہ اس بندے کا اللہ کے ہاں کیا مرتبہ ہے تو اس بات کو دیکھو کہ لوگ اس کے پیچھے کیا تعریف کرتے ہیں۔﴾

وضاحت :

یہ رسول اللہ ﷺ کا قول نہیں بلکہ کعب احبار کی بات ہے۔ میرے خیال میں یہ بات انھوں نے اپنے اس علم کے مطابق کہی ہوگی جو ان کو یہود سے ملا تھا۔ ہمارے ہاں یہ مضمون اس سے قدرے مختلف آتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک شخص کا جنازہ جا رہا تھا تو لوگوں نے کہا کہ مرنے والا بہت صالح اور متقی بندہ تھا، شاید اس نے جنت پالی۔ اسی

طریقے سے ایک دوسرے آدمی کا جنازہ اٹھا تو لوگوں نے مرنے والے کو برا آدمی کہا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ دونوں آدمیوں کے ساتھ معاملہ لوگوں کی رائے کے مطابق ہوگا کیونکہ تم لوگ شھداء اللہ فی الارض (روئے زمین پر اللہ کے گواہ) ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک یہ امت شھداء اللہ فی الارض کے مقام پر فائز رہی اس وقت تک اس کی شہادت کا یہی درجہ تھا کہ جس کے متعلق اس نے کہا کہ خیر ہے، خدا کے ہاں بھی وہ خیر ہی قرار پایا۔ لیکن جب امت اس مرتبہ سے گر گئی تب ان کی شہادت کا کچھ وزن نہیں۔ اس وقت عالم اسلام کے چوٹی کے لیڈروں کا جو پوری قوم کے ماں باپ سمجھے جاتے ہیں، حال یہ ہے کہ ان کی زندگیوں کا اسلام سے کوئی تعلق جوڑنا چاہے تو مشکل سے بھی آپ کو اس کا کوئی سراغ نہیں ملے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شھداء اللہ فی الارض نہیں رہے۔

حضرت کعبؓ کی بات ان لوگوں کے متعلق درست ہے جو اپنے صحیح مقام پر ہیں۔ یہ صالحین و ابرار کے تعلق سے درست ہے، ہمارے اول دور کے متعلق درست ہے، لیکن اس زمانے میں یہ بات غلط ہے کہ جس کے پیچھے جتنے زیادہ لوگ ہیں وہ اتنا ہی بڑا جنتی ہے۔ ہمارے معاشرہ میں آج کل جتنا ہی کوئی بڑا ممدوح ہے وہ اتنا ہی دین کے اعتبار سے ناقص نظر آتا ہے۔ لیکن لوگ اس کے شیدائی ہوتے ہیں۔

☐ **حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّهُ قَالَ بَلَغَنِي أَنَّ الْمَرْءَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الْقَائِمِ بِاللَّيْلِ الظَّامِئِ بِالْهَوَاجِرِ.**

﴿یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ آدمی اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے رات میں نماز کے لیے کھڑے ہونے والے اور سخت دھوپ میں روزہ رکھنے والے کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔﴾

وضاحت:

حسن اخلاق سے مراد دانت نکال کر بات کرنا نہیں بلکہ لوگوں کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آنا، لوگوں کی خدمت کرنا، ان سے ہمدردی کرنا، ان کی صحیح رہنمائی کرنا اور ان کی غلطیوں کو معاف کرنا ہے۔ یہ تمام کام جو شخص کرتا ہے وہ قائم باللیل اور صائم بالنہار کا ثواب حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نماز چھوڑ دیں، روزہ نہ رکھیں اور پھر بھی وہ مرتبہ آپ کو مل جائے۔ نہیں، آپ نماز پڑھتے رہیں گے، روزہ رکھیں گے اور حسن اخلاق سے پیش آئیں گے تو اگرچہ آپ نے زیادہ نمازیں نہیں پڑھیں، زیادہ روزے نہیں رکھے تو حسن خلق کی وجہ سے ان کی قدرے تلافی ہو جائے گی۔ مقصود آپ کو با کردار آدمی بنانا ہے۔

حدیث میں دوسری جگہ یہ بات بھی آئی ہے کہ ایک خاتون نمازیں تو زیادہ نہیں پڑھتی تھی لیکن دوسرے اس کی اذیت سے محفوظ رہتے اور وہ کچھ خیرات بھی کرتی تھی، تو آپ نے فرمایا کہ وہ جنتی ہے۔ عبادات میں جتنا فرض اور واجب ہے وہ کرنا ضروری ہے۔ اگر نماز روزہ چھوڑ دیں گے اور دن رات لوگوں کی خدمت کرتے رہیں گے تو آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ لیکن اگر آپ نماز روزہ واجب طریقے سے کرتے ہیں اور خدمت خلق بھی کرتے ہیں تو بلاشبہ آپ کا جتنا خلق اچھا ہو گا اس سے عبادات میں کمی کی تلافی ہوتی رہے گی۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ يَقُولُ أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِخَيْرٍ مِنْ كَثِيرٍ مِنَ الصَّلَاةِ وَالصَّدَقَةِ قَالُوا بَلَى قَالَ إِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ وَ إِيَّاكُمْ وَالْبِغْضَةَ فَإِنَّهَا هِيَ الْحَالِقَةُ.

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ میں نے سعید بن مسیب سے سنا۔ وہ لوگوں سے پوچھ رہے تھے کہ کیا میں تم کو بتاؤں کہ زیادہ نماز اور زیادہ صدقہ سے بہتر کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ تو کہنے لگے کہ دو آدمیوں کے درمیان معاملہ کی اصلاح کر دینا اور بغض اور عناد سے بچنا کہ یہ چیز مونڈ دینے والی ہے۔﴾

وضاحت :

مونڈ دینے کا مطلب یہ ہے کہ پھر اس کے بعد آدمی کے اندر دین کا کوئی شائبہ رہ ہی نہیں جاتا۔ جس طرح سے حجام سر مونڈ دیتا ہے اس طریقے سے باہمی بغض و عناد سارے دین کا تیا پانچہ کر دیتا ہے۔ یہ صالح مسلمانوں کے لحاظ سے درست بات ہے۔ لیکن جو شخص دین کا دشمن ہو گیا ہو اس سے بغض رکھنا ایمان کی علامت ہے۔

اس روایت کا مطلب بھی اوپر والی روایت کا ہی ہے کہ زیادہ نماز اور زیادہ صدقہ سے بڑھ کر اصلاح ذات البین کا مقام ہے۔ یعنی اگر آپ کے علم میں ہے کہ دو اچھے بھائیوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہے تو اس اختلاف کو دور کرنا اور ان میں صلح کرا دینا بہت بڑی نیکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان باہم مل کر ایک دیوار کی طرح ہیں جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔ اگر ایک اینٹ بھی کھسک جائے تو پوری دیوار میں رخنہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وحدت کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اختلافات دور کیے جائیں۔ یہاں بھی یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگر دین کے معاملے میں اختلاف ہے تو اس میں خدا کے واسطے سے صلح کرانے کی کوشش نہ کریں۔ اگر آپ کو

پورا علم نہیں ہے تو خواہ مخواہ اس میں دخل نہ دیں۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ قَدْ بَلَغَهُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ حُسْنَ الْأَخْلَاقِ.

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں بھیجا گیا ہوں کہ حسن اخلاق کی تکمیل کروں۔﴾

وضاحت:

بعض روایتوں میں حسن اخلاق کی جگہ مکارم الاخلاق ہے۔ روایت کے معنی کے لحاظ سے میں اس کو ترجیح دیتا ہوں۔ یہ فرق روایت بالمعنی ہونے کی وجہ سے ہے۔

جب آنحضرت ﷺ دین مکمل کرنے کے لیے مبعوث ہوئے تو مکارم اخلاق کی تکمیل بھی آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھی۔ تمام اعلیٰ اخلاق، اعلیٰ کردار جس کو آپ کیرکٹر کہتے ہیں، اور اس میں قومی کردار بھی شامل ہے اور انفرادی کردار بھی، ان سب میں نقطہ کمال سے آپ نے امت کو آگاہ فرمایا تاکہ کوئی خلا باقی نہ رہ جائے۔ اور آپ نے اس کا حق ادا کر دیا۔

مَاجَاءَ فِي الْحَيَاءِ

حیا کے بارے میں روایات

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ سَلَمَةَ بْنِ صَفْوَانَ بْنِ سَلَمَةَ الزُّرَقِيِّ عَنْ زَيْدِ بْنِ طَلْحَةَ بْنِ رُكَانَةَ يَرْفَعُهُ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لِكُلِّ دِينٍ خُلُقٌ وَ خُلُقُ الْإِسْلَامِ الْحَيَاءُ.

﴿زید بن طلحہ بن رکانہ اس روایت کو نبی ﷺ تک مرفوع کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر دین کا ایک خلق خاص ہوتا ہے اور اسلام کا خلق خاص حیا ہے۔﴾

وضاحت:

زید بن طلحہ بن رکانہ کی صحابیت مشکوک ہے، اس لیے یہ روایت موقوف ہے۔ لیکن بات جائے خود اپنی

جگہ پر مبنی بر حق ہو تو بات مان لی جائے گی۔ یہ روایت بھی اسی طرح کی ہے کہ نبی ﷺ کا ارشاد معلوم ہوتی ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ تک تمام انبیاء کا دین ایک ہی تھا اور وہ دین فطرت ہے، اس لیے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی چیز ہر پیغمبر کے ساتھ کیسے مخصوص ہو گی۔ لیکن یہ بات ہو سکتی ہے کہ ایک دین میں کسی خاص کردار پر زیادہ زور دیا گیا ہو اور دوسرے دین میں کسی دوسرے کردار پر۔ اس کی مثالیں تاریخ ادیان میں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاں ترک دنیا اور زہد پر اس مؤثر طریقہ پر زور دیا گیا ہے کہ بعد والوں کو مغالطہ ہو گیا اور رہبانیت کی طرف ان کا رجحان زیادہ ہو گیا۔ یہ بات نہیں ہے کہ ترک دنیا اور زہد کی تعلیم سے دوسرے ادیان خالی ہیں لیکن عیسائیت میں اس کا غلبہ ہو گیا۔ ٹھیک اسی طرح اسلام میں حیا کو خاص اہمیت دی گئی اور یہ مسلمان کا خاص کردار ہے۔

جہاں تک احادیث کا تعلق ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ ان میں حیا کی خاص تعلیم ہے۔ مثلاً الحیاء شعبۃ من الایمان (حیا ایمان کی ایک شاخ ہے) بہت سی نیکیوں کو فروغ دینے میں حیا کا خاص دخل ہے۔ سب سے زیادہ حیا تو آدمی کو خدا تعالیٰ سے ہونی چاہیے۔ اس سے بہت سی نیکیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کردار کے بہت سے پہلو اس میں آتے ہیں اور میرے نزدیک تو یہ ہے کہ آدمی کے اندر اگر حیا نہ ہو تو کوئی بری سے بری چیز بھی اس سے بعید نہیں۔

یہ بات نہیں کہ اسلام کے ساتھ ہی حیا کو خصوصیت ہے اور دوسرے ادیان اس سے خالی ہیں۔ بلکہ تمام ادیان میں اس کا ایک مقام ہے۔ لیکن اسلام میں اس پر زور دیا گیا ہے۔ خاص طریقے پر آنحضرت ﷺ نے اپنے عمل سے اس کو نمایاں کیا ہے۔ آنحضرتؐ کے متعلق احادیث میں آیا ہے کہ آپ کنواری لڑکی کی طرح شرمیلے تھے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر کا جب یہ کردار ہو گا تو امت کے اندر وہی چیز اس کے قول اور فعل سے منتقل ہو گی۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ عرب ذرا اکھڑ تھے تو ان کے اس مزاج کی درستی کے لیے حیا پر زیادہ زور دیا گیا۔

الحیاء شعبۃ من الایمان سے متعلق ایک اور بات یاد رکھیے۔ صوفیاء کے نزدیک کردار کی منزلیں ہوتی ہیں۔ ان کے نزدیک حیا ایک منزل ہے۔ یعنی کچھ روز آپ اس منزل پر قیام کریں گے، پھر دوسری جگہ جائیں گے، اس کے بعد تیسری جگہ۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ الگ الگ مقامات کوئی نہیں ہیں کہ کچھ دن آپ حیا میں معتکف رہیں، اس کے بعد فتوت میں منتقل ہو جائیں، اس کے بعد وجودیت میں چلے جائیں وغیرہ۔ کردار حیثیت مجموعی ایک ساتھ چلتا ہے، ہر آدمی بیک وقت ان تمام کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایمان ان کا جامع ہے اور یہ سب اس کی فروع ہیں۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ مَرَّ عَلٰى رَجُلٍ وَهُوَ يَعِظُ اَخَاهُ فِي الْحَيَاءِ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ دَعْهُ فَاِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْاِيْمَانِ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک شخص پر ہوا جبکہ وہ اپنے بھائی کو حیا کے بارے میں ملامت کر رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو، حیاء تو ایمان کا شعبہ ہے۔﴾

وضاحت:

مطلب یہ ہے کہ حیاء تو ایمان کے شجرہ طیبہ کی ایک شاخ ہے۔ اگرچہ یہ بہت بڑی شاخ ہے، لیکن ہے ایک شاخ ہی، مقام یا منزل نہیں کہ آپ کچھ دن اس پر قیام کریں تو پھر آپ مسلمان ہیں۔

آدمی کے اپنے بھائی کو ملامت کرنے کے دو مطلب نکل سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اس کو اس بات پر ملامت کر رہا تھا کہ تو نالائق ہے، عورتوں کی طرح شرماتا ہے، دنیا کا کیا کام کرے گا، بہادر بن۔ دوسرا یہ کہ وہ اس کو بے حیائی پر سرزنش کر رہا تھا۔ میرے نزدیک وہ شخص بھائی کے شرمیلے پن پر ملامت کر رہا تھا۔ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا اس کی جان چھوڑو۔ حیا تو ایمان کے تقاضوں میں سے ہے۔

مَاجَاءَ فِي الْغَضَبِ

غصے کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ حُمَيْدِ ابْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ اَنَّ رَجُلًا اَتٰى اِلٰى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ يَارَسُولَ اللّٰهِ عَلِّمْنِي كَلِمَاتٍ اَعِيْشُ بِهِنَّ وَلَا تُكْثِرْ عَلَيَّ فَاَنْسٰى فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَغْضَبْ.

﴿حمید بن عبدالرحمٰن روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا۔ اس نے کہا کہ یارسول اللہ، مجھے کچھ ایسے کلمات نصیحت فرما دیجئے کہ میں ان کی رہنمائی میں صحیح زندگی گزار سکوں۔ کلمات کچھ زیادہ نہ ہوں کہ میں بھول جاؤں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غصہ سے باز رہو۔﴾

وضاحت:

اس حدیث پر غور کرتے ہوئے مجھے یہ پریشانی پیش آئی کہ غصہ تو محبت، نفرت، شجاعت وغیرہ جیسے جذبات کی طرح فطرت کا تقاضا ہے۔ یہ غیرت کا تقاضا بھی ہے اور عدل کا بھی۔ اسی کے باعث آدمی مدافعت کرتا اور اپنے دشمنوں سے انتقام لیتا ہے۔ نکما ہے وہ آدمی کہ جس کو غصہ نہ آئے۔ غصہ آنا تو فطری امر ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے ممانعت کس چیز کی کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ غصہ تو آنا چاہیے لیکن غصے سے مغلوب ہو کر کوئی غلط اقدام نہیں کرنا چاہیے۔ گویا ممانعت غصہ آنے کی نہیں بلکہ غصہ میں ایسی حرکت کرنے کی ہے جو عدل سے متجاوز ہو۔ غصہ کے دو حصے ہو سکتے ہیں۔ ایک قولی اور دوسرا عملی۔ ایک یہ کہ غصہ آیا تو اول فول بکنا شروع کر دیا۔ گالیاں دینا شروع کر دیں اور دوسرا یہ کہ پتھر مار دیا، ڈنڈا لگا دیا۔ یہ دونوں کام غلط ہیں۔ غصہ کے اس طرح اظہار پر قابو پانا چاہیے اور اگر ایسی غلطی ہو جائے تو جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو اس سے معافی مانگنی چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اس نصیحت میں انسانوں کی ایک بہت بڑی کمزوری کی طرف توجہ دلائی ہے۔ غصے کے محرکات بہت سارے ہوتے ہیں لیکن ان کی وجہ سے حدود سے تجاوز نہیں ہونا چاہیے۔ آنحضرت ﷺ نے غصہ پر قابو پانے کے طریقے بھی بتائے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر آپ کھڑے ہیں تو بیٹھ جائیں اور اگر بیٹھے ہیں تو لیٹ جائیں۔ بہر حال ایک مسلمان کا عزم ہونا چاہیے کہ میں غصے کا ساتھ نہیں دوں گا، چاہے کچھ ہو جائے۔ اگر آپ اس میں کامیاب ہو گئے تو آپ کو اپنی تربیت میں نمایاں کامیابی ہو جائے گی اور اگر ناکام ہوئے تو پھر جس سے زیادتی ہو اس سے معافی مانگیے تاکہ نفس کے زور کا کسر ہوتا رہے۔ اللہ تعالیٰ سے بھی معافی مانگتے رہنا چاہیے تاکہ وہ بھی اس زیادتی کو معاف کر دے۔

آنحضرتؐ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دین و شریعت کے ہتک کا معاملہ ہوتا تو غصہ سے آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ آنکھوں میں سرخی آجاتی۔ مجرموں کے ساتھ معاملہ میں آپ رواداری نہ کرتے۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ شیطان صفت انسانوں کا معاملہ الگ ہے۔ ان پر خوب گرفت کرنی چاہیے کہ دین کے لیے غیرت کا یہی تقاضا ہے۔

❑ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ.

﴿سعید بن مسیب ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پہلوان وہ نہیں جو لوگوں کو پچھاڑ لینے والا ہو بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھ سکے۔﴾

وضاحت :

صرعہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ صرعہ وہ ہے جو اپنی گھونسے بازی کی بدولت اپنے دشمن کو پچھاڑ دے اور اس کا ناطقہ بند کر دے۔ اس طرح کی پہلوانی بہادری نہیں بلکہ طاقت کی علامت ہوتی ہے۔ بہادری یہ ہے کہ جب آدمی کو زک پہنچا کر غصہ دلا دیا جائے تو وہ اس وقت بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھے اور کوئی کام خلاف عدل نہ کرے۔ یہ قیمتی بات پیغمبر ﷺ ہی فرما سکتے ہیں۔

مَاجَاءَ فِی الْمُهَاجَرَةِ

روٹھ کر چھوڑنے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عَطَاءِ ابْنِ يَزِيدَ اللَّيْثِيِّ عَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ يَلْتَقِيَانِ فَيُعْرِضُ هٰذَا وَيُعْرِضُ هٰذَا وَخَيْرُهُمَا الَّذِی يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ.

﴿حضرت ابو ایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی سے روٹھا رہے تین دن سے زیادہ، اور ملے تو اس طرح سے کہ یہ ادھر منہ پھیرے ہوئے ہو اور وہ ادھر۔ ان دونوں میں سے بہتر وہ ہوگا جو سلام کرنے میں پہل کرے۔﴾

وضاحت :

روایت میں تین رات کا ذکر ہے لیکن میں نے ترجمہ تین دن کیا ہے کیونکہ رات سے مراد دن اور رات کا دورانیہ ہے۔ لفظ کا یہ استعمال ہماری زبان میں بھی ہے۔

تین دن کی مدت حکم پر عمل کے معاملہ میں سہولت کے لیے ہے۔ جب آدمی روٹھتا ہے تو راضی ہونے میں کچھ وقت تو لگتا ہے جس میں آدمی کوئی بہانہ پاتا ہے کہ غلط فہمی دور کر سکے۔ یہ اس مقصد کے لیے مہلت کی حد

بتائی ہے کہ معاملہ تین دن سے بڑھنے نہ دیا جائے۔ جب ناراضی ہوتی ہے تو اس کے بعد آدمی کو یہ شرم لاحق ہو جاتی ہے کہ میں صلح کے لیے پہلے سلام کیسے کروں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ بازی اسی کی ہوتی ہے جو پہلے سلام کر کے اپنے تعلقات کو ہموار کرلے اور اپنی انا کو آڑے نہ آنے دے۔

اس بارہ میں ایک بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں سے دین کے معاملے میں یا ان کے مسلک یا کردار کے معاملے میں اختلافات ہوں تو ان کے ضمن میں کیا کرے۔ محدثین کہتے ہیں کہ اہل بدعت اور اہل ضلالت اس ہدایت میں شامل نہیں ہیں۔ لفظ "اخاہ" کا تقاضا یہ ہے کہ صحیح معنوں میں مسلمان ہونا مراد ہے۔

اس معاملے میں میرے نزدیک یہ اصول مدنظر رکھنا چاہیے کہ جن لوگوں سے مسلک کا، رائے کا، عقیدے کا، نظریے کا، یا زندگی کی روش کا اختلاف ہے تو ان سے آپ سیاسی اختلاف رکھ سکتے ہیں لیکن جب ان سے ملیں تو خندہ پیشانی سے ملیں۔ دل میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بئس ابن العشیرۃ (سوسائٹی کا یہ کتنا برا آدمی ہے) ملاقات کے آداب الگ ہیں اور دل کے معاملات الگ ہیں۔ بات ایسے لوگوں سے آپ معروف طریقے سے ہی کریں گے۔ وہ رخصت ہونے لگیں تو باہر تک چھوڑنے بھی جائیں گے۔ ان کی خاطر مدارات بھی کریں لیکن دل میں رہے کہ پکا شیطان ہے۔ باقی تمام مسلمانوں سے اچھی طرح دل سے ملیں۔

روٹھنے کی مدت کا تعلق اختلاف کی نوعیت سے بھی ہوتا ہے۔ غزوہ تبوک میں جو مسلمان وسائل رکھنے کے باوجود شریک نہ ہوئے تو نبی ﷺ ان سے قطع تعلق کی مدت کو تین ماہ تک لے گئے تھے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق بھی روایت ہے کہ اپنے ایک بیٹے سے کئی ماہ تک نہیں بولے۔

❒ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَنَسِ ابْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا تَبَاغَضُوا وَلَا تَحَاسَدُوا وَلَا تَدَابَرُوا وَكُوْنُوا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ.

﴿انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو۔ آپس میں حسد نہ کرو اور ایک دوسرے سے منہ پھیرنے کی روش اختیار نہ کرو۔ اللہ کے بندو، بھائی بھائی بن کے رہو۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے۔﴾

وضاحت :

اس روایت میں بہت سی ایسی ہدایات جمع ہو گئی ہیں جو اسلامی معاشرہ میں مسلمانوں کے باہمی تعلقات کے بارے میں رہنمائی دیتی ہیں۔ بغض اخلاق فاسدہ سے ہونا چاہیے، دوسرے مسلمان بھائیوں سے نہیں۔ حسد ایک اخلاقی بیماری ہے۔ کسی کے علم و عمل پر رشک کرنا تو جائز ہے لیکن حسد ایک منفی صفت ہے جس سے ہر مسلمان کو اجتناب کرنا چاہیے۔ تدابر کے معنی خود امام مالکؒ نے بیان کر دیے ہیں اور وہ میرے نزدیک صحیح ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ لا احسب التدابر الا الاعراض عن اخيك المسلم، فتدبر عنه بوجهك (میرے نزدیک تدابر کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنے مسلمان بھائی سے اعراض کرو اور اپنا منہ اس سے پھیر لیا کرو) یہ طریقہ نہیں ہونا چاہیے کہ جہاں ملاقات ہوئی منہ پھیر کر بیٹھ رہے بلکہ السلام علیکم اور مصافحہ ہونا چاہیے۔ یہ چیز اختلافات کو فوزائل کر دیتی ہے۔

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا تَحَسَّسُوْا وَلَا تَنَافَسُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَکُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا.

﴿ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بچو گمان (یعنی سوء ظن) سے کیونکہ سوء ظن سب سے بڑا جھوٹ ہے، اور تجسس میں اور ٹوہ میں نہ رہو، ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کی جدوجہد میں نہ پڑو، باہم حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے غصہ نہ رکھو اور ایک دوسرے سے رخ نہ موڑو اور اللہ کے بندو سب بھائی بھائی بن کے رہو۔﴾

وضاحت :

حدیث میں لفظ ظن سے مراد سوء ظن ہے۔ حسن ظن رکھنے سے آدمی کسی وقت غلط فہمی میں تو پڑ سکتا یا قدرے نقصان اٹھا سکتا ہے اور اسی لیے بعض لوگ اسے بے وقوفی قرار دیتے ہیں لیکن اس میں کوئی زیادہ حرج نہیں۔ اگر زیادہ سنگین معاملہ نہ ہو تو یہ گوارا ہے۔ اس کے برعکس سوء ظن سب سے بڑا جھوٹ بھی ہے اور سب سے بڑی بیماری بھی ہے۔ لوگوں کے متعلق یہ خیال کر کے کہ ضرور یہ میرے خلاف سازش کرنے جا رہے ہیں حالانکہ ان کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں ہوتا، آپ اپنے آپ کو ایک بڑے جھوٹ میں مبتلا کر لیتے اور اپنے آپ کو خلجان

میں بھی ڈال لیتے ہیں۔ اس لیے جب تک کسی چیز کا ثبوت نہ ہو سوء ظن کرنے کا حق نہیں۔ حسن ظن ہی رکھیں اور اگر حسن ظن نہیں رکھنا چاہتے تو کم از کم سوء ظن بھی نہ رکھیں۔ یہ ضروری ہے۔

تحسس اور تجسس دونوں لفظوں کا مطلب ٹوہ میں لگنا اور جستجو میں پڑنا ہے۔ عمومی طور پر یہ ہم معنی ہیں۔ کان لگا کر سن گن لینا تحسس ہوتا ہے اور ٹوہ میں لگنا اور کھوج لگانا تجسس کہلاتا ہے۔ ممانعت بری نیت سے کسی کے عیوب اور معاملات کی ٹوہ لینے اور غلط مقصد کے لیے جاسوسی کرنے کی ہے۔ بعض لوگ ہر طرح کے معاملات میں تجسس کو غلط سمجھتے ہیں اور اسی بنیاد پر جاسوسی کے محکمہ کو بھی غلط قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا خلیفہ راشد بھی ایک خطرناک آدمی ثابت ہوتا ہے۔ آپ بھی تجسس کرنا چاہیں تو خیر کے لیے کر سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کے پڑوسی گھر کا مالک موجود نہیں تو آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ اس کے بچوں نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں، کس طرح ان کی گزر اوقات ہو رہی ہے۔ یہ پڑوسی سے متعلق آپ کے فرائض میں سے ہے۔ ایسا کرنے کی ممانعت نہیں۔ لیکن ٹوہ میں لگے رہنا کہ ایک شخص کی کوئی کمزوری ہاتھ آجائے اور آپ اس کو جلد سے جلد کہیں بیان کر کے یا اخبار میں دے کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کریں تو یہ کمینہ پن ہے۔ ایسا کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر کوئی شخص ان چیزوں میں فرق نہ کرے تو بہت مشکل میں پڑ جائے گا۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَطَاءِ بْنِ اَبِي مُسْلِمٍ عَبْدِ اللّٰهِ الْخُرَاسَانِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَصَافَحُوا يَذْهَبِ الْغِلُّ وَتَهَادَوْا تَحَابُّوا وَتَذْهَبِ الشَّحْنَاءُ.

﴿عبداللہ خراسانی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مصافحہ کیا کرو کہ اس سے کینہ دور ہوتا ہے اور ہدیہ دیتے رہو اس سے تمہارے درمیان محبت پیدا ہو گی اور طبیعت کا بغض یا نفرت دور ہو جائے گی۔﴾

وضاحت:

یہ ہدایت بھی معاشرتی زندگی میں حسن پیدا کرنے والی ہے۔ مصافحہ میں بڑی برکت ہے۔ بہت سی شکایتیں دھل جاتی ہیں۔ دل کے اندر سے کدورت نکل جاتی ہے۔ اسی طرح ہدیہ بھیجنا کدورت کو دور کرتا اور آپس کے تعلقات کو خوشگوار بناتا ہے۔ تحفہ بھیجنا، مصافحہ کرنا اور سلام میں سبقت کرنا یہ سب بہت بابرکت چیزیں ہیں۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ سُهَيْلِ بْنِ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ تُفْتَحُ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَ يَوْمَ الْخَمِيسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ مُسْلِمٍ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا إِلَّا رَجُلًا كَانَتْ بَيْنَهُ وَ بَيْنَ أَخِيهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ أَنْظِرُوا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا أَنْظِرُوا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت کے دروازے پیر کو اور جمعرات کو کھول دیے جاتے ہیں اور ہر ایسے مسلمان کو بخش دیا جاتا ہے جو کسی کو اللہ کا شریک نہیں ٹھہراتا، بجز اس کے کہ جس کے اور اس کے بھائی کے درمیان کوئی کدورت یا کینہ ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کو ابھی روکو یہاں تک کہ آپس میں صلح کرلیں، ان دونوں کے صلح کرلینے تک ابھی انتظار کرو۔﴾

وضاحت :

یہ روایت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کی ایک مشکل جنت کے دروازوں کا پیر اور جمعرات کو کھولا جانا ہے جبکہ یہ دن ہماری دنیاوی زندگی کے ایام ہیں۔ اللہ کے ہاں ایام ان سے مختلف ہیں اور وہ ہزار ہزار سال کے ہیں۔ پیر اور جمعرات کے دنوں میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر ان دونوں کا انتخاب کیا گیا ہے تو اس کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ روایت کی دوسری مشکل یہ ہے کہ قرآن مجید کی روشنی میں جہاں تک اس زندگی کا تعلق ہے تو صالحین پر ان کے اعمال کے لحاظ سے اچھے اثرات اور اشقیاء پر برے اثرات ضرور مرتب ہوتے ہیں لیکن اس مرحلے میں نہ ہی جنت میں جانے کا سوال ہے اور نہ ہی مغفرت کا۔ اس کے لیے ایک خاص دن مقرر ہے جس کا اعلان ابھی ہونا باقی ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک اس روایت میں کچھ گھپلا ہو گیا ہے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُسْلِمِ بْنِ أَبِي مَرْيَمَ عَنْ أَبِي صَالِحٍ السَّمَّانِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ قَالَ تُعْرَضُ أَعْمَالُ النَّاسِ كُلَّ جُمُعَةٍ مَرَّتَيْنِ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَيَوْمَ الْخَمِيسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ إِلَّا عَبْدًا كَانَتْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَخِيهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ اتْرُكُوا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَفِيئَا أَوْ ارْكُوا هٰذَيْنِ

حَتّٰی یَفِیْئَا

﴿حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ لوگوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں ہر ہفتے میں دو مرتبہ، پیر اور جمعرات کو۔ ہر مومن بندہ بخش دیا جاتا ہے سوائے اس شخص کے کہ اس کے اور اس کے بھائی کے درمیان کدورت ہو، تو ان کے متعلق حکم ہوتا ہے کہ ان کو چھوڑ دو یہاں تک کہ صلح کر لیں۔﴾

وضاحت:

یہ روایت مرفوع نہیں ہے۔ پچھلی روایت مرفوع تھی لہٰذا اس کو بھی اسی پر قیاس کیا جائے گا۔ اس روایت میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں میں ان کا ذکر کر چکا ہوں۔ یہاں ذکر جنت کے دروازے کھولے جانے کے بجائے اعمال کے پیش ہونے کا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ملائکہ اپنی رپورٹ دیتے ہوں اور یہ ابتدائی فیصلہ ہوتا ہو کہ فلاں آدمی صالحین میں سے ہے اور فلاں اشقیاء میں سے۔ اجزاء کی تفصیل تو قیامت کے دن ہو گی لیکن ایک اجمالی کام یہ ہوتا ہے کہ اعمال پیش ہوتے ہیں۔ اور اس پیشی کے نتیجہ میں یہ ہوتا ہے کہ جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں جس کا پچھلی روایت میں ذکر ہے۔ اگر یوں توجیہ کی جائے تو یہ بات قرین قیاس ہے۔

اب رہے وہ اشخاص جن کے درمیان کچھ کدورت ہو یا قضیہ ہو تو ان کا معاملہ اس وقت تک تصفیہ طلب رہتا ہے جب تک وہ آپس میں صلح نہ کر لیں۔ اگر اصلاح نہ کی تو برائی کے کھاتے میں چلے جائیں گے۔ بہر حال تفصیلی فیصلہ اور اعمال کا حتمی نتیجہ قیامت کے روز سامنے آئے گا۔ اس روایت میں لفظ جمعہ سے پورا ہفتہ مراد لیا گیا ہے۔ اترکوا اور ارکوا دونوں لفظوں کا مفہوم ایک ہی ہے یعنی چھوڑ دو، رہنے دو۔

مَاجَاءَ فِی لُبْسِ الثِّیَابِ لِلْجَمَالِ بِهَا

زینت کے لیے لباس پہننے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَیْدِ ابْنِ اَسْلَمَ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّهُ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِی غَزْوَةِ بَنِی اَنْمَارٍ قَالَ جَابِرٌ فَبَیْنَا اَنَا نَازِلٌ تَحْتَ شَجَرَةٍ اِذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَقْبَلَ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلُمَّ اِلَی الظِّلِّ قَالَ فَنَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ

فَقُمْتُ اِلٰی غِرَارَةٍ لَنَا فَالْتَمَسْتُ فِیْهَا شَیْئًا فَوَجَدْتُ فِیْهَا جِرْوَ قِثَّاءٍ فَكَسَرْتُهُ ثُمَّ قَرَّبْتُهُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ مِنْ اَیْنَ لَكُمْ هٰذَا قَالَ فَقُلْتُ خَرَجْنَا بِهٖ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مِنَ الْمَدِیْنَةِ قَالَ جَابِرٌ وَ عِنْدَنَا صَاحِبٌ لَنَا نُجَهِّزُهُ یَذْهَبُ یَرْعَی قَالَ فَجَهَّزْتُهُ ثُمَّ اَدْبَرَ یَذْهَبُ فِی الظَّهْرِ وَ عَلَیْهِ بُرْدَانِ لَهُ قَدْ خَلَقَا قَالَ فَنَظَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِلَیْهِ فَقَالَ اَمَالَهُ ثَوْبَانِ غَیْرُ هٰذَیْنِ فَقُلْتُ بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُ ثَوْبَانِ فِی الْعَیْبَةِ كَسَوْتُهُ اِیَّاهُمَا قَالَ فَادْعُهُ فَمُرْهُ فَلْیَلْبَسْهُمَا قَالَ فَدَعَوْتُهُ فَلَبِسَهُمَا ثُمَّ وَلّٰی یَذْهَبُ قَالَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَالَهُ ضَرَبَ اللّٰهُ عُنُقَهُ اَلَیْسَ هٰذَا خَیْرًا لَهُ قَالَ فَسَمِعَهُ الرَّجُلُ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ قَالَ فَقُتِلَ الرَّجُلُ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ.

﴿جابر بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں کہ ہم ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوہ بنی انمار میں نکلے۔ جابر کہتے ہیں کہ میں ایک درخت کے نیچے ٹھہرا ہوا تھا۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو میں نے کہا حضور، سائے میں آجایئے تو رسول اللہ ﷺ بھی وہیں اترے۔ میں نے اٹھ کر اپنے توشہ دان کا جائزہ لیا تو اس میں ایک چھوٹی سی ککڑی مل گئی۔ میں نے اس کو توڑا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کی۔ آپ نے پوچھا بھئی تمھیں یہ کہاں سے مل گئی؟ میں نے کہا یارسول اللہ ہم یہ مدینہ سے لائے ہیں۔ جابرؓ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک ہمارا آدمی تھا جس کو ہم سواریوں کو چرانے کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ میں نے اس کو تیار کیا۔ وہ سواری کے جانور لے کر جانے لگا تو وہ اپنے اوپر دو چادریں لیے ہوئے تھا جو پرانی ہو چکی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ کیا اس کے پاس ان دو کپڑوں کے علاوہ دو چادریں نہیں؟ میں نے کہا ہاں یارسول اللہ، گٹھڑی میں اس کے دو کپڑے اور ہیں جو میں نے اسے پہننے کے لیے دے رکھے ہیں۔ آپ نے فرمایا اس کو بلاؤ اور کہو کہ وہ دوسرے کپڑے پہنے۔ میں نے اس کو بلایا تو اس نے وہ کپڑے پہن لیے۔ پھر وہ جانے کے لیے مڑا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ اس کی گردن مارے۔ کیا یہ حالت پہلی سے بہتر نہیں؟ اس شخص نے یہ بات سن لی اور

کہا یا رسول اللہ، اللہ میری گردن اپنے راستے میں مارے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہاں اللہ کی راہ میں ہو۔ بعد میں وہ شخص اللہ کی راہ میں شہید ہوا۔﴾

وضاحت :

مزدور دو بوسیدہ چادریں باندھے ہوئے تھا۔ نبی ﷺ کو معلوم ہوا کہ اس کے پاس اچھے کپڑے بھی ہیں تو اس کو بلوایا اور دوسرے کپڑے پہننے کا حکم دیا۔ ان کپڑوں میں وہ بھلا آدمی لگا تو حضور نے اس کے لیے بہت شاندار کلمے کہے کہ خدا کے بندے اب تمہاری شکل نکلی کہ نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مہذب، شائستہ اور صاف ستھرا رہنا تقویٰ کے منافی نہیں بلکہ اسلام کا تقاضا ہے۔ اس سے آدمی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ غریبوں کو بھی اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہمارے ہاں بے شمار آدمی اس طرح میلے بنے رہتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر وحشت ہوتی ہے لیکن ان کے چوہدریوں کو احساس نہیں ہوتا کہ ان کو صاف ستھرا رہنے میں مدد دیں یا اس کی تلقین کریں۔ پس معلوم ہوا کہ شائستہ اور صاف ستھرا رہنا اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہے۔ اور جن لوگوں کے ہاتھ میں معاملات کی باگ ڈور ہے وہ اپنی قوم کے افراد کو مہذب بنانے کی کوشش کریں، ان کو تعلیم دیں اور ان کے لیے وسائل بھی پیدا کریں۔

ضرب الله عنقه (اللہ اس کی گردن مارے) عربی میں پیار کا کلمہ ہے۔ یہ بددعا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں بھی لوگ جب کہتے ہیں 'تمہاری ماں مرے' تو یہ بھی پیار کا کلمہ ہوتا ہے۔ اس کا مفہوم بددعا کا نہیں ہوتا۔ آنحضرت نے بھی آدمی کی تحسین کے لیے یہ جملہ استعمال کیا کہ دیکھو پہلے کی نسبت یہ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ آدمی سمجھدار تھا اس نے کلمات کو لفظی معنی میں لے کر درخواست کردی کہ یا رسول اللہ یہ بھی دعا کیجئے کہ یہ گردن اللہ کی راہ میں ماری جائے۔ دیکھئے نبی ﷺ کی زبان سے اس وقت جو مبارک کلمہ نکل گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو حقیقت بنا دیا۔ آپ نے جو فرمایا کہ اللہ کے راستے میں گردن ماری جائے تو وہ شخص جہاد میں شریک ہوا اور شہادت کا رتبہ پایا۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَيُّوبَ بْنِ أَبِي تَمِيمَةَ عَنِ ابْنِ سِيرِينَ قَالَ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ إِذَا أَوْسَعَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَأَوْسِعُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ جَمَعَ رَجُلٌ عَلَيْهِ ثِيَابَهُ.

﴿ابن سیرین کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ تم کو وسعت بخشے تو تم بھی اپنے اوپر وسعت کرو۔ ایک شخص نے اپنے کپڑوں پر پیوند لگا رکھے تھے۔﴾

وضاحت :

حضرت عمرؓ کے متعلق آیا ہے کہ ان کے کپڑوں میں چھ چھ پیوند لگے رہتے تھے حالانکہ وہ وقت کے خلیفہ تھے۔ ذاتی حیثیت میں وہ غریب آدمی نہ تھے اور اتنا ذی صلاحیت آدمی اتنا غریب ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ لیکن جب وہ خلیفہ تھے تو اتنی خستہ حالت میں کیوں رہتے تھے جب کہ ان کا مسلک یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے فراخی عطا کی ہے تو اپنے نفس کے لیے بھی فراخی ہونی چاہیے۔ دراصل یہ دوسرا شعبہ ہے۔ ایک وہ شخص ہوتا ہے جو دوسروں کے لیے نمونہ ہوتا ہے تو اس کے لیے بہر حال وہ معیار ہونا چاہیے جس کی غریب سے غریب آدمی بھی تقلید کر سکے۔ لہذا حضرت عمرؓ کا اپنا عمل عوام کے ایک لیڈر کی حیثیت سے ہے۔ ہمارا عمل اس سے الگ ہونا چاہیے۔ صاف ستھرے کپڑے پہننے چاہئیں تاکہ آدمی حقیر نہ معلوم ہو۔ اس کے لباس کا دوسروں پر اچھا اثر پڑے۔ لوگ اس کی صحبت سے وحشت زدہ نہ ہوں بلکہ پسند کریں۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ اِنِّي لَاُحِبُّ اَنْ اَنْظُرَ اِلَى الْقَارِئِ اَبْيَضَ الثِّيَابِ.

﴿امام مالک کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عمر بن خطابؓ کہتے تھے کہ مجھے یہ بات محبوب ہے کہ میں قاری کو سفید کپڑوں میں دیکھوں۔﴾

وضاحت :

قاری کا لفظ عربی میں عالم دین کے لیے بولا جاتا ہے جیسے ہم مولوی صاحب کا لفظ بولتے ہیں۔ یہ خاص لفظ قرآن مجید کے عالم کے لیے ہے کیونکہ اس زمانے میں قرآن ہی تمام علوم کا مجموعہ تھا اور اسی کے علم سے آدمی کا علم تولا جاتا تھا۔ لہذا حضرت عمرؓ کا مدعا یہ ہے کہ مولوی صاحب کو خوش لباس ہونا چاہیے۔ ان کو سفید کپڑے پہننے چاہئیں یعنی سنجیدہ لباس میں ہونا چاہیے اور فیشن سے اجتناب کرنا چاہیے۔

اس روایت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ خلیفہ وقت کو قوم کے مزاج کا علم ہوتا ہے اور تمام پہلوؤں پر اس کی نظر ہوتی ہے۔ وہ ہر طبقے کی رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایرانی سپہ سالار رستم کہا کرتا تھا کہ یہ عمر تو میرا کلیجہ کھا گیا، یہ کتوں کو آداب سکھا رہا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ عربوں کو دنیا کی قیادت کے لیے تیار کرنے کا جن

لوگوں نے کام کیا ان میں آنحضرت ﷺ کو چھوڑ کر سب سے شاندار رول سیدنا عمرؓ کا ہے۔

مَاجَاءَ فِي لُبْسِ الثِّيَابِ الْمُصْبَغَةِ وَالذَّهَبِ

رنگ دار کپڑے اور سونا پہننے کے بارے میں

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ أَنَّ عَبْدَاللهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ يَلْبَسُ الثَّوْبَ الْمَصْبُوغَ بِالْمَشْقِ وَالثَّوْبَ الْمَصْبُوغَ بِالزَّعْفَرَانِ.

﴿نافع روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ گیروے رنگے ہوئے اور زعفران سے رنگے ہوئے کپڑے پہنا کرتے تھے۔﴾

وضاحت :

مشق، گیروا یا مٹیالا رنگ جو جوگیوں اور صوفیوں کا ہے۔ یہ رنگ بہت باوقار ہے۔ یہ ایک قدرتی رنگ ہے۔ بعض علاقوں میں اس رنگ کی روئی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح کے کپڑے مصنوعی رنگ میں بھی ملتے ہیں۔ زعفران کے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ ہلکے رنگ میں تو کوئی قباحت نہیں لیکن گہرا ہو تو اس پر زنانہ پن غالب آجاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جن روایات سے لوگ اس کے خلاف دلیل لائے ہیں وہ احرام سے متعلق ہیں۔ احرام میں چونکہ زعفرانی رنگ جائز نہیں اس لیے اس کو لوگوں نے ناجائز قرار دے دیا۔ عبداللہ بن عمرؓ بڑے محتاط آدمی ہیں۔ وہ اگر زعفران سے رنگا ہوا کپڑا پہنتے تھے تو اس کے جائز ہونے میں کلام نہیں۔ بلکہ زعفرانی رنگ بہت اچھا اور خوشگوار ہوتا ہے۔

□ قَالَ يَحْيَى وَ سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُولُ وَ أَنَا أَكْرَهُ أَنْ يَلْبَسَ الْغِلْمَانُ شَيْئًا مِنَ الذَّهَبِ لِأَنَّهُ بَلَغَنِي أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهَى عَنْ تَخَتُّمِ الذَّهَبِ فَأَنَا أَكْرَهُهُ لِلرِّجَالِ الْكَبِيرِ مِنْهُمْ وَالصَّغِيرِ.

﴿یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے مالک کو کہتے سنا کہ میں مکروہ سمجھتا ہوں کہ لڑکے سونے کی کوئی چیز پہنیں کیونکہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سونے کی انگوٹھی پہننے سے روکا ہے، تو میں بڑے اور چھوٹے کے لیے اس کو مکروہ سمجھتا ہوں۔﴾

وضاحت :

امام صاحب کا یہ فتویٰ ٹھیک ہے۔ سونے کی کوئی چیز پہننا کسی مہذب آدمی کے لیے درست نہیں۔ اس زمانے میں لوگ فخریہ سونے کی زنجیر، انگوٹھیاں اور کانوں کا زیور استعمال کرتے ہیں۔ یہ بے حد ناپسندیدہ رواج ہے۔

□ قَالَ يَحْيٰى وَ سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُولُ فِي الْمَلَاحِفِ الْمُعَصْفَرَةِ فِي الْبُيُوتِ لِلرِّجَالِ وَ فِي الْأَفْنِيَةِ قَالَ لَا أَعْلَمُ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا حَرَامًا وَ غَيْرُ ذٰلِكَ مِنَ اللِّبَاسِ أَحَبُّ إِلَيَّ.

﴿یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے مالک سے سنا۔ وہ کہتے تھے کہ وہ زرد گوں لحاف جو مردوں کے لیے گھروں میں اور صحنوں میں رکھے ہوتے ہیں اس میں کسی چیز کو حرام تو نہیں جانتا لیکن پسندیدہ یہی ہے کہ پہننے کی چیز اس کے علاوہ ہو۔﴾

وضاحت :

لحاف اور کمبل عام طور پر رنگین اور اکثر ریشمی ہوتے ہیں۔ امام مالک کے نزدیک ان سے اجتناب بہتر ہے اگرچہ ان کا استعمال حرام نہیں۔

مَاجَاءَ فِي لُبْسِ الْخَزِّ

ریشم پہننے کے بارے میں

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهَا كَسَتْ عَبْدَاللهِ بْنَ الزُّبَيْرِ مِطْرَفَ خَزٍّ كَانَتْ عَائِشَةُ تَلْبَسُهُ.

﴿ہشام اپنے باپ عروہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ایک ریشمی مطرف عبداللہ بن زبیر کو پہنایا جو حضرت عائشہ خود پہنا کرتی تھیں۔﴾

وضاحت :

مطرف سے مراد وہ اونی کپڑا ہے جس کا تانا ریشم کا اور بانا اون کا ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے اگرچہ یہ عبداللہ

بن زبیرؓ کو پہننے کے لیے دیا تو اس کے جائز ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ کپڑا اگر پورے کا پورا ریشم ہو تو پھر سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ریشم کا پہننا مردوں کے لیے بالاتفاق جائز نہیں۔ تاہم اگر کسی اور چیز میں ریشم ملا ہوا ہو تو احتیاط کرنی چاہیے، اگرچہ اس کو حرام نہیں کہہ سکتے۔

مَا يُكْرَهُ لِلنِّسَاءِ لُبْسُهُ مِنَ الثِّيَابِ

عورتوں کے لیے کون سا کپڑا پہننا مکروہ ہے

❑ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَلْقَمَةَ ابْنِ أَبِي عَلْقَمَةَ عَنْ أُمِّهِ أَنَّهَا قَالَتْ دَخَلَتْ حَفْصَةُ بِنْتُ عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَلَى عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ وَ عَلَى حَفْصَةَ خِمَارٌ رَقِيقٌ فَشَقَّتْهُ عَائِشَةُ وَكَسَتْهَا خِمَارًا كَثِيفًا .

﴿علقمہ بن ابی علقمہ کی والدہ بیان کرتی ہیں کہ حفصہ بنت عبدالرحمٰن حضرت عائشہؓ کے پاس گئیں تو حفصہ نے اپنے اوپر ایک باریک اوڑھنی لے رکھی تھی۔ حضرت عائشہؓ نے اس کو پھاڑ کر پھینک دیا اور ان کو ایک موٹی اوڑھنی پہنادی۔﴾

وضاحت :

حضرت عائشہؓ کے اس عمل سے معلوم ہوا کہ عورت کو سر ڈھانپنا بھی چاہیے اور دوپٹہ دبیز بھی ہو۔ اگر باریک اوڑھنی ہو اسے اڑ جائے تو اس پہنادے کا کیا فائدہ؟ آج کل کے دوپٹے تو محض تہمت ہی ہیں۔ عورتیں سر سے زیادہ ان کو گلے میں پہنتی ہیں۔ دین میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

❑ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُسْلِمِ بْنِ أَبِي مَرْيَمَ عَنْ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ قَالَ نِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مَائِلَاتٌ مُمِيلَاتٌ لَا يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يَجِدْنَ رِيحَهَا وَ رِيحُهَا يُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ خَمْسِمِائَةِ عَامٍ .

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ عورتیں کپڑے پہنے ہوئے بھی عریاں، مٹکنے مٹکانے والی جنت میں داخل نہیں ہوں گی اور اس کی خوشبو بھی نہیں سونگھیں گی اگرچہ اس کی خوشبو پانچ سو سال کی

مسافت پر محسوس ہو گی۔﴾

وضاحت :

کاسیات عاریات کا مطلب 'جامے کے اندر یا جامے سے باہر' ہے۔ وہ لباس پہنے ہوئے بھی عریاں نظر آتی ہیں اور ان کا انگ انگ دیکھا جا سکتا ہے۔ مائلات کے معنی حق سے منحرف کے کیے گئے ہیں۔ لہٰذا مائلات ممیلات سے مراد یہ ہو گی کہ خود بھی سیدھی راہ سے ہٹی ہوتی ہیں اور خاوند کو بھی ہٹاتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ معنی صحیح نہیں۔ اصل میں مراد ہے مٹکنے مٹکانے والی یعنی وہ گردن اور جسم کو مٹکاتی ہوئی چلتی ہیں اور دوسروں کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ ایسی عورتیں جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکیں گی۔ پانچ سو سال کی مسافت تعبیر ہے ایک طویل فاصلہ کی۔ یہ روایت ابو ہریرہ سے ہے جبکہ اس کے تیور ایسے ہیں کہ یہ نبی ﷺ کا ارشاد ہو گا۔ بعض راویوں نے اس کو مرفوع بیان کیا ہے۔

❑ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَنَظَرَ فِي أُفُقِ السَّمَاءِ فَقَالَ مَاذَا فُتِحَ اللَّيْلَةَ مِنَ الْخَزَائِنِ وَمَا ذَا وَقَعَ مِنَ الْفِتَنِ كَمْ مِنْ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَيْقِظُوا صَوَاحِبَ الْحُجَرِ.

﴿ابن شہاب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک رات اٹھے۔ آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی تو زبان سے یہ کلمہ نکلا۔ سبحان اللہ! آج کی رات کیا کیا خزانے کھولے گئے ہیں اور کیا کیا فتنے واقع ہوئے ہیں۔ کتنی ہی جامہ پوش جو دنیا میں ہیں وہ قیامت کے روز عریاں ہوں گی۔ ان کوٹھڑی والیوں کو جگاؤ کہ (اللہ کو یاد کریں)﴾

وضاحت :

یہ ایک حقیقت بیان ہوئی ہے لیکن اس کو دیکھنے کے لیے چشم بصیرت چاہیے کہ ہر وقت خزانوں کی بھی بارش ہوتی رہتی ہے اور لوٹنے والے ان کو لوٹ لیتے ہیں، اور فتنے بھی برپا ہوتے رہتے ہیں اور ان کے رسیا ان کو بھی لوٹ لیتے ہیں۔ یہی راتیں تو ہوتی ہیں جن میں شب بیداری کرنے والے نہ جانے کتنے خزانے پاتے ہیں اور یہی راتیں ہوتی ہیں جن میں لوگوں کی کارستانیوں کی خبریں ہر صبح اخباروں میں آتی ہیں۔ نبی ﷺ نے اسی کے بارے

میں اپنا تاثر بیان فرمایا۔ دوسری بات جس کی طرف آنحضرت نے توجہ دلائی یہ ہے کہ لباس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جسم کی جو چیزیں چھپانے کی ہیں ان کو چھپایا جائے۔ موجودہ زمانے کا فیشن یہ ہے کہ جو چیز چھپانے کی ہے اس کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کے لیے لباس تراشا اور پہنا جاتا ہے۔ اس وقت تمام ممالک میں یہی مذاق فیشن بن چکا ہے۔ قیامت کے دن یہ لباس عریانی قرار پائے گا۔ پچھلی روایت اس دنیا سے متعلق تھی اور یہ روایت قیامت سے متعلق ہے۔ صواحب الحجر سے ازواج مطہرات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ جاگیں اور نیکی کے خزانے لوٹیں۔

مَاجَاءَ فِي إِسْبَالِ الرَّجُلِ ثَوْبَهُ

مرد کے اپنی تہمد لٹکانے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ الَّذِي يَجُرُّ ثَوْبَهُ خُيَلَاءَ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ اِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

﴿عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی تہمد غرور سے گھسیٹتا ہوا چلے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نگاہ نہیں کریں گے۔﴾

وضاحت :

عرب میں غنڈوں کا طریقہ تھا کہ وہ ریشمی تہمد پہنتے اور اس کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے چلتے تھے۔ میں نے اپنے دیہاتوں اور شہروں میں بھی دیکھا ہے کہ بانکے اور چھبیلے لوگ تہمد گھسیٹتے ہوئے چلتے ہیں۔ یہ غرور کی نشانی ہے۔ عام لوگوں میں اگر کسی کی تہمد ڈھیلی رہ جائے تو وہ غرور میں داخل نہیں۔ جو لوگ غرور سے چلیں گے تو خدا ان کی طرف نگاہ نہیں کرے گا یعنی توجہ یا التفات نہیں کرے گا۔ آخرت میں کامیابی کا انحصار اللہ کی عنایت پر ہو گا لہذا جس کی طرف اللہ تعالیٰ کی عنایت ہی نہیں ہو گی تو اس کی بدبختی میں کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اس روایت میں اصل چیز خیلاء ہے یعنی غرور و استکبار۔ یہ جس شکل میں بھی ہو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرک ہے، اس لیے کہ کبریائی صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ کسی مخلوق کو کوئی حق نہیں کہ اس میں کبریائی ہو۔ اگر کوئی اللہ کی کبریائی میں شریک ہوتا ہے تو وہ شرک کا مرتکب ہوتا ہے۔

بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ ایک ڈھب کی چال ان میں جائز ہوتی ہے، مثلاً جہاں اسلام کی شان و شوکت کو نمایاں کرنا ہو۔ کسی غزوہ کے دن آنحضرت نے ایک سپاہی کو دیکھا کہ بہت اکڑے ہوئے نکلے اور ھل من مبارز (ہے کوئی مقابلہ کرنے والا) کا نعرہ لگایا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ چال بہت ناپسند ہے لیکن آج کے دن یہ محبوب ہے۔ معلوم ہوا کہ اہل کفر کے مقابلے میں اسلام کی قوت اور شان کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ مستثنیٰ ہے۔

❏ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلٰى مَنْ يَجُرُّ اِزَارَهُ بَطَرًا۔

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس شخص کی طرف نہیں دیکھے گا جو اپنا تہمد غرور سے گھسیٹتا ہوا چلتا ہے۔﴾

❏ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ وَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ وَ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ كُلُّهُمْ يُخْبِرُهُ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلٰى مَنْ يَجُرُّ ثَوْبَهُ خُيَلَاءَ۔

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نگاہ نہیں کرے گا قیامت کے روز ان لوگوں کی طرف جو اپنا تہمد غرور کے باعث گھسیٹتے ہوئے چلتے ہیں۔﴾

❏ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ الْعَلَاءِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ اَبِيهِ اَنَّهُ قَالَ سَاَلْتُ اَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِيَّ عَنِ الْاِزَارِ فَقَالَ اَنَا اُخْبِرُكَ بِعِلْمٍ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ اُزْرَةُ الْمُؤْمِنِ اِلٰى اَنْصَافِ سَاقَيْهِ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ فِيمَا بَيْنَهُ وَ بَيْنَ الْكَعْبَيْنِ مَا اَسْفَلَ مِنْ ذٰلِكَ فَفِي النَّارِ مَا اَسْفَلَ مِنْ ذٰلِكَ فَفِي النَّارِ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلٰى مَنْ جَرَّ اِزَارَهُ بَطَرًا۔

﴿علاء بن عبدالرحمٰن اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے ابو سعید خدری سے تہمد کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہاں میں تم کو علم کی روشنی میں خبر دیتا ہوں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ مومن کا تہمد نصف ساق تک ہونا چاہیے۔ نصف ساق اور ٹخنوں کے بیچ بیچ ہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ اس سے نیچے جو ہے وہ آگ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نگاہ نہیں

کرے گا جو اپنا تہمد غرور سے گھسیٹتا ہوا چلتا ہے۔﴾

وضاحت :

یہ تمام روایات ایک ہی مضمون کی حامل ہیں۔ ان میں صرف سند اور الفاظ کا فرق ہے۔ آخری روایت میں تہمد کے طول کی حد بندی ہو گئی ہے جو پنڈلی کے نصف اور ٹخنے کے درمیان ہے۔ گویا اصل میں ٹخنے تک کی حد ہے۔ کپڑا اس سے نیچے نہیں ہونا چاہیے۔ پاجامے اور شلوار کے متعلق بھی یہی حکم ہے۔

مَاجَاءَ فِي إِسْبَالِ الْمَرْأَةِ ثَوْبَهَا

عورت کے کپڑا لٹکانے کے بارے میں

□ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي بَكْرِ بْنِ نَافِعٍ عَنْ أَبِيهِ نَافِعٍ مَوْلَى ابْنِ عُمَرَ عَنْ صَفِيَّةَ بِنْتِ أَبِي عُبَيْدٍ أَنَّهَا أَخْبَرَتْهُ عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهَا قَالَتْ حِينَ ذُكِرَ الْإِزَارُ فَالْمَرْأَةُ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ تُرْخِيهِ شِبْرًا قَالَتْ أُمُّ سَلَمَةَ إِذًا يَنْكَشِفُ عَنْهَا قَالَ فَذِرَاعًا لَا تَزِيدُ عَلَيْهِ

﴿آنحضرت ﷺ کی زوجہ ام سلمہؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ جب ان کے سامنے تہمد کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ! پھر عورت کے بارے میں کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا ایک بالشت کے قریب لٹکا لے۔ ام سلمہؓ نے کہا تب اس کے جسم کا کچھ حصہ (پاؤں) تو کھلا رہے گا۔ آپ نے فرمایا کہ ایک ہاتھ سہی، اس سے زیادہ نہیں کر سکتی۔﴾

وضاحت :

اسبال ازار یعنی تہمد لٹکانے کے معاملہ کا تعلق اصلاً مردوں، اور وہ بھی متکبر لوگوں سے ہے، عورتوں سے نہیں۔ حضرت ام سلمہؓ نے جب سنا کہ مردوں کو اسبال ازار سے منع کیا گیا ہے تو انہوں نے پوچھا کہ عورتوں کے لیے کیا حکم ہے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ عورتیں اپنا ازار یا تہمد پنڈلی کے نصف سے ایک بالشت نیچے تک لٹکا سکتی ہیں۔ اگر اس سے پاؤں کھلتے ہوں تو بالشت کی بجائے زیادہ سے زیادہ ایک ہاتھ نیچے کر لیں۔ اس سے زیادہ نیچے نہ کریں۔

مَاجَاءَ فِي الْاِنْتِعَالِ

جوتا پہننے کے بارے میں

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا یَمْشِیَنَّ اَحَدُكُم فِی نَعْلٍ وَاحِدَةٍ لِیَنْعَلْهُمَا جَمِیْعًا اَوْ لِیُحْفِهِمَا جَمِیْعًا.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص ایک جوتی پہن کر نہ چلے۔ یا تو دونوں پاؤں میں جوتا پہنے یا دونوں سے اتار دے۔﴾

وضاحت :

ایک پاؤں میں جوتا پہننا ایک احمقانہ حرکت ہے۔ آدمی کو جوتے دونوں پاؤں میں پہننے چاہئیں یا پھر دونوں میں نہ پہنے۔ ہاں اگر کسی کا ایک ہی پاؤں ہے یا کسی مجلس میں ایک جوتا گم ہو گیا تو مجبوری ہے۔ حدیث کا اطلاق اس صورت پر نہیں۔

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِذَا انْتَعَلَ اَحَدُكُم فَلْیَبْدَاْ بِالْیَمِیْنِ وَ اِذَا نَزَعَ فَلْیَبْدَاْ بِالشِّمَالِ وَلْتَكُنِ الْیُمْنٰی اَوَّلَهُمَا تُنْعَلُ وَ آخِرَهُمَا تُنْزَعُ.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی جوتا پہنے تو چاہیے کہ وہ دہنے پاؤں سے شروع کرے اور اتارے تو بائیں سے شروع کرے۔ داہنا پاؤں جوتا پہننے میں پہلا اور اتارنے میں آخری ہو۔﴾

وضاحت :

یہ بات اسلامی آداب میں سے ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ہر چیز میں اپنی امت کی تربیت بڑی تفصیل سے کی ہے، حتیٰ کہ یہاں جوتا پہننے اور اتارنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَمِّهِ أَبِي سُهَيْلِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ كَعْبِ الْأَحْبَارِ أَنَّ رَجُلًا نَزَعَ نَعْلَيْهِ فَقَالَ لِمَ خَلَعْتَ نَعْلَيْكَ لَعَلَّكَ تَأَوَّلْتَ هٰذِهِ الْآيَةَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِي الْمُقَدَّسِ طُوًى قَالَ ثُمَّ قَالَ كَعْبٌ لِلرَّجُلِ أَتَدْرِي مَا كَانَتْ نَعْلَا مُوسَى قَالَ مَالِكٌ لَا أَدْرِي مَا أَجَابَهُ الرَّجُلُ فَقَالَ كَعْبٌ كَانَتَا مِنْ جِلْدِ حِمَارٍ مَيِّتٍ.

﴿کعب احبارؒ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کسی موقع پر اپنے دونوں جوتے اتارے۔ انہوں نے پوچھا کہ تم نے جوتے کیوں اتارے؟ شاید تم نے یہ کام اس آیت کی تاویل میں کیا ہے۔ فاخلع نعليك انك بالوادى المقدس طوى (اپنے جوتے اتار دو کیونکہ تم وادی مقدس طویٰ میں ہو)۔ پھر کعب نے اس شخص سے کہا۔ کیا تم جانتے ہو کہ حضرت موسیٰ کے جوتے کس چیز کے بنے ہوئے تھے؟ مالک کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ اس شخص نے کیا جواب دیا۔ کعب نے کہا کہ وہ مردہ گدھے کی کھال کے بنے ہوئے تھے۔﴾

وضاحت:

معلوم ہوتا ہے آدمی نے جوتے کسی ایسے مقام پر اتار دیے جہاں ان کے اتارنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس پر کعب احبارؒ نے اعتراض کیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے اس حکم کی روشنی میں ایسا کیا ہے۔ جس میں انہیں کوہ طور کی وادی طویٰ میں جوتے اتارنے کو کہا گیا تھا۔ پھر انہوں نے بتایا کہ موسیٰ کو جن جوتوں کے اتارنے کا حکم ہوا وہ مردہ گدھے کی کھال سے بنائے گئے تھے۔ کعبؒ یہودی عالم تھے۔ ان کی ساری معلومات اسرائیلیات میں سے تھیں۔ جب اسلام میں آئے تو ان کو جب شوق ہوتا اور موقع ملتا تو اسرائیلی روایات بیان کرتے تھے۔ کعبؒ کی یہ روایت بھی اسرائیلیات کی ایک مثال ہے۔ ورنہ قرآن مجید نے جوتے اتارنے کا یہ سبب بیان نہیں کیا کہ حضرت موسیٰ کے جوتے مردہ گدھے کی کھال کے تھے۔

مَا جَاءَ فِي لُبْسِ الثِّيَابِ
کپڑوں کے پہننے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ قَالَ نَهَى رَسُولُ

اللهِ ﷺ عَنْ لِبْسَتَيْنِ وَ عَنْ بَيْعَتَيْنِ عَنِ الْمُلَامَسَةِ وَ عَنِ الْمُنَابَذَةِ وَ عَنْ اَنْ يَحْتَبِيَ الرَّجُلُ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ لَيْسَ عَلَى فَرْجِهِ مِنْهُ شَيْءٌ وَ عَنْ اَنْ يَشْتَمِلَ الرَّجُلُ بِالثَّوْبِ الْوَاحِدِ عَلَى اَحَدِ شِقَّيْهِ .

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو قسم کے لباسوں اور دو طرح کے سودوں سے منع فرمایا۔ آپ نے ملامست اور منابذت سے منع فرمایا، نیز اس بات سے کہ آدمی کمر اور ٹانگوں کو ایک ہی کپڑے میں اس طرح باندھے کہ اس کی شرمگاہ پر کوئی چیز نہ ہو، اور اس بات سے کہ آدمی اپنے چادر کو اس طرح لپیٹے کہ وہ ایک ہی پہلو پر آئے اور دوسرے پر کچھ نہ ہو۔﴾

وضاحت :

لوگوں نے جوے کی کئی شکلوں کو رواج دیا ہے۔ جس طرح آج ریفل اور لاٹری وغیرہ کی شکلیں رائج ہیں اسی طرح زمانہ جاہلیت میں تاجر مال کو دکھائے بغیر جوے کا سودا کرتے تھے۔ نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ ملامست بیع کی وہ شکل تھی جس میں خریدار مال کو دیکھے بغیر جس چیز پر ہاتھ رکھ دیتا اس کی بیع ہو جاتی۔ منابذت میں کوئی چیز پھینکی جاتی تو وہ جس مال کو لگ جاتی خریدار کے لیے اس کو لینا لازم ہوتا۔ خریدنے والے کو دیکھنے کا اختیار نہیں تھا۔ ایسے سودوں میں فریب، زیادتی اور خطرے کے عناصر شامل ہوتے ہیں، لہذا ان سے حضور نے منع فرمایا ہے۔

جن دو لباسوں سے حضور نے منع فرمایا ان کو احتباء اور اشتمال سے تعبیر کیا ہے۔ ہمارے دیہات میں لوگ جب مل بیٹھتے ہیں تو اپنی رانوں کو پیٹ کے ساتھ لگا کر ایک چادر سے ٹانگوں اور کمر کو باندھ لیتے ہیں۔ یہ نشست آرام دہ ہو جاتی ہے۔ اسی کو احتباء کہتے ہیں۔ اشتمال سے مراد جسم کو ایک ہی کپڑے سے اس طرح لپیٹ لینا ہے کہ بازو بھی اس میں سے نہ نکالے جا سکیں۔ ہمارے ہاں پاجامہ یا شلوار پہنی جاتی ہے لیکن عربوں کا لباس ایک لمبی قمیص پر مشتمل ہوتا جس کے نیچے کبھی پاجامہ یا جانگیہ پہنا جاتا اور کبھی غریب لوگ محض قمیص یا سادہ چادر کو کافی سمجھتے۔ آخری شکل میں احتباء اور اشتمال کی صورتوں میں ستر کھل جانے کا امکان ہوتا۔ لہذا اس خدشہ کے پیش نظر آنحضرت ﷺ نے چادر اوڑھنے کی ان شکلوں کو منع فرمایا۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَاَى حُلَّةً

سِيَرَاءَ تُبَاعُ عِنْدَ بَابِ الْمَسْجِدِ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ لَوِ اشْتَرَيْتَ هٰذِهِ الْحُلَّةَ فَلَبِسْتَهَا يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَلِلْوَفْدِ إِذَا قَدِمُوا عَلَيْكَ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّمَا يَلْبَسُ هٰذِهِ مَنْ لَا خَلَاقَ لَهُ فِي الْآخِرَةِ ثُمَّ جَاءَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ مِنْهَا حُلَلٌ فَأَعْطَى عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ مِنْهَا حُلَّةً فَقَالَ عُمَرُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَكَسَوْتَنِيهَا وَقَدْ قُلْتَ فِي حُلَّةِ عُطَارِدٍ مَا قُلْتَ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَمْ أَكْسُكَهَا لِتَلْبَسَهَا فَكَسَاهَا عُمَرُ أَخًا لَهُ مُشْرِكًا بِمَكَّةَ.

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک ریشمی سوٹ دیکھا کہ مسجد کے دروازے پر بک رہا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ! اگر آپ اس کو خرید لیتے تو جمعہ کو بھی پہن لیتے اور وفود کے لیے بھی جب وہ آتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کو تو وہ لوگ پہنتے ہیں جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ پھر آنحضرت ﷺ کے پاس کہیں سے ایسے سوٹ آئے تو آپ نے حضرت عمرؓ کو بھی ایک سوٹ بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ، آپ نے میرے پہننے کے لیے سوٹ بھیجا حالانکہ آپ نے عطارد کے سوٹ کے بارے میں جو کہا وہ کہا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے پہننے کے لیے نہیں دیا۔ تو حضرت عمرؓ نے اپنے ایک مشرک بھائی کے پہننے کے لیے مکہ بھیج دیا۔﴾

وضاحت :

حلہ کہتے ہیں ایک چادر اور ایک تہمد کو یا قمیض اور تہمد کو۔ یہ وہی عمر بن خطابؓ ہیں جن کے اپنے کپڑوں میں پیوند لگے رہتے تھے۔ لیکن اس وقت ابھی اس طرح کا جذبہ باقی تھا۔

اس بات میں اختلاف ہے کہ حضرت عمرؓ کا کوئی بھائی تھا یا نہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے آنحضرت ﷺ کو وہ بات یاد دلائی تو آپ نے وضاحت کر دی کہ تم اسے کسی اور کام میں لاؤ۔ مثلاً وہ اپنی بیوی کو دے سکتے تھے یا کسی اور کو تحفہ دے سکتے تھے تو انہوں نے اپنے مشرک بھائی کو بھیج دیا۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک دنیاوی معاملات کا تعلق ہے مسلمان اپنے کافر یا مشرک بھائیوں کا بھی خیال رکھتے تھے، اس لیے کہ یہ الگ

ایک خیر کا کام ہے۔

❐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِی طَلْحَةَ اَنَّهُ قَالَ قَالَ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ رَاَیْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَ هُوَ یَوْمَئِذٍ اَمِیرُ الْمَدِینَةِ وَقَدْ رَقَعَ بَیْنَ كَتِفَیْهِ بِرِقَاعٍ ثَلَاثٍ لَبَّدَ بَعْضَهَا فَوْقَ بَعْضٍ.

﴿انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر بن خطابؓ کو دیکھا، اور وہ اس زمانے میں مدینہ کے امیر تھے، کہ انہوں نے اپنے دونوں کندھوں کے درمیان تین پیوند ایک دوسرے کے اوپر چپکائے ہوئے تھے۔﴾

وضاحت:

ایک وہ عمر ہیں جو رسول اللہ ﷺ کو ریشمی سوٹ خریدنے کا مشورہ دیتے ہیں اور ایک یہ کہ اپنی قمیص کو تین تین پیوند لگائے ہوئے ہیں۔ امیر مدینہ ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خلیفہ بننے کے بعد کی بات ہے۔ حضرت عمر بیت المال سے اپنے اوپر کم سے کم خرچ کرتے تھے تاکہ غرباء کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ نیز یہ چیز اپنے دوسرے امراء اور بعد کے لوگوں کے لیے نمونہ ہو۔ یوں بھی خلفائے راشدین اپنا معیار زندگی عوام الناس سے زیادہ بلند نہیں کرتے تھے تاکہ لوگوں کے درمیان معیار بلند کرنے کے مقابلہ کی خواہش نہ پیدا ہو جائے۔

مَا جَاءَ فِی صِفَةِ النَّبِیِّ ﷺ

نبی ﷺ کے حلیہ کے بارے میں

❐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ رَبِیعَةَ بْنِ اَبِی عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّهُ سَمِعَهُ یَقُولُ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَیْسَ بِالطَّوِیلِ الْبَائِنِ وَلَا بِالْقَصِیرِ وَلَا بِالْاَبْیَضِ الْاَمْهَقِ وَلَا بِالْآدَمِ وَلَا بِالْجَعْدِ الْقَطَطِ وَلَا بِالسَّبِطِ بَعَثَهُ اللّٰهُ عَلٰی رَاْسِ اَرْبَعِینَ سَنَةً فَاَقَامَ بِمَكَّةَ عَشْرَ سِنِینَ وَ بِالْمَدِینَةِ عَشْرَ سِنِینَ وَتَوَفَّاهُ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ عَلٰی رَاْسِ سِتِّینَ سَنَةً وَ لَیْسَ فِی رَاْسِهِ وَلِحْیَتِهِ عِشْرُونَ شَعَرَةً بَیْضَاءَ ﷺ وَعَلَیْهِ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ.

﴿ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ انہوں نے انس بن مالک سے سنا۔ وہ فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نہ تو بہت لمبے تھے، نہ پستہ قد تھے، نہ بالکل چٹے سفید تھے اور نہ زیادہ گندم گوں۔ نہ آپ کے بال بالکل گھنگریالے تھے اور نہ بالکل سپاٹ۔ چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا۔ آپ نے مکے میں دس سال قیام کیا اور مدینہ میں دس سال اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ساٹھ سال کے خاتمے پر وفات دی جب آپ کے سر یا داڑھی میں بیس بال بھی سفید نہیں تھے۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے اور سلامتی دے۔ آپ پر اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں۔﴾

وضاحت :

جہاں تعریف کرنا مشکل ہو رہا ہو وہاں نفی و اثبات دونوں کو جمع کیا جاتا ہے۔ حضور طویل البائن یعنی لمبے تڑنگے نہ تھے اور نہ ہی پستہ قد تھے۔ مطلب یہ ہوا کہ درمیانہ قد تھے۔ اسی طرح آپ کا رنگ نہ بالکل سفید اور نہ ہی ایسا جو مائل بہ سیاہی ہو بلکہ سفیدی مائل گندمی تھا۔ بال بھی نہ بہت پر شکن تھے اور نہ ہی بالکل سپاٹ، جیسے معلوم ہو کہ پٹ سن کو دھو کر کسی چیز پر لٹکا دیا گیا ہے کہ اس میں نہ کوئی شکن ہے نہ گرہ۔

آنحضرت ﷺ کی عمر کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ مکے کے تیرہ سال شمار کرتے ہیں جبکہ اس روایت میں دس سال شمار کیے گئے ہیں۔ اسی بناء پر یہاں عمر تریسٹھ برس کے بجائے ساٹھ برس بتائی گئی ہے۔ باقی رہ گیا یہ سوال کہ نبوت کے لیے چالیس سال کی عمر متعین ہے تو اس مفروضہ کی کوئی بنیاد نہیں۔ عمر اس سے کم و بیش بھی ہو سکتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ ان کو اس سے کم عمر میں نبوت ملی۔ لہٰذا اس سوال کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔

مَاجَاءَ فِي صِفَةِ عِيسَى بْنِ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَالدَّجَّالِ

حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اور دجّال کے حلیہ کے بارے میں

❏ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَرَانِي اللَّيْلَةَ عِنْدَ الْكَعْبَةِ فَرَاَيْتُ رَجُلًا آدَمَ كَاَحْسَنِ مَا اَنْتَ رَاءٍ مِنْ اُدْمِ الرِّجَالِ لَهُ لِمَّةٌ" كَاَحْسَنِ

مَا اَنْتَ رَاءٍ مِنَ اللِّمَمِ قَدْ رَجَّلَهَا فَهِيَ تَقْطُرُ مَاءً مُتَّكِئًا عَلَى رَجُلَيْنِ اَوْ عَلَى عَوَاتِقِ رَجُلَيْنِ يَطُوفُ بِالْكَعْبَةِ فَسَأَلْتُ مَنْ هٰذَا قِيلَ هٰذَا الْمَسِيحُ بْنُ مَرْيَمَ ثُمَّ اِذَا اَنَا بِرَجُلٍ جَعْدٍ قَطَطٍ اَعْوَرِ الْعَيْنِ الْيُمْنٰى كَاَنَّهَا عِنَبَةٌ طَافِيَةٌ فَسَأَلْتُ مَنْ هٰذَا فَقِيلَ لِي هٰذَا الْمَسِيحُ الدَّجَّالُ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں رات میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں کعبہ کے پاس ہوں۔ پھر ایک گندمی رنگ کے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا رنگ گندمی لوگوں کے رنگ میں سے سب سے خوبصورت ہے۔ اس کی زلفیں بہترین ہیں جو کوئی دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے۔ ان میں کنگھا کیے ہوئے ہے اور ان میں سے پانی ٹپک رہا ہے۔ وہ دو آدمیوں پر ٹیک لگائے یا دو آدمیوں کے کندھوں کا سہارا لیے ہوئے کعبہ کا طواف کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون حضرت ہیں؟ تو جواب ملا کہ یہ عیسیٰ ابن مریم ہیں۔ پھر ناگاہ میری نظر ایک شخص پر پڑی جس کے بال حبشیوں کی طرح پر شکن گھنگھریالے تھے۔ اس کی دہنی آنکھ اندھی تھی اور ابھری ہوئی جیسے گول انگور کا دانہ۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے تو جواب ملا کہ یہ مسیح دجال ہے۔﴾

وضاحت:

اس روایت میں آنحضرت ﷺ کے ایک رویا کا ذکر ہے جس میں آپ نے دو اشخاص کو دیکھا۔ ایک عیسیٰ علیہ السلام کو بیت اللہ کا طواف کرتے اور دوسرا دجال کو۔ حضرت مسیح کے اس حلیہ کی تائید انجیلوں سے بھی ہوتی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ سیدنا مسیح کی زلفیں اس طرح کی نہیں تھیں جیسے سردی کے بے رونق، خشک اور پراگندہ بال ہوتے ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ ابھی نہا کر نکلے ہیں اور ابھی تیل لگا کر کنگھا کیا ہے یا یوں معلوم ہوتا تھا کہ تیل ٹپک رہا ہے۔

جعد قطط کا مطلب ہے بہت ہی گھنگریالے بالوں والا شخص۔ حبشی لوگوں کے بال اس طرح کے ہوتے ہیں۔ وہ ان میں انگوٹھیاں بھی لٹکا لیتے ہیں اور نہایت ہی بدنما معلوم ہوتے ہیں۔ دجال کے متعلق روایت صحیح بخاری میں بھی ہے۔ اس بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ مدینہ کے ایک شخص ابن صیاد کے متعلق آنحضرت کو شبہ ہوتا تھا کہ یہ وہی دجال نہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں اس کو قتل نہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ واقعی دجال ہو گا تو تم

اس پر قابو نہیں پاؤ گے اور اگر وہ نہیں ہے تو کسی کی جان لینے سے کیا فائدہ؟ بہر حال یہ ایک شخصیت ہے جس کے آنے کی روایت مشہور ہے لیکن وہ اب تک آئی نہیں۔ اگر آئی ہوتی تو پکڑی گئی ہوتی کیونکہ اتنی واضح علامات کے ہوتے ہوئے وہ چھپ تو نہیں سکتی۔ ایسی شخصیت ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آئے گی، ابھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب آئے گی دیکھا جائے گا۔ اس کا انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

حدیث کی کتابوں میں دجال اور حضرت عیسیٰ کا ذکر بالعموم ایک ساتھ آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت عیسیٰ کی شخصیت کو اکثر مدعیوں نے استعمال کیا ہے۔ چونکہ آنجناب کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دوبارہ زندہ ہوں گے، تو جو مدعی اٹھتا ہے ان کا نام لیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دجال بھی آئے گا تو انہی کے پردے میں آئے گا اور کہے گا کہ میں مسیح موعود ہوں۔ لیکن کہاں حضرت عیسیٰ کی زلفیں اور ملائم اور چمکتے بال اور کہاں یہ ذات خبیث کہ جس کی آنکھ پھولی ہوئی اور بال حبشیوں جیسے ہوں گے۔

مَاجَاءَ فِی السُّنَّةِ فِی الْفِطْرَةِ

فطرت کی سنت کے بارے میں

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِی سَعِيدٍ الْمَقْبُرِیِّ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ خَمْسٌ مِنَ الْفِطْرَةِ تَقْلِيمُ الْأَظْفَارِ وَقَصُّ الشَّارِبِ وَنَتْفُ الْإِبْطِ وَحَلْقُ الْعَانَةِ وَالْاِخْتِتَانُ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ پانچ چیزیں فطرت میں سے ہیں۔ ناخن ترشوانا، مونچھوں کا منڈوانا، بغل کے بال اتارنا، ناف کے نیچے کے بال مونڈنا اور ختنہ کروانا۔﴾

وضاحت :

یہاں یہ روایت موقوف ہے لیکن اسے مرفوع بھی بیان کیا گیا ہے۔ فطرت سے مراد وہ تقاضے ہیں جو خیر و شر کے اس علم پر مبنی ہیں جو انسان کے اندر ہے اور پہلے سے موجود ہے۔ شریعت اس کے علاوہ ہے اور یہ فطری نور کے اوپر ایک اور نور ہے۔ یعنی فطرت کے احکام قدیم ترین ہونے چاہئیں جو ازل سے چلے آرہے ہوں۔ گویا فطرت کے کام حضرت آدم بھی کرتے رہے ہوں گے اور ان کی اولاد میں بھی وہ چیزیں رائج رہی ہوں گی۔ روایت میں بیان کردہ پانچ باتوں میں پہلی بات ناخن ترشوانا ہے۔ اچھی انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ ناخن ترشوائے جائیں۔ ناخن

بڑھاپا اور رندوں کی صفت ہے۔ مونچھوں کا منڈوانا مالکیہ کے نزدیک یہ ہے کہ لبوں کے اوپر سے مونچھیں منڈوا دی جائیں۔ حضرت عمرؓ کے متعلق آتا ہے کہ ان کو جب کوئی مہم پیش آتی تو اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے غور کرتے تھے۔ میرا دل کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ ایسا کرتے ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مشکل پیش آتی ہے تو آدمی کمزور سا ہو جاتا ہے۔ اس کا چہرہ فق ہو جاتا ہے۔ لیکن صاحب عزم مشکل سے نکلنے کے لیے سوچتا ہے کہ کیا راستہ اختیار کیا جائے تو وہ مونچھوں کو تاؤ دیتا ہے۔ حضرت عمرؓ ایک مثالی صاحب عزم آدمی اور اسلامی تہذیب کے نمونہ کامل ہیں۔ اگر وہ مونچھیں رکھتے تھے تب قص شارب کے معنی یہ ہیں کہ لب کھلا ہونا چاہیے۔ اس سے اوپر رکھنے میں مضائقہ نہیں۔ مالکیہ کا مذہب میرے نزدیک ٹھیک ہے اور اہل حدیث اس معاملہ میں متشدد ہیں۔

بغل کے بال لینا اور زہار کے نیچے کے بال مونڈنا بھی فطرت کا تقاضا ہے۔ یہ بال بڑھ جائیں تو گھن آتی ہے۔

ختنہ بھی سنت فطرت میں سے ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق یہ روایت نہایت عجیب سی ہے کہ انہوں نے اسی سال کی عمر میں ختنہ کرایا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب یہ حکم فطرت کے احکام سے ہے تو یہ بالکل شروع ہی سے انسانوں کے عمل میں رہا ہوگا۔ عیسائیوں میں ختنہ کا رواج نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پال کے پیچھے لگ کر اپنی شریعت ہی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ یہی حال ہندوؤں کا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّهُ قَالَ كَانَ إِبْرَاهِيمُ أَوَّلَ النَّاسِ ضَيَّفَ الضَّيْفَ وَ أَوَّلَ النَّاسِ اخْتَتَنَ وَ أَوَّلَ النَّاسِ قَصَّ الشَّارِبَ وَ أَوَّلَ النَّاسِ رَأَى الشَّيْبَ فَقَالَ يَا رَبِّ مَا هَذَا فَقَالَ اللَّهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى وَقَارٌ يَا إِبْرَاهِيمُ فَقَالَ يَا رَبِّ زِدْنِي وَقَارًا.

﴿سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام پہلے شخص تھے جنہوں نے مہمانوں کی میزبانی کی۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ختنہ کیا۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے مونچھیں ترشوائیں اور وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے بڑھاپے کے سفید بال دیکھے۔ اس پر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا یا رب یہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ وقار ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اے رب، میرے وقار میں اضافہ کر۔﴾

وضاحت :

یہ ایک تابعی کا قول ہے۔ بعض علماء نے اس کو حضرت ابوہریرہؓ تک پہنچایا ہے لیکن بہر حال یہ مرفوع حدیث نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا مضمون پچھلی روایت سے ٹکراتا ہے۔ اس قول میں کچھ کاموں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولیت کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس مضمون کو دیکھتے ہوئے بہت سے لوگوں نے کچھ مزید کاموں میں ان کی اولیت بتائی ہے اور اس فہرست کو طویل کر دیا ہے۔

ابن مسیب نے جن باتوں میں حضرت ابراہیمؑ کی اولیت بیان کی ہے ان میں پہلی چیز مہمان نوازی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان سے پہلے کئی جلیل القدر پیغمبر گزرے تو کیا وہ مہمانوں کی میزبانی نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی امتوں کو اس کی تعلیم نہیں دی تھی۔ اسی طرح جب ختنہ کروانا اور مونچھیں ترشوانا خصال فطرت میں سے ہے تو کیا حضرت ابراہیمؑ سے پہلے جو سلیم الفطرت لوگ گزرے کیا انہیں اس کا سلیقہ نہیں آتا تھا۔ پھر اگر حضرت ابراہیم پہلے شخص تھے جنہوں نے بڑھاپا دیکھا تو کیا حضرت نوح علیہ السلام جنہوں نے تقریباً ایک ہزار برس عمر پائی ان پر بڑھاپا طاری نہیں ہوا اور وہ جوان ہی رہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام کاموں میں سے کوئی کام ایسا نہیں جس کا حضرت ابراہیم سے پہلے وجود ناممکن کہا جا سکتا ہو۔

ہو سکتا ہے ابن مسیب کے قول کا اصل مفہوم یہ ہو کہ جہاں تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم اور خاندان کا تعلق ہے ان کے اندر ابراہیمؑ سے قبل اعلیٰ خصال کی روایت نہیں تھی اور سیدنا ابراہیمؑ پہلے شخص تھے جنہوں نے ان پر عمل کیا۔ مثال کے طور پر ان سے پہلے انبیاء توحید کی دعوت دیتے رہے تھے لیکن جس طرح انہوں نے بتکدے میں اذان دی اس کی مثال پہلے نہیں ملتی۔ توجیہ اگر اس طرح کی جائے تو ابن مسیب کی بات کا ایک محل سمجھ میں آتا ہے ورنہ یہ روایت اوپر والی روایت کی نفی کرتی ہے۔

☐ **قَالَ يَحْيَى وَسَمِعْتُ مَالِكًا يَقُولُ يُؤْخَذُ مِنَ الشَّارِبِ حَتَّى يَبْدُوَ طَرَفُ الشَّفَةِ وَهُوَ الْإِطَارُ وَلَا يَجُزُّهُ فَيُمَثِّلُ بِنَفْسِهِ.**

﴿یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالک سے میں نے سنا۔ وہ کہتے تھے کہ مونچھوں میں سے اتنے بال لیے جائیں گے کہ آدمی کے ہونٹوں کے کنارے کھل جائیں اور اس کو اطار بھی کہتے ہیں۔ نیز مونچھوں کو

اتنا نہ گھونٹ دیا جائے کہ آدمی اپنے آپ کا مثلہ کر لے۔﴾

وضاحت :

یہ امام مالک کا فتویٰ ہے اور ماہیہ کا عمل اسی پر ہے۔ گویا ان کے نزدیک مونچھیں اتنی تو ہونی چاہئیں کہ کسی مشکل کے وقت آدمی ان کا سہارا لے سکے اور حضرت عمرؓ کی طرح اپنی مونچھوں کو تاؤ دے سکے۔

اَلنَّهْيُ عَنِ الْاَكْلِ بِالشِّمَالِ

بائیں ہاتھ سے کھانے کی ممانعت کے بارے میں

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی الزُّبَيْرِ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ السَّلَمِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰی اَنْ يَّاكُلَ الرَّجُلُ بِشِمَالِهٖ اَوْ يَمْشِیَ فِی نَعْلٍ وَاحِدَةٍ وَ اَنْ يَشْتَمِلَ الصَّمَّاءَ وَ اَنْ يَحْتَبِیَ فِی ثَوْبٍ وَاحِدٍ كَاشِفًا عَنْ فَرْجِهٖ.

﴿جابر بن عبداللہ سلمیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ آدمی اپنے بائیں ہاتھ سے کھائے، یا ایک ہی پاؤں میں جوتا پہنے چلے، یا ایک ہی کپڑے میں اشتمال یا احتباء کرے جس سے اس کی شرمگاہ کے ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو۔﴾

وضاحت :

بائیں ہاتھ سے کھانے کی دو صورتیں مجبوری کی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کا ایک ہی ہاتھ ہو اور دوسری یہ کہ دائیں میں کوئی تکلیف ہو، ورنہ میرے نزدیک فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ داہنے ہاتھ سے کھانا چاہیے۔ اس کے علاوہ جتنے بھی صاف ستھرے کام ہیں وہ داہنے ہاتھ سے کیے جائیں اور جتنے کام دوسرے الگاؤ لپیٹ کے ہیں وہ بائیں ہاتھ سے کیے جائیں۔

ایک پاؤں میں جوتا پہننے کے متعلق بھی یہی ہے کہ اگر کسی کا ایک ہی پاؤں ہے اور وہ بیساکھی پر چلتا ہے تو اعتراض نہ ہوگا لیکن اگر کوئی فیشن بنانا چاہے تو یہ حماقت ہے۔

اشتمال اور احتباء کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ اس کے ممنوع ہونے کا ہمارے ہاں سوال پیدا نہیں ہوتا

کیونکہ شلوار یا پاجامے کے ساتھ ستر نہیں کھلتا۔ البتہ دیہاتی لوگ اگر تہمد میں ہوں یا ایک چادر میں ہوں تو ان کے ستر کے کھل جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں احتیاط لازم ہوگی۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَبِی بَكْرِ بْنِ عُبَيْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِذَا اَكَلَ اَحَدُكُمْ فَلْيَاْكُلْ بِيَمِيْنِهٖ وَلْيَشْرَبْ بِيَمِيْنِهٖ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يَاْكُلُ بِشِمَالِهٖ وَيَشْرَبُ بِشِمَالِهٖ.

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو چاہیے کہ داہنے ہاتھ سے کھائے اور پانی پیئے تو داہنے سے پیئے کیونکہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور پیتا ہے۔﴾

وضاحت:

احادیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شر، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس کا منبع شیطان ہے۔ تو یہاں پر آنحضرتؐ نے بائیں ہاتھ سے کھانے کو اصل مرکزی طرف منسوب کر دیا کہ یہ شیطانی طریقہ ہے۔ چونکہ محرک اول وہی ہوتا ہے تو یہ فعل بھی شیطان کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ مہذب قوموں کو یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔

مَاجَاءَ فِی الْمَسَاكِيْنِ

مساکین کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ بِهٰذَا الطَّوَّافِ الَّذِی يَطُوْفُ عَلَى النَّاسِ فَتَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ قَالُوْا فَمَا الْمِسْكِيْنُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الَّذِی لَا يَجِدُ غِنًى يُغْنِيْهِ وَلَا يَفْطُنُ النَّاسُ لَهٗ فَيُتَصَدَّقُ عَلَيْهِ وَلَا يَقُوْمُ فَيَسْاَلُ النَّاسَ.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں کے آگے گردش کرتا ہے۔ کوئی اس کو ایک لقمہ دے دیتا ہے کوئی دو لقمے اور کوئی ایک کھجور دے دیتا ہے

کوئی دو کھجوریں۔ لوگوں نے پوچھا یارسول اللہ، پھر مسکین ہوا کون؟ آپ نے فرمایا جو اتنے مال سے تو محروم ہے جو اس کو غنی کر دے، لیکن اس کے استغناء کے باعث لوگ سمجھ نہیں پاتے کہ اس پر صدقہ کریں اور وہ خود نکلتا نہیں کہ لوگوں سے سوال کرے۔﴾

وضاحت:

یعنی ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتا اور اس حال میں رہتا ہے کہ لوگ سمجھ نہیں پاتے کہ آیا یہ مسکین ہے کہ اس کو کچھ دیا جائے۔ وہ بلند حوصلہ ہوتا ہے جو یہ زخم نہیں اٹھانا چاہتا کہ کوئی کہے کہ جاؤ بابا معاف کرو۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنِ ابْنِ بُجَيْدٍ الْأَنْصَارِيِّ ثُمَّ الْحَارِثِيِّ عَنْ جَدَّتِهِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ رُدُّوا الْمِسْكِينَ وَلَوْ بِظِلْفٍ مُحْرَقٍ.

﴿ابن جید انصاری اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسکین کو اپنے دروازے سے لوٹاؤ اگرچہ ایک جلی ہوئی کھری ہی سے کیوں نہ ہو۔﴾

وضاحت:

مراد وہ کھری ہے جو ہنڈیا میں چڑھائی گئی تھی اور وہ جل گئی۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی حقیر سے حقیر چیز ہی کیوں نہ میسر ہو مسکین کو کچھ دے دلا کر واپس کرنا چاہیے۔ ویسے ہی لوٹانا نہیں چاہیے۔

مَا جَاءَ فِي مِعَى الْكَافِرِ

کافر کی آنتوں کے بارے میں

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَأْكُلُ الْمُسْلِمُ فِي مِعًى وَاحِدٍ وَالْكَافِرُ يَأْكُلُ فِي سَبْعَةِ أَمْعَاءٍ.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان ایک آنت میں کھاتا ہے

اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔﴾

وضاحت :

یہ روایت ظاہر کے خلاف ہے اس لیے اس کی توجیہ اگلی روایت کی روشنی میں کرنی چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ راوی نے اس روایت سے اتنے ٹکڑے کو لے کر الگ روایت کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روایت اپنے موقع و محل سے کٹ گئی۔ اس وجہ سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ سُهَيْلِ بْنِ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ ضَافَهُ ضَيْفٌ كَافِرٌ فَأَمَرَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِشَاةٍ فَحُلِبَتْ فَشَرِبَ حِلَابَهَا ثُمَّ أُخْرَى فَشَرِبَهُ ثُمَّ أُخْرَى فَشَرِبَهُ حَتَّى شَرِبَ حِلَابَ سَبْعِ شِيَاهٍ ثُمَّ إِنَّهُ أَصْبَحَ فَأَسْلَمَ فَأَمَرَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِشَاةٍ فَحُلِبَتْ فَشَرِبَ حِلَابَهَا ثُمَّ أَمَرَ لَهُ بِأُخْرَى فَلَمْ يَسْتَتِمَّهَا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْمُؤْمِنُ يَشْرَبُ فِي مِعًى وَاحِدٍ وَالْكَافِرُ يَشْرَبُ فِي سَبْعَةِ أَمْعَاءٍ.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں ایک کافر مہمان ہوا۔ آنحضرتؐ نے ایک بکری اس کے لیے دوہنے کا حکم دیا۔ وہ دوہی گئی تو اس نے اس کا دودھ پیا۔ پھر دوسری دوہی گئی، وہ بھی پی گیا۔ پھر تیسری دوہی گئی وہ بھی پی گیا۔ یہاں تک کہ سات بکریوں کا دودھ پی گیا۔ صبح کو یہ آدمی مسلمان ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک بکری دوہنے کا کہا۔ وہ دوہی گئی تو اس نے اس کا دودھ پی لیا۔ پھر آپ نے دوسری بکری کا کہا تو اس کے کچھ گھونٹ پی کر بس کر دیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مومن ایک آنت میں پیتا ہے اور کافر سات آنتوں میں۔﴾

وضاحت :

یہ ایک خاص واقعہ ہے۔ اس میں مومن اور کافر کی طمع، خواہش اور حرص کا فرق نمایاں کیا ہے۔ مومن کے اندر صبر، قناعت اور غنا ہوتی ہے اور وہ تھوڑے پر کفایت کر لیتا ہے۔ اور کافر کے اندر یہ بات ہوتی ہے کہ معلوم نہیں پھر ملے یا نہ ملے، ابھی سے بھر لو۔ یہ بات اس کے کردار پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس طرح مومن کے ایمان کا

کردار پر یہ اثر پڑتا ہے کہ اس میں قناعت اور صبر اور اللہ پر بھروسہ ہوتا ہے کہ جس نے اب دیا ہے وہ آئندہ بھی دے گا۔ کافر کی یہ سوچ نہیں ہوتی۔

اس روایت میں متعین طور پر یہ بتانا مقصود نہیں کہ سب کافر ایسے ہی ہوتے ہیں بلکہ تمثیل کے طور پر واضح کیا ہے۔ کتنے کافر ہیں جن کی خوراک کم ہوتی ہے۔ اسی طرح سے بہت سے مسلمان ہیں جو کافروں کا حصہ بھی کھا جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ کھانے پینے کے معاملہ میں ایک صاحب ایمان آدمی کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ اس روایت سے پچھلی روایت کا سقم واضح ہو گیا۔ کیونکہ اسی روایت کے آخری ٹکڑے کو الگ کر کے روایت کر دی گئی۔ دونوں کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہی ہیں۔ لیکن ناقل مختلف ہیں۔ جب آخری ٹکڑا اپنے موقع و محل سے کٹ گیا تو روایت ظاہر کے خلاف ہو گئی۔ البتہ اب بات ٹھیک ہو گئی۔

اَلنَّهْىُ عَنِ الشُّرْبِ فِى آنِيَةِ الْفِضَّةِ وَالنَّفْخِ فِى الشَّرَابِ

چاندی کے برتن میں پینے اور پینے کی چیز میں پھونک مارنے کی ممانعت

☐ حَدَّثَنِى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِى بَكْرِ الصِّدِّيْقِ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ زَوْجِ النَّبِىِّ ﷺ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَلَّذِى يَشْرَبُ فِى آنِيَةِ الْفِضَّةِ اِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِى بَطْنِهِ نَارَ جَهَنَّمَ.

﴿عبداللہ بن عبدالرحمٰن نبی ﷺ کی زوجہ ام سلمہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص چاندی کے برتن میں پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ غٹ غٹ اتارتا ہے۔﴾

وضاحت :

اونٹ پانی پیتا ہے تو جب اپنی گردن اوپر اٹھاتا ہے تو اس سے غٹ غٹ کی آواز آتی ہے۔ اس کے لیے ''جرجر'' کا لفظ آتا ہے۔ جہنم کی آگ اگرچہ پینے کی چیز نہیں لیکن عربیت کے قاعدے کے لحاظ سے یہ تعبیر، اس خاص آواز کے لیے جو پانی پینے سے نکلتی ہے، ٹھیک ہے۔ کھانے میں، پینے میں، سواری میں، مکان میں اور ہر چیز میں غیر ضروری تکلف اخلاق کے خلاف ہے۔ زندگی سادہ ہونی چاہیے۔ آدمی اپنی وسعت اور حوصلے کے مطابق اسے جتنا بھی بڑھائے لیکن حدود سے کبھی تجاوز نہیں ہونا چاہیے۔ اگر چاندی کے برتن آپ کی میز پر ہوں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے

ریشمی سوٹ آپ کے سوٹ کیس میں ہوں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے چاندی کے برتنوں کی ممانعت اس لیے فرمائی کہ عربوں کی معاشرت سادہ تھی تو ان کی یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ایران اور مصر کی تہذیب کا عربوں کی زندگی پر خاصا اثر تھا اور ان کے برتنوں کے نام تک کافی تعداد میں معرب ہیں۔ حضرت عمرؓ کا طرزِ عمل بھی یہ بتاتا ہے کہ مشقت کی زندگی اختیار کی جانی چاہیے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَيُّوبَ بْنِ حَبِيبٍ مَوْلَى سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ عَنْ أَبِي الْمُثَنَّى الْجُهَنِيِّ أَنَّهُ قَالَ كُنْتُ عِنْدَ مَرْوَانَ بْنِ الْحَكَمِ فَدَخَلَ عَلَيْهِ أَبُو سَعِيدٍ الْخُدْرِيُّ فَقَالَ لَهُ مَرْوَانُ أَسَمِعْتَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ نَهَى عَنِ النَّفْخِ فِي الشَّرَابِ فَقَالَ لَهُ أَبُو سَعِيدٍ نَعَمْ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي لَا أَرْوَى مِنْ نَفَسٍ وَاحِدٍ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَأَبِنِ الْقَدَحَ عَنْ فِيكَ ثُمَّ تَنَفَّسْ فَقَالَ لَهُ أَرَى الْقَذَاةَ فِيهِ قَالَ فَأَهْرِقْهَا.

﴿ابو المثنی جہنی کہتے ہیں کہ میں مروان بن حکم کے پاس موجود تھا تو وہاں ابو سعید خدریؓ آ گئے۔ مروان نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ نے پینے کے پانی میں پھونک مارنے سے منع کیا ہے۔ ابو سعید نے کہا کہ ہاں۔ اس پر ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ، میں ایک سانس میں تو آسودہ نہیں ہو پاتا (لہٰذا لگاتار پیتا ہوں)۔ آپ نے فرمایا کہ پیالہ ہونٹ سے الگ کر کے سانس لے لیا کرو۔ اس نے کہا میں اس میں تنکا دیکھ لیتا ہوں تو؟ آپ نے فرمایا کہ پیالہ الٹ دو۔﴾

وضاحت :

نبی ﷺ نے جس چیز سے منع فرمایا وہ یہ ہے کہ آدمی پانی پیتا ہی چلا جائے اور سانس بھی پیالہ کے اندر ہی لے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر آدمی تھوڑا تھوڑا پانی پینے سے آسودہ نہ ہوتا ہو تو پیالہ کو منہ سے ذرا ہٹا کر سانس لے لے۔ پیالہ میں ہی سانس نہیں لینا چاہیے۔ آنحضرت کی یہ ہدایت طبی لحاظ سے بالکل درست ہے۔ پانی میں سانس لینے سے پانی سانس کی نالی میں چلے جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ نبی کا مقام ہے کہ حضور نے ہر معاملے میں امت کی رہنمائی فرمائی۔

مَاجَاءَ فِی شُرْبِ الرَّجُلِ وَھُوَ قَائِمٌ

کھڑے کھڑے پانی پینے کے بارے میں روایات

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَعَلِیَّ بْنَ اَبِی طَالِبٍ وَ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ كَانُوا يَشْرَبُونَ قِيَامًا.

﴿امام مالک کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ عمر بن خطابؓ، علی ابن ابی طالبؓ اور عثمان بن عفانؓ کھڑے ہو کر پانی پیتے تھے۔﴾

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَنَّ عَائِشَةَ اُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ سَعْدَ بْنَ اَبِی وَقَّاصٍ كَانَا لَايَرَيَانِ بِشُرْبِ الْاِنْسَانِ وَهُوَ قَائِمٌ بَاْسًا.

﴿ابن شہاب سے روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ ام المومنین اور سعد بن ابی وقاصؓ دونوں آدمی کے کھڑے ہو کر پانی پینے میں کوئی قباحت نہیں خیال کرتے تھے۔﴾

□ عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی جَعْفَرٍ الْقَارِی اَنَّهُ قَالَ رَاَيْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ يَشْرَبُ قَائِمًا.

﴿ابو جعفر قاری روایت کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرؓ کو کھڑے ہو کر پانی پیتے دیکھا۔﴾

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ اَبِيهِ اَنَّهُ كَانَ يَشْرَبُ قَائِمًا.

﴿عامر بن عبداللہ بن زبیر اپنے باپ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ کھڑے ہو کر پیتے تھے﴾

وضاحت:

مذکورہ چاروں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک کے زمانے میں یہ مسئلہ زیر بحث آگیا تھا کہ کیا کھڑے ہو کر پانی پینا جائز ہے یا نہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس بارے میں دو رائیں رہی ہوں گی۔ اس سلسلہ میں امام مالک نے تعامل صحابہ کا حوالہ دیا ہے کہ تمام اکابر صحابہ کھڑے ہو کر پینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان روایات میں یہ مسئلہ تو بالکل واضح ہو گیا کہ کھڑے ہو کر پانی پینے میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ کھڑے ہو کر کھانا کھانے کا مسئلہ قابل غور ہے۔ صحابہؓ کے دور میں یہ تصور بھی نہ تھا کہ کبھی ہونے کا وقت بھی آئے گا اور لوگ کھڑے ہو

کر کھانا کھایا کریں گے۔

اَلسُّنَّةُ فِي الشُّرْبِ وَمُنَاوَلَتِهِ عَنِ الْيَمِينِ

پینے اور داہنے سے پکڑانے کے بارے میں سنت

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ أُتِيَ بِلَبَنٍ قَدْ شِيبَ بِمَاءٍ مِنَ الْبِئْرِ وَ عَنْ يَمِينِهِ أَعْرَابِيٌّ وَ عَنْ يَسَارِهِ أَبُوبَكْرٍ الصِّدِّيقُ فَشَرِبَ ثُمَّ أَعْطَى الْأَعْرَابِيَّ وَقَالَ الْأَيْمَنَ فَالْأَيْمَنَ.

﴿انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس دودھ لایا گیا جس میں کنویں کا پانی ملایا گیا تھا۔ آپ کے داہنے ایک بدو تھا اور بائیں حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔ آپؐ نے پیا اور بدو کو دے دیا اور کہا کہ داہنا داہنا ہی ہے۔﴾

وضاحت :

جس طرح کھانا کھانے میں داہنے ہاتھ سے کھانے کا حکم ہے یا جوتا پہننے میں دائیں پاؤں سے آغاز کرنے کا حکم ہے اسی طرح مجلس میں کوئی چیز تقسیم کی جا رہی ہو تو اس میں دائیں بیٹھے ہوئے لوگوں کا حق مقدم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ جب ابوبکر صدیقؓ کو نظر انداز کر کے بدو کو پہلے دے رہے ہیں تو یہ بڑی چیز ہے اور اس کا سبب داہنے کا احترام ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي حَازِمِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ الْأَنْصَارِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ أُتِيَ بِشَرَابٍ فَشَرِبَ مِنْهُ وَ عَنْ يَمِينِهِ غُلَامٌ وَ عَنْ يَسَارِهِ الْأَشْيَاخُ فَقَالَ لِلْغُلَامِ أَتَأْذَنُ لِي أَنْ أُعْطِيَ هٰؤُلَاءِ الْأَشْيَاخَ فَقَالَ الْغُلَامُ لَا وَاللّٰهِ يَا رَسُولَ اللّٰهِ لَا أُوثِرُ بِنَصِيبِي مِنْكَ أَحَدًا قَالَ فَتَلَّهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي يَدِهِ.

﴿سہل بن سعد انصاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کوئی پینے کی چیز لائی گئی۔ آپ نے اس میں سے پیا۔ آپ کے داہنے ایک چھوکرا تھا اور بائیں بڑے عمر رسیدہ لوگ۔ آپ نے لڑکے

سے پوچھا کیوں بھئی، تم اجازت دیتے ہو کہ میں ان بزرگوں کو دے دوں۔ لڑکے نے کہا نہیں یا رسول اللہ، میں آپ کا بچا ہوا حصہ کسی کے لیے ایثار کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

وضاحت:

معلوم ہوتا ہے کہ لڑکا نہایت ہی سلیم الطبع تھا۔ جو حصہ اس کو رسول اللہ ﷺ سے مل رہا تھا وہ کسی کو دینے پر تیار نہ ہوا اور اکابر صحابہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ یہ بھی داہنے کا احترام تھا جو نبی ﷺ نے ملحوظ رکھا۔

جَامِعُ مَاجَاءَ فِي الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ

کھانے اور پینے کے بارے میں جامع باب

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ إِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ أَنَّهُ سَمِعَ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُولُ قَالَ أَبُو طَلْحَةَ لِأُمِّ سُلَيْمٍ لَقَدْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ ضَعِيفًا أَعْرِفُ فِيهِ الْجُوعَ فَهَلْ عِنْدَكِ مِنْ شَيْءٍ فَقَالَتْ نَعَمْ فَأَخْرَجَتْ أَقْرَاصًا مِنْ شَعِيرٍ ثُمَّ أَخَذَتْ خِمَارًا لَهَا فَلَفَّتِ الْخُبْزَ بِبَعْضِهِ ثُمَّ دَسَّتْهُ تَحْتَ يَدِي وَ رَدَّتْنِي بِبَعْضِهِ ثُمَّ أَرْسَلَتْنِي إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ فَذَهَبْتُ بِهِ فَوَجَدْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ جَالِسًا فِي الْمَسْجِدِ وَمَعَهُ النَّاسُ فَقُمْتُ عَلَيْهِمْ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَرْسَلَكَ أَبُو طَلْحَةَ قَالَ فَقُلْتُ نَعَمْ قَالَ لِلطَّعَامِ فَقُلْتُ نَعَمْ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لِمَنْ مَعَهُ قُومُوا قَالَ فَانْطَلَقَ وَانْطَلَقْتُ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ حَتّٰى جِئْتُ أَبَا طَلْحَةَ فَأَخْبَرْتُهُ فَقَالَ أَبُو طَلْحَةَ يَا أُمَّ سُلَيْمٍ قَدْ جَاءَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بِالنَّاسِ وَ لَيْسَ عِنْدَنَا مِنَ الطَّعَامِ مَا نُطْعِمُهُمْ فَقَالَتْ اللّٰهُ وَ رَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ فَانْطَلَقَ أَبُو طَلْحَةَ حَتّٰى لَقِيَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَأَقْبَلَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَ أَبُو طَلْحَةَ مَعَهُ حَتّٰى دَخَلَا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ هَلُمِّي يَا أُمَّ سُلَيْمٍ مَا عِنْدَكِ فَأَتَتْ بِذٰلِكَ الْخُبْزِ فَأَمَرَ بِهِ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَفُتَّ وَ عَصَرَتْ عَلَيْهِ أُمُّ سُلَيْمٍ

عُكَّةً لَهَا فَاَدَمَتْهُ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّقُوْلَ ثُمَّ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ بِالدُّخُوْلِ فَاَذِنَ لَهُمْ فَاَكَلُوْا حَتّٰى شَبِعُوْا ثُمَّ خَرَجُوْا ثُمَّ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ فَاَذِنَ لَهُمْ فَاَكَلُوْا حَتّٰى شَبِعُوْا ثُمَّ خَرَجُوْا ثُمَّ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ فَاَذِنَ لَهُمْ فَاَكَلُوْا حَتّٰى شَبِعُوْا ثُمَّ خَرَجُوْا ثُمَّ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ فَاَذِنَ لَهُمْ فَاَكَلُوْا حَتّٰى شَبِعُوْا ثُمَّ خَرَجُوْا ثُمَّ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ حَتّٰى اَكَلَ الْقَوْمُ كُلُّهُمْ وَ شَبِعُوْا وَالْقَوْمُ سَبْعُوْنَ رَجُلًا اَوْ ثَمَانُوْنَ رَجُلًا.

﴿ عبداللہ بن ابی طلحہؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے انس بن مالکؓ سے سنا۔ وہ کہتے تھے کہ ابو طلحہؓ نے اپنی بیوی ام سلیمؓ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی آواز میں کمزوری محسوس کی ہے۔ میرے خیال میں آپ بھوک میں مبتلا ہیں۔ کیا تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ انہوں نے چند ٹکیاں جو کی نکالیں، ان کو اپنی اوڑھنی کے کچھ حصہ میں لپیٹا اور میری بغل میں دے دیا اور اوڑھنی کا کچھ حصہ میرے اوپر ڈال دیا۔ پھر مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ آپ کے پاس اور لوگ بھی ہیں۔ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ کیا ابو طلحہ نے بھیجا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں۔ آپ نے پوچھا کھانے پر بلایا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ رسول اللہ ﷺ نے ساتھیوں سے کہا چلو۔ سب لوگ چل پڑے اور میں ان کے آگے آگے تھا۔ یہاں تک کہ میں ابو طلحہ کے پاس آیا اور ان کو خبر دی۔ ابو طلحہ نے ام سلیم سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں اور ہمارے پاس اتنا کھانا تو نہیں کہ ان کو کھلا سکیں۔ انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول خوب جانتے ہیں۔ انسؓ کہتے ہیں کہ ابو طلحہ گئے اور رسول اللہ ﷺ سے ملے۔ پھر رسول اللہ ﷺ اور ابو طلحہؓ ساتھ ساتھ گھر میں داخل ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے کہا ام سلیم لاؤ کیا ہے تمہارے پاس۔ انہوں نے وہی روٹیاں پیش کیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تو وہ چورا کی گئیں اور ام سلیم نے اپنی چمڑے کی کپی اوپر انڈیل دی اور اس کو سالن دار کر دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس پر جو چاہا دعا کی۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ دس آدمیوں کو اندر بلاؤ۔ آپ کی اجازت سے انہوں نے کھایا،

آسودہ ہو گئے اور نکل گئے۔ آپ نے پھر کہا کہ دس آدمیوں کو بلاؤ۔ آپ کی اجازت سے انہوں نے کھایا، آسودہ ہو گئے اور نکل گئے۔ آپ نے پھر کہا دس آدمیوں کو بلاؤ۔ آپ کی اجازت سے انہوں نے کھایا، آسودہ ہو گئے اور نکل گئے۔ آپ نے پھر فرمایا کہ دس آدمیوں کو بلاؤ، آپ کی اجازت سے انہوں نے کھایا، آسودہ ہوئے اور نکل گئے۔ آپ نے پھر فرمایا کہ دس آدمیوں کو بلاؤ۔ یہاں تک کہ سب لوگوں نے کھایا اور آسودہ ہو گئے۔ یہ تمام لوگ ستر یا اسی آدمی تھے۔

وضاحت:

یہ روایت صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دوسری کتابوں میں بھی آئی ہے لیکن الفاظ ہر جگہ بدلے ہوئے ہیں۔ زرقانی نے دس روایتوں کا حوالہ دیا ہے اور ان سب میں الفاظ مختلف ہیں۔ ان کے خیال میں موقع ایک ہی ہے البتہ واقعات مختلف ہو سکتے ہیں جن کو اکٹھا کر کے ایک واقعہ بنانے میں کامیابی نہیں ہوتی۔ بعض محدثین کا خیال ہے کہ ان تمام روایات کے مواقع الگ الگ ہوں گے، حالانکہ واقعات کا اختلاف اس بات کا قرینہ نہیں ہوتا کہ ان کا موقع الگ الگ ہو۔

بعض روایات کی رو سے یہ واقعہ غزوہ خندق کے دوران پیش آیا۔ اس روایت میں جو کی روٹیوں کا ذکر ہے جن کا چورا بنایا گیا اور اس میں گھی یا تیل ملا کر نرم کیا گیا، دوسری روایات میں بکری ذبح کر کے شوربے کے ساتھ روٹی کھلانے کا۔ اگر یہ واقعہ غزوہ خندق کا ہے تو مسجد سے مراد مسجد نبوی نہیں ہو گی بلکہ وہ جگہ ہو گی جہاں سب لوگ نماز کے لیے جمع ہوتے ہوں گے۔ اس روایت کے مطابق روٹیاں تیار تھیں جبکہ دوسری روایت میں یہ ہے کہ مزدوری کے معاوضہ سے غلہ خرید کر پیسا گیا اور اس سے روٹی بنائی گئی۔ روایات میں کھانے والوں کی تعداد کا فرق بھی ہے۔ بعض کے نزدیک یہ تعداد چالیس تھی۔

باقی رہ گئی یہ بات کہ کھانے میں برکت ہو سکتی ہے تو یہ مشاہدہ کی بات ہے کہ برکت ہوتی ہے۔ آنحضرتؐ کی دعا کے بعد اس میں ہر برکت کی توقع ہو سکتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جو معجزات بائبل میں بیان ہوئے ہیں ان میں بھی ہے کہ بعض اوقات لوگوں کی بھیڑ ہوتی تھی کہ آپ ان کو کھانے کی دعوت دے دیتے۔ ان کا خادم پوچھتا کہ ان کو کہاں سے کھلائیں گے۔ وہ کہتے کہ تم کھلاؤ گے۔ وقت آنے پر پوچھتے کہ تمہارے پاس کتنی روٹی ہے وہ

کتنے تین یا پانچ۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ اپنا معجزہ دکھاتے اور تمام گروہ کھا کر آسودہ ہو جاتا اور اس کے بعد بھی روٹی کے کئی ٹوکرے اٹھائے جاتے۔ لہذا پیغمبر کی دعا کی برکت سے ایسا ہونا ممکن ہے۔

❏ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ طَعَامُ الِاثْنَيْنِ كَافِي الثَّلَاثَةِ وَ طَعَامُ الثَّلَاثَةِ كَافِي الْأَرْبَعَةِ.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دو آدمیوں کا کھانا تین آدمیوں کے لیے کافی اور تین کا کھانا چار آدمی کے لیے کافی ہونا چاہیے۔﴾

وضاحت :

واقعہ یہ ہے کہ اگر دل میں جگہ ہو تو کھانے میں بھی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر دل تنگ ہو تو پھر کھانے کی برکت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ہر روز تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ کھانا اگرچہ دو آدمی کا ہوتا ہے لیکن تین چار کھا لیتے ہیں۔ روایت کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حکم ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ ایسا ہونا چاہیے۔ آدمی کے دل میں فیاضی اور وسعت ہو، قناعت اور ایثار ہو، خود غرضی اور طمع نہ ہو۔

❏ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي الزُّبَيْرِ الْمَكِّي عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللَّهِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ أَغْلِقُوا الْبَابَ وَ أَوْكِؤُا السِّقَاءَ وَ اكْفَؤُا الْإِنَاءَ أَوْ خَمِّرُوا الْإِنَاءَ وَ أَطْفِئُوا الْمِصْبَاحَ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَفْتَحُ غَلَقًا وَلَا يَحُلُّ وِكَاءً وَلَا يَكْشِفُ إِنَاءً وَ إِنَّ الْفُوَيْسِقَةَ تُضْرِمُ عَلَى النَّاسِ بَيْتَهُمْ.

﴿حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سونے سے پہلے دروازہ بند کر لو، مشکیزہ باندھ دو، برتن ڈھانک دو اور چراغ گل کر دو۔ کیونکہ شیطان بند دروازے کو نہیں کھولتا، نہ مشکیزہ کا بند حسن کھولتا اور نہ برتن کو کھولتا ہے۔ جبکہ چوہیا لوگوں کے گھروں کو آگ لگا دیتی ہے۔﴾

وضاحت :

روز مرہ زندگی سے متعلق آنحضرت ﷺ نے یہ ہدایات دی ہیں جو بے حد قیمتی ہیں۔ یہ حکمت کی تعلیم

ہے۔ چھوٹی چھوٹی بے پروائیاں بعض اوقات بہت سنگین نتائج تک پہنچا دیتی ہیں۔ لہذا آدمی کو محتاط رویہ رکھنا چاہیے۔
قرآن مجید کی روشنی میں شیطان کو جو اختیار حاصل ہے وہ اس اتنا ہے کہ صرف وسوسہ اندازی کرے۔ وہ عملاً کچھ
نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ دلوں میں غلط فہمیاں ڈال کر فتنہ اندازی کرتا ہے۔ اگر اسے عملاً نقصان پہنچانے کا اختیار ہو تو
کوئی گھر سلامت نہ رہے۔ اسی حقیقت کی تعبیر نبی ﷺ نے کی ہے۔

فویسقہ کا لفظ بہت ہی عمدہ ہے۔ طبیعت پھڑک اٹھی۔ یہ فاسقہ (چھنال) کی تصغیر ہے اور حضور نے اس
سے مراد چوہیا کو لیا ہے جو گھروں میں بڑے نقصانات کر دیتی ہے۔ گزشتہ زمانے میں اور آج بھی دیہاتوں میں
سرسوں کے تیل کے دیئے استعمال ہوتے ہیں۔ چوہیا کی غذا اس میں ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ جلتی بتی لے اڑتی اور گھر
میں آگ لگا دیتی ہے۔

❐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ سَعِيدِ ابْنِ أَبِي سَعِيدٍ الْمَقْبُرِيِّ عَنْ أَبِي شُرَيْحٍ الْكَعْبِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ جَارَهُ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ جَائِزَتُهُ يَوْمٌ وَلَيْلَةٌ وَضِيَافَتُهُ ثَلَاثَةُ أَيَّامٍ فَمَا كَانَ بَعْدَ ذَلِكَ فَهُوَ صَدَقَةٌ" وَلَا يَحِلُّ لَهُ أَنْ يَثْوِيَ عِنْدَهُ حَتَّى يُحْرِجَهُ.

﴿ابو شریح الکعبیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا
ہے اس کو چاہیے کہ بھلی بات کرے یا چپ رہے۔ اور جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہے اس
کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے۔ اور جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے
مہمان کی عزت کرے، ایک دن اور ایک رات اس کی خاطر تواضع کرے اور تین دن تک میزبانی
کرے۔ اس کے بعد جو ہے وہ صدقہ ہے اور مہمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس کے پاس اتنا ٹھہرے
کہ میزبان کو تنگ کر دے۔﴾

وضاحت:

زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کو آنحضرت ﷺ نے روشن نہ فرمایا ہو۔ اس روایت میں زندگی کے

بعید گوشوں کے متعلق رہنمائی فرمائی ہے۔ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ زبان کھولے تو خیر کے لیے ورنہ خاموش رہے کیونکہ سارے فتنے زبان کے بے جا استعمال سے جنم لیتے اور بالآخر آدمی کو جہنم میں لے جاتے ہیں۔ فضول بکواس، غیبت، تہمت، تحقیر نہیں کرنی چاہیے۔ کلمہ خیر ہے تو ٹھیک ورنہ خاموشی اختیار کرنا ہی بھلے لوگوں کا طریقہ ہے۔

اللہ اور یوم آخر پر ایمان کا تقاضا یہ بھی ہے کہ پڑوسی کی عزت اور مہمان کی قدر کرے ورنہ اس کا ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت معتبر نہیں۔ مہمان کے متعلق حضورؐ نے یہ بھی فرمایا کہ پہلے دن اور رات کو آدمی اس کی خاطر تواضع کرے اور اس کے بعد تین دن تک ضیافت کرے یعنی جو کچھ خود کھاتا ہے وہ اسے بھی کھلائے۔ اس کے بعد اس کو کھانا کھلانا صدقہ ہے یعنی وہ مہمان نہیں بلکہ سائل کے درجہ میں ہوگا۔ مہمان کے لیے آپ نے یہ نصیحت فرما دی کہ وہ اتنا قیام نہ کرے کہ میزبان کی زندگی اجیرن کردے۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ سُمَیٍّ مَوْلٰی اَبِی بَكْرٍ عَنْ اَبِی صَالِحٍ السَّمَّانِ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ بَیْنَمَا رَجُلٌ یَمْشِی بِطَرِیقٍ اِذَا اشْتَدَّ عَلَیْهِ الْعَطَشُ فَوَجَدَ بِئْرًا فَنَزَلَ فِیهَا فَشَرِبَ وَ خَرَجَ فَاِذَا كَلْبٌ یَلْهَثُ یَاْكُلُ الثَّرٰی مِنَ الْعَطَشِ فَقَالَ الرَّجُلُ لَقَدْ بَلَغَ هٰذَا الْكَلْبَ مِنَ الْعَطَشِ مِثْلُ الَّذِی بَلَغَ مِنِّی فَنَزَلَ الْبِئْرَ فَمَلَاَ خُفَّهُ ثُمَّ اَمْسَكَهُ بِفِیهِ حَتّٰی رَقِیَ ثُمَّ سَقَی الْكَلْبَ فَشَكَرَ اللّٰهُ لَهُ فَغَفَرَ لَهُ فَقَالُوا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ اِنَّ لَنَا فِی الْبَهَائِمِ لَاَجْرًا فَقَالَ فِی كُلِّ ذِی كَبِدٍ رَطْبَةٍ اَجْرٌ۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص راستے میں جا رہا تھا کہ اس کو سخت پیاس لگی۔ اس نے ایک کنواں پایا تو اس میں اتر گیا۔ اس نے پانی پیا اور نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا ہانپتا ہوا پیاس کے باعث مٹی چاٹ رہا ہے۔ اس کو خیال آیا کہ اس کتے کو بھی وہی پیاس ہے جس سے مجھے سابقہ تھا۔ وہ کنویں میں اترا، اپنا موزہ پانی سے بھر اور منہ میں پکڑ لیا، یہاں تک کہ اوپر چڑھ آیا۔ پھر پانی کتے کو پلایا۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی یہ خدمت پسند آئی تو اس کو بخش دیا۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا جانوروں کی خدمت کرنے میں بھی اجر ہے؟ آپ نے فرمایا جی، ہر زندہ جانور میں کہ جس کے اندر

جگر ہے، اس کا اجر ہے۔ ﴾

وضاحت :

بعض اوقات جس جذبے کے تحت کوئی کام کرتا ہے وہی اس کی اصل فطرت ہوتا ہے۔ جس شخص کا یہ جذبہ تھا کہ کتے کی پیاس دیکھ کر یہ کہے کہ اس کو بھی میرے جیسی پیاس لگی ہے وہ یقیناً بھلا آدمی ہو سکتا ہے، فاسق و فاجر شخص نہیں ہو سکتا۔ یہ ہر آدمی کا کام نہیں۔ اس شخص نے ایک ایسی خدمت کر دی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور اس کو معاف کر دیا۔ میرے خیال میں اس طرح کے آدمی نہایت شریف اور بنیادی طور پر نیک ہوتے ہیں۔ ان کے اندر رحم کا جذبہ ہوتا ہے۔ اس طرح کے آدمی کی غلطیاں ایسی نہیں ہوتیں کہ اس کو جہنم میں لے جائیں بلکہ ان کی اس طرح کی نیکیوں سے دھل جاتی ہیں۔

لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ کوئی زانیہ فاسقہ عورت ایسا کام کرے تو بخش دی جائے گی تو حیرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ اس طرح کے لوگ کبھی توفیق نہیں پاتے۔ جو بھلے لوگ ہوتے ہیں ان کو ہی اللہ تعالیٰ توفیق دیتا ہے کہ کوئی چھوٹی سی نیکی بھی وہ اس شان سے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خوش ہو جاتا ہے۔ اور اس کی خوشی ان کی بخشش کے لیے کافی ہوتی ہے۔

ایک بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آدمی کی اس نیکی نے اس کے اچھے اعمال کے پلڑے کو اتنا بھاری کر دیا کہ اس کے گناہوں کا پلڑا مقابلتاً ہلکا ہو گیا۔ جس خلوص سے اس نے نیکی کی اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشنودی اس میں شامل کر کے اس کے نیکیوں کے پلڑے کو بھاری کر دیا۔ ذالك فضل الله يوتيه من يشاء.

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ وَهْبِ بْنِ كَيْسَانَ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّهُ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَعْثًا قِبَلَ السَّاحِلِ فَاَمَّرَ عَلَيْهِم اَبَا عُبَيْدَةَ بْنَ الْجَرَّاحِ وَ هُمْ ثَلَاثُمِائَةٍ قَالَ وَ اَنَا فِيْهِمْ قَالَ فَخَرَجْنَا حَتّٰى اِذَا كُنَّا بِبَعْضِ الطَّرِيْقِ فَنِيَ الزَّادُ فَاَمَرَ اَبُوْعُبَيْدَةَ بِاَزْوَادِ ذٰلِكَ الْجَيْشِ فَجُمِعَ ذٰلِكَ كُلُّهُ فَكَانَ مِزْوَدَيْ تَمْرٍ قَالَ فَكَانَ يُقَوِّتُنَاهُ كُلَّ يَوْمٍ قَلِيْلًا قَلِيْلًا حَتّٰى فَنِيَ وَلَمْ تُصِبْنَا مِنْهُ اِلَّا تَمْرَةٌ" تَمْرَةٌ فَقُلْتُ وَمَا تُغْنِي تَمْرَةٌ فَقَالَ لَقَدْ وَجَدْنَا فَقْدَهَا حَيْثُ فَنِيَتْ قَالَ ثُمَّ انْتَهَيْنَا اِلَى الْبَحْرِ فَاِذَا حُوْتٌ مِثْلُ الظَّرِبِ فَاَكَلَ مِنْهُ ذٰلِكَ الْجَيْشُ ثَمَانِيَ عَشْرَةَ لَيْلَةً ثُمَّ اَمَرَ

اَبُوْ عُبَيْدَةَ بِضِلْعَيْنِ مِنْ اَضْلَاعِهِ فَنُصِبَتَا ثُمَّ اَمَرَ بِرَاحِلَةٍ فَرُحِلَتْ ثُمَّ مَرَّتْ تَحْتَهُمَا وَلَمْ تُصِبْهُمَا

﴿جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ساحل کی جانب ایک مہم بھیجی اور اس پر ابو عبیدہ بن جراحؓ کو امیر بنایا۔ یہ پوری پارٹی تین سو آدمیوں کی تھی اور میں بھی ان میں شامل تھا۔ کہتے ہیں کہ جب ہم راستے میں ہی تھے تو زادراہ ختم ہو گیا۔ لشکر کے پاس جتنا غذائی سامان تھا، حضرت ابو عبیدہؓ نے کل کا کل جمع کرنے کا حکم دیا۔ یہ کھجور کے دو توشہ دان بنے۔ کہتے ہیں کہ امیر ہمیں روزانہ تھوڑا تھوڑا راشن دیتے تھے، یہاں تک کہ وہ بھی ختم ہو گیا اور ہمیں اس میں سے ایک ایک کھجور ملنے لگی۔ میں نے کہا، "اس ایک کھجور سے کیا بنتا ہے؟" انہوں نے کہا کہ ہم نے اس کی کمی کو اس وقت محسوس کیا جب وہ بھی ختم ہو گئی۔ پھر ہم ساحل پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پہاڑی کی طرح کی ایک مچھلی پڑی ہوئی ہے۔ لشکر نے اس سے اپنی غذائی ضرورت پورے اٹھارہ دن پوری کی۔ پھر ابو عبیدہؓ نے حکم دیا تو اس کی دو پسلیاں کھڑی کی گئیں، پھر انہوں نے سواری کے اونٹ پر کجاوہ رکھوایا، پھر وہ سواری ان کے نیچے سے گزاری گئی اور وہ ان پسلیوں کو چھوئی نہیں۔﴾

وضاحت :

یہ واقعہ سریہ سیف البحر کا ہے۔ زادراہ ختم ہو جانے پر ایک عظیم الجثہ مچھلی کا ملنا مجاہدین کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد تھی جو غیر متوقع طور پر ان کو حاصل ہوئی اور انہوں نے اٹھارہ روز تک مچھلی کھائی۔ اس زمانے میں آج کل کے فریزر تو نہیں تھے۔ گوشت خشک کر کے رکھتے تھے۔ مچھلی کا بھی اور دوسرے جانوروں کا بھی۔ شریعت میں سمندر کا جانور حلال ہے اور اس کے لیے زندہ پکڑے جانے کی کوئی شرط نہیں۔ ہمارے ہاں فقہاء میں دو گروہ ہیں، جو دو انتہاؤں پر ہیں۔ احناف کے ہاں معروف مچھلی کے سوا اور کوئی چیز جائز نہیں، حالانکہ مچھلیاں بہت بڑی بڑی بھی ہوتی ہیں۔ شوافع کے ہاں شاید چند جانوروں کے سوا باقی سب سمندری جانور جائز ہیں۔ سمندری گھوڑے اور خنزیر، کچھوا اور کیکڑے بھی ان کے مذہب میں حلال ہیں۔ عام تصور دین میں بھی ان کی فقہ میں بڑی وسعت ہے۔ احناف نے

بالکل پابند کر دیا ہے۔ میرے خیال میں دونوں میں تھوڑی سی افراط و تفریط ہے۔ اصل میں دیکھا یہ گیا ہے کہ خشکی کے جانوروں میں جیسے ریچھ، سانپ اور بچھو بھی ہیں، اسی طرح پرندے بھی ہیں اور درندے بھی۔ پھر پرندوں میں بھی درندے ہیں، جو گوشت کھانے والے جانور ہیں۔ مذاق سلیم کے ساتھ یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ کون سی چیزیں کھانے کی ہیں اور کون سی کھانے کی نہیں ہیں۔ چوپایوں میں بہت سے جانور جو جنگل میں پائے جاتے ہیں، مثلاً ہرن، گورخر، نیل گائے وغیرہ، یہ سب مویشی چوپایوں کے حکم میں ہیں۔ اسی طرح سمندری جانوروں میں بہت سے ہیں جو خشکی کے درندوں (سباع) یا سانپوں کے مشابہ ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو انہی جانوروں کی مانند ہیں جن کو ہم کھاتے ہیں۔ مؤخر الذکر کا کھانا تو بلا شبہ جائز ہے لیکن جو جانور سانپوں اور بچھوؤں کے مشابہ ہیں، ان کو نہیں کھانا چاہیے۔ علیٰ ھذا القیاس سمندری پرندے مچھلیوں کے حکم میں نہیں آتے، بلکہ ان کا ذبح ہونا ضروری ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ سمندر میں بھی رہتے ہیں اور خشکی پر بھی رہتے ہیں۔ ان کا دونوں طرف آنا جانا ہوتا ہے۔ ان میں بھی بہت سے پرندے ایسے ہیں کہ جن کے گوشت میں حلت و حرمت کی بحث پیدا ہوتی ہے۔ میں نے سمندر کا سفر کیا ہے اور دیکھا ہے کہ غول کے غول پرندے ہوتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ کھانے کے نہیں ہیں اور ایسے بھی ہیں کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کھانے کے ہیں۔

باقی رہ گئی یہ بات کہ کیا اتنی بڑی مچھلی ہو سکتی ہے جس کی پسلیوں کو کھڑا کیا جائے تو ان کے نیچے سے اونٹ گزر سکے تو ایسا ہونا بعید نہیں۔ وہیل مچھلیاں بہت بڑی ہوتی ہیں۔ ان کے پیٹ میں کئی ہاتھی سما سکتے ہیں اور یہ مچھلیاں بعض اوقات سمندروں کے ساحلوں پر مردہ پائی بھی جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کوئی ایسی ہی مچھلی مجاہدین کی خوراک بنی۔

❑ **حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَمْرِو بْنِ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ عَنْ جَدَّتِهِ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ يَا نِسَاءَ الْمُؤْمِنَاتِ لَا تَحْقِرَنَّ جَارَةٌ لِجَارَتِهَا وَلَوْ كُرَاعَ شَاةٍ مُحْرَقًا.**

﴿عمرو بن سعد کی دادی روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مومنین کی بیویو، تم میں سے کوئی بھی اپنی پڑوسن کے لیے حقیر نہ سمجھے، اگرچہ بکری کی ایک جلی ہوئی کھری ہی کیوں نہ ہو۔﴾

وضاحت:

یہ آنحضرت ﷺ نے نصیحت کی ہے کہ اے مومن خواتین، تم میں سے کوئی بھی اپنی پڑوسن کے لیے

اپنے تحفہ کو حقیر نہ جانے، اگرچہ یہ تحفہ بکری کی جلی ہوئی کھری ہی کیوں نہ ہو۔ بکری کا جلا ہوا کھر یہ ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ہو تو یہ نہ سوچنا چاہیے کہ ایسا تحفہ کیا دینا۔ جو کچھ بھی میسر ہو، اس میں سے تحفہ بھیجنا چاہیے۔ یہ محبت کا اظہار ہے۔ محبت کے اسی اظہار کے لیے دوسری روایت میں آیا ہے کہ تحفے دیا کرو۔ یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ کوئی اچھی سی چیز ہو تو تحفہ بھیجوں۔ اپنے اظہار تعلق کے لیے یہ ضروری ہے کہ کچھ بھی ہو بھیجنا چاہیے اور تحفہ وصول کرنے والے کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ کسی بھی تحفہ کو حقیر نہ خیال کرے۔ "کراع" بکری کے کھر کو کہتے ہیں اور اس کو تیار کرنے کے لیے آگ پر جلاتے ہیں۔ جب اس کا سوپ نکلتا ہے تو وہ کوئی حقیر چیز نہیں ہوتا۔ وہ قیمتی ہوتا ہے، اگرچہ کھر خود اتنا قیمتی نہیں ہوتا۔ آج کل تو کھر کے بھی اتنے دام ہیں کہ حضرت عمرؓ اگر ہوتے تو اتنی قیمتی ڈش بھی نہ کھاتے۔ نفسیاتی طور پر یہ حقیقت ہے کہ تحفے تحائف محبت بڑھانے کا قابل اعتماد ذریعہ ہیں۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي بَكْرٍ اَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ نُهُوْا عَنْ اَكْلِ الشَّحْمِ فَبَاعُوْهُ فَاَكَلُوْا ثَمَنَهُ.

﴿عبداللہ بن ابی بکر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ یہود کو غارت کرے کہ ان کو چربی کھانے سے منع کیا گیا تو انہوں نے (یہ حیلہ کیا کہ) اس کو بیچا اور اس کی قیمت کھا گئے۔﴾

وضاحت:

قرآن مجید میں ہے کہ یہود کی سرکشی کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے اصر و اغلال کی نوعیت کی جو چیزیں ان پر حرام کیں، ان میں چربی بھی تھی، تو انہوں نے یہ طریقہ ایجاد کر لیا کہ چربی بیچ کر اس کی قیمت کھا جاتے۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ جو چیز کھانے کے لیے حرام ہے تو اس کی تجارت کر کے فائدہ اٹھانا بھی حرام ہے۔ جس چیز کا کھانا ممنوع نہیں، اس کی بیع کی حرمت کی بھی کوئی وجہ نہیں۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ كَانَ يَقُوْلُ يَا بَنِي اِسْرَائِيْلَ عَلَيْكُمْ بِالْمَاءِ الْقَرَاحِ وَالْبَقْلِ الْبَرِّيِّ وَ خُبْزِ الشَّعِيْرِ وَ اِيَّاكُمْ وَ خُبْزَ الْبُرِّ فَاِنَّكُمْ لَنْ تَقُوْمُوْا بِشُكْرِهِ.

﴿امام مالک کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ عیسیٰ ابن مریم فرماتے تھے کہ اے بنی اسرائیل،

تمہارے لیے صاف پانی، کھیتی کی سبزی اور جو کی روٹی ہے، یہ کھایا کرو اور گیہوں کی روٹی سے چوکہ تم اس کا شکر نہیں ادا کر پاؤ گے۔﴾

وضاحت:

یہ امام مالک کے بلاغات میں سے ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ یہ بات انہوں نے کہاں سے سنی۔ اس پر نہ ہی حدیث کا اطلاق ہوتا ہے، اور نہ ہی یہ بات انجیلوں میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معروف اقوال جو انہوں نے سنے، ان میں سے یہ ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امام مالک سند کو اہمیت نہیں دیتے، اگر بات مفید ہو تو روایت کر دیتے ہیں۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَوَجَدَ فِيهِ أَبَابَكْرٍ الصِّدِّيقَ وَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فَسَأَلَهُمَا فَقَالَا أَخْرَجَنَا الْجُوعُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَ أَنَا أَخْرَجَنِي الْجُوعُ فَذَهَبُوا إِلَى أَبِي الْهَيْثَمِ بْنِ التَّيِّهَانِ الْأَنْصَارِيِّ فَأَمَرَ لَهُمْ بِشَعِيرٍ عِنْدَهُ يُعْمَلُ وَقَامَ يَذْبَحُ لَهُمْ شَاةً فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نَكِّبْ عَنْ ذَاتِ الدَّرِّ فَذَبَحَ لَهُمْ شَاةً وَاسْتَعْذَبَ لَهُمْ مَاءً فَعُلِّقَ فِي نَخْلَةٍ ثُمَّ أُتُوا بِذَلِكَ الطَّعَامِ فَأَكَلُوا مِنْهُ وَشَرِبُوا مِنْ ذَلِكَ الْمَاءِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَتُسْأَلُنَّ عَنْ نَعِيمِ هَذَا الْيَوْمِ.

﴿مالک کہتے ہیں کہ یہ بات ان کو پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں داخل ہوئے تو انہوں نے ابو بکر صدیقؓ اور عمر بن خطابؓ کو مسجد میں پایا۔ ان سے پوچھا (کہ کیسے آنا ہوا) تو انہوں نے کہا کہ ہم بھوک کے ستائے ہوئے نکلے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے بھی بھوک ہی نے نکالا ہے۔ پھر وہ ابو الہیثم بن التیہان انصاری کے پاس گئے تو ان کے پاس جو کا آٹا تھا۔ آپ نے حکم دیا کہ اس کو بنایا جائے۔ وہ اٹھے کہ مہمانوں کے لیے بکری ذبح کریں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو دودھ والی سے بچیو۔ انہوں نے ایک بکری ذبح کی اور ٹھنڈا پانی لائے اور اس کا مشکیزہ کھجور کے تنے سے لٹکا دیا۔ پھر کھانا لایا گیا اور اس میں سے سب نے کھایا اور پانی پیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آج جو نعمت نصیب ہوئی ہے اس کے متعلق قیامت میں تم سے پوچھا جائے گا۔﴾

وضاحت :

یہ حدیث امام مسلمؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ لیکن موطا میں یہ امام مالکؒ کے بلاغات میں سے ہے۔

اس روایت میں کچھ چیزیں قابل غور ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہی تین ہستیاں امت کا سرمایہ ہیں۔ روایت کی رو سے ان تینوں کا حال یہ تھا کہ بھوک سے لاچار ہو کر گھر سے نکل پڑیں۔ بھوک تو بلا شبہ لگ سکتی ہے لیکن یہ کیا کہ کھانے کی طلب میں گھر سے نکل پڑیں۔ آخر مقصد کیا تھا؟ کیا یہ تھا کہ کوئی ہمارے چہرے کو دیکھ کر پوچھے کہ کیا بات ہے تو کہہ دیں کہ خیر نہیں ہے، کچھ کھلاؤ۔ یا یہ کہ کوئی ہماری حالت کو دیکھ کر ہی ترس کھا جائے اور کچھ لا کر کھلا دے۔ یہ باتیں میں اپنے متعلق گمان نہیں کر سکتا چہ جائیکہ آنحضرت ﷺ کے متعلق گمان کروں۔ آنحضرتؐ کو بھوک لگتی رہی ہے لیکن اور کوئی واقعہ ایسا نہیں پایا کہ گھر سے اس مقصد کے ساتھ نکلے ہوں کہ کوئی کھانا کھلا دے۔

علماء کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ایک اور روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو بھوک پیاس نہیں لگتی تھی جبکہ اس روایت میں یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے بھوک نے گھر سے باہر نکالا ہے۔

اسی طرح کی ترمذی کی روایت میں بیان ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابو بکر صدیقؓ سے جب پوچھا کہ وہ کیسے آئے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے سوچا کہ آپ کی زیارت ہو جائے گی۔ یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ یہاں یہ روایت امام مالک کے بلاغات میں سے ہے لیکن مسلم میں یہ حدیث موصول ہے اور اس کے راوی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا اسلام غزوۂ خیبر کے بعد کا ہے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کا یہ حال نہیں رہا تھا کہ ایسی فاقہ کشی پیش آتی ہو۔ آنحضرتؐ کے حصہ میں تو خیبر کی کافی جائداد آئی تھی۔ دوسرے مسلمان بھی اس زمانہ میں خوشحال ہو گئے تھے۔ لہذا روایت میں بیان کی گئی کیفیت امر واقعی کے خلاف ہے۔ اگر یہ بات ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے کسی سے سن کر پچھلے دور کا واقعہ بیان کیا ہے تو انہیں بتانا چاہیے تھا کہ فلاں سے یہ سنا ہے، کیونکہ وہ خود واقعہ کے شاہد نہ تھے۔ ایک ایسے واقعہ کے متعلق جو اس زمانے میں پیش آیا جب وہ مسلمان بھی نہ تھے تو ان کا راوی ہونا ہی ثابت نہیں ہوتا۔

تیسری بات یہ ہے کہ بالفرض اگر یہ تینوں اکابر امت بھوکے تھے تو اس وقت کے معاشرے میں یہ کس

کے ہاں مہمان بن کر جا سکتے تھے؟ جن صحابی کا نام یہاں لیا گیا ہے ان کے ہاں آنحضرت کا آنا جانا معروف نہیں ہے۔ نیز ان کی شخصیت پر بھی راویوں کا اتفاق نہیں ہے۔ دوسری روایت میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے ہاں جانے کا ذکر ہے تو ان کے پاس کھجور کا ایسا باغ نہیں تھا جیسا کہ یہاں بیان کیا گیا ہے۔ کھجور کا باغ حضرت ابو طلحہ کے پاس تھا۔ وہاں حضور جاتے تو وہ کھجور اور ٹھنڈا پانی پیش کیا کرتے۔ زرقانی نے روایت کے کئی طریقے نقل کیے ہیں اور ہر ایک میں الگ الگ بیان ہے اور یہ معین نہیں ہوتا کہ یہ کس کا قصہ ہے۔

یہ اس روایت کی مشکلات ہیں۔ جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے تو اس سے ملتا جلتا کوئی واقعہ پیش آیا ہوگا۔ اور آنحضرت کا یہ فرمانا نہایت بر محل ہے کہ اس نعمت کے متعلق سوال ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل ہوا کہ اپنے گھر سے بھوکے نکلے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اچھا خاصا گوشت کھلا دیا۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ يَأْكُلُ خُبْزًا بِسَمْنٍ فَدَعَا رَجُلًا مِنْ أَهْلِ الذِّمَّةِ فَجَعَلَ يَأْكُلُ وَيَتَّبِعُ بِاللُّقْمَةِ وَضَرَ الصَّحْفَةِ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ كَأَنَّكَ مُقْفِرٌ فَقَالَ وَاللَّهِ مَا أَكَلْتُ سَمْنًا وَلَا لَكْتُ أَكْلًا بِهِ مُنْذُ كَذَا وَ كَذَا فَقَالَ عُمَرُ لَا آكُلُ السَّمْنَ حَتَّى يَحْيَا النَّاسُ مِنْ أَوَّلِ مَا يَحْيَوْنَ.

﴿حضرت عمر رضی اللہ عنہ روغن کے ساتھ روٹی کھا رہے تھے کہ اہل ذمہ میں سے ایک آدمی کو (کھانے میں شریک کرنے کے لیے) بلا لیا۔ وہ رکابی میں سے وہ روغن کھانے لگا جو ادھر ادھر کونوں میں لگا پڑا رہ گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم عرصے سے فاقے میں رہے ہو۔ اس نے کہا کہ نہ میں نے روغن کھایا اور نہ فلاں زمانہ کے بعد سے کسی کو اس کے ساتھ روٹی کھاتے دیکھا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اب میں روغن نہیں کھاؤں گا جب تک لوگوں پر پہلی بارش کا چھینٹا نہ پڑ جائے۔﴾

وضاحت :

معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت اس قحط کے زمانے سے متعلق ہے جو حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں پڑا تھا۔ "یحیا الناس من اول ما یحیون" کا یہ ترجمہ بھی کیا گیا ہے کہ جب تک لوگوں کی حالت پہلے جیسی نہ ہو جائے یعنی قحط کی حالت ختم نہ ہو جائے۔ بارش بھی قحط دور کرنے اور زندگی کی ہماہمی کا ذریعہ بنتی ہے اس لیے میں نے لوگوں پر

بارش کا چھینٹا پڑنے کے معنی لیے ہیں۔ حضرت عمرؓ اس ذمی کی حالت دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور قحط کے ختم ہونے تک روغن کھانا ترک کر دیا۔ یہ خلیفہ وقت نے مسلمانوں کے لیے مثال قائم کی۔ اگر ملک کے سربراہ کے دل میں عوام کا واقعی درد ہو تو وہ اپنے اوپر اس طرح کی پابندیاں عائد کرتا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ إِسْحَقَ بْنِ عَبْدِاللهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّهُ قَالَ رَأَيْتُ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِ وَهُوَ يَوْمَئِذٍ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ يُطْرَحُ لَهُ صَاعٌ مِنْ تَمْرٍ فَيَأْكُلُهُ حَتَّى يَأْكُلَ حَشَفَهَا.

﴿انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دیکھا، اور وہ اس وقت امیر المومنین تھے، کہ ان کے آگے ایک صاع بھر کھجور ڈال دیے جاتے اور وہ ایسے کھجور بھی کھاتے جو خراب ہوتے۔﴾

وضاحت:

حشف اس کھجور کو کہتے ہیں جو سوکھ کر خراب ہو گئی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے جب کھجوریں رکھی جاتیں تو وہ ایسی کھجور بھی کھا لیتے تھے جو قدرے خراب ہوتی۔ ان کا وہ حصہ جو کھانے کے قابل نہ ہوتا صرف اسی کو پھینکتے۔ ان کے سامنے کھجور پیش کرنے میں بھی رکھ رکھاؤ کا خیال نہیں ہوتا تھا کیونکہ انہوں نے بالکل سادہ عوامی انداز زندگی اپنا رکھا تھا۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّهُ قَالَ سُئِلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عَنِ الْجَرَادِ فَقَالَ وَدِدْتُ أَنَّ عِنْدِي قَفْعَةً نَأْكُلُ مِنْهُ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ سے ٹڈی کے متعلق ان کا فتویٰ پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میری خواہش تو یہ ہے کہ ایک ٹوکری میرے آگے رکھ دی جائے کہ ہم اس میں سے کھائیں۔﴾

وضاحت:

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق آتا ہے کہ وہ جنگل کے شہد اور ٹڈیوں پر گزارا کرتے تھے۔ یہ ضرورت

پر منحصر ہے۔ اگر کوئی دوسری چیز میسر نہ ہو تو نڈی کھانا ٹھیک ہے۔ جس چیز کو حضرت یحییٰ علیہ السلام نے کھایا اور حضرت عمرؓ نے اس کے کھانے کی خواہش ظاہر کی تو اس کا کھانا بہر حال جائز ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ نڈی جو ہمارے ہاں آتی ہے اس میں اور صحرائی نڈی میں بڑا فرق ہوتا ہے لیکن یہ بات کچھ درست نہیں معلوم ہوتی۔ صرف چھوٹی بڑی کا فرق ہو سکتا ہے۔

حضرت عمرؓ کی یہی دو چیزیں ہیں جن کے پیش نظر حضرت علیؓ نے ان سے کہا تھا کہ آپ نے اپنے بعد آنے والے تمام خلفاء کو شکست دے دی۔ اب کس کی طاقت ہے کہ آپ کی تقلید کر سکے گا۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَلْحَلَةَ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ مَالِكِ بْنِ خُثَيْمٍ اَنَّهُ قَالَ كُنْتُ جَالِسًا مَعَ اَبِي هُرَيْرَةَ بِاَرْضِهِ بِالْعَقِيقِ فَاَتَاهُ قَوْمٌ مِنْ اَهْلِ الْمَدِينَةِ عَلَى دَوَابَّ فَنَزَلُوا عِنْدَهُ قَالَ حُمَيْدٌ فَقَالَ اَبُوهُرَيْرَةَ اِذْهَبْ اِلَى اُمِّي فَقُلْ اِنَّ ابْنَكِ يُقْرِئُكِ السَّلَامَ وَ يَقُولُ اَطْعِمِينَا شَيْئًا قَالَ فَوَضَعَتْ لَهُ ثَلَاثَةَ اَقْرَاصٍ فِي صَحْفَةٍ وَ شَيْئًا مِنْ زَيْتٍ وَ مِلْحٍ ثُمَّ وَضَعَتْهَا عَلَى رَاْسِي وَ حَمَلْتُهَا اِلَيْهِمْ فَلَمَّا وَضَعْتُهَا بَيْنَ اَيْدِيهِمْ كَبَّرَ اَبُوهُرَيْرَةَ وَ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي اَشْبَعَنَا مِنَ الْخُبْزِ بَعْدَ اَنْ لَمْ يَكُنْ طَعَامُنَا اِلَّا الْاَسْوَدَيْنِ الْمَاءَ وَالتَّمْرَ فَلَمْ يُصِبْ مِنَ الطَّعَامِ شَيْئًا فَلَمَّا انْصَرَفُوا قَالَ يَا ابْنَ اَخِي اَحْسِنْ اِلَى غَنَمِكَ وَامْسَحِ الرُّعَامَ عَنْهَا وَ اَطِبْ مُرَاحَهَا وَصَلِّ فِي نَاحِيَتِهَا فَاِنَّهَا مِنْ دَوَابِّ الْجَنَّةِ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَيُوشِكُ اَنْ يَاْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ تَكُونُ الثُّلَّةُ مِنَ الْغَنَمِ اَحَبَّ اِلَى صَاحِبِهَا مِنْ دَارِ مَرْوَانَ.

﴿ حمید بن مالک کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوہریرہؓ کے پاس ان کے رقبے العقیق میں تھا۔ اہل مدینہ میں سے کچھ لوگ اپنی سواریوں پر آئے اور ان کے پاس اترے۔ حمید کہتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مجھے کہا کہ تم میری امی کے پاس جاؤ اور کہو کہ بیٹا آپ کو سلام کہتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم کو کچھ کھلایئے۔ کہتے ہیں کہ والدہ نے تین ٹکیاں اور کچھ روغن اور نمک رکابی میں رکھا۔ پھر اس کو میرے سر پر رکھا اور میں ان کے پاس لے کر آیا۔ جب میں نے رکابی ان کے آگے رکھی تو حضرت ابوہریرہؓ نے

اللہ اکبر کہا اور کہنے لگے کہ شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہمیں روٹی کا کھانا کھلایا جبکہ پہلے ہماری غذا صرف دو سیاہ چیزیں تھیں یعنی پانی اور کھجور، اور کھانے کی قسم کی کوئی چیز نہ ملتی تھی۔ جب لوگ چلے گئے تو ابو ہریرہؓ نے کہا کہ اے میرے بھتیجے، اپنی بکریوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کرو، ان کی ناک صاف کیا کرو، ان کے ڈیرے کی خوب صفائی رکھو اور اسی ڈیرے میں نماز پڑھ لیا کرو۔ کیونکہ یہ جنت کے جانوروں میں سے ہے۔ اور اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے، قریب ہے کہ وہ زمانہ آئے کہ بکریوں کا ایک ریوڑ اس کے مالک کو مروان کے محل سے زیادہ مرغوب ہوگا۔

وضاحت :

یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے متعلق ہے۔ وہ اپنے ماضی کے احوال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب غربت کا یہ عالم تھا کہ کھانے کے لیے صرف کھجور اور پانی میسر تھے۔ اب اللہ کا شکر ہے کہ کھانے کو روٹی اور روغن ملتا ہے۔ کھجور اور پانی کے لیے انھوں نے لفظ اسودین (دو سیاہ چیزیں) استعمال کیا ہے، جبکہ پانی سیاہ نہیں ہوتا۔ البتہ کھجور بالعموم سیاہی مائل ہوتی ہے۔ یہ لفظ کا استعمال علی سبیل التغلیب ہے اور عام بول چال کی بات ہے۔

* حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مستقبل کے متعلق ایک پیشگوئی کرتے ہیں کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ جس آدمی کو اپنے ایمان کی سلامتی عزیز ہوگی اسے مروان بن الحکم (اموی خلیفہ) کے محل کا قرب عزیز نہیں ہوگا بلکہ وہ پسند کرے گا کہ اپنی بکریوں کا ریوڑ پہاڑوں میں جا کر چرائے اور اس طرح اپنی روزی کمائے۔ حضرت ابو ہریرہؓ یہ بھی فرماتے ہیں کہ بکریاں جنت کے جانور ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ پیشگوئی اور بکریوں کے جنت کے جانور ہونے کے امور کی بنیاد کیا ہے۔ محدثین کا کہنا یہ ہے کہ اس طرح کی تمام روایات میں کوئی صحابی بات اپنے بل بوتے پر نہیں کہہ سکتے۔ لازماً انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایسا سنا ہوگا۔ لہٰذا اسی بنا پر ان کا بیان حدیث بن جاتا ہے۔ بعض جگہ تو محدثین کی یہ بات درست بیٹھتی ہے لیکن کہیں کہیں اس میں تردد ہوتا ہے۔ اس بات کو بطور اصول ماننا آسان نہیں۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي نُعَيْمٍ وَهْبِ ابْنِ كَيْسَانَ قَالَ أُتِيَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ

بطعَامٍ وَ مَعَهُ رَبِيبُهُ عُمَرُ بْنُ سَلَمَةَ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ سَمِّ اللّٰهِ وَ كُلْ مِمَّا يَلِيكَ.

﴿وھب بن کیسان کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کھانا لایا گیا اور آپ کے ساتھ آپ کے ربیب عمر بن سلمہ بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کا نام لے کر کھاؤ اور جو تمہارے سامنے ہے اس میں سے کھاؤ۔﴾

وضاحت :

ربیب اس بچے کو کہتے ہیں جو بیوی کا اس کے سابق شوہر سے ہو۔ عمر بن سلمہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے پہلے شوہر ابو سلمہ کے بیٹے تھے اور نبی ﷺ ان کی پرورش کرتے تھے۔ جب وہ پلیٹ میں ادھر ادھر ہاتھ مار رہے ہوں گے تو آنحضرت نے ان کو کھانے کے آداب بتاتے ہوئے فرمایا کہ کھانا شروع کرتے وقت بسم اللہ پڑھا کرو اور جب بہت سے لوگ مل کر کھائیں تو ہر ایک کو اس بات کا لحاظ کرنا چاہیے کہ دوسرے بھی کھا رہے ہیں لہذا دست درازی نہیں کرنی چاہیے، اور پلیٹ کے اس حصہ میں سے کھانا چاہیے جو اپنے سامنے ہو۔

بسم اللہ سے مراد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ جو کہا ہے کہ پہلے لقمہ پر بسم اللہ اور دوسرے پر الرحمٰن الرحیم پڑھنا چاہیے اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پورا پڑھنا چاہیے۔ ہاں شروع میں اگر بھول جائے تو جب یاد آئے پڑھ لے یا پھر آخر میں پڑھ لے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ يَقُولُ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ فَقَالَ لَهُ إِنَّ لِي يَتِيمًا وَلَهُ إِبِلٌ أَفَأَشْرَبُ مِنْ لَبَنِ إِبِلِهِ فَقَالَ لَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ إِنْ كُنْتَ تَبْغِي ضَالَّةَ إِبِلِهِ وَ تَهْنَأُ جَرْبَاهَا وَتَلُطُّ حَوْضَهَا وَ تَسْقِيهَا يَوْمَ وِرْدِهَا فَاشْرَبْ غَيْرَ مُضِرٍّ بِنَسْلٍ وَلَا نَاهِكٍ فِي الْحَلْبِ.

﴿یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ میں نے قاسم بن محمد سے سنا۔ وہ کہتے تھے کہ ایک شخص عبداللہ بن عباس کے پاس آیا اور ان سے پوچھا کہ میری نگرانی میں ایک یتیم ہے اور اس کے کچھ اونٹ ہیں، تو کیا میں اس کی اونٹنیوں کے دودھ میں سے کچھ پی سکتا ہوں۔ تو ابن عباس نے اس سے کہا کہ اگر تم اس کے کھوئے

ہوئے اونٹ کو تلاش کرتے ہو، خارش زدہ اونٹوں کو تیل ملتے ہو، ان کے حوض کی لپائی کرتے ہو اور ان کی باری کے دن پانی پلاتے ہو تو بے شک پیو، بشرطیکہ ان کے بچے کو نقصان نہ پہنچے اور سارا دودھ نچوڑنے والے نہ ہو۔﴾

وضاحت :

قرآن مجید میں یہ اجازت دی گئی ہے کہ حیثیت کے مطابق یتیم کے مال سے اس کا ولی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسی اجازت کی روشنی میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ اگر یہ تمام خدمات انجام دیتے ہو تو دودھ بھی لے سکتے ہو بشرطیکہ اونٹنی کے بچوں کو اس سے محروم کرنے والے نہ ہو۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ كَانَ لَا يُؤْتَى أَبَدًا بِطَعَامٍ وَلَا شَرَابٍ حَتَّى الدَّوَاءُ فَيَطْعَمُهُ أَوْ يَشْرَبُهُ إِلَّا قَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا وَ أَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا وَ نَعَّمَنَا اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُمَّ أَلْفَتْنَا نِعْمَتُكَ بِكُلِّ شَرٍّ فَأَصْبَحْنَا مِنْهَا وَ أَمْسَيْنَا بِكُلِّ خَيْرٍ فَنَسْأَلُكَ تَمَامَهَا وَ شُكْرَهَا لَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُكَ وَلَا إِلَهَ غَيْرُكَ إِلَهَ الصَّالِحِينَ وَ رَبَّ الْعَالَمِينَ الْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيمَا رَزَقْتَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ.

﴿ہشام اپنے باپ عروہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب ان کے سامنے کوئی چیز کھانے یا پینے کی لائی جاتی، یہاں تک کہ دوا بھی، اور وہ کھاتے یا پیتے تو یہ دعا ضرور کرتے۔ اللہ کا شکر ہے جس نے ہم کو ہدایت دی اور ہم کو کھلایا اور پلایا اور نعمت بخشی۔ اے اللہ تو بہت بڑا ہے۔ اے اللہ تیری نعمت نے ہم کو پایا ہماری تمام برائیوں کے باوجود اور ہم صبح و شام اس کے خیر سے متمتع ہونے لگے۔ اے اللہ ہم تجھ سے اس نعمت کا اتمام اور اس کے شکر کی توفیق مانگتے ہیں۔ نہیں ہے کوئی خیر تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں تیرے سوا۔ اے نیکوں کے اللہ اور اے عالم کے خدا۔ شکر ہے اللہ کے لیے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ جو اللہ چاہے وہی ہوتا ہے۔ اے اللہ تیرے سوا کوئی قوت نہیں۔ اے اللہ تو نے ہمیں جو رزق دیا ہے اس میں برکت دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔﴾

وضاحت :

روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ عروہ نے یہ دعا آنحضرت ﷺ سے سیکھی، نہ ہی تو انہوں نے اس کا کوئی حوالہ دیا ہے۔ یہ ان کی اپنی دعا معلوم ہوتی ہے۔ الفاظ کی ترتیب سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کی دعاؤں سے اس کو کوئی مناسبت نہیں۔ اس میں آنحضرت ﷺ کی دعاؤں والی چستی نہیں پائی جاتی۔ بہر حال وہ شکر نعمت کے طور پر یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

☐ قَالَ يَحْيَى سُئِلَ مَالِكٌ هَلْ تَأْكُلُ الْمَرْأَةُ مَعَ غَيْرِ ذِي مَحْرَمٍ اَوْ مَعَ غُلَامِهَا فَقَالَ مَالِكٌ لَيْسَ بِذَالِكَ بَأْسٌ اِذَا كَانَ ذٰلِكَ عَلٰى وَجْهِ مَا يُعْرَفُ لِلْمَرْأَةِ اَنْ تَأْكُلَ مَعَهُ مِنَ الرِّجَالِ قَالَ وَقَدْ تَأْكُلُ الْمَرْأَةُ مَعَ زَوْجِهَا وَ مَعَ غَيْرِهِ مِمَّنْ تُؤَاكِلُهُ اَوْمَعَ اَخِيْهَا عَلٰى مِثْلِ ذٰلِكَ وَ يُكْرَهُ لِلْمَرْأَةِ اَنْ تَخْلُوَ مَعَ الرَّجُلِ لَيْسَ بَيْنَهُ وَ بَيْنَهَا حُرْمَةٌ.

﴿یحیٰ کہتے ہیں کہ امام مالک سے فتویٰ پوچھا گیا کہ عورت کسی غیر محرم یا اپنے غلام کے ساتھ کچھ کھا پی سکتی ہے؟ امام مالک نے کہا کہ اس میں کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ وہ اس طریقے سے کھائے جو عورت کے لیے معروف ہے۔ انہوں نے کہا کہ عورت کبھی کبھی اپنے شوہر کے ساتھ اور کبھی کسی دوسرے کے ساتھ جس کے ساتھ اس کا کھانا پینا ہوتا ہے یا اپنے بھائی کے ساتھ کھانا کھالیتی ہے۔ لیکن یہ مکروہ ہے کہ عورت کسی ایسے آدمی کے ساتھ تنہا ہو جس کی اس کے ساتھ حرمت نہیں ہے۔﴾

وضاحت :

یہ امام مالک کا فتویٰ ہے کہ نامانوس غیر محرم آدمی کے ساتھ تنہا بیٹھ کر عورت کے کھانے پینے میں حرج ہے۔ لیکن اعزہ واقربا میں سے اور دوستوں میں سے بھی جو اعتماد کے لوگ ہوتے ہیں، اگر کھانے میں شریک ہو جاتے ہیں تو ان کی موجودگی میں کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ نہ ہو تو معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے۔

قرآن مجید کی روشنی میں پردے کے احکام میں اپنے رسالہ میں بیان کر چکا ہوں۔ مزید تفصیل کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ کرلیں۔

مَاجَاءَ فِي أَكْلِ اللَّحْمِ

گوشت کھانے کے بارے میں

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ أَدْرَكَ جَابِرَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ وَ مَعَهُ حِمَالُ لَحْمٍ فَقَالَ مَا هٰذَا فَقَالَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ قَرِمْنَا إِلَى اللَّحْمِ فَاشْتَرَيْتُ بِدِرْهَمٍ لَحْمًا فَقَالَ عُمَرُ أَمَا يُرِيدُ أَحَدُكُمْ أَنْ يَطْوِيَ بَطْنَهُ عَنْ جَارِهِ أَوْ ابْنِ عَمِّهِ أَيْنَ تَذْهَبُ عَنْكُمْ هٰذِهِ الْآيَةُ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا.

﴿یحیٰ بن سعید سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی ملاقات جابر بن عبداللہ سے ہو گئی جبکہ وہ گوشت کی ایک گٹھڑی اٹھائے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا امیر المومنین! گوشت کھانے کو بہت جی چاہا تو ایک درہم کا گوشت خریدا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کے اندر یہ ولولہ پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنے پڑوسی کی خاطر یا اپنے بھائیوں کی خاطر اپنے پیٹ کو لپیٹے رکھے۔ آخر تم لوگ اس آیت کو کیوں بھول گئے ہو "تم نے اپنی تمام نعمتیں دنیا میں ختم کر لیں اور ان سے فائدہ اٹھا چکے"۔﴾

وضاحت :

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ تھا کہ اگر تمہارے ہاں گوشت پکے گا تو اس کی خوشبو پڑوسیوں کو بھی پہنچے گی، ان کے بچوں کو بھی پہنچے گی، ان کا دل چاہے گا کہ ان کے ہاں بھی گوشت پکے۔ وہ حسرت کریں گے تو اس سے بہتر یہ ہے کہ اپنے پڑوسی اور اپنے بھائیوں کے خیال سے اپنے پیٹ کو لپیٹے رکھے۔ لیکن اگر آپ کا بھائی یا پڑوسی ہو، اس کے مالی حالات اچھے نہ ہوں اور آپ کی حیثیت ایسی ہو کہ آپ روز گوشت کھا سکیں تو اپنے بچوں کو تو آپ محروم نہیں رکھ سکتے۔ اس صورت میں اس حدیث پر عمل اس طرح کریں کہ کھانے میں سے اپنے پڑوسی کو تحفہ بھجوائیں۔

آیت کا مطلب بھی یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جتنی بھی نعمتیں ہیں وہ سب کی سب

یہیں ختم کر لی جائیں اور آخرت کے لیے کوئی سرمایہ محفوظ نہ کیا جائے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ اِيَّاكُمْ وَاللَّحْمَ فَاِنَّهُ لَهُ ضَرَاوَةٌ" كَضَرَاوَةِ الْخَمْرِ.

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ گوشت سے بچو کیونکہ اس کا چسکا شراب کا سا چسکا ہے۔﴾

وضاحت:

مطلب یہ ہے کہ گوشت کثرت سے نہیں کھانا چاہیے اور دسترخوان پر اس کا زیادہ اہتمام نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کا چسکا لگ جائے تو پھر دوسری چیزوں کی طرف رغبت نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ بہت سے لوگ ہوتے ہیں جن کو مہینے کے مہینے گوشت کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ اسلام کے منافی ہے کہ آپ تو روز بھنا ہوا گوشت کھائیں اور صرف ایک ڈش نہیں بلکہ کئی کئی، اور دوسرے لوگ اس سے محروم رہیں۔ کتنے لوگ گوشت کھاتے ہیں لیکن ان کے گوشت کھانے کی خواہش ختم نہیں ہوتی۔ یہ بات سیدنا عمرؓ کی ہے اور واقعتاً ان کی باتیں ایسی ہیں کہ ہر مسلمان کو سمجھنی بھی چاہئیں اور ماننی بھی چاہئیں۔ ان سے زیادہ جرأت کے ساتھ اسلام کی خدمت کرنے کا موقع کسی کو مشکل ہی ملا ہے۔ وہ مسلمانوں کی ذہنی اخلاقی تربیت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

مَاجَاءَ فِي لُبْسِ الْخَاتَمِ

انگوٹھی پہننے کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَلْبَسُ خَاتَمًا مِنْ ذَهَبٍ ثُمَّ قَامَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَنَبَذَهُ وَ قَالَ لَا اَلْبَسُهُ اَبَدًا قَالَ فَنَبَذَ النَّاسُ بِخَوَاتِيمِهِمْ.

﴿عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سونے کی انگوٹھی پہنا کرتے تھے۔

پھر رسول اللہ ﷺ اٹھے اور اس کو پھینک دیا اور کہا کہ میں اب اس کو کبھی نہیں پہنوں گا۔ عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ اس پر سب لوگوں نے اپنی انگوٹھیاں پھینک دیں۔»

وضاحت:

پھینک دینے کا یہ مطلب نہیں کہ جو ہڑ میں پھینک دی بلکہ یہ ہے کہ اتار دی۔ ہو سکتا ہے کہ اپنی کسی اہلیہ کو دے دی یا کسی اور کو۔ اسی طرح دوسرے لوگوں نے بھی اپنی سونے کی انگوٹھیاں اتار دیں۔ یا تو اپنی عورتوں کو دے دیں یا گلا کر کسی اور مصرف میں استعمال کر لیں۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ صَدَقَةَ بْنِ يَسَارٍ أَنَّهُ قَالَ سَأَلْتُ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ عَنْ لُبْسِ الْخَاتَمِ قَالَ الْبَسْهُ وَ أَخْبِرِ النَّاسَ أَنِّي أَفْتَيْتُكَ بِذَلِكَ.

«صدقہ بن یسار کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن مسیب سے انگوٹھی پہننے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اس کو پہنو اور لوگوں کو بتاؤ کہ تم کو میں نے اس کا فتویٰ دیا ہے۔»

وضاحت:

اس سے صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انگوٹھی اتاری تو لوگوں نے بڑھ کر ہاتھ مارا اور کہا کہ انگوٹھی پہننا حرام ہے۔ حالانکہ سونے کی انگوٹھی مردوں کے لیے پہننا حرام تھی، چاندی کی حرام نہیں تھی۔ سعید بن مسیب کو یہ بات معلوم رہی ہو گی تو انہوں نے سونے کے سوا دھات کی انگوٹھی کا فتویٰ دے دیا کہ پہنو۔ ظاہر ہے کہ وہ سونے کی انگوٹھی کا فتویٰ نہیں دے سکتے تھے۔ راوی نے موقع کا ذکر نہیں کیا۔ موقع متعین نہ ہونے کی وجہ سے حدیث کی بڑی بڑی مشکلیں پیدا ہو گئیں اور دین میں اتنے بڑے فتنے پیدا ہو گئے کہ الامان والحفیظ۔

مَاجَاءَ فِي نَزْعِ الْمَعَالِيقِ وَالْجَرَسِ مِنَ الْعَيْنِ

نظر بد سے بچنے کے لیے پٹے اور گھنٹیاں اتارنے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللَّهِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيمٍ أَنَّ أَبَا بَشِيرٍ الْأَنْصَارِيَّ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ كَانَ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي بَعْضِ أَسْفَارِهِ قَالَ فَأَرْسَلَ رَسُولُ اللَّهِ

ﷺ رَسُوْلًا فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ اَبِیْ بَکْرٍ حَسِبْتُ اَنَّهٗ قَالَ وَالنَّاسُ فِیْ مَقِیْلِهِمْ لَا تُبْقَیَنَّ فِیْ رَقَبَةِ بَعِیْرٍ قِلَادَةٌ مِنْ وَتَرٍ اَوْقِلَادَةٌ اِلَّا قُطِعَتْ قَالَ یَحْیٰی سَمِعْتُ مَالِکًا یَقُوْلُ اَرٰی ذٰلِکَ مِنَ الْعَیْنِ.

﴿عباد بن تمیم کہتے ہیں کہ ابو بشیر انصاری نے ان کو خبر دی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ایک سفر میں آپ کے ساتھ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو بھیجا (اور عبداللہ بن ابی بکر کہتے ہیں کہ میرا گمان یہ ہے کہ عباد نے یہ بھی کہا کہ اس وقت لوگ قیلولہ کر رہے تھے) کہ کسی اونٹ کی گردن میں نہ چھوڑ یہ بالوں کا کوئی پٹہ مگر یہ کہ وہ کاٹ دیا جائے۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ میرے خیال میں یہ حکم ان پٹوں کے بارے میں تھا جو نظر بد سے بچنے کے لیے باندھے گئے تھے۔﴾

وضاحت :

جانوروں کے گلے میں پٹے اور گھنٹیاں باندھنے کا ہر ملک میں رواج ہے۔ دیہاتوں میں کسان صبح کے دھندلکے میں مویشی لے کر نکلتے ہیں تو کچھ نظر نہیں آتا۔ امکان ہوتا ہے کہ کوئی بے خبر آدمی جانوروں سے ٹکرا جائے۔ گھنٹیاں ایسے لوگوں کو متنبہ کر دیتی ہیں۔ تو یہ اہتمام ضرورت کے تحت کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کے مد نظر زیب و زینت کا پہلو ہوتا ہے۔ کچھ لوگ شان اور فخر کے اظہار کے لیے پٹے اور گھنگھریاں باندھتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ بھی ہے جو اوہام پرست ہوتا ہے۔ ان کو وہم ہوتا ہے کہ ان کے جانوروں کو نظر لگ جائے گی تو وہ جانوروں کے بالوں سے بٹے ہوئے پٹے یا تعویذ جانوروں کے گلے میں لٹکاتے ہیں۔ امام مالک کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم اس آخری قسم کے پٹوں کے بارے میں تھا۔ یہ ان کا قیاس ہے اور درست معلوم ہوتا ہے۔

اَلْوُضُوْءُ مِنَ الْعَیْنِ

نظر بد کے سبب سے وضو کا حکم

☐ حَدَّثَنِیْ یَحْیٰی عَنْ مَالِکٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اَبِیْ اُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَیْفٍ اَنَّهٗ سَمِعَ اَبَاهُ یَقُوْلُ اغْتَسَلَ اَبِیْ سَهْلُ بْنُ حُنَیْفٍ بِالْخَرَّارِ فَنَزَعَ جُبَّةً کَانَتْ عَلَیْهِ وَ عَامِرُ بْنُ رَبِیْعَةَ

يَنظُرُ قَالَ وَ كَانَ سَهْلٌ رَجُلًا أَبْيَضَ حَسَنَ الجِلْدِ قَالَ فَقَالَ لَهُ عَامِرُ بْنُ رَبِيعَةَ مَا رَأَيْتُ كَالْيَوْمِ وَلَا جِلْدَ عَذْرَاءَ قَالَ فَوُعِكَ سَهْلٌ مَكَانَهُ وَاشْتَدَّ وَ عَكُهُ فَأُتِيَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَأُخْبِرَ أَنَّ سَهْلًا وُعِكَ وَ أَنَّهُ غَيْرُ رَائِحٍ مَعَكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ فَأَتَاهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَأَخْبَرَهُ سَهْلٌ بِالَّذِي كَانَ مِنْ أَمْرِ عَامِرٍ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَلَامَ يَقْتُلُ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ أَلَا بَرَّكْتَ إِنَّ الْعَيْنَ حَقٌّ تَوَضَّأْ لَهُ فَتَوَضَّأَ لَهُ عَامِرٌ فَرَاحَ سَهْلٌ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ لَيْسَ بِهِ بَأْسٌ".

﴿ابو امامہ روایت کرتے ہیں کہ میرے باپ سہل بن حنیف نے خرار میں غسل کیا۔ وہ ایک جبہ پہنے ہوئے تھے۔ اسے اتارا تو عامر بن ربیعہ ان کو دیکھ رہے تھے۔ سہل بہت گورے اور خوبصورت جسم کے آدمی تھے۔ عامر بن ربیعہ نے کہا کہ آپ جیسا جسم آج تک میں نے کسی کنواری کا بھی نہیں دیکھا۔ سہل کو اسی وقت بخار آگیا اور بخار شدید ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس آدمی آیا اور ان کو بتایا کہ سہل بن حنیف کو تپ چڑھ گیا ہے اور وہ تو اب آپ کے ساتھ جانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ رسول اللہ ﷺ ان کے پاس آئے تو سہل نے جو بات عامر بن ربیعہ کی طرف سے ہوئی تھی وہ آپ کو بتائی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کیوں بلاوجہ قتل کرتا ہے۔ تم نے ان کو برکت کی دعا کیوں نہیں دی۔ نظر تو حق ہے۔ اس کے لیے وضو کرو۔ عامر نے اس کے لیے وضو کیا تو سہل ٹھیک ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ اس حال میں روانہ ہو گئے کہ ان کو کوئی تکلیف نہ تھی۔﴾

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ" عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ أَبِي أُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ أَنَّهُ قَالَ رَأَى عَامِرُ بْنُ رَبِيعَةَ سَهْلَ بْنَ حُنَيْفٍ يَغْتَسِلُ فَقَالَ مَا رَأَيْتُ كَالْيَوْمِ وَلَا جِلْدَ مُخْبَأَةٍ فَلُبِطَ سَهْلٌ فَأُتِيَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَقِيلَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ هَلْ لَكَ فِي سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ وَاللّٰهِ مَا يَرْفَعُ رَأْسَهُ فَقَالَ هَلْ تَتَّهِمُونَ لَهُ أَحَدًا قَالُوا نَتَّهِمُ عَامِرَ بْنَ رَبِيعَةَ فَتَغَيَّظَ عَلَيْهِ وَقَالَ عَلَامَ يَقْتُلُ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ أَلَا بَرَّكْتَ اغْتَسِلْ لَهُ فَغَسَلَ عَامِرٌ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ وَمِرْفَقَيْهِ وَرُكْبَتَيْهِ وَأَطْرَافَ رِجْلَيْهِ وَدَاخِلَةَ إِزَارِهِ فِي قَدَحٍ ثُمَّ صُبَّ عَلَيْهِ فَرَاحَ سَهْلٌ مَعَ النَّاسِ لَيْسَ بِهِ بَأْسٌ.

﴿ابو اسامہ بن سہل کہتے ہیں کہ عامر بن ربیعہ نے سہل بن حنیف کو غسل کرتے دیکھا تو انہوں نے کہا کہ میں نے آج تک اتنا خوبصورت جسم کسی پردہ نشین کا بھی نہیں دیکھا۔ اس پر سہل وہیں گر پڑے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی آیا اور پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ کو کچھ سہل کا حال بھی معلوم ہے؟ خدا کی قسم، وہ تو سر بھی نہیں اٹھا رہے ہیں۔ آپؐ نے پوچھا کیا تم ان کے بارے میں کسی کو متہم کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم تو عامر بن ربیعہ کو متہم کرتے ہیں۔ آپ عامر پر غصے ہوئے اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کیوں ناحق قتل کرتا ہے۔ تو نے ان کو برکت کی دعا کیوں نہ دی، اب اس کے لیے غسل کرو۔ تو عامر نے دھویا اپنا چہرہ، دونوں ہاتھ، کہنیاں، دونوں گھٹنے، پاؤں کے اطراف اور تہمد کا اندرون ایک برتن میں۔ پھر یہ سارا پانی سہل کے اوپر ڈال دیا تو وہ ٹھیک ہو گئے اور لوگوں کے ساتھ اس حال میں نکلے کہ ان کو کوئی تکلیف نہ تھی۔﴾

وضاحت:

یہ دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں۔ عامر بن ربیعہ نے سہل بن حنیف کو غسل کرتے دیکھا تو ان کی خوش رنگ جلد پر ایسی نگاہ ڈالی کہ وہ نظر بد کا شکار ہو کر اسی وقت گر پڑے اور انہیں شدید بخار آ گیا۔ نظر بد ایک شیطانی کام ہے۔ انسان کے اندر جو شیطان ہوتا ہے وہ اس کا ذریعہ بنتا اور دوسرے آدمی کو متاثر کرتا ہے۔ نظر بد بھی اعمال سفلیہ کی طرح کی ایک چیز ہے۔ اس میں اتنی ہی تاثیر ہوتی ہے جتنی سحر میں ہوتی ہے۔ سحر قوت متخیلہ کو متاثر کرتا ہے لیکن اتنا نہیں کہ آدمی اس کے نتیجہ میں مر جائے یا مخبوط الحواس ہو جائے۔ اس کا اثر وقتی طور پر پڑتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ جو فرمایا کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتا ہے تو اس سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ نظر بد قتل تک متعدی ہو سکتی ہے۔ اسی لیے اس روایت کی بنا پر یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ نظر بد کے نتیجہ میں اگر کوئی قتل ہو جائے تو کیا نظر بد ڈالنے والا قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ فقہا کے ایک گروہ کے خیال میں وہ قتل کر دیا جائے گا جبکہ دوسرے گروہ کا کہنا یہ ہے کہ شریعت میں قتل کی تحقیق کا ایک ضابطہ ہے۔ اس کے لیے شہادتیں لی جاتی ہیں، آلۂ قتل دیکھا جاتا ہے، مقتول کا جائزہ لیا جاتا ہے، اس کے بعد قاضی اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ نظر بد میں شریعت کے ان ضابطوں پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ امام نووی کی رائے

میں نظر بد کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔

دوسری طرف قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اعمال خبیثہ میں شیطان کو کسی پر سلطان یا کامل اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ آدمی کی جان ہی لے لے۔ زیادہ سے زیادہ وہ وسوسہ اندازی کر سکتا ہے، گناہ پر ابھار سکتا ہے اور وقتی طور پر کسی مشکل میں ڈال سکتا ہے۔ اس کی روشنی میں قتل سے مراد حقیقی قتل نہیں ہو سکتا جس کا آنحضرتؐ نے حوالہ دیا ہے۔

اگرچہ دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ کو بیان کرتی ہیں لیکن ان میں جو افرق میرے نزدیک اس وجہ سے پیدا ہو گیا ہے کہ پہلی روایت کے راوی محمد بن ابی امامہ ہیں جبکہ دوسری محمد بن شہاب زہری سے مروی ہے۔ پہلی روایت کے مطابق نبی ﷺ نے عامر بن ربیعہ کو وضو کرنے کا حکم دیا اور سہل بن حنیف کے لیے برکت کی دعا کرنے کو کہا جس سے سہل اچھے ہو گئے۔ یہ بات قرین قیاس اور شریعت کے مزاج کے مطابق ہے۔ دوسری روایت میں ابن شہاب نے اس کو ایک ٹوٹکا بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق جس آدمی سے نظر بد لگی ہو اس کو نہلایا جائے۔ تمام اعضاء حتیٰ کہ زیر جامہ کے اعضاء کو بھی دھو کر پانی ایک برتن میں جمع کیا جائے اور وہ تمام کا تمام مریض کے اوپر ڈالا جائے تو نظر بد کا اثر ختم ہو جائے گا اور مریض تندرست ہو جائے گا۔ یہ سب اوہام ہیں۔ ان کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ زہری کے مقاصد میں یہ بات بھی رہی ہے کہ یہود کے اعمال سفلیہ کو اسلام میں گھسایا جائے اور ایمان بالجبت (یا اعمال سفلیہ پر ایمان) یہود کی خصوصیت رہی ہے۔ ٹونے ٹوٹکے وغیرہ سب جبت کے قبیل سے ہیں۔

روایت میں غسل کے اس طریقہ کے لیے شاہ ولی اللہؒ نے بھی لکھا ہے کہ یہ ابن شہاب کی اپنی گرہ ہے۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ ان باتوں کا عقل سے کوئی تعلق نہیں۔ ٹونے ٹوٹکے دل سے مان لینے کی چیزیں ہیں۔ میرے نزدیک یہ قرآن کے خلاف اور یہود کے بقایا میں سے ہیں۔ صوفیوں کے ذریعے ان کو فروغ حاصل ہوا ہے۔

اَلرُّقْيَةُ مِنَ الْعَيْنِ

نظر بد کے لیے جھاڑ پھونک کرنا

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ قَيْسٍ الْمَكِّيِّ اَنَّهُ قَالَ دُخِلَ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ بِابْنَيْ جَعْفَرِ بْنِ اَبِي طَالِبٍ فَقَالَ لِحَاضِنَتِهِمَا مَالِي اَرَاهُمَا ضَارِعَيْنِ فَقَالَتْ حَاضِنَتُهُمَا يَا

رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّہٗ تَسْرَعُ اِلَیْھِمَا الْعَیْنُ وَلَمْ یَمْنَعْنَا اَنْ نَسْتَرْقِیَ لَھُمَا اِلَّا اَنَّا لَا نَدْرِیْ مَا یُوَافِقُکَ مِنْ ذٰلِکَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اسْتَرْقُوْا لَھُمَا فَاِنَّہٗ لَوْ سَبَقَ شَیْءٌ الْقَدَرَ لَسَبَقَتْہُ الْعَیْنُ.

﴿ حمید بن قیس مکی کہتے ہیں کہ جعفر بن ابی طالبؓ کے دو بیٹے رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے گئے۔ آپ نے ان کو دودھ پلانے والیوں سے کہا کہ میں ان کو کمزور کیوں دیکھتا ہوں، تو ان کی دودھ پلانے والیوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول، ان کو نظر بہت جلد لگ جاتی ہے اور ہم ان کے لیے ٹونے ٹوٹکے نہیں کرتے کیونکہ معلوم نہیں کہ آپ اس کو پسند کریں گے یا نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان کو جھاڑ پھونک کراؤ کیونکہ تقدیر پر اگر کوئی چیز سبقت کرنے والی ہوتی تو نظر بد اس پر سبقت کر لیتی۔ ﴾

وضاحت :

"ضارع" کمزور کو کہتے ہیں۔ استرقاء کا لفظ جھاڑ پھونک کروانے کے لیے آتا ہے۔ حدیث اپنے مفہوم میں واضح ہے۔ بچوں کی آیاؤں نے ان کی کمزوری کو نظر بد پر محمول کیا۔ ہمارے یہاں بھی عورتیں بچے کی پرورش میں اپنا کوئی قصور ماننے کو تیار نہیں ہوتیں۔ اگر کسی کمزور بچے کے متعلق پوچھا جاتا ہے تو یہی جواب دیتی ہیں کہ اس پر نظر بد کا اثر ہے۔

اس روایت میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آنحضرت ﷺ نے یہ کیوں فرمایا کہ ان کے لیے جھاڑ پھونک کراؤ۔ بچوں کی صحت کے لیے آپ خود دعا کر سکتے تھے۔ آپ کی دعا سے بہتر اور پاکیزہ کس کی دعا ہو سکتی تھی اور آپ کی دعا کے لیے حضرت علیؓ کے بھتیجوں سے زیادہ اور کون محبوب ہو سکتا تھا۔ آپ فرما دیتے کہ میں ان کے لیے دعا کرتا ہوں۔ اس کے بجائے آپ نے فرمایا کہ جھاڑ پھونک کراؤ۔ نظر بد کے اثر کو زائل کرنے کا یہ بڑا اکارگر نسخہ ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا آپ روایتی جھاڑ پھونک کرنے والوں کے عمل کی تاثیر کے قائل تھے؟ یہ بالکل ناممکن بات ہے۔ آنحضرت کا مدعا بھی اگر ہو سکتا ہے تو وہ دعا کا ہو سکتا ہے جو ایک مشروع چیز ہے۔ روایت میں اگر استرقاء کا لفظ آگیا ہے تو اسے دعا ہی پر محمول کرنا چاہیے۔

☐ حَدَّثَنِیْ مَالِکٌ عَنْ یَحْیَی بْنِ سَعِیْدٍ عَنْ سُلَیْمَانَ بْنِ یَسَارٍ اَنَّ عُرْوَۃَ بْنَ الزُّبَیْرِ حَدَّثَہٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ دَخَلَ بَیْتَ اُمِّ سَلَمَۃَ زَوْجِ النَّبِیِّ ﷺ وَ فِی الْبَیْتِ صَبِیٌّ یَبْکِیْ

فذكروا له أن به العين قال عروة فقال رسول الله ﷺ الا تسترقون له من العين.

﴿ عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی زوجہ ام سلمہؓ کے گھر میں داخل ہوئے تو گھر میں ایک بچہ رو رہا تھا۔ آپ کو بتایا گیا کہ اس کو نظر لگ گئی ہے۔ عروہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم اسے نظر بد سے جھاڑ پھونک کیوں نہیں کراتے؟

وضاحت:

یہاں بھی روایت میں وہی مشکل ہے جو پچھلی روایت میں تھی۔ قرآن مجید میں اور خود رسول اللہ ﷺ کے عمل میں جو چیز ہے وہ دعا ہے، جھاڑ پھونک نہیں۔ دعا میں کلمات طیبہ کا ہونا ضروری ہے۔ کوئی شرکیہ کلمہ نہ ہو، ان کو پڑھ کر مریض پر پھونک دیں تو یہ عمل درست ہوگا۔ اگر اس کو استرقاء کہا گیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

ماجاء في أجر المريض

بیمار کے اجر کے بارے میں

☐ حدثني مالك" عن زيد بن أسلم عن عطاء بن يسار أن رسول الله ﷺ قال إذا مرض العبد بعث الله تبارك و تعالى إليه ملكين فقال انظرا ماذا يقول لعواده فإن هو إذا جاءوه حمد الله و أثنى عليه رفعا ذلك إلى الله عز وجل وهو أعلم فيقول لعبدي علي إن توفيته أن أدخله الجنة و إن أنا شفيته أن أبدل له لحما خيرا من لحمه ودما خيرا من دمه و أن أكفر عنه سيئاته.

﴿ عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی بندہ بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالی اس کی طرف دو فرشتے بھیجتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو کہ وہ اپنی عیادت کرنے والوں سے کیا کہتا ہے۔ اگر وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہو، اس کی ثنا کرتا ہو، تو وہ دونوں فرشتے خدا کے پاس اس کی خبر لے جاتے ہیں، حالانکہ خدا خود جانتا ہے۔ تو اللہ تعالی فرماتا ہے کہ میرے بندے کا میرے اوپر ذمہ ہے کہ اگر میں اس کو وفات دوں تو اس کو جنت میں داخل کروں گا اور اگر اس کو شفا دوں تو اس کے گوشت کو اس سے بہتر

گوشت سے اور خون کو اس سے بہتر خون سے بدل دوں گا اور اس کے گناہ بھی معاف کر دوں گا۔﴾

وضاحت:

اللہ اپنے شاکر و صابر بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ ایسے بندوں کو اگر کانٹا بھی چبھتا ہے تو وہ اس کو ان کے لیے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہم لوگ جو قدم قدم پر گناہ کرتے ہیں وہ کس طرح سے معاف ہوں گے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَزِيدَ بْنِ خُصَيْفَةَ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ أَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ تَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يُصِيبُ الْمُؤْمِنَ مِنْ مُصِيبَةٍ حَتَّى الشَّوْكَةُ إِلَّا قُصَّ بِهَا أَوْ كُفِّرَ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ لَا يَدْرِي يَزِيدُ أَيُّهُمَا قَالَ عُرْوَةُ.

﴿عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ زوجہ نبی ﷺ سے سنا کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ مومن کو کوئی دکھ نہیں پہنچتا یہاں تک کہ کانٹا چبھنے کا بھی مگر یہ کہ اسے اس کا قصاص دیا جاتا ہے یا یہ اس کی خطاؤں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ یزید کو یہ معلوم نہیں کہ عروہ نے ان دونوں میں سے کون سی بات کہی۔﴾

وضاحت:

یہ روایت امام مسلم نے بھی لی ہے۔ پچھلی روایت میں یہی بات دوسرے حوالہ سے بیان ہوئی ہے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللَّهِ بْنِ أَبِي صَعْصَعَةَ أَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا الْحُبَابِ سَعِيدَ بْنَ يَسَارٍ يَقُولُ سَمِعْتُ أَبَاهُرَيْرَةَ يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُصِبْ مِنْهُ.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس بندے کی بہتری چاہتا ہے تو اس کی طرف سے اس کو آزمائش پہنچتی ہے۔﴾

وضاحت:

اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے، اور قرآن مجید میں اس کی وضاحت یوں ہے، کہ خیر سے یا تکلیف سے اللہ تعالیٰ انسان کا امتحان لیتا رہتا ہے۔ خیر سے اس کے شکر کا اور تکلیف سے اس کے صبر کا امتحان ہوتا ہے۔ زندگی بھر یہ سلسلہ

برابر جاری رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر کسی آزمائش میں ڈالتا ہے تو اس سے خیر ہی مطلوب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے ساتھ کوئی دشمنی تو ہو نہیں سکتی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں غفلت سے جھنجھوڑنا مقصود ہو۔ ہم جاگ نہ رہے ہوں تو کسی طرح سے وہ ہمیں ابتلا میں ڈال کر خواب غفلت سے جگا کر متوجہ کر دے، تو یہ بہت بڑا خیر ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّ رَجُلًا جَاءَهُ الْمَوْتُ فِي زَمَانِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَقَالَ رَجُلٌ هَنِيئًا لَهُ مَاتَ وَلَمْ يُبْتَلَ بِمَرَضٍ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَيْحَكَ وَمَا يُدْرِيكَ لَوْ أَنَّ اللهَ ابْتَلَاهُ بِمَرَضٍ يُكَفِّرُ بِهِ عَنْهُ مِنْ سَيِّئَاتِهِ.

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص کی موت کا وقت آگیا تو ایک شخص نے کہا کتنا مبارک ہے یہ شخص، مرا اور کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرا اس ہو۔ تم کو کیا معلوم کہ اگر اللہ اس کو مرض میں مبتلا کرتا تو وہ اس کے گناہوں کو جھاڑنے والا بنتا۔﴾

وضاحت:

معلوم ہوا کہ یہ نہیں چاہنا چاہیے کہ ہم کو کوئی مرض نہ لاحق ہو، مگر یہ دعا ضرور کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ موت دے تو آسان دے۔ میں یہ دعا ضرور کرتا ہوں۔ مرض تو آزمائش ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت اس کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس میں گھبرانا نہیں چاہیے۔

اَلتَّعَوُّذُ وَالرُّقْيَةُ مِنَ الْمَرَضِ

مرض سے پناہ مانگنا اور جھاڑ پھونک کرنا

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَزِيدَ بْنِ خُصَيْفَةَ أَنَّ عَمْرَو بْنَ عَبْدِاللهِ بْنِ كَعْبِ السُّلَمِيَّ أَخْبَرَهُ أَنَّ نَافِعَ بْنَ جُبَيْرٍ أَخْبَرَهُ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي الْعَاصِي أَنَّهُ أَتَى رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ عُثْمَانُ وَبِي وَجَعٌ قَدْ كَادَ يُهْلِكُنِي قَالَ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ امْسَحْهُ بِيَمِينِكَ سَبْعَ مَرَّاتٍ وَقُلْ أَعُوذُ بِعِزَّةِ اللهِ وَقُدْرَتِهِ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ قَالَ فَفَعَلْتُ ذَلِكَ فَأَذْهَبَ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى

مَا كَانَ بِي فَلَمْ أَزَلْ آمُرُ بِهَا أَهْلِي وَ غَيْرَهُمْ

﴿عثمان بن العاص سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ ان کو اتنا شدید درد اٹھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ انہیں ہلاک کر دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس پر مسح کرو اپنے دائیں ہاتھ سے سات مرتبہ اور دعا کرو کہ میں اللہ کی عزت اور قدرت کی پناہ مانگتا ہوں اس شر اور دکھ سے جو مجھے پہنچا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے میری وہ تکلیف دور کر دی۔ اس کے بعد میں برابر اپنے گھر والوں اور دوسرے لوگوں کو اس دعا کی تلقین کرتا ہوں۔﴾

وضاحت :

یہ دعا آنحضرت ﷺ نے سکھائی ہے۔ مسنون الفاظ یہی ہیں۔ نہایت مختصر اور آسان ہے۔ سب کو یاد کر لینی چاہیے۔ یہ استرقاء کا مسنون طریقہ ہے۔ اس طریقے سے دعا مانگ کر پانی پلانے یا تکلیف کے مقام پر پھونک مارنے یا ہاتھ پھیرنے کا نفسیاتی اثر پڑتا ہے اور مریض کے لیے نفسیاتی اثر کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ اس طرح کے جھاڑ پھونک میں کوئی برائی نہیں۔ جو چیز بری ہے وہ یہ ہے کہ کلمات شرکیہ ہوں۔ جتنی بھی معروف و مسنون دعائیں پیغمبر ﷺ کی ہیں وہ اختیار کرنی چاہئیں۔ سات مرتبہ کا جو عدد ہے یہ بہت سی روایتوں میں آیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دین میں اعداد کا کچھ اعتبار ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں اعداد کا لحاظ ہے۔ آخر نماز کے پانچ اوقات ہیں۔ بعض نمازوں کی رکعتیں دو، بعض کی تین اور بعض کی چار ہیں۔ تو یہ سب بغیر حکمت کے نہیں۔ دین میں ان کا لحاظ ہے۔ اگر کوئی چیز قرآن مجید سے یا صحیح حدیث سے ثابت ہو تو ہر چند اس کی حکمت نہ معلوم ہو اس کی پیروی کرنی چاہیے۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بلا حکمت بات ہے۔ ہاں اگر کسی ایرے غیرے کی بتائی ہوئی ہو تو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ إِذَا اشْتَكَى يَقْرَأُ عَلَى نَفْسِهِ بِالْمُعَوِّذَاتِ وَ يَنْفُثُ قَالَتْ فَلَمَّا اشْتَدَّ وَجَعُهُ كُنْتُ أَنَا أَقْرَأُ عَلَيْهِ وَ أَمْسَحُ عَلَيْهِ بِيَمِينِهِ رَجَاءَ بَرَكَتِهَا.

﴿حضرت عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کہتی تھیں کہ آنحضرت ﷺ جب بیمار ہوتے تو آپ اپنے اوپر معوذات پڑھتے اور پھونکتے۔ فرماتی ہیں کہ جب آپ کی تکلیف زیادہ

ہوئی تو میں آپ پر پڑھ کر پھونکتی اور برکت کے خیال سے آپ کے ہاتھ پر مسح کرتی۔﴾

وضاحت :

معوذات سے قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس مراد ہیں۔ یہ دونوں سورتیں ہر طرح کے شر سے، آفت اور شیطان کے حملوں سے اللہ کی پناہ طلب کرنے کی دعا ہیں۔ اس لیے تمام تکالیف میں معوذتین پڑھنا اللہ کی مدد و نصرت کو آواز دینے کے مترادف ہے۔ دعا کے ساتھ پھونک مارنا اور ہاتھ پھیرنا خلاف عقل ہے نہ خلاف دین۔ مریض پر اس کا بھی اثر ہوتا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّ اَبَابَكْرٍ الصِّدِّيقَ دَخَلَ عَلٰى عَائِشَةَ وَهِيَ تَشْتَكِي وَيَهُودِيَّةٌ تَرْقِيهَا فَقَالَ اَبُوبَكْرٍ ارْقِيهَا بِكِتَابِ اللّٰهِ.

﴿عمرہ بنت عبد الرحمٰن سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق حضرت عائشہؓ کے پاس آئے، وہ بیمار تھیں اور ایک یہودی عورت ان کو جھاڑ پھونک کر رہی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ کتاب اللہ سے جھاڑ پھونک کرو۔﴾

وضاحت :

قرینہ ہے کہ یہ ہجرت کے بعد شروع زمانے کا واقعہ ہے۔ حضرت عائشہؓ کی شادی کے بعد کا نہیں۔ شادی کے بعد تو آنحضرت ﷺ سے بڑا کوئی دعا کرنے والا نہیں تھا۔ اس وقت ابھی مسلمانوں میں علاج کرنے والے نہیں ہوں گے اور پرانی روایت یہ چلی آرہی ہوگی کہ بعض لوگ ایسے لوگوں سے عمل کروا لیتے ہوں گے جن کو جوگی یا بڑا مستجاب الدعوات خیال کرتے رہے ہوں گے۔ تو اسی طرح کی یہ یہودی عورت ہوگی۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ فرمادیا کہ کتاب اللہ سے جھاڑ پھونک کرو۔ کتاب اللہ سے یہاں مراد تورات معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہودی عورت قرآن مجید کو تو جانتی نہیں ہوگی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں آکر استرقاء کے علم میں یہ ترمیم ہوئی ہے کہ اب جھاڑ پھونک یونہی نہیں کہ جو چاہے کردے بلکہ کتاب اللہ کے کلمات سے ہو، اگرچہ وہ کتاب پہلے ہی کی ہو۔

تعالُجُ المَرِيْضِ

مریض کے علاج کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ اَنَّ رَجُلًا فِی زَمَانِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَصَابَهٗ جُرْحٌ فَاحْتَقَنَ الْجُرْحُ الدَّمَ وَ اَنَّ الرَّجُلَ دَعَا رَجُلَيْنِ مِنْ بَنِی اَنْمَارٍ فَنَظَرَا اِلَيْهِ فَزَعَمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَهُمَا اَيُّكُمَا اَطَبُّ فَقَالَا اَوَ فِی الطِّبِّ خَيْرٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَزَعَمَ زَيْدٌ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اَنْزَلَ الدَّوَاءَ الَّذِی اَنْزَلَ الْاَدْوَاءَ۔

﴿زید بن اسلم روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک شخص زخمی ہوا اور اس کے زخم نے خون جمع کر لیا (یعنی خون نکلا نہیں) اس نے بنی انمار کے دو آدمیوں کو بلایا، انہوں نے اسے دیکھا۔ انہوں نے خیال کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم دونوں میں سے کون سا اعلیٰ طبیب ہے۔ انہوں نے کہا، یا رسول اللہ! کیا طب میں بھی کوئی خیر ہے؟ زید کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے بیماریاں اتاری ہیں اس نے دوا بھی اتاری ہے۔﴾

وضاحت:

یہ روایت مرسل ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ راوی پورے اعتماد کے ساتھ اسے روایت نہیں کر رہے ہیں۔ معاملہ کسی شخص کے جسم میں خون بھر جانے کا تھا۔ اس کے علاج کے لیے دو معالج بلائے گئے تو نبی ﷺ نے پوچھ لیا کہ تم میں اچھا معالج کون ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ کچھ چونک گئے اور طب کے بارے میں آنحضرت ﷺ کی رائے دریافت کی۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ جس نے بیماریاں اتاری ہیں اس نے دوائیں بھی پیدا کی ہیں۔

علاج معالجہ جائز ہے۔ یہ ایسا معاملہ نہیں جس میں کچھ شبہ ہو۔ بعض لوگ علاج کو صبر اور توکل کے خلاف سمجھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے بیماری دی ہے تو اس کو صبر سے جھیلنا چاہیے۔ لیکن نبی ﷺ نے تعلیم دی کہ اللہ تعالیٰ نے اگر بیماری دی ہے تو دوا بھی دی ہے۔ لہٰذا مریض کو علاج کرانا چاہیے۔ البتہ یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ معلوم ہوا کہ اس وضاحت کی ضرورت تھی ورنہ لوگ بیماری کا علاج کرانے کے

معاملہ میں وہم میں مبتلا ہو جاتے۔

❏ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِکٍ عَنْ یَحْیَی بْنِ سَعِیْدٍ قَالَ بَلَغَنِی اَنَّ سَعْدَ بْنَ زُرَارَۃَ اکْتَوٰی فِی زَمَانِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ مِنَ الذُّبْحَۃِ فَمَاتَ۔

﴿یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ سعد بن زرارہؓ نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں حلق کی بیماری سے داغ لگوایا اور مر گئے۔﴾

وضاحت

ذبحہ سے مراد گلے کی ایک بیماری ہے جس میں گلے میں ایک دانہ نکل آتا ہے۔اس سے گلا گھٹتا ہے اور ایسی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں جو بہت تکلیف دہ ہوتی ہیں اور مریض کے لیے سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے۔اس زمانے میں اس بیماری کا علاج کسی گرم چیز سے داغنا تھا۔ہمارے زمانے میں بھی بعض زخموں کو جلانے کے لیے یہ طریق علاج استعمال ہوتا ہے۔اس بارے میں اختلاف ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے یہ علاج کبھی کروایا یا نہیں۔لیکن علاج کا جہاں تک تعلق ہے اس زمانے میں یہ ایک عام علاج تھا اور بدویانہ زندگی میں اسی طرح کے علاج تھے۔معلوم ہوتا ہے سعد بن زرارہؓ اس بیماری سے شفایاب نہ ہو سکے اور ان کا انتقال ہو گیا۔

❏ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِکٍ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰہِ بْنَ عُمَرَ اکْتَوٰی مِنَ اللَّقْوَۃِ وَرُقِیَ مِنَ الْعَقْرَبِ۔

﴿نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے لقوہ کے لیے داغ لگوایا اور بچھو کے کاٹنے کا ان پر دم کیا گیا۔﴾

وضاحت

معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو لقوہ کا عارضہ ہو گیا تو انھوں نے بھی داغ لگوا کر اس کا علاج کیا۔نیز بچھو نے کاٹا تو اس کے لیے دم کیا۔ان کاموں کو انھوں نے خلاف شریعت نہیں سمجھا۔

اَلْغُسْلُ بِالْمَاءِ مِنَ الْحُمّٰی

بخار میں پانی سے غسل کے بارے میں

❏ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِکٍ عَنْ ہِشَامِ بْنِ عُرْوَۃَ عَنْ فَاطِمَۃَ بِنْتِ الْمُنْذِرِ اَنَّ اَسْمَاءَ بِنْتَ اَبِی

بكرٍ كَانَتْ اِذَا اُتِيَتْ بِالْمَرْاَةِ وَقَدْ حُمَّتْ تَدْعُو لَهَا اَخَذَتِ الْمَاءَ فَصَبَّتْهُ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ جَيْبِهَا وَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَاْمُرُنَا اَنْ نَبْرُدَهَا بِالْمَاءِ۔

﴿حشام بن عروہ فاطمہ بنت منذر سے روایت کرتے ہیں کہ اسماء بنت ابی بکرؓ کی خدمت میں جب کوئی بخار زدہ عورت دعا کے لیے لائی جاتی تو وہ پانی لیتیں اور اس کے اور اس کے گریبان کے درمیان چھڑکتیں اور وہ کہتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیتے تھے کہ بخار کو پانی سے ٹھنڈا کیا کرو۔﴾

وضاحت

اس عمل کا حکیم لوگوں نے بڑا مذاق اڑایا ہے کہ اس علاج سے تو مریض مر جائے گا۔ لیکن واقعہ یہ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب لو لگتی ہے، اور عرب میں تو اکثر لو چلتی ہے، تو پانی سے اس کا اثر دور کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں بھی اگر بخار میں شدت آجائے تو ڈاکٹر برف کے پانی سے علاج کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ البتہ ایسی روایتوں کے بارے میں بعض غلط فہمیوں کو صاف ہو جانا چاہیے۔ مثلاً یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اگر ایسی ہدایت فرمائی تو ضروری نہیں کہ آپ کی یہ بات وحی پر مبنی اور شریعت کا کوئی جز ہو بلکہ عام تجربے کی بنا پر آپ نے ایک بات بتادی۔ گرم ملک میں لو لگنے کا عارضہ عام تھا تو اس میں یہ علاج مفید ہے۔ لوگ سمجھنے میں یہ غلطی کرتے ہیں کہ ایک خاص معاملے کو عام کر دیتے ہیں۔ یعنی آنحضرت ﷺ نے ایک خاص بخار کے لیے علاج بتایا، لوگوں نے سمجھا کہ جس قسم کا بھی بخار ہو مریض کو خوب نہلا دو۔ پھر روایت میں پانی چھڑکنے کا کہا ہے تو لوگ اس پر قناعت نہیں کریں گے بلکہ جا کر ندی میں نہالیں گے۔ ظاہر ہے کہ آدمی مر جائے گا، اس لیے کہ کچھ بخار ایسے ہیں کہ پانی ان کے لیے زہر قاتل ہے۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ لوگ اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ آنحضرتؐ جتنی باتیں بتاتے وہ سب کی سب وحی پر مبنی نہیں ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر تابیر نخل کے بارے میں آپؐ نے لوگوں سے کہا کہ درخت کا بور کھجور کے درختوں پر جو چھڑکتے ہو، اگر تم ایسا نہ کرو تو کیا حرج ہے۔ لوگوں نے بور چھڑکنا چھوڑ دیا تو پھل کم آیا۔ لوگوں نے پھل کی کمی کی شکایت آپ کے پاس کی کہ حضور، ہم نے آپ کے حکم سے ایسا کیا تھا لیکن پھل بہت کم آیا، تو آپؐ نے فرمایا کہ "انتم اعلم بامور دنیاکم" "تم دنیا کے معاملات میں بہتر جانتے ہو۔ کھیتی باڑی کے معاملات تم

جانو- مجھے تو ایک ذوق کی بات لگی تھی تو میں نے کہہ دیا- یہ کوئی شریعت کا حکم تو نہیں تھا- علی ہذا القیاس بیماریوں کے علاج کی روایتوں کو جمع کر کے لوگوں نے طب نبوی کو باقاعدہ مرتب کر کے پیش کر دیا ہے- ظاہر ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ایک متقی آدمی دوسرا علاج کیوں کرائے گا- وہ اسے تقویٰ کے خلاف سمجھے گا- لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایسی روایات کو بھی تابیر نخل کے واقعہ پر قیاس کرنا چاہیے- کیونکہ نبی ﷺ جسمانی بیماریوں کے نہیں بلکہ روحانی بیماریوں کے معالج ہو کر آئے تھے- آپ کی طرف طب روحانی کے سوا اور کسی طب کے منسوب کرنے کی گنجائش نہیں- لہذا اس طرح کے معاملات میں موقع و محل کا لحاظ ہونا چاہیے- یہ واقعہ ہے کہ بعض بخاروں میں پانی بہت مفید ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض میں یہ انتہائی نقصان دہ ہے- اس لیے بخار کی نوعیت کا لحاظ رکھنا ہو گا-

میرے نزدیک یہ بات قرآن مجید کی اس آیت میں بھی ملحوظ ہونی چاہیے جس میں فرمایا ہے کہ شہد میں شفا بھی ہے- یہ قرآن مجید پر ظلم ہو گا اگر آپ اس کے معنی یہ لیں کہ شہد ہر مرض کی دوا ہے- یقیناً وہ بہت سے امراض میں مفید ہے لیکن اس میں ہر مرض کا تو علاج نہیں کہ آپ ہر مرض میں مریض کو شہد ہی پلانے کی کوشش کریں- خود قرآن مجید کے الفاظ سے یہ بات نہیں نکلتی کہ وہ شہد کو بطور علاج تجویز کر رہا ہے- اس نے اس نعمت کا اسی طرح ذکر کیا ہے جس طرح دوسری نعمتوں کا جن کو انسان اپنے فائدہ کے لیے استعمال کرتا ہے-

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيهِ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنَّ الْحُمّٰى مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ فَابْرُدُوهَا بِالْمَاءِ- عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ الْحُمّٰى مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ فَاطْفِئُوهَا بِالْمَاءِ-

﴿ہشام بن عروہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بخار جہنم کی پھونک میں سے ہے، اس کو پانی سے ٹھنڈا کرو- نافع ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بخار جہنم کی پھونک میں سے ہے، اسے پانی سے بجھاؤ-﴾

وضاحت

یہ واقعہ ہے کہ جتنا خیر ہے اس کا منبع جنت ہے اور جتنا شر ہے اس کا منبع دوزخ ہے- خیر اور شر کے ذخیرے یہی ہیں- حدیث میں بخار کی بیماری کا خاندان و نسب بتا دیا ہے کہ یہ کس خاندان سے چلی ہے- گویا یہ بیماری بھی اس

طرح کی ہے کہ تمام شر کا منبع ہے لہذا اس کو پانی سے ٹھنڈا کرو۔ روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آنحضرتؐ نے یہ بات کس موقع پر فرمائی۔ ہو سکتا ہے بخار کی کوئی خاص قسم مراد ہو یا کسی کے بخار کا ذکر آیا ہو اور آپ کو معلوم ہو کہ اس کو لو لگی ہے تو اس موقع پر آپ نے فرمایا ہو۔ بہت سی روایات کو سمجھنے میں لوگوں کو مشکل اس لیے پیش آئی کہ راوی حضرات روایت کا موقع و محل متعین نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے فتنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

عِيَادَةُ الْمَرِيْضِ وَالطِّيَرَةُ

مریض کی عیادت اور شگون کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ عَنْ جَابِرِ ابْنِ عَبْدِاللّٰهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِذَا عَادَالرَّجُلُ الْمَرِيْضَ خَاضَ الرَّحْمَةَ حَتّٰى اِذَاقَعَدَ عِنْدَهُ قَرَّتْ فِيْهِ اَوْ نَحْوَهٰذَا۔

﴿امام مالکؒ کو یہ بات جابر بن عبداللہؓ سے پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص کسی مریض کی عیادت کو جاتا ہے تو خدا کی رحمت میں ڈوب جاتا ہے (یا غوطہ لگاتا ہے) اور جب وہ اس کے پاس بیٹھ جاتا ہے تو رحمت اس کے پاس ٹک جاتی ہے یا اسی طرح کے اور الفاظ کہے۔﴾

وضاحت

مریض کی عیادت بہت بڑی سعادت ہے۔ ہمدردی سے معاشرہ میں حسن و خوبی پیدا ہوتی ہے۔ آپس میں محبت بڑھتی ہے۔ عیادت مریض ایک مسلمان کا دوسرے پر حق ہے۔ اگر کھڑے کھڑے پوچھ کے چلے آئیں کہ کیسا مزاج ہے تو یہ بھی نیکی ہے لیکن ایسا نہ کریں، ذرا بیٹھ جائیں۔ مریض کے سر پر ہاتھ بھی رکھ دیں۔ اس کے جسم کا اندازہ کریں اور کچھ تسلی کے الفاظ بھی کہہ دیں تو پھر کیا کہنے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ایسے شخص کو گھیر لیتی ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ عَنْ بُكَيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْاَشَجِّ عَنِ ابْنِ عَطِيَّةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا عَدْوٰى ، وَلَا هَامَ وَلَا صَفَرَ، وَلَا يَحُلُّ الْمُمْرِضُ عَلَى الْمُصِحِّ، وَلْيَحْلُلِ الْمُصِحُّ حَيْثُ شَاءَ فَقَالُوا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَمَا ذَاكَ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّهُ اَذًى۔

﴿ابن عطیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ متعدی، ہام اور صفر کا کوئی تصور (اسلام

میں) نہیں اور یہ ٹھیک نہیں کہ کوئی اپنے مریض جانوروں کو ان پر لے جائے جو تندرست ہوں۔ البتہ یہ درست ہے کہ تندرست جانور کو جہاں چاہے لے جائے۔ لوگوں نے پوچھا یارسول اللہ ﷺ یہ کیا بات ہوئی؟ تو آپ نے فرمایا ایسا کرنا باعث تکلیف ہوتا ہے۔

وضاحت

حدیث میں عدوی، ہام اور صفر کے تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کے بارے میں عربوں کے اندر بڑے اوہام پائے جاتے تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ایسے اوہام کا اسلام میں کوئی تصور نہیں۔ عدوی کے معنی بیماری کا متعدی ہونا ہے۔ عربوں کا خیال تھا کہ ایک بیمار اونٹ دوسرے تندرست اونٹوں کو بھی بیمار کر دیتا ہے لہذا وہ اس کو گلے سے الگ کر دیتے۔

ہام کے متعلق مختلف روایتیں ان لوگوں کے ہاں تھیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی شخص اگر قتل ہو جائے اور اس کا قصاص نہ لیا جائے تو اس کی روح ایک پرندے کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور وہ استقونی، استقونی کا نعرہ لگاتی رہتی ہے یعنی مجھے پلاؤ، میں پیاسی ہوں، جب تک کہ اس کا انتقام نہ لے لیا جائے۔ یا یہ کہ فلاں پرندہ اگر گھر کی چھت پر بیٹھ جائے تو اس گھر سے میت نکلتی ہے۔ اوہام پرست معاشرہ میں اس طرح کے شگون لینے کا بڑا رواج ہوتا ہے۔

صفر کے مہینے کے اوہام میں بھی بڑے اختلافات ہیں۔ بعض لوگ اس مہینے کو بیماریوں کا گھر سمجھتے۔ اسی طرح اس مہینہ میں شادی کرنے پر بھی برا شگون لیتے۔ نسی کے قاعدہ کے تحت ماہ محرم کو حلال قرار دے دیتے اور ماہ صفر کو شہر حرام قرار دے دیتے تھے۔ شادی کے معاملہ میں تو ہمارے ہاں بھی ایک وہم پایا جاتا ہے کہ محرم میں شادی نہ کی جائے۔ اس زمانے میں صفر بدنام تھا اب محرم بدنام ہو گیا۔ میرے نزدیک اس میں کچھ حرج نہیں۔ یہ اسی طرح کا وہم ہے جس طرح کے وہم کو اسلام نے آکر دور کیا۔

اسلام میں کوئی چیز بذات خود موثر نہیں مانی جاتی۔ ہر کام اللہ کے حکم سے ہوتا ہے اور اسی طرح ہوتا ہے جو مقدر کر دیا گیا ہے۔ عدوی میں بھی فیصلہ کن بات مرض کا متعدی ہونا نہیں بلکہ اللہ کا حکم ہی ناطق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی متعدی وباؤں میں مریضوں کی تیمارداری کرنے والے مرض کے حملہ سے بچ جاتے ہیں اور جہاں وبا کے کوئی آثار نہیں ہوتے وہاں بیماری پھیل جاتی ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی ﷺ کے پاس اونٹوں کی خارش کے متعدی ہونے کا ذکر ہوا تو آپ نے پوچھا کہ سب سے پہلے جس اونٹ کو خارش ہوئی اس کو کس سے

چھوٹ گئی تھی-

اس دور میں ایڈز وغیرہ کا جو پروپیگنڈا کیا گیا ہے اس کے باعث اسلام کا یہ تصور قبول کرنے میں لوگوں کو وقت پیش آئے گی-بہر حال اسلام کی تعلیم یہ بھی نہیں ہے کہ آپ کسی وبازدہ علاقہ میں خواہ تو اہ کو دپڑیں-اجتناب کرنا ہی صحیح ہے-لیکن اگر فرائض کا تقاضا ہو تو محض اس وہم کے باعث کہ بیماری لگ جائے گی، وبازدہ علاقہ میں جانے سے گریز نہیں کرنا چاہیے-

نبی ﷺ نے جب یہ ہدایت دی کہ آدمی اپنے بیمار جانوروں کو تندرست جانوروں میں نہ لے جائے تو لوگوں کو حیرانی ہوئی کہ جب عدوی کی کوئی حقیقت نہیں تو پھر اس ممانعت کا کیا سبب ہے-تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ایسا کرنے سے تندرست جانوروں کا مالک برا منائے گا-یہ اسی طرح ہے کہ جس طرح برص کے مریض کو مسجد میں جانے کی ممانعت ہے تو اس کی بنیاد یہ نہیں کہ یہ مرض دوسروں کو لگ جائے گا بلکہ یہ ہے کہ لوگ ایسے شخص سے ناگواری محسوس کریں گے تو خود اس کی دل شکنی ہو گی-

اَلسُّنَّةُ فِی الشَّعَرِ

بالوں کے بارے میں سنت

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِی بَكْرِ بْنِ نَافِعٍ عَنْ اَبِیهِ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ اَمَرَ بِاِحْفَاءِ الشَّوَارِبِ وَ اِعْفَاءِ اللِّحَی-

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مونچھوں کو منڈوانے اور داڑھیوں کو بڑھانے کا حکم دیا-﴾

وضاحت

مونچھوں کو شارب (پینے والی) اس لیے کہتے ہیں کہ اگر بڑھ جائیں تو یہ آپ کی چائے، شربت اور کھانے کی چیز میں شریک ہو جاتی ہیں-احفاء سے مطلب یہ ہے کہ ان کو اچھی طرح مونڈ دیا جائے-اہل حدیث کا یہ مذہب ہے کہ استرے سے صاف کر دیا جائے لیکن مالکیہ اس کو مثلہ کہتے ہیں اور وہ اس کی اجازت نہیں دیتے-بعض لوگ احفاء کا تقاضا یہ سمجھتے ہیں کہ مونچھوں کے بالوں کو ہونٹوں کی طرف نہ بڑھنے دیا جائے-چنانچہ حضرت عمرؓ کے

متعلق آیا ہے کہ جب وہ کسی اہم مسئلہ پر غور کر رہے ہوتے تو وہ اپنی مونچھوں کے بالوں کو بٹتے رہتے۔

اعفاء اللحی کا ظاہر مطلب تو یہ ہے کہ داڑھی کو بڑھنے دیا جائے اور بالکل ہاتھ نہ لگایا جائے۔ لیکن ایک روایت میں آیا ہے کہ ''کان یاخذ عن یمینہ و شمالہ'' کہ آپؐ دائیں اور بائیں سے بال کاٹتے تھے۔ اگر دائیں اور بائیں جانب سے بالوں کو کاٹ دیا جائے اور نیچے کی جانب ان کو بڑھنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو خدا جانے آدمی کیا بن جائے۔ لہذا روایت کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ داڑھی حسین ہو۔ بال دائیں بائیں اور طول و عرض میں کاٹے جائیں گے۔ اس کو ٹھیک کیا جائے گا۔ بعض صحابہ مثلاً ابن عمرؓ اور ابو ہریرہؓ کی داڑھی ایک مشت ہوتی تھی۔ امام مالک کا بھی یہی فتویٰ ہے۔

میرے نزدیک اعفاء کا تقاضا یہ ہے کہ داڑھی چہرے پر نمایاں ہو اور اس کو سنوار کر رکھا جائے۔ اس کو دیکھ کر یہ تاثر نہیں ملنا چاہیے کہ شیو بڑھی ہوئی ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ اَنَّهٗ سَمِعَ مُعَاوِيَةَ بْنَ اَبِي سُفْيَانَ عَامَ حَجَّ وَ هُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَ تَنَاوَلَ قُصَّةً مِنْ شَعَرٍ كَانَتْ فِي يَدِ حَرَسِيٍّ يَقُولُ يَا اَهْلَ الْمَدِينَةِ اَيْنَ عُلَمَاؤُكُمْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَنْهَى عَنْ مِثْلِ هٰذِهٖ وَ يَقُولُ اِنَّمَا هَلَكَتْ بَنُو اِسْرَائِيلَ حِيْنَ اتَّخَذَ هٰذِهٖ نِسَاؤُهُمْ۔

﴿حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت ہے کہ انہوں نے معاویہ بن ابی سفیان سے، جس سال انہوں نے حج کیا، منبر پر خطبہ کے دوران میں سنا۔ بالوں کا ایک گچھا ان کے ہاتھ میں تھا جو انہوں نے اپنے باڈی گارڈ سے لیا تھا۔ انہوں نے کہا اے اہل مدینہ، تمہارے علماء کہاں مر گئے؟ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپؐ اس طرح کی حرکتوں سے منع کرتے اور یہ فرماتے تھے کہ بنی اسرائیل اپنی عورتوں کی اس طرح کی حرکتوں کے باعث ہلاک ہوئے۔﴾

وضاحت

اس گچھے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جن عورتوں کے سر پر بال کم ہو جاتے ہوں گے تو مصنوعی طریقے پر بال بڑھانے کے لیے دوسری عورتوں کے بال جمع کر کے گچھے بنا کر سر پر سجاتی ہوں گی، کیونکہ عورتیں

لمبے بالوں کی بہت شوقین ہوتی ہیں۔ وہ کچھا کہیں سے حضرت امیر معاویہؓ کے سیکورٹی کے آدمی نے اٹھالیا تو انہوں نے منبر رسول پر خطبہ کے دوران لوگوں کو دکھایا کہ مدینہ منورہ میں اس طرح کی حرکتیں ہو رہی ہیں اور تمہارے علماء خاموش ہیں، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ان باتوں سے منع فرمایا۔ پھر حدیث ہی کے حوالے سے انہوں نے اپنی تقریر میں یہ بھی واضح کیا کہ اسی طرح کی حرکتوں سے بنی اسرائیل تباہ ہوئے۔ ہماری عورتوں اور بہو بیٹیوں کا حال لوگوں کو نہیں معلوم کہ جو کچھ آج یہ کر رہی ہیں اس کے باعث سے اس قوم کا حشر کیا ہونے والا ہے۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ زِیَادِ بْنِ سَعْدٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَنَّهُ سَمِعَهُ یَقُوْلُ سَدَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَاصِیَتَهُ مَاشَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ فَرَقَ بَعْدَ ذٰلِكَ۔ قَالَ مَالِكٌ "لَیْسَ عَلَى الرَّجُلِ یَنْظُرُ اِلٰى شَعَرِ امْرَاَةِ ابْنِهٖ اَوْ شَعَرِ اُمِّ امْرَاَتِهٖ بَاْسٌ"۔

﴿زیاد بن سعد نے ابن شہاب کو بیان کرتے سنا کہ رسول اللہ ﷺ پہلے تو، جب تک اللہ نے چاہا، اپنی پیشانی پر بال چھوڑے رہتے تھے لیکن بعد میں آپ نے مانگ نکالنی شروع کر دی۔ امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ کوئی شخص اگر اپنی بہو کے یا اپنی ساس کے بال دیکھے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔﴾

وضاحت

'سدل' کے معنی بالوں کو کھلا چھوڑ دینا ہے کہ لٹکتے رہیں۔ 'فرق' سے مراد بالوں کو تقسیم کر کے مانگ نکالنا ہے۔ عربوں کے ہاں پٹے رکھنے کا عام رواج تھا اور لوگ بالعموم ان کو کھلا چھوڑ دیتے اور نبی ﷺ کا عمل بھی اسی پر تھا۔ جب اہل کتاب کے ساتھ قریب رہنے کا موقع ملا تو آپ نے دیکھا کہ وہ بالوں میں مانگ نکالتے ہیں۔ آپ کو یہ طریقہ بھلا لگا اور آپ نے بھی اہل کتاب کے طریقہ کے مطابق مانگ نکالنی شروع کر دی۔ کیونکہ جس معاملہ میں اسلام کی اپنی کوئی رہنمائی نہیں ہوتی تھی تو آپ اہل کتاب کے طریقہ پر عمل کرتے تھے۔ اس روایت میں آپ لوگوں کے لیے یہ تعلیم ہے کہ جو لوگ پٹے رکھیں وہ شوق سے مانگ نکالیں۔

امام مالک کا فتویٰ بالوں کے بارے میں اس روایت کے تحت معلوم نہیں کیوں نقل کر دیا گیا ہے۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّهُ كَانَ یَكْرَهُ الْاِخْصَاءَ وَ یَقُوْلُ فِیْهِ تَمَامُ الْخَلْقِ۔

﴿نافع عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ وہ خصی کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس (قوت) سے خلق کی تکمیل ہوتی ۔ ﴾

وضاحت

یہ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بڑی رعایت کر دی ہے کہ خصی کرنے کو مکروہ ہی کہا ہے، حالانکہ اس سے بڑھ کر کوئی حرام قطعی نہیں۔ اگر راہبوں اور صوفیوں نے ایسا کیا ہے تو یہ ان کے ان جرائم میں سے ہے جن میں راہب اور صوفی مبتلا رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ جس آدمی میں مردمی نہ ہو وہ آدمی اسلام کی اعلیٰ صفات کا حامل ہو ہی نہیں سکتا۔ فتوت، شجاعت، استقامت، انکار منکر کے کام وہ آدمی کر ہی نہیں سکتا جو زنخا ہے۔ اس میں یہ صفات پیدا ہی نہیں ہو سکتیں۔ جس آدمی میں رجولیت ختم ہو گئی وہ وہ کوڑی کا ہے۔ اپنے آپ کو خصی کروالینا ہرگز نیکی کا کام نہیں۔ اس جوہر کا ہونا اور اس کو کنٹرول میں رکھنا اصلی رجولیت اور فتوت ہے۔

'مکروہ' بہت ہلکا لفظ ہے۔ 'حرام' کہنا چاہیے تھا۔ فیہ تمام الخلق کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی خلقت کی تکمیل اس قوت سے ہوتی ہے۔ اور یہ مطلب بھی ہے کہ اسی سے دنیا پیدا ہوتی ہے، لہٰذا اس قوت کو باقی رہنا چاہیے۔

☐ حدثنی عن مالک عن نافع عن صفوان بن سلیم انہ بلغہ ان النبی ﷺ قال انا و کافل الیتیم لہ او لغیرہ فی الجنۃ کھاتین اذا اتقی و اشار باصبعیہ الوسطی والتی تلی الابھام۔

﴿صفوان بن سلیم سے روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا، خواہ وہ اس کا اپنا ہو یا غیروں میں سے کوئی دوسرا، جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح ہوں گے، اگر وہ تقویٰ اختیار کرے۔ اور آپ نے اپنی درمیانی انگلی اور انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے اشارہ کیا۔﴾

وضاحت

فی الواقع یتیم کی کفالت کرنے والے کا بڑا رتبہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے جنت میں ایسے شخص کا قرب ظاہر کرنے کے لیے فرمایا کہ ہم اس طرح قریب ہوں گے جیسے ہاتھ کی ساتھ ساتھ کی دو انگلیاں۔ ظاہر ہے اس سے بڑھ کر کوئی شخص کون سا رتبہ حاصل کر سکتا ہے۔

اِصْلَاحُ الشَّعَرِ

بالوں کو سنوارنے کے بارے میں

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ یَحْیَی بْنِ سَعِیْدٍ اَنَّ اَبَا قَتَادَةَ الْاَنْصَارِیَّ قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ لِیْ جُمَّةً اَفَاُرَجِّلُهَا؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَعَمْ وَ اَکْرِمْهَا- فَکَانَ اَبُوْ قَتَادَةَ رُبَّمَا دَهَنَهَا فِی الْیَوْمِ مَرَّتَیْنِ لِمَا قَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَعَمْ وَ اَکْرِمْهَا-

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ ابو قتادہ انصاری نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ میں پٹے رکھے ہوئے ہوں تو کیا میں اس میں کنگھا کر لیا کروں- تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں اور بالوں کی قدر کرو- چنانچہ ابو قتادہ کبھی کبھی دن میں دو مرتبہ بھی تیل لگایا کرتے تھے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہاں ان کی قدر کرو-﴾

وضاحت :

ہدایت صاف ہے کہ اگر پٹے رکھے ہیں تو ان کی قدر کرو- پریشان حال نہ چھوڑو- تیل بھی لگاؤ اور کنگھی بھی کرو- بعض لوگ دینداری کا تقاضا یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ میلے کچیلے رہتے ہیں- ان کے خیال میں زہد کا اعلیٰ مقام اسی سے حاصل ہوتا ہے- اسلام دین فطرت ہے۔ اس میں ایسے کوئی معیارات قائم نہیں کیے گئے جو انسانیت کے فطری تقاضوں کے مطابق نہ ہوں-

□ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَیْدِ بْنِ اَسْلَمَ اَنَّ عَطَاءَ بْنَ یَسَارٍ اَخْبَرَهٗ قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِی الْمَسْجِدِ فَدَخَلَ رَجُلٌ ثَائِرَ الرَّاْسِ وَاللِّحْیَةِ فَاَشَارَ اِلَیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِیَدِهٖ اَنْ اخْرُجْ کَاَنَّهٗ یَعْنِیْ اِصْلَاحَ شَعَرِ رَاْسِهٖ وَ لِحْیَتِهٖ فَفَعَلَ الرَّجُلُ ثُمَّ رَجَعَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلَیْسَ هٰذَا خَیْرًا مِنْ اَنْ یَاْتِیَ اَحَدُکُمْ ثَائِرَ الرَّاْسِ کَاَنَّهٗ شَیْطَانٌ-

﴿زید بن اسلم سے روایت ہے کہ عطاء بن یسار نے ان کو خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تھے تو

ایک شخص داخل ہوا جس کے سر اور داڑھی کے بال پراگندہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ مسجد سے نکل جاؤ۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ اپنی ڈاڑھی اور سر کے بالوں کی اصلاح کرو۔ تو اس شخص نے ایسا کیا اور لوٹ آیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا یہ اس سے بہتر نہیں کہ تم میں سے کوئی پراگندہ سر ہو کر آئے جیسے وہ شیطان ہو۔

وضاحت :

یہ روایت مرسل ہے لیکن اس میں بات وہی اوپر والی روایت کی طرح ہے کہ بال سنوار کر رکھنے چاہئیں۔ ان کو پراگندہ نہیں چھوڑنا چاہیے کہ آدمی بھوت معلوم ہو۔ نبی ﷺ نے صفائی، ستھرائی اور نظافت کو اس قدر اہمیت دی کہ پراگندہ بال مسجد میں آنے والے شخص کو آپ نے لوٹ جانے اور اپنی حالت درست کر کے آنے کی ہدایت فرمائی۔

مَا جَاءَ فِی صَبْغِ الشَّعَرِ

بال رنگنے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ یَحْیٰی بْنِ سَعِیْدٍ قَالَ: اَخْبَرَنِی مُحَمَّدُ بْنُ اِبْرَاهِیْمَ التَّیْمِیُّ عَنْ اَبِی سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّ عَبْدَالرَّحْمٰنِ بْنَ الْاَسْوَدِ بْنِ عَبْدِ یَغُوْثَ قَالَ وَ كَانَ جَلِیْسًا لَهُمْ وَ كَانَ اَبْیَضَ اللِّحْیَةِ وَالرَّاْسِ - قَالَ فَغَدَا عَلَیْهِمْ ذَاتَ یَوْمٍ وَ قَدْ حَمَّرَهُمَا- قَالَ فَقَالَ لَهُ الْقَوْمُ هٰذَا اَحْسَنُ فَقَالَ اِنَّ اُمِّی عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِیِّ ﷺ اَرْسَلَتْ اِلَیَّ الْبَارِحَةَ جَارِیَتَهَا نُخَیْلَةَ فَاَقْسَمَتْ عَلَیَّ لَاَصْبُغَنَّ وَ اَخْبَرَتْنِی اَنَّ اَبَابَكْرٍ الصِّدِّیْقَ كَانَ یَصْبُغُ- قَالَ یَحْیٰی سَمِعْتُ مَالِكًا یَقُوْلُ فِی صَبْغِ الشَّعَرِ بِالسَّوَادِ لَمْ اَسْمَعْ فِی ذٰلِكَ شَیْئًا مَعْلُوْمًا وَ غَیْرُ ذٰلِكَ مِنَ الصَّبْغِ اَحَبُّ اِلَیَّ قَالَ وَ تَرْكُ الصَّبْغِ كُلِّهِ وَاسِعٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَیْسَ عَلَی النَّاسِ فِی ذٰلِكَ ضِیْقٌ- قَالَ وَ سَمِعْتُ مَالِكًا یَقُوْلُ فِی هٰذَا الْحَدِیْثِ بَیَانُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَمْ یَصْبُغْ وَ

لو صَبَغَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَاَرْسَلَتْ بِذٰلِكَ عَائِشَةُ اِلٰى عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ الْاَسْوَدِ۔

﴿ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن اسود بن عبد یغوث ان کے پاس بیٹھنے والے تھے۔ان کی داڑھی اور سر کے بال سفید تھے۔کہتے ہیں کہ ایک دن وہ آئے تو انہوں نے سر اور داڑھی دونوں کو سرخ رنگ میں رنگ رکھا تھا۔لوگوں نے ان سے کہا کہ یہ اچھا لگ رہا ہے تو انہوں نے کہا میری امی عائشہ نبی ﷺ کی اہلیہ نے کل رات اپنی لونڈی نخیلہ کے ذریعے سے مجھے یہ پیغام بھیجا کہ تمہیں قسم ہے کہ اپنے بالوں کو ضرور رنگو۔انہوں نے مجھے یہ بھی خبر دی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی بالوں کو رنگتے تھے۔یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک کو کہتے سنا کہ میں نے بالوں کو سیاہ رنگنے کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں سنی اور اس کے علاوہ جو دوسرے خضاب ہیں وہ مجھے زیادہ پسند ہیں۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ بال رنگنے سے اجتناب میں ان شاء اللہ زیادہ وسعت ہے۔اس میں لوگوں کے لیے تنگی نہیں ہے۔انہوں نے کہا کہ میں نے امام مالک کو یہ فرماتے سنا کہ اس حدیث میں اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بالوں کو خضاب نہیں لگایا۔اگر آپ نے ایسا کیا ہوتا تو حضرت عائشہ عبدالرحمٰن بن الاسود کو اپنے پیغام میں اس بات کا حوالہ دیتیں۔﴾

وضاحت :

اس روایت سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ آنحضرت ﷺ نے خضاب نہیں لگایا۔کیونکہ حضرت عائشہؓ کو یہ بتانا چاہیے تھا کہ آنحضرتؐ نے ایسا کیا۔لیکن روایات میں اختلاف ہے۔حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے خضاب لگایا۔دوسری روایت میں ہے کہ آپ کی تھوڑی میں چند بال سفید تھے تو پھر آپ خضاب کہاں لگاتے۔پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ کام مذاق سلیم کے خلاف ہے۔فطرت اس سے ابا کرتی ہے۔رسول اللہ ﷺ سے یہ بعید ہے کہ آپ نے فطرت کے خلاف کیا ہو۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق یہ روایت گزر چکی ہے کہ آپ نے بڑھاپا دیکھا تو اللہ تعالیٰ سے کہا کہ یہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ وقار ہے۔اب اس وقار کو، جو اللہ تعالیٰ کسی کو عطا فرمائے، سرخی یا سیاہی سے چھپا دینا کہاں کی

عقلمندی ہے۔ اگر آنحضرتؐ کے متعلق یہ بات ثابت ہو کہ آپ نے خضاب لگایا تو ہو سکتا ہے کہ آپ نے خوشبو کے لیے زعفران لگایا ہو۔ راویوں نے اس کو یہ رنگ دے دیا۔ خضاب کے متعلق اگر کسی کو شوق ہو تو مہندی کا خضاب لگا لے، اس سے زیادہ نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت ابوبکر صدیق کے متعلق اگر یہ ہے کہ وہ خضاب لگاتے تھے تو یہ پچھلے رواج کے مطابق ہوگا۔ اسلام میں اس کی کوئی ممانعت تو ہوئی نہیں۔ اگر وہ کرتے رہے تو اس کے جواز میں کوئی شک نہیں رہتا۔

امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ رنگنا اور نہ رنگنا دونوں یکساں ہیں۔ اس معاملے میں کوئی تنگی نہیں۔ البتہ خضاب نہ لگانے میں سہولت ہے۔

مَا يُؤْمَرُ بِهِ مِنَ التَّعَوُّذِ

تعوذ کے بارے میں کیا حکم ہے

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ قَالَ بَلَغَنِي أَنَّ خَالِدَ بْنَ الْوَلِيدِ قَالَ لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ إِنِّي أُرَوَّعُ فِي مَنَامِي، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قُلْ أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّةِ مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ، وَشَرِّ عِبَادِهِ، وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَنْ يَحْضُرُونِ۔

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ خالد بن ولیدؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ حضور میں خواب میں ڈر جایا کرتا ہوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ دعا پڑھ لیا کرو کہ میں اللہ تعالیٰ کے کامل کلموں کے ذریعے اس کے غصے اور عتاب سے اور اس کے بندوں کے شر سے اور شیاطین کے وسوسوں سے اور اس بات سے کہ شیاطین میرے پاس آئیں، اس کی پناہ مانگتا ہوں۔﴾

وضاحت:

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ خالد بن ولید "سیف اللہ" ہیں اور وہ بھی خواب میں ڈر جاتے رہے ہیں۔ جب حضرت خالد بن ولید ڈر جاتے ہیں تو ہما شما کا کیا ہے۔ یہ حالت سب کو پیش آ سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو دعا بتا دی جو سب کو یاد کر لینی چاہیے۔ یہ دعا برے خوابوں کے علاوہ نظر بد کے لیے بھی ہے۔

کامل کلمات سے مراد وہی ہے جو دوسری دعا کے الفاظ بکل اسم سمیت به تفسک سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اور شانوں کا احاطہ کر کے ان کے حوالہ سے دعا مانگنا ہوتا ہے۔ دعا ہمیشہ جامع الفاظ میں مانگنی چاہیے۔ زیر بحث دعا ان الفاظ میں ہے کہ اے اللہ، تیری رحمت کے تمام سہاروں اور تیرے تمام ناموں کی برکت کے حوالہ سے میں تیرے غضب سے، تیرے عتاب سے، تیرے بندوں کے شر سے اور شیاطین کے وسوسوں سے اور اس بات سے کہ وہ میرے پاس آئیں، تیری پناہ مانگتا ہوں۔

میرے نزدیک شیاطین کو اللہ تعالیٰ کے نیک اور صالح بندوں پر اس سے زیادہ کوئی اختیار نہیں کہ وہ وسوسہ اندازی کر سکیں۔ وہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اس لیے میں ان لوگوں کی رائے کو غلط سمجھتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ ساحر اپنے سحر کے ذریعہ سے یا شیطانوں کے ذریعہ سے قتل بھی کر سکتے ہیں۔ بیمار بھی کر سکتے ہیں، نامرد بھی بنا سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے کہ "اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغَاوِیْنَ" (الحجر ۴۲)

(میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا بجز ان کے جو گمراہوں میں سے تیرے پیرو بن جائیں)

بعض لوگ شیطانی عمل کرتے ہیں تاکہ شیطانوں اور جنوں کو مسخر کریں تو وہ انہی کے بھائی بند ہوتے ہیں۔ بعض مرتبہ شیطانوں کا داؤ چل جاتا ہے تو وہ ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ نیک لوگوں یعنی موحدین پر ان کا صرف اتنا ہی اثر ہو سکتا ہے کہ وہ وسوسہ اندازی کریں۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّهُ قَالَ أُسْرِيَ بِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَرَأَى عِفْرِيتاً مِنَ الْجِنِّ يَطْلُبُهُ بِشُعْلَةٍ مِنْ نَارٍ كُلَّمَا الْتَفَتَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ رَآهُ، فَقَالَ لَهُ جِبْرِيلُ أَفَلَا أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ تَقُولُهُنَّ إِذَا قُلْتَهُنَّ طُفِئَتْ شُعْلَتُهُ وَ خَرَّ لِفِيهِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بَلَى فَقَالَ جِبْرِيلُ فَقُلْ أَعُوذُ بِوَجْهِ اللَّهِ الْكَرِيمِ وَ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ مِنْ شَرِّ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَ شَرِّ مَا يَعْرُجُ فِيهَا وَشَرِّ مَا ذَرَأَ فِي الْأَرْضِ، وَ شَرِّ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا، وَ مِنْ فِتَنِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، وَ مِنْ طَوَارِقِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِلَّا طَارِقاً يَطْرُقُ

بِخَيْرٍ يَا رَحْمٰنُ-

﴿یحیٰی بن سعید کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کو ایک رات لے جایا گیا تو آپ نے دیکھا کہ جنوں کا ایک بھوت آپ کا آگ کے شعلے کے ساتھ پیچھا کر رہا ہے- جب جب رسول اللہ ﷺ اس کی طرف متوجہ ہوتے آپ اس کو دیکھتے تو جبریل نے کہا کہ آپ کو ایسے کلمات نہ سکھادوں کہ وہ آپ پڑھیں تو اس کا شعلہ بجھ جائے اور وہ اپنے منہ کے بل گر پڑے- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں ضرور سکھایئے- تو جبریل نے کہا پڑھیے، میں اللہ کریم کے چہرے اور اس کے ان کامل کلمات کے سہارے کی جن سے آگے نہیں جا سکتا نہ کوئی نیک نہ بد، ہر اس چیز کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو آسمان سے اترتی ہے اور اس چیز کے شر سے جو آسمان میں چڑھتی ہے، ہر اس چیز کے شر سے جو زمین میں پیدا ہوتی ہے اور اس چیز کے شر سے جو اس سے نکلتی ہے اور رات اور دن کے فتنوں سے اور رات اور دن کے طوارق سے جو رات یا دن کو اچانک نمودار ہوں سوائے طارق خیر سے، اے رحمٰن-﴾

وضاحت :

یہ روایت مرسل ہے اس لیے نفس واقعہ پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا-

طارق، جس کی جمع طوارق ہے، کے معنی رات میں آنے والے کے ہیں اور یہ آنے والے اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی-

جہاں تک دعا کا تعلق ہے تو میرا خیال یہ ہے کہ اس طرح کی دعائیں نبی ﷺ کے راویوں کے لیے ٹھیک ٹھیک یاد رکھنا آسان نہیں ہے- میرے نزدیک تعوذ کی بہت ہی جامع اور بلیغ ترین دعائیں قرآن مجید کی آخری دو سورتیں ہیں- وہ اتنی جامع ہیں کہ کلمات اللہ التامہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں- میں تو یہی کرتا ہوں کہ آیۃ الکرسی، قل ھو اللہ اور معوذتین پڑھنے کے بعد سونے کی دعا پڑھ کر سو جاتا ہوں- باقی اگر کسی کو یہ دعا یاد رہ جائے تو فبہا-

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ سُهَيْلِ بْنِ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَجُلًا مِنْ

اَسْلَمَ قَالَ مَا نِمْتُ هٰذِهِ اللَّيْلَةَ ، فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ اَیِّ شَیْءٍ؟ فَقَالَ لَدَغَتْنِی عَقْرَبٌ" فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَمَا اِنَّكَ لَوْ قُلْتَ حِيْنَ اَمْسَيْتَ اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ لَمْ تَضُرَّكَ-

﴿ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ اسلم قبیلے کے ایک شخص نے کہا میں آج رات بھر نہیں سویا- رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: اس کا سبب کیا تھا؟ اس نے کہا کہ مجھے بچھو نے ڈنک مارا- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم شام کو سوتے وقت یہ کہتے کہ میں اللہ تعالیٰ کے کامل کلمات کی پناہ مانگتا ہوں ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی تو تم کو تکلیف نہ ہوتی-﴾

وضاحت :

یہ سونے کے وقت کی دعا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے کامل کلمات کے حوالے سے ہر چیز کے شر سے خدا کی پناہ مانگی گئی ہے- مختصر اور جامع دعا ہے- یاد کر لینی چاہیے-

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ سُمَیٍّ مَوْلٰی اَبِی بَكْرٍ عَنِ الْقَعْقَاعِ بْنِ حَكِيْمٍ اَنَّ كَعْبَ الْاَحْبَارِ قَالَ لَوْ لَا كَلِمَاتٌ اَقُوْلُهُنَّ لَجَعَلَتْنِی يَهُوْدُ حِمَارًا، فَقِيْلَ لَهُ وَ مَا هُنَّ فَقَالَ اَعُوْذُ بِوَجْهِ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ الَّذِیْ لَيْسَ شَیْءٌ اَعْظَمَ مِنْهُ، وَبِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِی لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّ لَا فَاجِرٌ وَ بِاَسْمَاءِ اللّٰهِ الْحُسْنٰى كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَ مَالَمْ اَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَ ذَرَاَ وَ بَرَاَ-

﴿قعقاع بن حکیم سے روایت ہے کہ کعب احبار نے کہا کہ اگر میں کچھ کلمات نہ پڑھتا ہوتا تو یہود تو مجھے گدھا بنا چھوڑتے- پوچھا گیا وہ کلمات کیا ہیں تو انہوں نے کہا، میں پناہ مانگتا ہوں اللہ عظیم کی ذات کی جس سے کوئی بڑا نہیں اور اللہ کے کامل کلمات کی کہ جن سے آگے نہ کوئی نیک جا سکتا ہے نہ بد- اور اللہ کے اچھے ناموں میں سے جو میں جانتا ہوں اور جو نہیں جانتا اس شر سے جو اللہ نے پیدا کیا اور پھیلایا-﴾

وضاحت :

کعب احبار جو یہ کہتے ہیں کہ یہود مجھے گدھا نہ چھوڑتے تو یہ اشارہ ان کے جادو کے افعال کی طرف ہے۔ اس بارے میں میں اپنا نقطۂ نظر قرآن مجید کی روشنی میں اوپر خالد بن ولید والی روایت کے تحت بیان کر چکا ہوں۔

کعب احبار کی اس دعا میں وہ بات نہیں جو نبی ﷺ سے سونے کے وقت اور اٹھنے کے وقت کی ماثور دعاؤں میں ہے۔ وہ ایسی ہیں کہ ان کے پڑھنے سے ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید کے سوا نبی ﷺ کے کلام سے زیادہ بلیغ کلام کوئی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر جانب سے گھیر لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر آنحضرت ﷺ کی یہ دعا دیکھیں کتنی جامع اور موثر ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّی عَبْدُكَ ابْنُ عَبْدِكَ ابْنُ اَمَتِكَ نَاصِيَتِی بِيَدِكَ مَاضٍ فِیَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِیَّ قَضَاءُكَ اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِی كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِيْعَ قَلْبِی وَ نُوْرَ صَدْرِی وَ جِلَاءَ حُزْنِی وَ ذَهَابَ هَمِّی وَغَمِّی

(اے اللہ میں تیرا بندہ، تیرے غلام کا بیٹا، تیری لونڈی کا بیٹا ہوں۔ میری پیشانی تیری گرفت میں ہے۔ میرے بارے میں تیرا حکم نافذ ہے، میرے بارے میں تیرا فیصلہ عدل پر مبنی ہے۔ میں سوال کرتا ہوں ہر اس نام سے جو تیرا ہے، جو تو نے اپنی ذات کا رکھا ہے یا اپنی کتاب میں اتارا ہے یا اپنی مخلوق میں کسی کو اس کا علم دیا ہے کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور، میرے دکھ کا مداوا اور میری پریشانی اور غم کا علاج بنا دے۔)

مَاجَاءَ فِی الْمُتَحَابِّيْنَ فِی اللّٰهِ

ان لوگوں کے بارے میں جو اللہ کے لیے محبت کرتے ہیں

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ مَعْمَرٍ عَنْ اَبِی الْحُبَابِ سَعِيْدِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ اَنَّهٗ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی يَقُوْلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

أَيْنَ الْمُتَحَابُّونَ لِجَلَالِي الْيَوْمَ أُظِلُّهُمْ فِي ظِلِّي يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلِّي ـ

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ بندے جو محض میرے جلال کے اندیشے سے آپس میں محبت کرتے تھے۔ آج میں ان کو اپنے سائے میں لوں گا جس دن کہ میرے سائے کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا۔﴾

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ خُبَيْبِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ الْاَنْصَارِيِّ عَنْ حَفْصِ بْنِ عَاصِمٍ عَنْ اَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ اَوْ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّهُ، اِمَامٌ عَادِلٌ، وَ شَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَ رَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ بِالْمَسْجِدِ اِذَا خَرَجَ مِنْهُ حَتّٰى يَعُوْدَ اِلَيْهِ وَ رَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللّٰهِ اجْتَمَعَا عَلٰى ذٰلِكَ وَ تَفَرَّقَا وَ رَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ، وَ رَجُلٌ دَعَتْهُ ذَاتُ حَسَبٍ وَ جَمَالٍ فَقَالَ اِنِّي اَخَافُ اللّٰهَ وَ رَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَاَخْفَاهَا حَتّٰى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِيْنُهُ.

﴿ابو سعید خدری یا ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سات قسم کے آدمی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ خاص اپنے سائے میں لے گا اس دن جب اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔ ایک تو عادل حکمران، دوسرا وہ نوجوان جس کی اٹھان اللہ عزوجل کی عبادت میں ہوئی، تیسرا وہ شخص جس کا دل مسجد میں اٹکا رہے جب مسجد سے نکلے، اس وقت تک جب کہ لوٹ نہ آئے، چوتھے وہ دو شخص جو اللہ کے لیے محبت کرنے والے ہوتے ہیں، اللہ کے لیے جمع ہوتے ہیں اور اسی کے لیے جدا ہوتے ہیں۔ پانچواں وہ شخص جو اللہ کو تنہائی میں یاد کرے تو اس کے آنسو نکل پڑیں۔ چھٹا وہ شخص جس کو کوئی نسب و جمال والی عورت دعوت عشق دے اور وہ کہے بی بی، میں اپنے رب سے ڈرتا ہوں۔ اور ساتواں وہ شخص جو صدقہ دے اتنے خفیہ طریقے سے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو معلوم نہ ہو کہ اس کے دائیں نے کیا خرچ کیا۔﴾

وضاحت :

اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔ یہ روایت بخاری اور مسلم دونوں میں ہے۔ اس روایت کا ایک ایک لفظ لعل و گوہر سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ جن سات قسم کے آدمیوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کا عمل ان کی سلیم فطرت، اللہ کے خوف اور تقویٰ اور حقیقی جذبہ خیر کی بدولت ممکن ہوتا ہے۔ نیکی ان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوتی ہے اور وہ عارضی طور پر یہ کام نہیں کر رہے ہوتے ہیں۔ اب دیکھیے وہ خوش بخت لوگ جن کی قدر افزائی اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کون ہیں:

(i) اقتدار میں آ کر آدمی جب ہر سیاہ و سفید کا مالک بن جاتا ہے تو اپنی قوت کے نشہ میں من مانیاں کرنے لگتا ہے۔ اپنوں کو نوازتا اور مخالفوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیتا ہے۔ اس وقت عدل کرنا بے حد مشکل کام ہوتا ہے۔ لیکن جو حکمران عدل کے ساتھ حکومت کر جائے تو گویا اس نے ایک بڑی آزمائش میں کامیابی حاصل کر لی۔ آخرت میں اللہ کی رحمت اس پر سایہ فگن ہوگی۔

(ii) ایک نوجوان جس کی اٹھان اللہ کی عبادت میں ہوئی ہو تو ظاہر ہے کہ پختہ عمر ہونے پر اس کے عمل میں مزید پختگی آئے گی اور وہ مجسم نیکی بن جائے گا۔

(iii) وہ شخص جو مسجد سے نکلا لیکن دل اس کا مسجد کے ساتھ اٹکا ہوا ہے کہ کب یہاں لوٹنا نصیب ہو یعنی اس کا مسجد سے نکلنا ایسا ہو جیسے اصل مامن سے نکلنا ہوتا ہے۔ بندۂ مومن کا اصل مامن مسجد ہی ہے اور اس کا دل وہیں اٹکا رہتا ہے۔

(iv) وہ دو شخص جو محض فی اللہ محبت کرتے ہیں، کوئی دنیاوی غرض وابستہ نہیں، کسی کاروبار میں شراکت نہیں، شادی بیاہ نہیں کرنا، قرض نہیں لینا، اپنے کسی مقصد کے لیے بے وقوف نہیں بنانا۔ بس ہر ایک کی یہ سوچ ہو کہ بہت نیک آدمی ہے۔ اس کے پاس بیٹھتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کی یاد آ جاتی ہے۔ اس طرح وہ دونوں اللہ کے لیے اکٹھے ہوں، جب ملیں تو اسی مقصد کے لیے کہ اللہ کو یاد کریں اور جب جدا ہوں تو کسی نیکی کے مقصد کو پورا کریں۔

(v) تنہائی میں اللہ کو یاد کر کے اس کے خوف سے اور اپنی کوتاہیوں پر نظر کر کے آدمی کے آنسو نکل پڑیں تو یہ بڑا مقام ہے۔ ہما شما کو یہ کہاں حاصل!

(vi) پاک دامنی کی یہ اعلیٰ مثال حضرت یوسف علیہ السلام نے قائم کی۔ یہ مشکل مقام بھی ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے۔

(vii) صدقہ کرنے میں جس قدر اخفا ممکن ہو کرنا چاہیے۔ یہ ممکن تو نہیں کہ ایک ہاتھ کا دیا دوسرے ہاتھ کو معلوم نہ ہو۔ مقصد یہ ہے کہ اس کا چرچا نہ ہو۔ لوگوں کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ دکھاوے کے لیے نہیں بلکہ اللہ کے لیے دے۔ آج کل کی طرح نہیں کہ آٹا بانٹتے ہیں یا چیک تقسیم کرتے ہیں تو فوٹو کھنچوانے کے لیے۔

لیکن اس روایت کے ساتھ ایک آفت یہ لگی ہوئی ہے کہ کتنی روایتوں میں سات کا عدد آیا ہے لیکن تفصیل کسی میں کچھ اور کسی میں کچھ اور ہے۔ اس سے اطمینان قلب چھن جاتا ہے کہ معلوم نہیں کون سا بیان صحیح ہے۔ اسی طرح بعض روایتوں میں یہ اشخاص دس تک ہیں اور بعض میں چودہ پندرہ تک تعداد چلی گئی ہے۔ میرے خیال میں راوی حضرات نے معنی کے لحاظ سے اس کو ادا کیا ہوگا۔ بعد میں ان کو کچھ باتیں معلوم ہوئیں لیکن ان کو اس روایت میں یہ عمل ملا نہیں تو انہوں نے از خود اس کو ٹھونس دیا۔ اس لیے اگر معنی کا اشتراک ہو تو آپ اس عمل کو لے سکتے ہیں۔ چونکہ یہ روایت بخاری اور مسلم دونوں میں ہے تو اس کو ترجیح دیجئے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ سُهَيْلِ بْنِ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: إِذَا أَحَبَّ اللَّهُ الْعَبْدَ قَالَ لِجِبْرِيلَ قَدْ أَحْبَبْتُ فُلَانًا فَأَحِبَّهُ فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ ثُمَّ يُنَادِي فِي أَهْلِ السَّمَاءِ إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَبَّ فُلَانًا فَأَحِبُّوهُ فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ يُوضَعُ لَهُ الْقَبُولُ فِي الْأَرْضِ، وَ إِذَا أَبْغَضَ اللَّهُ الْعَبْدَ، قَالَ مَالِكٌ: لَا أَحْسِبُهُ إِلَّا أَنَّهُ قَالَ فِي الْبُغْضِ مِثْلَ ذَالِكَ۔

﴿ حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرنے لگتا ہے تو جبریلؑ سے فرماتا ہے کہ میں اس بندے سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو تو جبریل بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر وہ آسمان والوں میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں بندے کو محبوب بنالیا ہے تو اے آسمان والو تم بھی اس سے محبت کرو تو وہ بھی محبت کرنے

لگتے ہیں۔ پھر اس کے لیے ساری زمین میں حسن قبول پھیلا دیا جاتا ہے تو سب اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اور جب اللہ کسی بندے پر غضبناک ہو تو مالک کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غضب کے سلسلے میں بھی ایسے ہی فرمایا۔"

وضاحت :

کیا اس روایت سے یہ بات نکلتی ہے کہ جن لوگوں کو دنیا میں حسن قبول حاصل ہوتا ہے وہ حضرت جبریلؑ کی منادی سے ہوتا ہے؟ تو آج کل جو مقبولیت اداکاروں اور کرکٹرز کو حاصل ہے کیا اس کو کوئی تعلق جبریل کی منادی سے ہے۔ بالکل کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو شیطان کی منادی ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں تو ان کے لیے آسمان میں بھی منادی ہوتی ہے اور زمین میں بھی۔ ظاہر ہے کہ یہ منادی صرف انہی کے لیے ہوگی جو بندہ فی اللہ محبت کرتے ہیں۔ ہر ایرے غیرے کے لیے نہیں ہوگی۔ ان کے لیے اس منادی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے نیک بندوں میں ان کے لیے محبت پیدا ہو جاتی ہے اور اگرچہ وہ زمین میں تھوڑے ہیں باقی سب شیطان کی ذریت ہے تو صرف انہی تھوڑے بندوں کے اندر ان کے لیے محبت پیدا ہوگی جو اللہ سے محبت کرتے ہیں، اور وہ تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بات ہوتی ضرور ہے۔ اگر ان کے زمانے میں نیک بندے کم ہیں تو صرف انہی کے اندر ہوگی۔ لیکن اللہ تعالیٰ اگر چاہے گا تو تاریخ میں ان کا نام روشن رہے گا اور اللہ کے نیک بندے ان سے محبت کریں گے۔ اس کی مثال اصحاب کہف ہیں۔ ان کے زمانہ کے لوگوں نے ان کو قتل کرنے کی دھمکی دی تو وہ غار میں جا کر چھپ گئے۔ وہاں ان پر نیند طاری ہو گئی۔ عرصہ دراز کے بعد آنکھ اس وقت کھلی جب زمانہ بدل گیا اور دینی انقلاب آ گیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ جن کو سنگسار کرنے کی دھمکی دی گئی تھی لوگوں کے درمیان ان کی یادگار تعمیر کرنے پر جھگڑا شروع ہو گیا۔

حضرت ابراہیمؑ کے لیے لسان صدق علیا یعنی دائمی شہرت کا جو ذکر ہے وہ ان کے اپنے زمانے میں تو نہ تھی، اگرچہ منادی تو جبریلؑ نے اس زمانے میں بھی کی ہوگی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو قبول ان کو حاصل ہوا اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ دنیا کے تمام بڑے خاندان اور قومیں ان کی کلمہ گو ہیں۔ لہذا میرے نزدیک یہ منادی

ضرور ہوتی ہے لیکن یہ صرف اللہ کے نیک بندوں کے لیے ہوتی ہے- گویوں، کھلاڑیوں، سیاست دانوں کی شہرت اس سے الگ ہے- اس کا تعلق شیطان کی منادی اور ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کی برکات سے ہے- پھر جبریلؑ کی منادی کا اثر بھی نیک بندوں ہی پر ہوتا ہے اور اس کے لیے زمانہ کی کوئی قید نہیں-

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اللہ کی محبت کی بات تو درست ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ کسی سے غضب رکھتا ہے تو کیا ہو گا- ان کا خیال ہے کہ بغض کے بارے میں بھی یہی ہو گا- گویا اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میں اس بندے سے نفرت کرتا ہوں تم آسمان میں منادی کر دو- لیکن یہ الفاظ روایت میں نہیں ہیں- مجھے امام صاحب کی اس رائے سے اختلاف ہے- یہ دونوں باتیں متوازی نہیں ہیں اور ہونا بھی نہیں چاہیے- اسی وجہ سے یہ الفاظ روایت میں نہیں ہیں-

❑ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي حَازِمِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ أَبِي إِدْرِيسَ الْخَوْلَانِيِّ أَنَّهُ قَالَ: دَخَلْتُ مَسْجِدَ دِمَشْقَ فَإِذَا فَتًى شَابٌّ بَرَّاقُ الثَّنَايَا، وَ إِذَا النَّاسُ مَعَهُ إِذَا اخْتَلَفُوا فِي شَيْءٍ أَسْنَدُوا إِلَيْهِ وَ صَدَرُوا عَنْ قَوْلِهِ فَسَأَلْتُ عَنْهُ فَقِيلَ هَذَا مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ، فَلَمَّا كَانَ الْغَدُ هَجَّرْتُ فَوَجَدْتُهُ قَدْ سَبَقَنِي بِالتَّهْجِيرِ وَ وَجَدْتُهُ يُصَلِّي، قَالَ: فَانْتَظَرْتُهُ حَتَّى قَضَى صَلَاتَهُ ثُمَّ جِئْتُهُ مِنْ قِبَلِ وَجْهِهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ ثُمَّ قُلْتُ وَاللَّهِ إِنِّي لَأُحِبُّكَ لِلَّهِ، فَقَالَ آللَّهِ، فَقُلْتُ آللَّهِ، فَقَالَ آللَّهِ، فَقُلْتُ آللَّهِ، فَقَالَ آللَّهِ، فَقُلْتُ آللَّهِ، قَالَ فَأَخَذَ بِحُبْوَةِ رِدَائِي فَجَبَذَنِي إِلَيْهِ وَ قَالَ: أَبْشِرْ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ قَالَ اللَّهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى: وَجَبَتْ مَحَبَّتِي لِلْمُتَحَابِّينَ فِيَّ وَالْمُتَجَالِسِينَ فِيَّ، وَالْمُتَزَاوِرِينَ فِيَّ، وَالْمُتَبَاذِلِينَ فِيَّ-

﴿ابو ادریس خولانی کہتے ہیں کہ میں مسجد دمشق میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نوجوان چمکتے دانتوں والا (یعنی ہنس مکھ) ہے- لوگ اس کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں- جب کسی معاملہ میں بحث پیدا ہوتی ہے تو سب اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس کی بات سن کر مطمئن لوٹتے ہیں- میں نے پوچھا یہ کون حضرت ہیں، تو بتایا گیا کہ یہ معاذ بن جبل ہیں- جب دوسرا دن ہوا تو میں صبح جلدی مسجد

میں چلا گیا تو دیکھا کہ وہ مجھ سے بھی پہلے پہنچے ہوئے ہیں- اور میں نے ان کو نماز پڑھتے پایا- میں نے انتظار کیا یہاں تک کہ انہوں نے اپنی نماز پوری کی- میں نے ان کے آگے سے ہو کر ان کو سلام کیا- پھر میں نے عرض کی کہ خدا کی قسم، میں آپ سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں- تو انہوں نے کہا کیا اللہ کے لیے، تو میں نے کہا کہ اللہ کے لیے- انہوں نے کہا کیا اللہ کے لیے؟ میں نے کہا کہ اللہ کے لیے- انہوں نے کہا کیا اللہ کے لیے؟ میں نے کہا کہ اللہ کے لیے- کہتے ہیں کہ انہوں نے میری چادر کا کونہ پکڑ لیا اور کھینچا اپنی طرف اور کہا کہ بشارت حاصل کرو کہ رسول اللہ ﷺ کو میں نے فرماتے سنا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا کہ میری محبت ان لوگوں کے لیے واجب ہے کہ جو میری خاطر محبت کرنے والے، میری خاطر مل کر بیٹھنے والے، میری خاطر زیارت کرنے والے اور میری خاطر انفاق کرنے والے ہیں-﴾

وضاحت:

یہ حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت ہے- اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک دوسرے آدمی نے ان سے نقل کیا- اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ اس نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے کہ میں ان سے ضرور محبت کرتا ہوں جو میری خاطر آپس میں محبت کرتے ہیں، تو یہ بہت اونچا درجہ ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں- لیکن فی زمانہ للہ فی اللہ محبت کا وجود بہت ہی شاذ ہے-

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ الْقَصْدُ وَ التُّؤَدَةُ وَ حُسْنُ السَّمْتِ جُزْءٌ مِنْ خَمْسَةٍ وَ عِشْرِينَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ

﴿امام مالک کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات عبداللہ بن عباسؓ سے پہنچی ہے کہ میانہ روی، سنجیدگی اور خوش سلیقگی نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزو ہے-﴾

وضاحت:

نبوت کے جو مدارج اور خصائص ہیں وہ گویا پچیس ہیں- ان میں ایک جزو کا ذکر یہاں ہے اور اس کا تمام تر

تعلق انسان کے ظاہری اوصاف سے ہے۔ یعنی حسن کردار، خوش مزاجی، سنجیدگی، میانہ روی ہونی چاہیے۔ گویا ہر چیز میں اعتدال ہونا چاہیے۔ کپڑا پہننے میں بھی سلیقہ ہو اور داڑھی رکھنے میں بھی سلیقہ۔ ٹوپی پہننے میں اور تہمد باندھنے میں بھی سلیقہ ہو، گویا ہر چیز سلیقے سے ہونی چاہیے۔ دین دار آدمی کو بے ہنگم نہیں ہونا چاہیے۔ اوپر ایک روایت گزری ہے کہ نبی ﷺ نے الجھے ہوئے بالوں والے ایک شخص کو جو مسجد میں آیا تھا واپس جانے کے لیے کہا کہ جا کر پہلے اپنی حالت درست کرے، پھر مسجد میں آئے۔

آنحضرت ﷺ کے متعلق تو معلوم ہے کہ کھانے پینے میں، اٹھنے بیٹھنے میں، چلنے پھرنے میں، ہر چیز میں بہترین مظہر کے پیکر تھے۔ موجودہ زمانہ میں یہ ہے کہ اس میں تہذیب کے آداب مسجد کے آداب سے بھی زیادہ ہیں۔ دین کے آداب میں اتنی شدت نہیں جتنی ان لوگوں کے خود ساختہ آداب میں پائی جاتی ہے۔ لیکن کبھی ان کے ساتھ بیٹھیں تو ان کی پھکڑ بازی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے یہ شریفانہ آداب کے بالکل خلاف ہے۔ ان کا لباس بھی (خواہ عورتوں کا ہو یا مردوں کا) تہذیب اور شرافت دونوں کے لحاظ سے نہایت بد تمیز ہوتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خوش سلیقگی اور چیز ہے اور ٹھاٹھ باٹھ بالکل دوسری چیز۔ ٹھاٹھ باٹھ سے ہمیں منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ چیز تکبر پیدا کرتی ہے، اور تکبر شیطان کی صفت ہے۔

مَا جَاءَ فِي الرُّؤْيَا

خواب کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ إِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ الْأَنْصَارِيِّ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اَلرُّؤْيَا الْحَسَنَةُ مِنَ الرَّجُلِ الصَّالِحِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَّ أَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ

﴿انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اچھے خواب، جبکہ وہ ایک نیک آدمی نے دیکھے ہوں، نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہوتے ہیں۔﴾

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ بِمِثْلِ ذٰلِكَ۔

﴿حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح فرمایا-﴾

وضاحت :

اس روایت میں نبوت سے مراد علم نبوت ہے- جہاں تک نبوت کا تعلق ہے اس کا کوئی حصہ اب باقی نہیں رہا- لیکن علم نبوت میں سے صرف وحی منقطع ہوئی ہے- یہ علم دوسرے ذرائع مثلاً قرآن مجید اور سنت رسول اللہ کے ذریعہ سے باقی ہے- اس کا ایک ذریعہ انبیاء کے خواب بھی ہوتے ہیں- لہذا اس روایت کی رو سے علم نبوت کا فیضان نیک آدمی کے خواب میں بھی ظاہر ہوتا ہے-

خواب انبیاء کے علم کا ایک معروف ذریعہ ہیں، بالخصوص وہ معاملات کہ جن کو عملاً دکھانا ہو وہ انبیاء کو الفاظ کی بجائے رویا میں دکھائے جاتے ہیں تاکہ پورا نقشہ ان کے سامنے آجائے- انبیاء کے بڑے بڑے رویا میں مثلاً حضرت ابراہیم کا وہ خواب ہے جو حضرت اسمٰعیل کے ذبح کے متعلق تھا- اسی طرح آنحضرت ﷺ کو جنگ بدر کا سارا نقشہ پہلے ہی دکھا دیا گیا تھا- قرآن مجید میں اسراء کے واقعہ کو بھی رویا سے ہی تعبیر کیا گیا ہے- علم نبوت ایک سمندر ہے- اس میں ایک نیک آدمی کا اچھا خواب کتنا حصہ ہوتا ہے، اس کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا کہ یہ علم نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہوتا ہے- ہم اس اشارہ کو سمجھ تو سکتے ہیں لیکن اس نسبت کی حقیقت نہیں جان سکتے- اس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے- ہم علم غیب نہیں جانتے اور خواب کی تعبیر قطعیت کے ساتھ کرنا ممکن نہیں ہوتا- خوابوں کی تعبیر کا علم انبیاء کو خاص طور پر عطا کیا جاتا ہے- ہمارے لیے صرف یہ ہے کہ ہم اچھے خواب سے بشارت حاصل کر سکتے ہیں- قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہمارے خواب پریشان خواب بھی ہو سکتے ہیں-

اہل علم جب خواب دیکھیں تو وہ بھی ان سے بشارت ہی حاصل کریں- ان پر نازنہ کریں بلکہ خوابوں پر زیادہ اعتماد بھی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ہم علم غیب کو نہیں جانتے-

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ اِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِی طَلْحَةَ عَنْ زُفَرَ بْنِ صَعْصَعَةَ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ اِذَا انْصَرَفَ مِنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ یَقُوْلُ هَلْ رَاٰی اَحَدٌ مِنْكُمُ اللَّیْلَةَ رُؤْیَا وَ یَقُوْلُ لَیْسَ یَبْقٰی بَعْدِیْ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب صبح کی نماز سے فارغ ہوتے تو پوچھتے کہ کیا تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے اور یہ بھی فرماتے کہ علم نبوت میں سے میرے بعد رویائے صالحہ کے سوا اور کوئی چیز باقی نہیں رہی-﴾

وضاحت :

چونکہ خواب علم نبوت کا ایک ذریعہ تھا اس لیے آپؐ صحابہ سے نماز فجر کے بعد پوچھتے کہ کیا کسی نے کوئی خواب دیکھا-اگر کوئی شخص اپنا خواب بیان کرتا تو آپ اس کی تعبیر بیان فرماتے- تعبیر کا علم بھی علوم نبوت میں سے ہے اس لیے آنحضرتؐ کی بیان کردہ تعبیر قابل اعتماد ہوتی-لیکن اب یہ معاملہ بہت مشکل ہو گیا ہے- تعبیر میں اختلاف ہوتا ہے-اور یہ بھی معلوم ہے کہ صحابہؓ نے رویا کے ذریعے بڑے بڑے مسائل حل کیے ہیں-اذان کا مسئلہ رویا ہی سے حل ہوا-اذان کے الفاظ تو الہامی ہیں لیکن یہ رویا کے ذریعے ہی سے صحابہ کرام نے دیکھے اور اس طرح یہ ہم تک پہنچے-

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ ابْنِ يَسَارٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَنْ يَبْقَى بَعْدِي مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ ، فَقَالُوا وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الرَّجُلُ الصَّالِحُ أَوْ تُرَى لَهُ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَ أَرْبَعِينَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ

﴿عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد علم نبوت میں سے مبشرات کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہے گی-لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ وہ مبشرات کیا ہیں-آپ نے فرمایا یہ وہ اچھے خواب ہیں جو ایک نیک آدمی دیکھے یا کوئی دوسرا اس نیک آدمی کے بارے میں دیکھے-یہ نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے-﴾

وضاحت :

رویائے صالحہ جو ایک نیک آدمی اپنے متعلق دیکھے یا دوسرے آدمی کے لیے دیکھے تو اس سے وہ اپنے لیے یا دوسرے شخص کے لیے خوشخبری حاصل کر سکتا ہے-وہ دوسرے آدمی سے کہہ سکتا ہے کہ مبارک ہو، میں نے آپ

کے متعلق یہ نیک خواب دیکھا، آپ بھی اس سے خوشی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن کسی خواب کے اعتماد پر کوئی دعوے کر دینا ایک غلط کام ہے۔ باقی رہ گیا اچھے خوابوں کا علم نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہونا تو اس سے ہم اس تفاوت کو سمجھ سکتے ہیں جو نبوت اور اچھے خواب کی بشارت میں ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا ہمارے بس میں نہیں۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ أَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ أَنَّهُ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا قَتَادَةَ بْنَ رِبْعِي يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ مِنَ اللّٰهِ وَالْحُلْمُ مِنَ الشَّيْطَانِ فَإِذَا رَأَى أَحَدُكُمُ الشَّيْءَ يَكْرَهُهُ فَلْيَنْفُثْ عَنْ يَسَارِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ إِذَا اسْتَيْقَظَ وَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّهَا فَإِنَّهَا لَنْ تَضُرَّهُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ ، فَقَالَ أَبُو سَلَمَةَ إِنْ كُنْتُ لَأَرَى الرُّؤْيَا هِيَ أَثْقَلُ عَلَيَّ مِنَ الْجَبَلِ ، فَلَمَّا سَمِعْتُ هٰذَا الْحَدِيثَ فَمَا كُنْتُ أُبَالِيهَا۔

﴿ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے قتادہ بن ربعی سے سنا، وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ اچھے خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور خواب پریشان شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں۔ تو جب تم میں سے کوئی ایسا خواب دیکھے جو ناگوار محسوس ہو تو اس کو چاہیے کہ جب اس کی آنکھ کھلے تو اس کے شر سے تین مرتبہ اللہ کی پناہ مانگ کر اپنی بائیں طرف پھونکے تو انشاء اللہ اس خواب کا کچھ نقصان نہ ہوگا۔ ابو سلمہ کہتے ہیں کہ پہلے میں کوئی خواب دیکھتا جو مجھ پر پہاڑ سے بھی بھاری ہوتا لیکن جب سے میں نے یہ حدیث سنی ہے تو میں ایسے خواب کی کچھ پروا نہیں کرتا۔﴾

وضاحت:

یہ روایت بخاری میں بھی ہے اور مسلم میں بھی۔ اللہ کی پناہ مانگنے کی بہترین دعا تو قرآن مجید کی آخری دو سورتیں ہیں لیکن نبی ﷺ سے اور ماثور کلمات بھی ہیں وہ آپ پڑھ سکتے ہیں۔ یہ دعائیں شیطان کو تیر کے طریقے سے لگتی ہیں اور وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ابو سلمہ کا اپنا اثر یہ ہے کہ وہ اگر پہاڑ سے بھی بھاری خواب دیکھتے تو اس حدیث پر عمل کر کے بالکل بے خوف ہو جاتے تھے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ فِي هٰذِهِ الْآيَةِ: لَهُمُ

الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِى الْآخِرَةِ. قَالَ هِىَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الرَّجُلُ الصَّالِحُ اَوْ تُرٰى لَهٗ

﴿ہشام بن عروہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اس آیت "ان کے لیے بشارت ہے اس دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں" کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ رویائے صالحہ ہے جو ایک شخص دیکھے یا اس کے لیے کوئی دوسرا دیکھے۔﴾

وضاحت:

رویائے صالحہ اس آیت کے مطلب میں داخل کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس آیت کا موقع و محل بہت عظیم ہے۔ لہذا عروہ کا یہ قول اس آیت کی تاویل نہیں ہے بلکہ اس آیت کے عظیم مطالب میں سے ایک ذرہ قلیل وہ بھی ہے جو عروہ نے مراد لیا ہے۔ سورہ یونس کی آیت نمبر ۶۴ اور ضمیر ھم کا مرجع آیت نمبر ۶۲ و آیت ۶۳ میں دیکھئے تو اس کا موقع و محل واضح ہو جاتا ہے۔

مَاجَاءَ فِى النَّرْدِ

نرد کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِى عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُوسَى بْنِ مَيْسَرَةَ عَنْ سَعِيدِ بْنِ اَبِى هِنْدٍ عَنْ اَبِى مُوسَى الْاَشْعَرِىِّ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ لَعِبَ بِالنَّرْدِ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَ رَسُولَهٗ

﴿حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ نرد کھیلتے ہیں وہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتے ہیں۔﴾

وضاحت:

نرد بساط، مہروں اور پانسے کے دانہ پر مشتمل کھیل ہے جسے دو آدمی میز یا تخت پر کھیلتے ہیں۔ اس میں کامیابی یا ناکامی کا انحصار قسمت پر ہوتا ہے۔ لہذا اس کے ساتھ جوا بھی وابستہ ہو گیا ہے۔ یہ کھیل ایران کے بادشاہ اردشیر کی

ایجاد ہے۔ وہیں سے یہ کھیل عرب میں پہنچا۔ نبی ﷺ نے اس کھیل کو اللہ اور رسول کی نافرمانی قرار دیا ہے۔

بے کاری کے دور میں لوگ وقت ضائع کرنے کے لیے اس طرح کے کھیل ایجاد کر لیتے ہیں اور ان سے شیطان کے بہت سے راستے نکلتے ہیں۔ نرد کی طرح کے کئی کھیل لوگوں میں مقبول ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ شیطان نے وقت ضائع کرنے کے ان سے زیادہ کارگر نسخے ایجاد نہیں کیے۔ اور اگر اس سے بھی زیادہ لغو کام کوئی ایجاد کیا ہے تو وہ کرکٹ کا کھیل ہے۔

انسان کے پاس وقت ایک بہت بڑی دولت ہے۔ جس نے اس کو ضائع کر دیا تو اس نے بہت کچھ ضائع کر دیا۔ سب انبیاء کی تعلیم یہی ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ وہ مومن کامیاب ہو گئے جو لغویات سے بچتے ہیں۔ لغو سے مراد ہر وہ چیز ہے جو آدمی کو اس کے مقصد حیات سے غافل کر دے۔ نرد، شطرنج، تاش اور کرکٹ سے زیادہ لغو کام اور کیا ہو گا۔

❑ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ أَبِي عَلْقَمَةَ عَنْ أُمِّهِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ بَلَغَهَا أَنَّ أَهْلَ بَيْتٍ فِي دَارِهَا كَانُوا سُكَّانًا فِيهَا وَ عِنْدَهُمْ نَرْدٌ. فَأَرْسَلَتْ إِلَيْهِمْ لَئِنْ لَمْ تُخْرِجُوهَا لَأُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ دَارِي وَأَنْكَرَتْ ذَلِكَ عَلَيْهِمْ.

﴿حضرت عائشہؓ کے متعلق یہ روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ ان کے گھر میں ایک خاندان کے جو لوگ رہ رہے ہیں ان کے پاس نرد ہے تو انہوں نے ان کو پیغام بھیجا کہ اگر تم لوگ نرد کے شیطان کو نہ نکالو گے تو میں تم کو اپنے گھر سے نکال دوں گی اور اس کو انہوں نے بہت ناگوار جانا۔﴾

وضاحت :

حضرت عائشہؓ لغویات کے گناہ ہونے سے آگاہ تھیں۔ انہوں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ ان کے مکان میں لغویات کا کاروبار ہوتا رہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے مکینوں کو پیغام بھیجا کہ یا تو وہ نرد کو گھر سے باہر پھینکیں یا پھر مکان خالی کر دیں۔ موجودہ کرایہ داری قانون کے تحت تو آپ کچھ نہیں کر سکتے بلکہ اس سے بڑے بڑے جرائم بھی کریں تب بھی کچھ نہیں کر سکتے اور آج کل شطرنج، تاش اور کرکٹ تو کسی طور پر جرائم میں شامل نہیں بلکہ اکثریت کا

مشغلہ ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ہمیں ان لغویات کی سنگینی کا مطلق احساس نہیں ہے۔

□ حدَّثني عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّهُ كَانَ اِذَا وَجَدَ اَحَدًا مِنْ اَهْلِهِ يَلْعَبُ بِالنَّرْدِ ضَرَبَهُ وَ كَسَرَهَا. قَالَ يَحْيٰى وَ سَمِعْتُ مَالِكًا يَقُوْلُ: لَا خَيْرَ فِى الشَّطْرَنْجِ وَ كَرِهَهَا وَ سَمِعْتُهُ يَكْرَهُ اللَّعِبَ بِهَا وَ بِغَيْرِهَا مِنَ الْبَاطِلِ وَ يَتْلُوْ هٰذِهِ الْآيَةَ: فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ.

﴿نافع رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ ان کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے اہل و عیال میں سے کسی کو نرد کھیلتے دیکھتے تو اس کو مارتے اور نرد کو بھی توڑ دیتے تھے۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ انہوں نے امام مالک کا یہ فتویٰ سنا ہے کہ شطرنج میں کوئی خیر نہیں اور مالک اس کو بہت مکروہ کہتے اور وہ خود اس سے یا اس کے سوا کسی اور چیز سے کھیلنا باطل سمجھتے تھے اور یہ آیت پڑھتے تھے کہ "حق کے بعد سوائے ضلالت کے اور کیا ہے"۔﴾

وضاحت :

آج کل شطرنج کے ساتھ ایک فلسفہ بھی لگا دیا گیا ہے کہ چونکہ شطرنج کی بساط پر جنگ لڑی جاتی ہے جس میں منصوبہ بندی اور تدبیر کو بڑا دخل ہوتا ہے اس لیے یہ کھیل بہت ذہانت پیدا کرتا ہے۔ ذہانت اگر وقت کو ضائع کرنے کا نام ہے تو ٹھیک ہے ورنہ حماقت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب شطرنج کی بازی ہو رہی ہو تو گھنٹوں کے لیے بڑے سے بڑے نقصان اور بڑے سے بڑے خطرے سے آدمی بے پروا ہو جاتا ہے اور بڑے سے بڑے خیر کے لیے بھی حوصلہ نہیں کرتا۔ اس سے بڑھ کر خطرناک کیا چیز ہو سکتی ہے۔

شطرنج کو امام مالک کا مکروہ جاننا حرمت کے قریب قریب ہے اس لیے کہ یہ علما اگر تعریف کریں تو کہتے ہیں کہ "احب الی" مجھے یہ پسند ہے اور اگر خلاف ہوں تو کہتے ہیں "اکرہ ذالک" مجھے یہ ناگوار محسوس ہوتا ہے۔ ہمارے مولوی لوگوں کی طرح تکفیر و تحریم پر نہیں آتے۔ جو آیت امام صاحب نے نقل کی ہے اس سے وہ بات بھی نکلتی ہے جو امام صاحب کہنا چاہتے ہیں۔ اس کھیل کے ضلالت ہونے میں کیا شبہ ہے۔

اَلْعَمَلُ فِی السَّلَامِ

سلام کرنے کا طریقہ

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: يُسَلِّمُ الرَّاكِبُ عَلَى الْمَاشِي، وَ اِذَا سَلَّمَ مِنَ الْقَوْمِ اَحَدٌ اَجْزَاَ عَنْهُمْ.

﴿زید بن اسلم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سوار کو چاہیے کہ وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے اور جب گروہ میں سے کسی ایک نے سلام کر دیا تو وہ سارے گروہ کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔﴾

وضاحت:

اس روایت کے دو جزو ہیں۔ پہلا تو یہ ہے کہ اگر آپ گھوڑے پر یا موٹر پر سوار ہوں تو آپ کو سلام میں پہل کرنی چاہیے۔ رعونت آپ پر سوار نہ ہو کہ میں پیدل چلنے والے کو پہلے سلام کیوں کروں۔ اور واقعی سلام کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ بس ہاتھ اٹھا دیا بلکہ جہاں بھی موقع ہو سلام کرے۔ اس لیے کہ جو لوگ سوار ہوتے ہیں وہ اس خبط میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ میرے جیسا اس روئے زمین پر کوئی نہیں۔ اس خناس کو نکالنے کے لیے یہ بہترین نسخہ ہے کہ آدمی دوسروں کو سلام کر دے۔ اس سے طبیعت میں تواضع اور فروتنی پیدا ہو جائے گی۔ آدمی کے استکبار کو ضرب لگتی ہے۔ اس معاملے میں شرمیلا پن بھی نہیں ہونا چاہیے۔

دوسری بات آنحضرت ﷺ نے یہ فرمائی کہ گروہ میں سے ایک کا سلام کرنا سب کے لیے کافی ہوگا اور اگر جواب دینے والوں میں سے کسی ایک نے جواب دے دیا تو وہ بھی سب کی طرف سے ہو جائے گا۔ یہ بھی بڑی عمدہ بات ہے کہ سلام کرنے کے لیے بھی ایک آدمی کو امام بنا لیا جائے۔ زندگی امام کے بغیر کبھی نہیں گزرنی چاہیے۔ اسی طرح مصافحہ بھی اگر ایک آدمی کرے تو سب کے لیے کافی ہوگا۔

یہ روایت اگرچہ مرسل ہے لیکن معنی کے لحاظ سے ٹھیک ہے کیونکہ ایسی بات نبی ﷺ ہی فرما سکتے ہیں۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ وَهْبِ بْنِ كَيْسَانَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَطَاءٍ اَنَّهُ قَالَ: كُنْتُ

جَالِسًا عِنْدَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ فَدَخَلَ عَلَيْهِ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْيَمَنِ فَقَالَ : اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهٗ، ثُمَّ زَادَ شَيْئًا مَعَ ذَالِكَ اَيْضًا. قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَهُوَ يَوْمَئِذٍ قَدْ ذَهَبَ بَصَرُهٗ مَنْ هٰذَا؟ قَالُو هٰذَا الْيَمَانِيُّ الَّذِي يَغْشَاكَ فَعَرَّفُوهُ اِيَّاهُ. قَالَ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اِنَّ السَّلَامَ انْتَهٰى اِلَى الْبَرَكَةِ. قَالَ يَحْيٰى سُئِلَ مَالِكٌ هَلْ يُسَلَّمُ عَلَى الْمَرْاَةِ، فَقَالَ اَمَّا الْمُتَجَالَّةُ فَلَا اَكْرَهُ ذَالِكَ وَ اَمَّا الشَّابَّةُ فَلَا اُحِبُّ ذَالِكَ.

﴿ محمد بن عطاء سے روایت ہے کہ میں عبداللہ بن عباسؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اہل یمن میں سے ایک آدمی آیا تو اس نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا۔ پھر اس کے ساتھ کچھ اور الفاظ بھی بڑھا دیے۔ ابن عباس اس زمانہ میں نابینا ہو چکے تھے۔ انہوں نے پوچھا یہ کون ہے تو لوگوں نے کہا کہ ایک یمنی ہیں جو آپ سے ملنے کو آئے ہیں۔ ان کا تعارف کرایا گیا تو ابن عباس نے کہا کہ سلام کی آخری حد برکت تک ہے۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالک سے پوچھا گیا کہ کیا عورت کو سلام کرنا چاہیے تو انہوں نے کہا کہ بڑی بوڑھی کو کر دیا جائے تو میں اسے مکروہ نہیں سمجھتا لیکن جوان عورت کو سلام کرنا میں پسند نہیں کرتا۔ ﴾

وضاحت :

حضرت ابن عباسؓ کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہہ دیا تو اس پر مزید کسی اضافہ کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ سلامتی، رحمت اور برکت کی دعا کے بعد اور کیا چاہیے۔ میرے نزدیک السلام علیکم خود ہی ایک مکمل دعا ہے۔ اللہ رب العزت اہل جنت کے لیے یہی لفظ استعمال کریں گے۔ نبی ﷺ انہی لفظوں سے مسلمانوں کو سلام کرتے تھے۔ اس دور میں اگر کسی کو خالی السلام علیکم لکھیں یا کہیں یا جواب میں صرف وعلیکم السلام کہیں تو اسے بالکل ناکافی سمجھا جاتا ہے۔

عورتوں کو سلام کرنے کے بارے میں امام مالکؒ کا فتویٰ ٹھیک ہے۔ لیکن میرے نزدیک جوان عورت کو بھی سلام کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ جواب نہ دینا چاہے گی تو نہیں دے گی یا اشارہ دے گی۔ بڑی بوڑھیوں کو سلام کرنے میں بالکل کچھ حرج نہیں۔ یہ تو کسی کو دعا دینا ہے۔

مَاجَاءَ فِي السَّلَامِ عَلَى الْيَهُودِيِّ وَالنَّصْرَانِيِّ

کسی یہودی اور نصرانی کو سلام کرنے کے بارے میں

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّ الْيَهُودَ إِذَا سَلَّمَ عَلَيْكُمْ أَحَدُهُمْ فَإِنَّمَا يَقُولُ السَّامُ عَلَيْكُمْ ، فَقُلْ عَلَيْكَ . قَالَ يَحْيَى وَ سُئِلَ مَالِكٌ عَمَّنْ سَلَّمَ عَلَى الْيَهُودِيِّ أَوِ النَّصْرَانِيِّ هَلْ يَسْتَقِيلُهُ ذَالِكَ؟ فَقَالَ لَا.

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہود میں سے جب کوئی تم کو سلام کرتا ہے تو وہ کہتا ہے السام علیکم۔ تم جواب میں صرف 'علیک' کہہ دیا کرو۔﴾

یحیٰ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ سے فتویٰ پوچھا گیا کہ جو شخص یہودی یا نصرانی کو سلام کہے تو کیا اس کو ایسا کہنا چاہیے۔ تو انہوں نے کہا کہ نہیں۔

وضاحت :

مدینہ کے شریر یہودیوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ جب مسلمانوں کو سلام کرتے تو بظاہر وہ مسلمانوں کے طریقہ پر السلام علیکم کہتے لیکن الفاظ ادا کرنے میں سلام میں سے حرف لام نہ بولتے بلکہ السام علیکم کہتے۔ سام کا لفظ موت کے معنی میں آتا ہے۔ گویا یہود سلامتی کی دعا دینے کے بجائے سلام کو بد دعا کا کلمہ بنا دیتے۔ ایسے شریروں کے حوالے سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم جواب میں محض 'علیکم' کہہ دیا کرو تاکہ یہ بد دعا یہود ہی پر لوٹ جائے۔

اس روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ غیر مسلموں کے ساتھ سلام کے بارے میں کیا کلیہ ہے۔ سلام کے بہت سے پہلو ہیں۔ سلام اجازت طلب کرنے کے لیے بھی کیا جاتا ہے، سلام کسی پر محض اعتماد کے اظہار کے لیے بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنے ہی آدمی ہیں۔ اور سلام خیر مقدم کے لیے بھی ہے۔ خیر مقدم مسلم اور غیر مسلم دونوں کا ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ اگر تم کو کوئی سلام کے تو نہ کہو کہ "لست مومنا" (تم مومن نہیں ہو) حالانکہ یہ ممکن ہے کہ آپ نہ جانتے ہوں اور وہ کافر ہی ہو۔ وہ جو کچھ بھی ہو اگر اس نے سلام کیا ہے تو اس کا جواب دینا چاہیے۔ جواب دینے سے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا جو مذہب ہے میرے نزدیک وہ مضبوط ہے

یعنی سلام کا جواب دینا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ "ردوھا" یعنی سلام کا جواب ضرور دو۔ اور یہ برابر سرابر ہونا ضروری ہے۔

ایک اسلامی ملک میں کچھ لوگ ذمی بھی ہوں گے اور اہل صلح یا معاہد بھی ہوں گے۔ اگر آپ کو وہ سلام کہیں تو کیا آپ منہ پھیر لیں گے۔ یہ کوئی مہذب طریقہ تو نہیں۔ سلام کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم اور آپ ایک ہیں، ایک ہی ملک کے شہری ہیں، دوست ہیں دشمن نہیں ہیں۔ باہر کے لوگوں سے جب ملیں گے تو کیا کہیں گے کہ ہم سلام نہیں کرتے؟ منہ بنائے رہتے ہیں۔ آپ خیر مقدم کے لیے انگریزی میں گڈ مارننگ کہہ دیں گے لیکن فائدہ کیا ہوگا۔ سلام تو وہ بھی ہوگا۔ سلام میں دعا کا پہلو ہے۔ عربوں میں بھی پہلے وہی تھا جو انگریزی میں ہے۔ اسلام نے آ کر یہ تبدیلی کی کہ اس میں برکت کا اضافہ کر دیا۔ لہذا میرے نزدیک آپ سب کو سلام کر سکتے ہیں۔ یہ مشہور تعارف ہے، اظہار اعتماد ہے اور آپ کو اطمینان دلاتا ہے کہ ہم اور آپ دوست ہیں دشمن نہیں۔

جَامِعُ السَّلَامِ

سلام کے بارے میں جامع باب

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ إِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِی طَلْحَةَ عَنْ أَبِی مُرَّةَ مَوْلٰی عَقِیلِ بْنِ أَبِی طَالِبٍ عَنْ أَبِی وَاقِدٍ اللَّیْثِیِّ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ بَیْنَمَا هُوَ جَالِسٌ فِی الْمَسْجِدِ وَالنَّاسُ مَعَهُ إِذْ أَقْبَلَ نَفَرٌ ثَلَاثَةٌ، فَأَقْبَلَ اثْنَانِ إِلٰی رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَ ذَهَبَ وَاحِدٌ، فَلَمَّا وَقَفَا عَلٰی مَجْلِسِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ سَلَّمَا، فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَرَأٰی فُرْجَةً فِی الْحَلْقَةِ فَجَلَسَ فِیهَا، وَ أَمَّا الْآخَرُ فَجَلَسَ خَلْفَهُمْ، وَ أَمَّا الثَّالِثُ فَأَدْبَرَ ذَاهِبًا ، فَلَمَّا فَرَغَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: أَلَا أُخْبِرُكُمْ عَنِ النَّفَرِ الثَّلَاثَةِ: أَمَّا أَحَدُهُمْ فَأَوٰی إِلَی اللّٰهِ فَآوَاهُ اللّٰهُ ، وَ أَمَّا الْآخَرُ فَاسْتَحْیٰی فَاسْتَحْیَی اللّٰهُ مِنْهُ، وَ أَمَّا الْآخَرُ فَأَعْرَضَ فَأَعْرَضَ اللّٰهُ عَنْهُ.

ابو واقد لیثی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے اور لوگ آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ تین آدمی آئے۔ ان میں سے دو تو رسول اللہ ﷺ کے قریب ہو گئے اور ایک چلا گیا۔ جب وہ دونوں مجلس کے قریب گئے تو دونوں نے سلام کیا۔ ان میں سے ایک نے حلقہ کے اندر

کچھ گنجائش پائی تو بیٹھ گیا۔ دوسرا لوگوں کے پیچھے بیٹھ گیا۔ رہا تیسرا تو وہ وہاں سے چلا گیا۔ رسول اللہ ﷺ جب فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ میں ان تینوں کا ماجرا تم کو بتاؤں۔ ایک نے اللہ کی پناہ لی تو اللہ نے اس کو پناہ دی۔ دوسرا شرمایا تو اللہ نے اس کی لاج رکھ لی۔ رہا تیسرا تو اس نے منہ موڑ لیا تو اللہ نے بھی اس سے بے رخی کی۔﴾

وضاحت:

اتنی مبارک مجلس میں آکر اتنی اکڑفوں نہیں دکھانی چاہیے کہ جگہ تو ہے نہیں، واپس ہی چلے جاتے ہیں۔ جہاں گنجائش ملے وہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ اگر گھس کر بیٹھنے کا موقع نہیں ملتا تو پیچھے ہی بیٹھ جائیں۔ اور نہیں تو کھڑے کھڑے ہی سن لیں۔ مجلس میں آنے والے تین آدمیوں کا رویہ الگ الگ تھا جس پر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ایک نے راستہ نکالنا چاہا تو اللہ نے اس کے لیے راستہ نکال دیا۔ ایک شرماشرمی سے پیچھے بیٹھ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی لاج رکھ لی۔ اور تیسرا اپنے گھمنڈ میں واپس چلا گیا تو اللہ نے بھی اس کو رد کر دیا۔ مجلسی تعلیم کے لحاظ سے یہ بہت بڑی رہنمائی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب جماعتی زندگی کا معاملہ ہوتا ہے تو ہر جگہ اپنی شان نہیں بگھاری جاتی۔ دب کر بھی رہنا پڑتا ہے۔ انکساری میں بھی شان ہوتی ہے۔ اسلام مسلمانوں کے اندر یہ انداز فکر پیدا کرنا چاہتا ہے۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ إِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِی طَلْحَةَ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّهُ سَمِعَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَسَلَّمَ عَلَيْهِ رَجُلٌ فَرَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ، ثُمَّ سَئَلَ عُمَرُ الرَّجُلَ كَيْفَ أَنْتَ؟ فَقَالَ أَحْمَدُ اللّٰهَ إِلَيْكَ فَقَالَ عُمَرُ ذَالِكَ الَّذِی أَرَدْتُ مِنْكَ.

﴿انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمر بن خطابؓ کو سنا کہ ایک شخص نے ان کو سلام کیا تو انہوں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ آپ کیسے ہو، تو اس نے کہا کہ میں آپ کے سامنے اپنے رب کا شکر گزار ہوں۔ تو آپ نے فرمایا مجھے آپ سے یہی توقع تھی۔﴾

وضاحت:

'یہی توقع تھی' کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ اچھے ہی رہے ہوں گے لیکن اس سے زیادہ بار یک یہ بات بھی ہو سکتی ہے کہ مجھے یہی توقع تھی کہ آپ یہی جواب دیں گے۔ اس لیے کہ یہ جواب عالمانہ اور عارفانہ ہے کہ

میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اچھا ہوں۔ میرے نزدیک یہی مطلب زیادہ ٹھیک ہے۔ خواہ مخواہ میں اپنا دکھ درد لے کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ إِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ أَنَّ الطُّفَيْلَ ابْنَ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ كَانَ يَأْتِي عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ فَيَغْدُوْ مَعَهُ إِلَى السُّوقِ قَالَ فَإِذَا غَدَوْنَا إِلَى السُّوقِ لَمْ يَمُرَّ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ عَلَى سَقَاطٍ وَلَا صَاحِبِ بَيْعَةٍ وَلَا مِسْكِيْنٍ وَلَا أَحَدٍ إِلَّا سَلَّمَ عَلَيْهِ، قَالَ الطُّفَيْلُ فَجِئْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ يَوْمًا فَاسْتَتْبَعَنِي إِلَى السُّوقِ فَقُلْتُ لَهُ وَ مَا تَصْنَعُ فِي السُّوقِ وَ أَنْتَ لَا تَقِفُ عَلَى الْبَيْعِ وَلَا تَسْئَلُ عَنِ السِّلَعِ وَلَا تَسُوْمُ بِهَا وَلَا تَجْلِسُ فِي مَجَالِسِ السُّوقِ، قَالَ وَ أَقُوْلُ اجْلِسْ بِنَا هٰهُنَا نَتَحَدَّثُ، قَالَ فَقَالَ لِي عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ يَا أَبَا بَطْنٍ وَ كَانَ الطُّفَيْلُ ذَا بَطْنٍ إِنَّمَا نَغْدُوْ مِنْ أَجْلِ السَّلَامِ نُسَلِّمُ عَلَى مَنْ لَقِيْنَا.

﴿ طفیل بن ابی بن کعب روایت کرتے ہیں کہ وہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں آیا کرتے تو وہ ان کو ساتھ لے کر بازار نکل جایا کرتے۔ طفیل کہتے ہیں کہ جب ہم بازار کی طرف چلتے تو عبداللہ بن عمر کا گزر جس دکاندار، جس کسی بیچنے والے اور جس مسکین پر ہوتا اور جو شخص بھی سامنے آتا وہ اس کو سلام کرتے۔ طفیل کہتے ہیں کہ میں ایک روز عبداللہ بن عمر کے پاس آیا تو انہوں نے مجھے بازار جانے کے لیے ساتھ لگا لیا۔ تو میں نے کہا حضرت، آپ بازار میں کیا لینے جاتے ہیں جب کہ آپ کسی جگہ خریدنے کے لیے رکتے نہیں، کسی جگہ مول بھاؤ نہیں کرتے، کسی جگہ آپ خرید و فروخت نہیں کرتے اور نہ مجالس بازار میں سے کسی جگہ آپ بیٹھتے ہیں۔ میں نے کہا یہیں تشریف رکھیے بات چیت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا اے حضرت پیٹو صاحب (طفیل بن ابی کا پیٹ بہت بڑا تھا) سن لو کہ ہم بازار میں اس لیے جاتے ہیں کہ ہر اس شخص کو سلام کریں جو ہم کو مل جائے۔ ﴾

وضاحت:

یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا خاص ذوق تھا کہ وہ نیکی کمانے کی غرض سے بازار کو نکل جاتے۔ آپ لوگ اس مقصد کے لیے بازار نہ بھی جائیں لیکن جب جائیں تو یہ کرنا چاہیے کہ لوگوں کو سلام کریں۔ اس زمانے میں یہ چیز بالکل ختم ہو گئی ہے۔ صرف تعارف کے ساتھ سلام رہ گیا ہے۔ باقی مسلمانوں کے لیے سلام کا طریقہ بالکل ختم ہو گیا

ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق معلوم ہے کہ ان کی طبیعت میں ان معاملات میں بہت زیادہ تقشف تھا۔ وہ نیکی کے دلدادہ آدمی تھے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ اَنَّ رَجُلًا سَلَّمَ عَلَى عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْكَ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهُ وَالْغَادِيَاتُ وَ الرَّائِحَاتُ، فَقَالَ لَهُ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ وَ عَلَيْكَ اَلْفًا ثُمَّ كَاَنَّهُ كَرِهَ ذَالِكَ.

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عبداللہ بن عمرؓ کو یوں سلام کیا کہ آپ پر سلامتی، اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں اور صبح کو آنے والی اور رات کو آنے والی تمام فضیلتیں آپ کو حاصل ہوں۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ آپ کے اوپر بھی ہزاروں ہزاروں ہوں۔ معلوم ہوتا تھا کہ آپ نے اس سے ناگواری کا اظہار کیا۔﴾

وضاحت :

اگرچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق گمان تو یہ تھا کہ انہیں خوش ہونا چاہیے تھا لیکن انہوں نے بھی سلام کے الفاظ پر اس قسم کی زیادتی کو برداشت نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ السلام علیکم کہنا ہی کافی ہے۔ اس پر اگر اضافہ کیا جائے تو ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کا ہونا چاہیے اور بس۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اِذَا دُخِلَ الْبَيْتُ غَيْرُ الْمَسْكُوْنِ يُقَالُ السَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلَى عِبَادِاللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ.

﴿امام مالکؒ سے روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ جب ایسی جگہ جائیں جہاں مکان خالی ہو جب بھی یہ کہہ دیں کہ ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر سلام۔﴾

وضاحت :

سلام اصل میں دعا ہے اور کوئی موقع دعا سے خالی نہیں جانا چاہیے۔ اللہ کو ہر وقت یاد رکھنا اور اس کی رحمت طلب کرنا ایک بابرکت کام ہے۔

بَابُ الْاِسْتِئْذَانِ

اجازت لینے کے بارے میں باب

☐ حَدَّثَنِی مَالِکٌ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَیْمٍ عَنْ عَطَاءِ بْنِ یَسَارٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ سَاَلَہٗ رَجُلٌ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَسْتَاْذِنُ عَلٰی اُمِّی؟ فَقَالَ نَعَمْ. قَالَ الرَّجُلُ اِنِّی مَعَہَا فِی الْبَیْتِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اسْتَاْذِنْ عَلَیْہَا فَقَالَ الرَّجُلُ اِنِّی خَادِمُہَا، فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اسْتَاْذِنْ عَلَیْہَا اَتُحِبُّ اَنْ تَرَاہَا عُرْیَانَۃً؟ قَالَ لَا. قَالَ فَاسْتَاْذِنْ عَلَیْہَا.

﴿عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا میں اپنی ماں سے بھی اجازت لے کر گھر میں داخل ہوا کروں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ اس نے کہا کہ میں تو اس کے ساتھ گھر میں رہتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تاہم اجازت لو۔ اس آدمی نے کہا کہ میں تو اس کا خادم ہوں۔ آپ نے فرمایا جی ہاں، اس کے باوجود اجازت لو۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ان کو ننگا دیکھو؟ اس نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا تو پھر اجازت لو۔﴾

وضاحت :

آدمی کے بار بار سوال کرنے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اب اس ہدایت کی علت بیان کرنی پڑے گی تو نبی ﷺ نے علت بیان کر دی کہ ہو سکتا ہے کہ کسی ضرورت سے والدہ نے کپڑے اتارے ہوں اور آپ دندناتے ہوئے گھر میں آ جائیں۔ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو عریاں دیکھنا تو پسند نہیں کرتا۔ گھر میں داخلہ کے یہ بڑے ضروری آداب میں سے ہے۔ گھر میں صرف ایک ہی خاتون ہو خواہ وہ ماں ہی ہو تب تو اور بھی احتیاط کرنی چاہیے کیونکہ یہ سمجھ کر کہ گھر میں کوئی اور تو ہے نہیں وہ کسی ضرورت میں ہو اور آپ دندناتے ہوئے پہنچ جائیں تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔

☐ حَدَّثَنِی مَالِکٌ" عَنِ الثِّقَۃِ عِنْدَہٗ عَنْ بُکَیْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ الْاَشَجِّ عَنْ بُسْرِ بْنِ سَعِیْدٍ

عَنْ اَبِی سَعِیدِ الْخُدْرِیِّ عَنْ اَبِی مُوسَی الْاَشْعَرِیِّ اَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَلْاِسْتِئْذَانُ ثَلَاثٌ. فَاِنْ اُذِنَ لَكَ فَادْخُلْ وَاِلَّا فَارْجِعْ.

﴿ابو موسیٰ اشعری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی کے گھر میں داخلہ کی اجازت تین مرتبہ مانگی جائے۔ اگر اجازت مل جائے تو داخل ہو جاؤ ورنہ لوٹ جاؤ۔﴾

وضاحت:

یہ تین مرتبہ تاکید کے لیے ہے اور روز مرہ کی ضروریات کے لیے یہ عدد کافی ہے۔ اس روایت میں ذکر نہیں لیکن دوسری روایت میں آیا ہے کہ تین مرتبہ السلام علیکم کہہ کر اجازت لینی چاہیے۔ اگر ایک مرتبہ جواب نہ ملے تو دوبارہ کرلے۔ پھر بھی نہیں تو تیسری مرتبہ کرے۔ ہو سکتا ہے کہ گھر میں کوئی مصروفیت ہو یا کوئی جواب دینے والا نہ ہو تو تین مرتبہ کے بعد لوٹ جائے۔

☐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ رَبِیعَةَ بْنِ اَبِی عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ غَیْرِ وَاحِدٍ مِنْ عُلَمَاءِ هِمْ اَنَّ اَبَا مُوسَی الْاَشْعَرِیَّ جَاءَ یَسْتَاْذِنُ عَلٰی عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَاسْتَاْذَنَ ثَلَاثًا ثُمَّ رَجَعَ فَاَرْسَلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فِی اَثَرِهِ، فَقَالَ مَالَكَ لَمْ تَدْخُلْ فَقَالَ اَبُو مُوسَی سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ یَقُولُ الْاِسْتِئْذَانُ ثَلَاثٌ فَاِنْ اُذِنَ لَكَ فَادْخُلْ وَ اِلَّا فَارْجِعْ. فَقَالَ عُمَرُ وَمَنْ یَعْلَمُ هٰذَا لَئِنْ لَمْ تَاْتِنِی بِمَنْ یَعْلَمُ ذَالِكَ لَاَفْعَلَنَّ بِكَ كَذَا وَ كَذَا فَخَرَجَ اَبُو مُوسَی حَتّٰی جَاءَ مَجْلِسًا فِی الْمَسْجِدِ یُقَالُ لَهُ مَجْلِسُ الْاَنْصَارِ، فَقَالَ اِنِّی اَخْبَرْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اَنِّی سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ یَقُولُ الْاِسْتِئْذَانُ ثَلَاثٌ فَاِنْ اُذِنَ لَكَ فَادْخُلْ وَ اِلَّا فَارْجِعْ. فَقَالَ لَئِنْ لَمْ تَاْتِنِی بِمَنْ یَعْلَمُ هٰذَا لَاَفْعَلَنَّ بِكَ كَذَا وَ كَذَا فَاِنْ كَانَ سَمِعَ ذَالِكَ اَحَدٌ مِنْكُمْ فَلْیَقُمْ مَعِی، فَقَالُوا لِاَبِی سَعِیدِ الْخُدْرِیِّ قُمْ مَعَهُ، وَ كَانَ اَبُو سَعِیدٍ اَصْغَرَهُمْ فَقَامَ مَعَهُ فَاَخْبَرَ بِذَالِكَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ، فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لِاَبِی مُوسَی اَمَا اِنِّی لَمْ اَتَّهِمْكَ وَلٰكِنْ خَشِیتُ اَنْ یَتَقَوَّلَ النَّاسُ عَلٰی رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ.

﴿ ربیعہ بن عبدالرحمن متعدد علماء سے راوی ہیں کہ ابو موسیٰ اشعری حضرت عمرؓ کے دروازے پر اجازت لینے آئے تو تین مرتبہ اجازت مانگ کر لوٹ گئے۔ حضرت عمرؓ نے ان کے پیچھے آدمی دوڑایا اور پوچھا کہ آپ گھر میں داخل کیوں نہ ہوئے۔ ابو موسیٰ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ اجازت طلب کرنا تین مرتبہ ہے۔ اگر اجازت مل جائے تو داخل ہو جاؤ ورنہ لوٹ جاؤ۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اور کون آپ کی اس بات کو جانتا ہے۔ اگر تم کوئی دوسرا جاننے والا نہ لائے تو پھر میں تمہارے ساتھ ایسا ویسا کروں گا۔ حضرت ابو موسیٰ نکلے تو مسجد میں انصار کی مجلس تھی۔ ان سے کہا کہ میں نے حضرت عمر بن خطابؓ کو بتایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اجازت تین مرتبہ ہے۔ اگر اجازت مل جائے تو داخل ہو جاؤ ورنہ لوٹ جاؤ۔ حضرت عمرؓ نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر تم کوئی اور اس کا جاننے والا نہ لاؤ گے تو میں تمہاری اچھی طرح خبر لوں گا۔ اگر تم میں سے کسی نے یہ حکم سنا ہو تو میرے ساتھ چلے۔ لوگوں نے ابو سعید خدری سے کہا کہ آپ جائیں اور وہ ان سب سے چھوٹے تھے۔ وہ ان کے ساتھ گئے اور حضرت عمرؓ کو بتایا۔ حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ سے کہا کہ میں نے تم کو جھوٹا نہیں خیال کیا تھا بلکہ میں اس بات سے ڈرا کہ کہیں لوگ رسول اللہ ﷺ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب نہ کرنے لگیں۔ ﴾

وضاحت :

اس روایت کے ہوتے ہوئے شوافع کا یہ مذہب کہ خبر واحد حجت ہے کس طرح صحیح ہے؟ اگر خبر واحد حجت تھی تو حضرت عمرؓ یہ کیوں کہتے کہ میں تمہاری خبر لوں گا اگر کوئی دوسرا جاننے والا نہ لائے۔ تو معلوم ہوا کہ خبر واحد میں شبہات کے بہت سے امکانات ہیں۔ اب یہاں تو راوی بہت ثقہ ہیں لیکن حضرت عمرؓ نہ مانے اور اس کی علت بھی بتادی کہ میں نے احتیاط کی ہے کہ لوگ آنحضرت ﷺ کی طرف جھوٹ روایات نہ منسوب کریں۔ معلوم ہوا کہ خبر واحد میں بڑے خطرے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے ہاں اتنی احتیاط ہے لیکن امام شافعی کو اتنی شدت سے خبر واحد پر اصرار ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس میں بڑے اندیشے ہیں۔ اس بارے میں امام شافعی کی دلیلیں بھی بہت کمزور ہیں۔

اَلتَّشْمِیْتُ فِی الْعُطَاسِ

چھینک آنے پر دعائیہ کلمات کہنے کے بارے میں

☐ حدَّثنی مَالِكٌ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِی بَكْرٍ عَنْ اَبِیهِ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنْ عَطِسَ فَشَمِّتْهُ ثُمَّ اِنْ عَطِسَ فَشَمِّتْهُ ثُمَّ اِنْ عَطِسَ فَشَمِّتْهُ ثُمَّ اِنْ عَطِسَ فَقُلْ اِنَّكَ مَضْنُوكٌ" فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ اَبِی بَكْرٍ لَا اَدْرِی اَبَعْدَ الثَّالِثَةِ اَوِ الرَّابِعَةِ.

﴿عبداللہ اپنے باپ ابو بکر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کسی کو چھینک آئے تو تم تشمیت کرو۔ پھر چھینک آئے تو تشمیت کرو۔ پھر چھینک آئے تو تشمیت کرو۔ پھر چھینک آئے تو کہو کہ آپ کو زکام ہے۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ یہ نہیں معلوم کہ تیسری چھینک پر یہ کہے کہ آپ کو زکام ہے یا چوتھی پر۔﴾

وضاحت:

تشمیت کے معنی کوئی دعائیہ کلمہ کہنا ہے کہ اللہ آپ کو ہر تکلیف سے محفوظ رکھے۔ تشمیت کی ایک معین شکل یہ ہے کہ اگر کسی کو چھینک آئے اور وہ الحمدللہ کہے تو آپ یرحمک اللہ (اللہ آپ پر رحم فرمائے) کہیں۔ ایسا کہنا مسنون ہے۔ میرے خیال میں یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اگر چھینکنے والا الحمدللہ نہ کہے تب بھی آپ یرحمک اللہ کہہ دیں تو کوئی حرج نہیں تاکہ اس کو یاددہانی ہو جائے۔ لیکن بعض لوگ یہ نہیں مانتے وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ خود الحمدللہ کہے تب تو یرحمک اللہ کہو ورنہ چپ رہو۔

روایت کی رو سے تین چھینک تک یرحمک اللہ کہنا چاہیے لیکن اگر سلسلہ جاری رہے تو یہ زکام کی علامت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زکام میں چھینک پر چھینک آتی ہے۔ ایسی صورت میں علاج کی طرف توجہ دلانی چاہیے۔ عام حالات میں چھینک دماغی کسل کو دور کرتی ہے۔ دماغ پر بخارات حاوی ہو جاتے ہیں تو یہ ان کو دور کرتی ہے۔ ایک دو چھینک آنا صحت کی علامت ہے اور مسنون طریقہ یہ ہے کہ چھینکنے والا الحمدللہ کہے۔ یعنی اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرے کہ دماغ کے اوپر سے بوجھ دور ہوا۔ چھینکنے والے کے پاس موجود شخص کے لیے حکم یہ ہے کہ اپنے مسلمان

بھائی کے لیے یرحمک اللہ کہے یعنی یہ کہ اللہ تجھ پر رحم فرمائے اور اپنی امان میں رکھے۔

☐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ اِذَا عَطَسَ فَقِيلَ لَهُ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ قَالَ يَرْحَمُنَا اللّٰهُ وَاِيَّاكُمْ وَيَغْفِرُ لَنَا وَلَكُمْ.

﴿نافع روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو جب چھینک آتی اور ان کو یرحمک اللہ کہا جاتا تو وہ کہتے کہ اللہ ہم پر بھی رحم کرے اور تم پر بھی اور وہ ہم کو بخش دے اور تمہیں بھی بخش دے۔﴾

وضاحت:

اس سے میرا مسلک ثابت ہو جاتا ہے کہ باوجود اس کے کہ چھینکنے والے نے الحمدللہ نہ کہا ہو لیکن اگر کوئی شخص یرحمک اللہ کہے تو دونوں کام اس طرح ہو جائیں گے کہ وہ یرحمنا اللہ کہہ کر اس کی تلافی کر دے۔ البتہ مسنون طریقہ وہی ہے جو پہلے بیان ہو چکا۔

مَاجَاءَ فِی الصُّوَرِ وَالتَّمَاثِيلِ

تصویروں اور مورتیوں کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ اِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ اَبِی طَلْحَةَ اَنَّ رَافِعَ بْنَ اِسْحٰقَ مَوْلَى الشِّفَاءِ اَخْبَرَهُ قَالَ دَخَلْتُ اَنَا وَعَبْدُاللّٰهِ بْنُ اَبِی طَلْحَةَ عَلَى اَبِی سَعِيدِ الْخُدْرِیِّ نَعُودُهُ فَقَالَ لَنَا اَبُو سَعِيدٍ اَخْبَرَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَنَّ الْمَلَائِكَةَ لَا تَدْخُلُ بَيْتًا فِيهِ تَمَاثِيلُ اَوْ تَصَاوِيرُ شَكَّ اِسْحٰقُ لَا يَدْرِی اَيَّتَهُمَا قَالَ اَبُوسَعِيدِ الْخُدْرِیُّ.

﴿رافع بن اسحٰق جو شفا کے آزاد کردہ غلام ہیں خبر دیتے ہیں کہ میں اور عبداللہ بن ابی طلحہ ابو سعید خدری کی خدمت میں ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوئے تو ابو سعید نے فرمایا کہ ہم کو رسول اللہ ﷺ نے خبر دی کہ ملائکہ اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں مورتیں یا تصویریں ہوں۔ اسحٰق کو شک ہے کہ ابو سعید نے دونوں میں سے کون سی چیز کا ذکر کیا۔﴾

□ حدثنی مالكٌ عن ابی النضر عن عُبَیدالله بن عبدالله بن عُتبة بن مسعود انّه دخل علی ابی طلحة الانصاری یعوده قال فوجد عنده سهل بن حُنیف فدعا ابوطلحة انسانًا فنزع نمطًا من تحته فقال له سهل بن حُنیف لم تنزعهٗ قال لانّ فیه تصاویر و قد قال رسول الله ﷺ فیها ما قد علمت فقال سهل الم یقل رسول الله ﷺ الّا ما کان رقمًا فی ثوب قال بلی ولکنّهٗ اطیب لنفسی.

﴿عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ کہتے ہیں کہ وہ ابوطلحہ انصاری کے گھر ان کی عیادت کے لیے گئے۔ کہتے ہیں کہ وہاں سہل بن حنیف موجود تھے۔ ابوطلحہ نے ایک آدمی کو بلایا تو اس نے ایک قالین ان کے نیچے سے کھینچا۔ سہل بن حنیف نے ان سے پوچھا کہ اس کو کیوں کھینچ رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ اس لیے کہ اس میں کچھ تصاویر ہیں اور تصاویر کے بارے میں جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔ سہل نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا یہ نہیں فرمایا کہ اگر وہ ساوٹ میں بنی ہوئی ہوں تو وہ مستثنیٰ ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ یہ بات تو ہے لیکن میں اپنے لیے یہی پسند کرتا ہوں۔﴾

□ حدثنی مالكٌ عن نافع عن القاسم بن محمّد عن عائشة زوج النبی ﷺ انّها اشترت نُمرقة فیها تصاویر فلمّا رآها رسول الله ﷺ قام علی الباب فلم یدخل فعرفت فی وجهه الکراهیة وقالت یا رسول الله اتوب الی الله و الی رسوله فماذا اذنبت فقال رسول الله ﷺ فما بال هذه النُمرقة قالت اشتریتها لك تقعد علیها وتوسّدها فقال رسول الله ﷺ انّ اصحاب هذه الصُوَر یعذّبون یوم القیامة یقال لهم احیوا ما خلقتم ثمّ قال انّ البیت الّذی فیه الصُوَر لا تدخله الملائکة.

﴿قاسم بن محمد حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک قالین خریدا جس میں تصویریں تھیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اس کو دیکھا تو دروازے پر ٹھٹک گئے اور اندر داخل نہ ہوئے۔ حضرت عائشہؓ نے آپ کے چہرے پر ناگواری محسوس کر کے کہا کہ میں اللہ کی طرف اور اس

کے رسول کی طرف رجوع کرتی ہوں۔ میں نے کیا گناہ کیا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس قالین کا کیا معاملہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اسے خریدا کہ آپ اس پر بیٹھیں گے اور ٹیک لگائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان تصویروں والے قیامت کے روز عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔ ان سے کہا جائے گا کہ اس کو زندہ کرو جو تم نے پیدا کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ وہ گھر جس میں صورتیں ہوں فرشتے اس میں داخل نہیں ہوتے۔ ؏

وضاحت:

یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس زمانے میں فوٹو کا کوئی وجود نہ تھا۔ دو ہی چیزیں تھیں۔ لوگ مٹی، تانبے، پیتل، چاندی یا پتھر کی مورتیں بناتے جن کو تماثیل کہتے ہیں یا خاکے اور تصویریں بناتے تھے۔ یہ ساری چیزیں ان کے متعلق ہوتی تھیں جن کو لوگ پوجتے تھے۔ بت پرستی کے لیے ان کو وہ گھروں میں رکھتے اور ان کو بہت عزیز جانتے تھے۔ انہی کے خاکے بھی بنتے تھے اور مورتیں بھی بنتی تھیں۔ اور یہ مختلف چیزوں مثلاً برتنوں پر اور گدے اور قالینوں پر بھی بنائی جاتیں۔ عمارتوں کی دیواروں اور چھتوں پر ملائکہ اور بزرگوں کی تصویریں بنانے کا رواج بھی رہا ہے۔ ان مورتوں اور تصاویر میں بت پرستی کا عنصر شامل ہونے کے باعث ان کے حرام ہونے میں شبہ کی کوئی وجہ نہیں۔

رہا حکم دوسری تصاویر کا تو اسلام میں ایسی چیزوں کی ممانعت بھی کر دی جاتی ہے جو کسی حرام کام کے ارتکاب کی راہ کھولنے والی اور اس کا ذریعہ بننے والی ہوں۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے ایک قبیلہ کو خاص قسم کے برتن۔۔۔ دباء، مزفت، حنتم وغیرہ۔۔۔ استعمال کرنے سے روک دیا۔ ان برتنوں میں ایک خوشگوار مشروب نبیذ تیار ہوتا لیکن ان کے مساموں کو بند کر کے اسی نبیذ کو شراب کی شکل دینا بھی ممکن تھا۔ چونکہ یہ برتن شراب کا خمیر اٹھانے کے باعث بنتے لہٰذا نبی ﷺ نے ان پر پابندی عائد کر دی۔ پھر جب پختہ طور پر مسئلہ لوگوں کے سامنے واضح ہو گیا اور شراب تیار کرنے سے لوگ رک گئے تو آپ نے برتنوں کے استعمال پر پابندی کا حکم ختم کر دیا۔ دیگر کئی معاملات ایسے ملتے ہیں جن سے پہلے آپ نے روکا، پھر اجازت دے دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابتدا میں قدیم تصورات کے تحت ان میں لوگوں کے فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا امکان تھا۔ لیکن جب دین کی تعلیم ذہنوں میں راسخ ہو

گئی تو پھر اس بات کا امکان نہ رہا کہ لوگ دوبارہ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔

مورتوں اور تصویروں کی ممانعت کی علت میرے نزدیک یہی ہے کہ جو چیزیں بت پرستی کی ہیں ان کی تصاویر یا مورتیں نہ بنائی جائیں البتہ سدذریعہ کے لیے حکم کو عام کر دیا گیا۔ سدذریعہ کے علاوہ تقویٰ کے باعث بھی کوئی پابندی قبول کی جاتی ہے جیسے ابوطلحہ انصاری نے کہا کہ بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ منقش قالین بچھانے میں کوئی حرج نہیں لیکن میں اسے پسند نہیں کرتا۔ ابوطلحہ کا یہ فرمانا احتیاط کے لیے تھا۔ جو چیزیں سدذریعہ کے لیے ممنوع ہوتی ہیں وہ اصلاً حرام نہیں ہوتیں، لیکن تقویٰ کا بھی ایک تقاضا ہوتا ہے جس کے تحت آدمی اس سے اجتناب کرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کئی لباس حرام کی حدود میں نہیں آتے لیکن بعض لوگوں کے نزدیک ان کا استعمال وقار کے منافی ہوتا ہے۔ میرے ایک عقیدت مند میرے لیے ایک ٹوپی لائے جو بہت اونچی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر میں یہ ٹوپی پہن کر نکلوں گا تو لوگ کیا کہیں گے۔ کہنے لگے کہ یہ تو صرف آپ کے لیے خریدی گئی ہے۔ میں نے پھر معذرت کی کہ آپ لوگوں کو مجھے جاننے کے لیے بہت دن لگیں گے۔ بہت سی چیزیں ہیں جن میں تقویٰ کا نہ سہی، رکھ رکھاؤ کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔

میرے نزدیک مصریوں کا یہ فتویٰ بالکل لغو ہے کہ فوٹو تو محض ایک عکس ہے۔ اس کے عکس ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سے کوئی چیز جائز نہیں ہو جاتی۔ جائز اگر ہو گی تو صرف دو وجہوں سے ہو گی۔ ایک تو کسی خاص ضرورت کے تحت جیسے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ کے لیے فوٹو لازم ہے۔ دوسری کسی قومی یا ملکی ضرورت کے تحت فوٹو کی افادیت ہو۔ یہ جو اخبارات کے پہلے صفحے پر اداکاروں اور اداکاراؤں کی فوٹو آتی ہیں، الامان والحفیظ، اگر آپ ان کو اپنے کمرے میں لگائیں تو فرشتوں کے اس میں داخل ہونے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کوئی شریف آدمی بھی اس میں جانا گوارا نہیں کرے گا۔ ان کی تصویریں اس لیے بھی حرام ہیں کہ یہ آوارہ لوگ ہیں۔ بدقوار لوگوں کی فوٹو دیکھنا بھی بدقوارگی ہے۔

مَاجَاءَ فِي اَكْلِ الضَّبِّ

گوہ کے کھانے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِي صَعْصَعَةَ

عَنْ سُلَيمَانَ بْنِ يَسَارٍ انَّهُ قَالَ دَخَلَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بَيْتَ مَيْمُونَةَ بِنْتِ الحَارِثِ فَاِذَا ضِبَابٌ فِيهَا بَيْضٌ وَمَعَهُ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عَبَّاسٍ وَ خَالِدُ بْنُ الْوَلِيدِ فَقَالَ مِنْ اَيْنَ لَكُمْ هٰذَا فَقَالَتْ اَهْدَتْهُ لِيْ أُخْتِي هُزَيْلَةُ بِنْتُ الحَارِثِ فَقَالَ لِعَبدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ و خَالِدِبْنِ الْوَلِيدِ كُلَا فَقَالَا اَوَلَا تَاكُلُ اَنْتَ يَارَسُولَ اللّٰهِ فَقَالَ اِنِّي تَحْضُرُنِي مِنَ اللّٰهِ حَاضِرَةٌ قَالَتْ مَيْمُونَةُ اَنَسْقِيكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ مِنْ لَبَنٍ عِنْدَنَا فَقَالَ نَعَمْ فَلَمَّا شَرِبَ قَالَ مِنْ اَيْنَ لَكُمْ هٰذَا فَقَالَتْ أَهْدَتْهُ لِي اُخْتِي هُزَيْلَةُ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَرَأَيْتِكِ جَارِيَتَكِ الَّتِي كُنْتِ اسْتَأْمَرْتِينِي فِي عِتْقِهَا أَعْطِيهَا أُخْتَكِ وَ صِلِي بِهَا رَحِمَكِ تَرْعَى عَلَيْهَا فَاِنَّهُ خَيْرٌ لَكِ.

﴿سلیمان بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ میمونہ بنت حارث کے گھر آئے تو وہاں گوہ رکھی ہوئی تھیں اور ان میں انڈے بھی تھے۔ آپ کے ساتھ عبداللہ بن عباسؓ اور خالد بن ولیدؓ تھے۔ آپ نے پوچھا تم لوگوں کے پاس یہ گوہ کہاں سے آئیں تو انہوں نے کہا کہ یہ میری بہن ھزیلہ بنت حارث نے تحفہ میں بھیجی ہیں۔ آپؐ نے عبداللہ بن عباسؓ اور خالد بن ولیدؓ سے کہا کہ تم دونوں کھاؤ۔ انہوں نے کہا حضور آپ نہیں کھائیں گے؟ آپ نے فرمایا میرے پاس اللہ کی طرف سے آنے والے آتے ہیں (یعنی حضرت جبریل علیہ السلام) میمونہ نے کہا یارسول اللہ ہمارے پاس دودھ بھی ہے۔ کیا آپ کو دو پلادیں۔ تو آپ نے کہا ہاں۔ جب آپ نے پی لیا تو پوچھا کہ یہ آپ کے پاس کہاں سے آیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ بھی میری بہن ھزیلہ نے تحفہ دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ لونڈی جس کے آزاد کرنے کے بارے میں تم نے مجھ سے مشورہ چاہا تھا وہ تم اس بہن کو دے دو کہ اس سے صلہ رحمی بھی ہو جائے گی اور وہ ان کی بکریوں کی بھی دیکھ بھال کرے گی اور یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔﴾

وضاحت:

آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا کہ میرے پاس آنے والے آتے ہیں یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ چونکہ مہبط وحی تھے۔ جبریل امینؑ آپ کے پاس آتے رہتے تھے اس لیے آپ نظافت کا خاص خیال فرماتے۔ حتیٰ کہ پیاز اور لہسن جیسی

چیزوں سے، جن کی بو کھانے کے بعد بھی منہ میں باقی رہتی ہے، اجتناب فرماتے۔ اسی عادت مبارکہ کے تحت آپ نے گوہ کھانے سے بھی معذرت کر دی۔

اس روایت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غلاموں کو آزاد کرنے پر اسلام نے شروع ہی سے بہت زور دیا ہے۔ کئی سورتوں میں جہاں نیکی کے بنیادی کاموں کا ذکر ہے ان میں فک رقبہ (غلام آزاد کرنا) کو بھی شمار کیا گیا ہے۔ اس روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے صلہ رحمی کو غلام کی آزادی پر ترجیح دی ہے۔ یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ اس وقت تک غلام آزاد کرنے کی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے ہزیلہ بنت حارث کو بکریاں چرانے میں زحمت ہوتی ہو تو جب حضرت میمونہؓ نے نبی ﷺ سے لونڈی کو آزاد کرنے کے بارے میں مشورہ کیا تو آپ نے آزادی کو مؤخر کر کے لونڈی کو ہزیلہ کے حوالہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صلہ رحمی بھی بڑی افضل نیکی ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ یہ روایت مرسل ہے۔ گوہ کا گوشت کھانے کے بارے میں وضاحت اگلی روایت میں آئے گی۔

❑ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ أَبِي أُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ عَنْ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيدِ بْنِ الْمُغِيرَةِ أَنَّهُ دَخَلَ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ بَيْتَ مَيْمُونَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ فَأُتِيَ بِضَبٍّ مَحْنُوذٍ فَأَهْوَى إِلَيْهِ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بِيَدِهِ فَقَالَ بَعْضُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي فِي بَيْتِ مَيْمُونَةَ أَخْبِرُوا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ بِمَا يُرِيدُ أَنْ يَأْكُلَ مِنْهُ فَقِيلَ هُوَ ضَبٌّ يَا رَسُولَ اللّٰهِ فَرَفَعَ يَدَهُ فَقُلْتُ أَحَرَامٌ هُوَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ فَقَالَ لَا وَلٰكِنَّهُ لَمْ يَكُنْ بِأَرْضِ قَوْمِي فَأَجِدُنِي أَعَافُهُ قَالَ خَالِدٌ فَاجْتَرَرْتُهُ فَأَكَلْتُهُ وَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَنْظُرُ.

﴿خالد بن ولیدؓ روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضور کی اہلیہ حضرت میمونہؓ کے گھر میں داخل ہوئے تو بھنی ہوئی گوہ لائی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ بڑھایا تو کسی عورت نے جو حضرت میمونہؓ کے گھر میں تھیں، کہا کہ رسول اللہ ﷺ کو خبر کر دو کہ آپ کیا کھانے چلے ہیں۔ آپ کو بتایا گیا کہ یا رسول اللہ، یہ گوہ کا گوشت ہے تو آپ نے ہاتھ اٹھا لیا۔ میں نے آپ سے پوچھا کہ کیا یہ حرام ہے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، لیکن چونکہ یہ میری قوم کے علاقہ میں نہیں پائی جاتی تو میں طبیعت کے اندر کراہت محسوس کرتا ہوں۔ خالد بن ولیدؓ کہتے ہیں کہ میں نے کھینچ لیا اور کھایا اور رسول اللہ

ﷺ دیکھتے رہے۔﴾

وضاحت :

جانوروں میں سے کچھ چیزیں صریح حرام ہیں اور کچھ صریح طیب۔ بیچ میں کچھ چیزیں مشتبہ ہیں۔ مشتبہ چیزوں کے بارے میں ہدایت یہ ہے کہ اگر آپ ان کو ناگوار پاتے ہوں تو ان کو نہ کھائیں لیکن اگر دوسرے کھاتے ہیں تو ان پر حرام خوری کا الزام نہ لگائیں۔ گوہ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن علاقوں میں گوہ نہیں پائی جاتی وہاں کے باشندے اس سے کراہت محسوس کرتے ہیں جبکہ دوسروں کے نزدیک اس کا گوشت بے حد لذیذ اور پسندیدہ بھی ہو سکتا ہے۔ شوافع کا مذہب سمندری اور ساحلی علاقوں میں خوب پھیلا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ انہوں نے مشکل ہی سے کوئی سمندری جانور ایسا چھوڑا ہو گا جو ان کی فقہ میں کھانا جائز ہو۔ امام شافعیؒ کے ایک جلیل القدر امام فقہ ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا اور ان کی فقہ ایک وسیع علاقہ میں نافذ بھی رہی ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک ایسی چیزوں کے بارے میں، جو صریح حرام نہیں، یہ کہنا ہی مناسب ہے کہ اگرچہ ہم ان کو کھانا پسند نہیں کرتے لیکن دوسرے اگر کھاتے ہیں تو ہمیں ان پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔

☐ **حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلًا نَادَى رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ مَا تَرَى فِي الضَّبِّ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَسْتُ بِاٰكِلِهِ وَلَا بِمُحَرِّمِهِ.**

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کو پکارا اور پوچھا کہ گوہ کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے تو آپ نے فرمایا کہ نہ میں اس کو کھاتا ہوں اور نہ حرام کرتا ہوں۔﴾

وضاحت :

اس روایت نے اس بات کو مؤکد کر دیا کہ گوہ کا کھانا حرام نہیں۔ اس کا کھانا آپ کو اگر گوارا نہ ہو اور دوسرے کھاتے ہوں تو آپ ان پر نکیر نہ کریں۔ گوہ جیسے جانور صحراؤں میں پائے جاتے ہیں۔ صحراؤں میں بسنے والے لوگ ان سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور انہیں یہ چیز ناگوار نہیں ہوتی تو نبی ﷺ نے بھی اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔

مَا جَاءَ فِي أَمْرِ الْكِلَابِ

کتوں کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَزِيدَ بْنِ خُصَيْفَةَ أَنَّ السَّائِبَ بْنَ يَزِيدَ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ سَمِعَ سُفْيَانَ بْنَ أَبِي زُهَيْرٍ وَهُوَ رَجُلٌ مِنْ أَزْدِ شَنُوءَةَ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ يُحَدِّثُ نَاسًا مَعَهُ عِنْدَ بَابِ الْمَسْجِدِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَنِ اقْتَنَى كَلْبًا لَا يُغْنِي عَنْهُ زَرْعًا وَلَا ضَرْعًا نَقَصَ مِنْ أَجْرِ عَمَلِهِ كُلَّ يَوْمٍ قِيرَاطٌ قَالَ أَنْتَ سَمِعْتَ هَذَا مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ إِي وَرَبِّ هَذَا الْمَسْجِدِ.

﴿سفیان بن ابی زہیر، جو قبیلہ ازد شنوءہ میں سے رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں، مسجد نبوی کے دروازے کے پاس کچھ لوگوں سے بیان کر رہے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جس نے کوئی کتا پالا جو نہ اس کی زراعت کے کام کا اور نہ اس کے گلے کی حفاظت کے کام کا ہو تو ایسے شخص کا روزانہ ایک قیراط کے برابر عمل کا اجر کم ہو جاتا ہے۔ سائب بن یزید نے ان سے پوچھا کہ کیا یہ بات آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے تو انھوں نے کہا ہاں، اس مسجد کے خداوند کی قسم﴾

وضاحت:

مطلب یہ ہے کہ کتے کو پالنا کسی مفید مقصد کے لیے ہونا چاہیے۔ یہ مقصد کھیتی یا باغ کی حفاظت یا گلے کی نگرانی یا دروازے کی پاسبانی کا ہو سکتا ہے اور اس کے لیے آپ کتا رکھ سکتے ہیں۔ اگر ایسا کوئی مقصد نہ ہو تو کتا پالنے سے آدمی کے نیک عمل کا وزن ایک قیراط یومیہ کم ہو جائے گا۔ ایک قیراط کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ ہی ٹھیک ٹھیک جانتے ہیں۔ ہم شاید اس کو نہیں جان سکتے۔

روایت سننے والے صاحب نے پوچھا کہ کیا آپ نے یہ رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے تو کہا ہاں، اس مسجد کے خداوند کی قسم۔ انھوں نے قسم بھی اس مسجد کی کھائی جو مقدس ترین مساجد میں سے ہے۔

یہ معلوم ہونا چاہیے کہ عرب لوگ، شہری ہوں یا بدوی، شکاری کتے بڑے شوق سے رکھتے تھے۔ ان کو

شکار کی تربیت دی جاتی تھی۔ قرآن مجید نے ان کتوں کے شکار کردہ جانور کو حلال قرار دیا ہے۔ اس زمانہ میں کتوں کی تربیت میں مزید ترقی ہوئی ہے اور ان کو کھوج لگانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہوائی اڈوں پر لوگوں کو اور ان کے سامان کو سونگھ کر کے منشیات کا کھوج لگا لیتے ہیں۔ یہ مقاصد بھی اچھے ہیں جن کے لیے کتوں کو پالا جا سکتا ہے۔

اس روایت میں یہ بات بھی ہے کہ ایک آدمی نے راوی کو ٹوک کر بات مؤکد کرائی کہ انہوں نے یہ بات فی الواقع نبی ﷺ کی زبان سے سنی۔ کسی روایت میں اگر دینی اعمال کے اجر میں کمی بیشی کا معاملہ آیا ہو تو روایت کی تحقیق کے درپے ہونا فطرت کا تقاضا ہے۔ اہل حدیث اور شافعی حضرات کے نزدیک روایت کرنے والا ایک ہی ہو تو آنکھ بند کر کے روایت کو مان لیں گے، اور اگر نہیں مانتے تو منکر حدیث ٹھہریں گے۔ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر خبر کی نوعیت ایسی ہے جو خاص اہمیت نہیں رکھتی تو اس کو اگر ایک کافر بھی بیان کرے تو مان لینے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر ایک شخص کوئی ایسی بات کہتا ہے جو دین میں اہمیت رکھتی ہے تو پھر شخص کا بھی سوال پیدا ہوگا اور بات کا بھی، اور تحقیق ضروری ہوگی۔ بغیر تحقیق کے ہر چیز نہیں ماننی چاہیے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنِ اقْتَنَى كَلْبًا اِلَّا كَلْبًا ضَارِيًا اَوْ كَلْبَ مَاشِيَةٍ نَقَصَ مِنْ اَجْرِ عَمَلِهِ كُلَّ يَوْمٍ قِيرَاطَانِ.

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کوئی کتا پالا، الا یہ کہ وہ شکاری کتا ہو یا گلے کی نگرانی کا ہو، تو اس کے عمل کے اجر سے روزانہ دو قیراط کم ہو جاتا ہے۔﴾

وضاحت :

پہلی روایت اور اس روایت میں میرے نزدیک تناقض ہے۔ پہلی میں اجر میں ایک قیراط کی کمی بتائی گئی ہے اور اس میں دو قیراط کی۔ اس روایت کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں جو سلسلۃ الذہب میں سے ہیں۔ شارحین نے دونوں روایتوں کو جمع کرنے کی جو ترکیبیں بیان کی ہیں ان میں کوئی ایسی نہیں جس پر میرا دل مطمئن ہو۔ اور جس پر اپنا دل مطمئن نہ ہو اس کے بیان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پہلی روایت بخاری اور مسلم دونوں میں ہے۔ آپ لوگ خود فیصلہ کریں کہ روایت کے لحاظ سے بڑا درجہ کس کا ہے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَمَرَ بِقَتْلِ الْكِلَابِ.

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتوں کے قتل کا حکم دیا۔﴾

وضاحت :

اس حکم کی توجیہ شارحین یہ کرتے ہیں کہ مدینہ منورہ چونکہ وحی کا مہبط تھا اس لیے آپ نے کتوں کے قتل کرنے کا حکم دیا۔ اور یہ بھی آتا ہے کہ بعد میں آنحضرت ﷺ نے اس سے روک دیا کہ یہ جانور بھی امۃ من الامم ہیں۔ ہماری میونسپلٹیاں بھی کتوں کے مارنے کی مہم کبھی کبھی چلایا کرتی ہیں اور بات ان کی معقول ہوتی ہے۔ جب کتے آفت بن جاتے ہیں اور ان کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے تو ان کے لڑائی جھگڑے سے شہری زندگی تنگ ہو جاتی ہے۔ ان کے اندر لوگوں کو کاٹنے کا ولولہ بھی بڑھ جاتا ہے اور جب اکٹھے ہوتے ہیں تو حملہ بھی کر دیتے ہیں۔ میرے خیال میں مدینہ منورہ میں ایسا ہوا ہو گا جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہو گا کہ ان کو قتل کر دو۔ قتل کی حد بھی بتادی ہو گی کہ نسل ختم کرنا مقصود نہیں۔ گویا اس حکم کی نوعیت یہ ہے کہ شہر مقدس ہو یا نہ ہو، غلاظت اور بچوں بوڑھوں کی حفاظت کے پیش نظر کتوں کو قتل بھی کر سکتے ہیں۔ اس میں آج کل کے صاحب لوگوں کے کتے خارج از بحث ہیں۔ ان کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بغل میں لینے کے ذلیل مقصد کے لیے کتے نہیں پالنے چاہئیں۔

مَاجَاءَ فِي أَمْرِ الْغَنَمِ

بکریوں کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ رَأْسُ الْكُفْرِ نَحْوَ الْمَشْرِقِ وَالْفَخْرُ وَالْخُيَلَاءُ فِي أَهْلِ الْخَيْلِ وَالْإِبِلِ وَالْفَدَّادِينَ أَهْلِ الْوَبَرِ وَالسَّكِينَةُ فِي أَهْلِ الْغَنَمِ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کفر کا گڑھ مشرق کی طرف ہے۔ فخر و غرور گھوڑوں اور اونٹوں اور خیموں کے ساکنوں کے اندر ہے اور متانت اور سنجیدگی بھیڑ بکری رکھنے والوں میں ہے۔﴾

وضاحت :

یہ آنحضرت ﷺ نے کوئی دینی مسئلہ نہیں بیان کیا بلکہ زندگی کے عام تجربات کے حوالے سے ایک بات

فرمائی ہے۔ اس میں بنیادی چیز یہ ہے کہ آدمی کا جس طرح کے جانوروں سے واسطہ ہو گا تو اس کے مزاج میں انہی کی خو بو آ جائے گی۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ گھوڑے یا اونٹ پر سوار ہو کر چلتے ہیں تو ان میں فخر و غرور تو پیدا ہو گا۔ شان و شوکت کا مزاج پر اثر پڑتا ہے۔ جو لوگ گائے بھینس چرائیں گے اور ان کے پیچھے پھریں گے تو مزاج میں سختی اور خشونت پیدا ہو گی۔ جو لوگ گلے کی حفاظت کریں گے تو ان میں مسکنت، متانت، خاکساری اور تواضع پیدا ہو گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ یا تو جانوروں سے تعلق نہ رکھیے اور اگر رکھیں تو بڑی احتیاط کے ساتھ، اپنے اخلاق و عادات کی نگرانی کرتے ہوئے یہ تعلق رکھیں۔ نبی ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ کفر کا گڑھ مشرق کی طرف ہے۔ مشرق میں قریبی علاقہ تو ایران اور عراق ہی ہو سکتا ہے اور آنحضرتؐ کا یہ فرمانا حالات کے لحاظ سے بالکل ٹھیک تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خسرو پرویز نے آپ کا نامہ مبارک پھاڑ دیا تھا۔ جب ایران فتح ہو گیا تو اس کے بعد بھی یہ علاقہ ہمیشہ سے شر و فساد کا گڑھ رہا ہے۔ عراق بھی تمام دینی فرقوں کا مرکز رہا ہے اور اب بھی ہے۔ سب فتنے وہیں سے پیدا ہوئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے یہ بات وقت کے حالات کے لحاظ سے فرمائی ہے اور اس میں تبدیلی بھی ہو سکتی ہے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِي صَعْصَعَةَ عَنْ اَبِيهِ عَنْ اَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ اَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُوشِكُ اَنْ يَكُونَ خَيْرُ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمًا يَتْبَعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ يَفِرُّ بِدِينِهِ مِنَ الْفِتَنِ.

﴿ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قریب ہے وہ وقت کہ بہترین مال کسی مسلمان کے لیے بکریوں کا ریوڑ ہو کہ جن کو لیے ہوئے وہ پہاڑوں کی گھاٹیوں میں یا بارش کے مقامات پر پھرے۔ اس کا مقصد اپنے دین کو فتنوں سے بچانا ہو۔﴾

وضاحت:

نبی ﷺ نے امت کو مستقبل میں پیش آنے والے فتنوں سے بھی آگاہ فرمایا۔ یہ حدیث انہی فتنوں سے متعلق ہے۔ اس میں حضورؐ نے یہ فرمایا کہ وہ زمانہ قریب ہے کہ جس شخص کو اپنے دین کی فکر ہو گی وہ اس بات پر قناعت کرنے کی کوشش کرے گا کہ کوئی چھوٹا موٹا بکریوں کا گلہ ہو اور وہ اس کو لے کر پہاڑوں میں چلا جائے اور انہی کا دودھ پی کر اور انہی کی کھال کا لباس پہن کر زندگی گزارے لیکن شہری زندگی کی شیطنت سے اپنے آپ کو بچا لے۔

اس زمانہ میں جو دنیا پرستی آئے گی اس کے نتیجہ میں جگہ جگہ فتنے اور فساد اٹھیں گے۔ چنانچہ ایک دیندار آدمی مجبور ہو گا کہ اپنے دین کو بچانے کے لیے الگ تھلگ ہو کر اپنے گلے پر ہی قناعت کرے۔ آنحضرت ﷺ نے جس زمانہ کی خبر دی وہ زمانہ غنیمت تھا کہ آپ بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ پہاڑوں میں زندگی گزار سکتے تھے۔ لیکن آج تو وہ زمانہ آ گیا ہے کہ آپ ریوڑ بھی کہیں نہیں رکھ سکتے۔ چور اور ڈاکو نہیں چھوڑتے۔ شہروں کے اندر زندگی گزارنا مشکل ہو گیا ہے۔ کسی کی حفاظت کا ذمہ اٹھانا ممکن نہیں رہا۔

اس روایت سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کو ایمان عزیز ہو تو الگ تھلگ ہو جائے وہیں یہ حکم بھی نکلتا ہے کہ دنیا سے الگ تھلگ رہنا صرف ایمان کو بچانے کے لیے ہو ورنہ دنیا کے ساتھ رہنا اس وقت تک واجب ہے جب تک آدمی کے لیے یہ ممکن ہو کہ اپنے دین کو بچاتے ہوئے لوگوں کے کانوں میں اللہ کا کلمہ پہنچا سکتا اور اپنے دین کے جو کم سے کم حقوق ہیں وہ ادا کر سکتا ہو۔ یہ بات حدیثوں میں بھی آئی ہے اور قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔ اگر آدمی اپنے دین کو نہیں بچا سکتا تو اصحاب کہف کے طریقہ پر اللہ پر توکل کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ انتظام کر دے گا۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَحْتَلِبَنَّ اَحَدٌ مَاشِيَةَ اَحَدٍ بِغَيْرِ اِذْنِهٖ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تُؤْتٰى مَشْرُبَتُهٗ فَتُكْسَرَ خِزَانَتُهٗ فَيُنْتَقَلَ طَعَامُهٗ وَ اِنَّمَا تَخْزُنُ لَهُمْ ضُرُوْعُ مَوَاشِيْهِمْ اَطْعِمَاتِهِمْ فَلَا يَحْتَلِبَنَّ اَحَدٌ مَاشِيَةَ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِهٖ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص کسی دوسرے کی گائے بکری بغیر اس کی اجازت کے نہ دودھے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کے کمرے میں داخل ہو کر اس کی الماری توڑی جائے اور اس کا کھانا منتقل ہو جائے۔ یاد رکھو کہ مویشیوں کے تھن لوگوں کی غذا کے خزانے ہیں تو یہ جائز نہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے مویشیوں کا دودھ اس کی اجازت کے بغیر دودھے۔﴾

وضاحت:

حدیث کا مفہوم واضح ہے۔ ایسا کام بے تکلفی میں بھی نہیں کرنا چاہیے بلکہ اجازت لے کر کرنا چاہیے۔ اس

طرح کی احتیاط ہر مہذب آدمی کو کرنی چاہیے۔ لیکن اگر آپ کسی ایسی جگہ پہنچ گئے کہ باغ آپ کے پر اعتماد دوست کا ہے اور آپ کو بھوک لگی ہے، اس بات کا یقین ہے کہ اگر آپ نے ایک دو سیب توڑ کر کھا لیے تو وہ دوست ناراض نہیں ہوگا بلکہ خوش ہوگا تو کچھ حرج نہیں۔ لیکن جہاں پر اس طرح کا اندیشہ ہو کہ مالک ناراض ہوگا تو وہاں پر ہیز کرنا چاہیے۔ اضطرار کا الگ قانون ہے۔ اگر آپ مجبور ہوں تو بقدر ضرورت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جہاں ایسی مشکل نہ ہو تو محض بے تکلفی میں کسی کی گاجریں نکال کر حلوا بنانا ٹھیک نہیں۔

□ **حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَا مِنْ نَبِيٍّ اِلَّا قَدْرَعَى غَنَمًا قِيْلَ وَ اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَ اَنَا.**

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ پوچھا گیا آپ نے بھی یا رسول اللہؐ؟ تو فرمایا کہ ہاں میں نے بھی۔﴾

وضاحت:

انبیاء کی معلوم تاریخ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرائیں۔ امیر انبیاء میں حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ ہیں۔ حضرت داؤدؑ کے متعلق تورات میں بیان ہوا ہے کہ انہوں نے اپنے ابتدائی زمانہ میں بکریاں چرائی ہیں۔ جب اس وقت کے پیغمبر نے ان کی کم عمری کی وجہ سے اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ دشمن فوج کے سردار جالوت کا مقابلہ کریں تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میں فلاخن کی مدد سے اپنی بھیڑوں پر حملہ کرنے والے جانور کے دانت توڑ دیتا ہوں۔ چنانچہ اس بیان پر ان کو مقابلہ کی اجازت مل گئی۔ انہوں نے فلاخن سے جب پتھر مارا تو سپہ سالار کے سر پر چپک کر رہ گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

حضرت سلیمانؑ کے متعلق بھی یہ بعید نہیں کہ انہوں نے بھی یہ کارنامہ انجام دیا ہو۔ ہماری تاریخ کے بہت بڑے آدمی حضرت عمرؓ نے بھی یہ کام کیا ہے۔ اور حضرت عمرؓ اور حضرت سلیمانؑ میں بڑی مشابہت ہے۔ دونوں نے ساری زندگی فقیری میں گزاری حالانکہ وہ ایک بڑی سلطنت کے حکمران تھے۔ زندگی کے تمام نشیب و فراز میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی تربیت کرتا ہے تو انسانوں کے گلے کی چرواہی کے لیے اگر بکریوں کے گلے کی نگہبانی سے تربیت دی جائے تو یہ بالکل درست ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج کے حکمرانوں کو تربیت دینے کے لیے بھی چرواہی پر لگا دیا جائے تاکہ ان کی عقل کچھ درست ہو جائے۔ لیکن ان سے تو یہ اندیشہ بھی ہے کہ گلے کو ذبح کر کے اس کا گوشت

کھا جائیں گے اور کہاں بچ لیں گے۔

مَا جَاءَ فِي الْفَأْرَةِ تَقَعُ فِي السَّمْنِ وَالْبَدْءِ بِالْأَكْلِ قَبْلَ الصَّلَاةِ

چوہیا کے گھی میں گر جانے اور نماز سے پہلے کھانا شروع کرنے کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يُقَرَّبُ اِلَيْهِ عَشَاؤُهُ فَيَسْمَعُ قِرَاءَةَ الْإِمَامِ وَهُوَ فِي بَيْتِهِ فَلَا يَعْجَلُ عَنْ طَعَامِهِ حَتّٰى يَقْضِيَ حَاجَتَهُ مِنْهُ.

﴿نافع بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ کے لیے شام کا کھانا لایا جاتا اور وہ اپنے گھر میں امام کی قرأت سنتے ہوتے لیکن وہ کھانے میں جلدی نہ کرتے جب تک کہ اپنی حاجت پوری نہ کرلیں۔﴾

وضاحت :

دین کے معاملات میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے زیادہ کوئی آدمی متشدد نہ تھا۔ اس لیے ان کے متعلق یہ بات مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے کہ وہ امام کی قرأت سن رہے ہوں اور گھر میں اطمینان سے کھانا کھاتے رہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی رائے یہ رہی ہو کہ کھانا اگر سامنے آجائے تو کھانا کھا کر نماز ادا کرنی چاہیے۔

دینی معاملات میں میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہیؒ بھی بے حد محتاط تھے۔ ایک مرتبہ کچھ لوگ جمع تھے تو ایک صاحب نے کہا کہ نماز پڑھ لی جائے تو کھانا اطمینان سے کھایا جائے۔ مولانا فراہیؒ نے فرمایا کہ نہیں، کھانا پہلے کھا لیا جائے، پھر نماز اطمینان سے پڑھی جائے۔ میں نے کہا استاذ کا موقف ٹھیک ہے، اطمینان نماز کے لیے مطلوب ہے، کھانا کھانے کے لیے نہیں۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ عَنْ مَيْمُوْنَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ سُئِلَ عَنِ الْفَأْرَةِ تَقَعُ فِي السَّمْنِ فَقَالَ انْزِعُوْهَا وَمَا حَوْلَهَا فَاطْرَحُوْهُ

﴿حضرت میمونہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ چوہیا اگر گھی میں گر جائے تو کیا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو اور اس کے ارد گرد کے گھی کو نکال کر پھینک دو۔﴾

وضاحت :

گھی اگر جما ہوا ہو تو ایسا کرنے سے مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن اگر گھی پتلا ہو تو سارے کا سارا پھینکنا پڑے گا۔

مَا يُتَّقَى مِنَ الشُّؤْمِ

نحوست سے بچنے کے لیے کیا کیا جائے

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ أَبِي حَازِمِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ إِنْ كَانَ فَفِي الْفَرَسِ وَالْمَرْأَةِ وَالْمَسْكَنِ يَعْنِي الشُّؤْمَ.

﴿سہل بن سعد ساعدی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر نحوست ہو سکتی ہے تو گھوڑے میں، عورت میں اور گھر میں ہو سکتی ہے۔﴾

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ حَمْزَةَ وَ سَالِمٍ ابْنَيْ عَبْدِاللَّهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ عَبْدِاللَّهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ الشُّؤْمُ فِي الدَّارِ وَالْمَرْأَةِ وَالْفَرَسِ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نحوست گھر میں، عورت میں اور گھوڑے میں ہوتی ہے۔﴾

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّهُ قَالَ جَاءَتِ امْرَأَةٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ دَارٌ سَكَنَّاهَا وَالْعَدَدُ كَثِيرٌ وَالْمَالُ وَافِرٌ فَقَلَّ الْعَدَدُ وَذَهَبَ الْمَالُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ دَعُوهَا ذَمِيمَةً.

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئی تو اس نے کہا یا رسول اللہ ہم جس گھر میں رہتے ہیں جب اس میں آئے تو اللہ کی قسم گھر کے افراد بھی بہت تھے اور مال بھی وافر تھا۔ لیکن اب نہ تعداد رہی نہ مال رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس منحوس مکان کو چھوڑ دو۔﴾

وضاحت :

یہ تین روایتیں ہیں۔ پہلی میں إن كان (اگر ہو سکتی) ہے جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ ادھوری

روایت ہے۔ اس میں آگے یا پیچھے کا کچھ حصہ چھوٹا ہوا ہے۔ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے قطعی طور پر فرمایا کہ گھوڑے، عورت اور گھر تینوں میں نحوست ہوتی ہے۔ تیسری روایت میں ہے کہ ایک خاتون نے نبی ﷺ سے شکایت کی کہ جب ہم اپنے گھر میں آئے تھے تو کنبہ بڑا اور مال وافر تھا۔ اب کنبہ بھی چھوٹا ہو گیا ہے اور مال بھی ہوا ہو گیا ہے۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس گھر کے بارے میں آپ کا یہ خیال ہو اس کو چھوڑ دو۔

اگر روایات میں بات یوں ہوتی کہ بعض گھروں، بعض گھوڑوں اور بعض عورتوں میں نحوست ہوتی ہے تب تو گوارا تھی لیکن ان میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔ دوسری طرف قرآن میں گھوڑوں کے کردار کو نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سورہ عادیات میں فرمایا ہے کہ ناالتو، دیکھو تمہارے گھوڑے کتنے وفادار ہیں اور تم اپنے رب کے ناشکرے ہو۔ عربوں کا گھوڑوں سے متعلق کیا ذہن ہے آپ اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے ایک حدیث میں بھی آیا ہے کہ الخیل خیر المال (گھوڑا بہترین مال ہے) یہ تو مانا جا سکتا ہے کہ کسی گھوڑے میں نحوست ہو لیکن پوری جنس کے ساتھ اس قسم کا حکم لگا دینا، جیسا کہ روایت میں ہے، درست نہیں۔ عورتوں پر غور کیجیے تو اس میں حضرت مریم بھی ہیں اور فرعون کی بیوی بھی، جن کو قرآن نے اہل ایمان کے لیے نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اسی طرح حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ اور دوسری امہات المومنین بھی ہیں جن کی نیکی اس امت کے لیے ایک مثال ہے۔ تو کلیہ کے طور پر عورت میں نحوست ہونے کی بات صحیح نہیں اور جزوی طور پر روایت کا اطلاق کرنے کے لیے الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ شارحین نے ان روایتوں کی جو توجیہات کی ہیں ان کو پڑھ پڑھ کر تو میرا سر چکرا گیا اور کوئی بات بھی سیدھی نہیں کی گئی۔ البتہ حضرت عائشہؓ کی ایک وضاحت مسئلہ کو کسی قدر حل کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات جو ارشاد فرمائی تو اصل میں یہود کے عقیدہ کا حوالہ دیا تھا لیکن راویوں نے اس سیاق و سباق کے بغیر روایت کر دی۔ میرے نزدیک صرف یہ توجیہ ایسی ہے جس میں بات رہ جاتی ہے۔

مَا يُكْرَهُ مِنَ الْأَسْمَاءِ

ایسے نام جن میں ناگواری ہوتی ہے

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لِلَقْحَةٍ تُحْلَبُ مَنْ يَحْلُبُ هٰذِهِ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا اسْمُكَ فَقَالَ لَهُ الرَّجُلُ مُرَّةُ فَقَالَ لَهُ

رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ اجلِسْ ثُمَّ قَالَ مَنْ یَحْلُبُ ھٰذِہٖ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ لَہٗ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ مَا اسْمُکَ فَقَالَ حَرْبٌ فَقَالَ لَہٗ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ اجلِسْ ثُمَّ قَالَ مَنْ یَحْلُبُ ھٰذِہٖ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ لَہٗ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ مَا اسْمُکَ فَقَالَ یَعِیْشُ فَقَالَ لَہٗ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ احْلُبْ

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دودھ والی اونٹنی کے بارے میں پوچھا کہ اس کو کون دوہے گا تو ایک شخص کھڑا ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے۔ تو اس شخص نے کہا مرۃ۔ آپؐ نے فرمایا کہ آپ تشریف رکھو۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اس کو کون دوہے گا تو ایک شخص کھڑا ہوا۔ آپؐ نے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے۔ تو اس آدمی نے کہا کہ حرب۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تشریف رکھیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ اس کو کون دوہے گا تو ایک صاحب کھڑے ہوئے۔ آپؐ نے پوچھا جناب کا نام کیا ہے؟ تو اس نے کہا یعیش۔ آپ نے فرمایا کہ آپ دوہو۔﴾

وضاحت:

مرۃ کے معنی کڑوے اور تلخ کے ہیں۔ حرب جنگ کو کہتے ہیں۔ یعیش کے معنی ہیں زندگی پانے والا۔ پہلے دونوں ناموں میں بدشگونی پائی جاتی ہے جبکہ تیسرے نام کے معنی اچھے ہیں۔ نبی ﷺ نے تیسرے آدمی کو دودھ دوہنے کا حکم دیا۔ میرے نزدیک نام کی نامعقولیت پہلی چیز ہے جو سوء انفعال پیدا کرتی ہے اور بعض اوقات اس سے بڑے بڑے مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ فرض کریں کہ کسی گاؤں کا نام بہت ہی برا ہے اور بعد میں اس گاؤں میں ایک پیر صاحب پیدا ہو گئے اور گاؤں کے نام کے ساتھ شریف کا لفظ لگ گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں شریف کا لفظ سر پیٹ لیتا ہو گا۔ پس برا نام رکھنے میں ایک نحوست ہے۔ نام اچھے رکھنے چاہئیں۔ مبارک نام ہوں۔ یہاں یہ روایت مرسل ہے لیکن دوسری کتابوں میں موصول ہو گئی ہے۔

☐ حَدَّثَنِی مَالِکٌ عَنْ یَحْیَی بْنِ سَعِیدٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ لِرَجُلٍ مَا اسْمُکَ فَقَالَ جَمْرَۃُ فَقَالَ ابْنُ مَنْ فَقَالَ ابْنُ شِھَابٍ قَالَ مِمَّنْ قَالَ مِنَ الْحُرَقَۃِ قَالَ اَیْنَ مَسْکَنُکَ قَالَ بِحَرَّۃِ النَّارِ قَالَ بِاَیِّھَا قَالَ بِذَاتِ لَظًی قَالَ عُمَرُ اَدْرِکْ اَھْلَکَ فَقَدِ احْتَرَقُوا قَالَ فَکَانَ کَمَا

قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ

﴿امام مالک یحییٰ بن سعید سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک شخص سے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے تو اس نے کہا جمرہ۔ پھر پوچھا کہ آپ کے باپ کا کیا نام ہے تو اس نے کہا شہاب۔ پھر پوچھا کہ آپ کس قبیلے سے ہیں؟ تو اس نے کہا حرقہ قبیلے سے۔ حضرت عمرؓ نے پھر پوچھا کہ آپ کا دولت خانہ کہاں ہے تو اس نے کہا حرۃ النار میں۔ آپؓ نے کہا کہ کس حصے میں تو اس نے کہا ذات لظی میں۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا آپ اپنے گھر تشریف لے جائیں کیونکہ آپ کے اہل و عیال جل چکے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جیسے حضرت عمر نے فرمایا تھا ویسے ہی ہوا۔﴾

وضاحت :

جمرہ کے معنی انگارے کے ہیں۔ شہاب شعلہ ہوتا ہے۔ حرق جلنے کے معنی میں آتا ہے۔ حرۃ النار آگ کے الاؤ کو کہیں گے اور ذات لظی کے معنی ہیں شعلہ گھر۔ گویا آدمی اور اس کے والد، قبیلہ، مسکن وغیرہ سب کے ناموں میں آگ کا ذکر ہے۔

اگرچہ اتنے سارے اتفاقات کا جمع ہونا ناممکن تو نہیں لیکن اس میں یار لوگوں کی کارستانی ضرور ہے۔ اگر اصل میں کوئی کمی تھی تو وہ پوری کر لی گئی ہے۔

جب اس واقعہ میں تمام علامات موجود ہیں تو آخر محدثین میں سے کسی نے اس مقام اور خاندان کا کوئی پتہ کیوں نہیں چلایا۔ شارحین کے ہاں ایسی کوئی تحقیق نہیں ملتی۔ میرے نزدیک یہ مکالمہ ایک لطیفے سے زیادہ نہیں۔ لیکن لطیفہ اچھا ہے۔ اس کے مطابق حضرت عمرؓ نے اس شخص کے اہل و عیال کے جل کر ہلاک ہو جانے کی پیشگوئی کی جو پوری ہوئی۔ حضرت عمرؓ کو محدث کہا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑی صفت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بڑے بڑے واقعات اللہ میاں ان پر القا کر دیتے تھے۔ اگر اس بات کو ثابت کرنے کے لیے یہ لطیفہ بنایا گیا ہے تو بہت خوبصورت ہے۔ لیکن میرے نزدیک حضرت عمرؓ کا محدث ہونا اس روایت کا محتاج نہیں۔ وہ ذہین اور فطین انسان تھے۔ حالات پر غور کرنے والے تھے۔ وہ تاڑ جاتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ اسی طرح اخلاقی و روحانی امور سے متعلق بہت سے واقعات ہوتے ہیں کہ بعض لوگوں کے دل میں پہلے سے بات ڈال دی جاتی ہے اور بعد میں وہ سچے ثابت ہوتے ہیں۔

حضرت عمرؓ سے متعلق بعض ایسے واقعات بھی ہیں۔ وہ بہت بڑے مدبر تھے۔ حالات پر بہت دور تک ان کی نظر تھی اور بڑے اہم فیصلے کر دیتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا کہ بہت بڑی غلطی کر گئے لیکن نتائج سے معلوم ہوتا کہ نہیں بالکل ٹھیک فیصلہ تھا۔ حضرت خالدؓ جیسے سپہ سالار کو معزول کر دینا کوئی معمولی بات نہ تھی لیکن انہوں نے عین اس وقت ان کو معزول کیا جب کہ جنگ پورے شباب پر تھی۔

مَاجَاءَ فِي الْحِجَامَةِ وَ اِجَارَةِ الْحَجَّامِ

پچھنا لگانے اور پچھنا لگانے والے کی اجرت سے متعلق روایات

□ حدثني مالكٌ عَنْ حُمَيْدٍ الطَّوِيلِ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّهُ قَالَ احْتَجَمَ رَسُولُ اللهِ ﷺ حَجَمَهُ أَبُو طَيْبَةَ فَأَمَرَ لَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِصَاعٍ مِنْ تَمْرٍ وَ أَمَرَ أَهْلَهُ أَنْ يُخَفِّفُوا عَنْهُ مِنْ خَرَاجِهِ

﴿انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پچھنا لگوایا۔ ابو طیبہ نے پچھنا لگایا تو رسول اللہ ﷺ نے ایک صاع کھجور اجرت کے طور پر اس کو دلوائی اور اس کے مالکوں کو ہدایت کی کہ اس کا خراج ذرا کم کر دیں۔﴾

وضاحت:

پچھنا لگانا خون نکالنا ہوتا ہے۔ بعض گرم ممالک میں خون میں اتنا ہیجان پیدا ہو جاتا ہے جس سے سر درد اور دوسری خطرناک بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ آنحضرتؐ کے متعلق آیا ہے کہ آپ کو درد شقیقہ کی شکایت تھی۔ ایک پہلو میں شدید درد ہوتا تھا تو آپ خون نکلواتے تھے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں یہ عام طریقہ علاج تھا لیکن اس زمانے میں اس کی اہمیت باقی نہیں رہی۔ رہ گیا اس کی اجرت کا معاملہ تو نبی ﷺ نے اجرت دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خون نکالنے کی اجرت لینا جائز ہے۔

غلاموں کے اوپر ان کے مالک ایک رقم لگا دیا کرتے تھے کہ جو وہ کمائیں اس میں سے اتنی رقم ان کو ادا کر دیا کریں تو آنحضرت ﷺ نے ابو طیبہ کی رقم قدرے کم کرنے کی ہدایت فرمائی۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنْ كَانَ دَوَاءٌ يَبْلُغُ الدَّاءَ فَاِنَّ الْحِجَامَةَ تَبْلُغُهُ.

﴿امام مالک کی بلاغات میں سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر دوا مرض تک پہنچنے والی ہے تو پچھنا لگانا بھی اپنے مرض تک پہنچ جانے والا علاج ہے۔﴾

وضاحت :

اگرچہ جملہ مشروط ہے اس وجہ سے یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ آنحضرتؐ نے پچھنا لگانے کی تعریف فرمائی ہے، لیکن موقع تعریف ہی کا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بحث ہو رہی ہو کہ یہ طریقہ علاج مفید ہے یا نہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی دوا اپنے مرض کو پاتی ہے تو میرے نزدیک یہ بھی مرض کو پا لینے والا طریقہ علاج ہے۔ اس لیے کہ آنحضرتؐ خود پچھنا لگواتے تھے اور آپ کو فائدہ ہوتا تھا۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنِ ابْنِ مُحَيِّصَةَ الْاَنْصَارِيِّ اَحَدِ بَنِي حَارِثَةَ اَنَّهُ اسْتَاْذَنَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فِي اِجَارَةِ الْحَجَّامِ فَنَهَاهُ عَنْهَا فَلَمْ يَزَلْ يَسْاَلُهُ وَ يَسْتَاْذِنُهُ حَتّٰى قَالَ اَعْلِفْهُ نُضَّاحَكَ يَعْنِي رَقِيقَكَ.

﴿ابن شہاب ابن محیصہ انصاری سے جو بنی حارثہ کے قبیلے میں سے تھے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پچھنا لگانے والے کی اجرت کے متعلق اجازت چاہی تو آپؐ نے روک دیا۔ وہ برابر پوچھتے رہے اور اجازت مانگتے رہے یہاں تک کہ آپ نے فرمایا کہ اپنے اونٹوں پر پانی لانے والے لونڈوں یعنی اپنے غلاموں کو کھلا دو۔﴾

وضاحت :

ابن محیصہ انصاری نے اتنے اصرار سے جو یہ سوال کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کچھ غلام تھے جو پچھنا لگانے کا کام کرتے تھے اور ان پر انہوں نے خراج لگا رکھا تھا۔ آنحضرتؐ نے جس سے پچھنا لگوایا وہ بھی ابن محیصہ کے غلاموں میں سے تھا۔ نبی ﷺ اگر اجرت کو حرام قرار دے دیتے تو رزق کا یہ دروازہ بند ہو جاتا۔ لہٰذا آپ نے فرمایا اگر

و تو اپنے غلاموں کو کھلادو۔ مطلب یہ کہ یہ کمائی پسندیدہ نہیں، کراہت کے درجے میں آتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بعض چھوٹی موٹی خدمات ہوتی ہیں، ان کو معاش کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔ یہ لئیم ہونے کی علامت ہے۔ لیکن اگر کوئی ان کا معاوضہ دے تو قبول کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ دیہاتوں میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ بچے کو کوئی معمولی تکلیف ہوگئی اور کسی نے مشورہ دے دیا کہ یوں کرلو ٹھیک ہو جائے گا۔ تو اس طرح غریبوں کے کئی کام نکلتے ہیں اور ایسے مشوروں کی اجرت مقرر نہیں ہوتی۔ فی سبیل اللہ یہ کام ہوتے ہیں۔ البتہ یہ ہے کہ جیسے رسول اللہ ﷺ نے ابو طیبہ کو کچھ دے دیا جو انہوں نے لے لیا تو یہ ٹھیک ہے۔ گویا اجرت مقرر کرنا اور لینا درست نہیں۔ اگر کوئی دے تو قبول کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ اس سے دونوں روایتوں کو جمع کرنے کی صورت نکل آتی ہے۔

مَاجَاءَ فِی الْمَشْرِقِ

مشرق کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِینَارٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یُشِیْرُ اِلَی الْمَشْرِقِ وَ یَقُوْلُ هَا اِنَّ الْفِتْنَةَ هَاهُنَا اِنَّ الْفِتْنَةَ مِنْ حَیْثُ یَطْلُعُ قَرْنُ الشَّیْطَانِ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ مشرق کی طرف اشارہ کر کے فرما رہے تھے کہ اے لو فتنہ یہاں ہے۔ فتنے کا منبع وہاں ہے جہاں سے شیطان کا سینگ ابھرتا ہے۔﴾

وضاحت:

"جہاں سے شیطان کا سینگ ابھرتا ہے" سورج کے طلوع ہونے کے مقام کی تعبیر ہے۔ آپ نے مشرق کی طرف اشارہ کیا تو آپ کی مراد ایران اور عراق کے ممالک ہوں گے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان ممالک نے بڑے بڑے فتنوں کو جنم دیا ہے خواہ یہ فتنے عقائدی ہوں یا اخلاقی۔ شیعیت، تصوف، باطنیت اور فلسفیت یہ سب وہاں سے پیدا ہوئیں۔ اور ہمارے ہاں جو گمراہیاں پھیلی ہیں تو وہیں سے آئی ہیں۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ أَرَادَ أَنْ يَخْرُجَ إِلَى الْعِرَاقِ فَقَالَ لَهُ كَعْبُ الْأَحْبَارِ لَا تَخْرُجْ إِلَيْهَا يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ فَإِنَّ بِهَا تِسْعَةَ أَعْشَارِ السِّحْرِ وَبِهَا فَسَقَةُ الْجِنِّ وَبِهَا الدَّاءُ الْعُضَالُ.

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے عراق کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا تو ان کو کعب احبار نے کہا کہ اس کی طرف نہ نکلو وہاں تو دس میں سے ۹ حصے جادو ہے۔ بڑے بڑے طاقتور جنات ہیں اور نا قابل علاج بیماریاں ہیں۔﴾

وضاحت:

یہ کعب احبار کا قول ہے۔ وہ یہود کی قدیم تاریخ کے عالم تھے اور یہ معلومات اسی میں سے انھوں نے ہم کو تحفے میں دی ہیں۔ یہود کی اسیری بابل میں ہوئی اور وہیں سحر و ساحری اور ہاروت وماروت کے علم کا چرچا ہوا۔ یہ علاقہ سحر کا بڑا گڑھ رہا۔ انھی معلومات کی بنا پر کعب احبارؓ نے حضرت عمرؓ کو عراق جانے سے روکا ہوگا۔

مَاجَاءَ فِي قَتْلِ الْحَيَّاتِ وَمَا يُقَالُ فِي ذٰلِكَ

سانپوں کے مارنے کے بارے میں کیا احکام اور اقوال ہیں

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ أَبِي لُبَابَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ قَتْلِ الْحَيَّاتِ الَّتِي فِي الْبُيُوتِ.

﴿ابو لبابہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھریلو سانپوں کو مارنے سے روکا ہے۔﴾

وضاحت:

اس معاملہ میں ہم لوگوں کا احساس بہت شدید ہے۔ ہمارے دیار میں سانپ ایک خطرناک چیز ہے کہ اس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کو گھریلو مہمان بنانے کا کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ چونکہ سانپوں کی ہزاروں قسمیں ہیں جن میں زہریلے سانپ بھی ہیں اور بے ضرر بھی، اور سانپوں کے بارے میں جاننے والے تو یہ کہتے ہیں کہ اکثر سانپ زہریلے نہیں ہوتے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ نبی ﷺ نے بے ضرر سانپوں کے

بارے میں یہ ہدایت دی ہو کہ ان کو مارا نہ جائے۔ ایک روایت میں یہ آیا بھی ہے کہ جو سانپ چوہے کھاتے ہیں اور انسانوں کو کاٹتے نہیں، آنحضرتؐ نے ان کو مارنے سے روکا۔ تاہم ایک عام آدمی کے لیے یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ کون سا سانپ خطرناک ہے اور کونسا بے ضرر۔

□ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ سَائِبَةَ مَوْلَاةٍ لِعَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ قَتْلِ الْجِنَّانِ الَّتِى فِى الْبُيُوْتِ اِلَّا ذَا الطُّفْيَتَيْنِ وَالْاَبْتَرَ فَاِنَّهُمَا يَخْطِفَانِ الْبَصَرَ وَ يَطْرَحَانِ مَا فِى بُطُوْنِ النِّسَاءِ.

﴿نافع حضرت عائشہؓ کی آزاد کردہ لونڈی سائبہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے منع کیا ہے ان سانپوں کے مارنے سے جو گھروں میں رہتے ہیں بجز ان کے جو اوپر دھاری والے ہوں یا دم کٹے ہوں اس لیے کہ یہ نگاہ اچک لیتے اور عورتوں کے حمل گروا دیتے ہیں۔﴾

وضاحت :

سانپوں کی قسموں کا کچھ شمار نہیں۔ ہو سکتا ہے مدینہ منورہ میں دھاری والے اور دم کٹے دو قسم کے سانپوں کے متعلق مشہور روایت یہ رہی ہو کہ ان کے اثرات آنکھوں پر بھی پڑ سکتے ہیں اور ان کے خوف سے عورتوں کے حمل بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آنحضرتؐ نے ان کی یہ حیثیت تسلیم کی بلکہ یہ حضرت عائشہؓ کے قول کا حصہ ہو سکتا ہے جس میں انہوں نے مشہور روایت بیان کر دی۔

□ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ صَيْفِىٍّ مَوْلَى بَنِى اَفْلَحَ عَنْ اَبِى السَّائِبِ مَوْلَى هِشَامِ بْنِ زُهْرَةَ اَنَّهٗ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى اَبِى سَعِيْدِ الْخُدْرِىِّ فَوَجَدْتُهٗ يُصَلِّى فَجَلَسْتُ اَنْتَظِرُهٗ حَتّٰى قَضٰى صَلَاتَهٗ فَسَمِعْتُ تَحْرِيْكًا تَحْتَ سَرِيْرٍ فِى بَيْتِهٖ فَاِذَا حَيَّةٌ فَقُمْتُ لِاَقْتُلَهَا فَاَشَارَ اَبُوْ سَعِيْدٍ اَنِ اجْلِسْ فَلَمَّا انْصَرَفَ اَشَارَ اِلٰى بَيْتٍ فِى الدَّارِ فَقَالَ اَتَرٰى هٰذَا الْبَيْتَ فَقُلْتُ نَعَمْ قَالَ اِنَّهٗ قَدْ كَانَ فِيْهِ فَتًى حَدِيْثٌ عَهْدُهٗ بِعُرْسٍ فَخَرَجَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِلَى الْخَنْدَقِ فَبَيْنَا هُوَ بِهٖ اِذْ اَتَاهُ الْفَتٰى يَسْتَاْذِنُهٗ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ائْذَنْ لِىْ اُحْدِثُ بِاَهْلِىْ عَهْدًا فَاَذِنَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَقَالَ

خُذْ عَلَيْكَ سِلَاحَكَ فَاِنِّي اَخْشَى عَلَيْكَ بَنِي قُرَيْظَةَ فَانْطَلَقَ الْفَتَى اِلَى اَهْلِهِ فَوَجَدَ امْرَاَتَهُ قَائِمَةً بَيْنَ الْبَابَيْنِ فَاَهْوَى اِلَيْهَا بِالرُّمْحِ لِيَطْعَنَهَا وَ اَدْرَكَتْهُ غَيْرَةٌ فَقَالَتْ لَا تَعْجَلْ حَتَّى تَدْخُلَ وَ تَنْظُرَ مَا فِي بَيْتِكَ فَدَخَلَ فَاِذَا هُوَ بِحَيَّةٍ مُنْطَوِيَةٍ عَلَى فِرَاشِهِ فَرَكَزَ فِيهَا رُمْحَهُ ثُمَّ خَرَجَ بِهَا فَنَصَبَهُ فِي الدَّارِ فَاضْطَرَبَتِ الْحَيَّةُ فِي رَاْسِ الرُّمْحِ وَ خَرَّ الْفَتَى مَيِّتًا فَمَا يُدْرَى اَيُّهُمَا كَانَ اَسْرَعَ مَوْتًا الْفَتَى اَمِ الْحَيَّةُ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ اِنَّ بِالْمَدِيْنَةِ جِنًّا قَدْ اَسْلَمُوْا فَاِذَا رَاَيْتُمْ مِنْهُمْ شَيْئًا فَاٰذِنُوْهُ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ فَاِنْ بَدَا لَكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاقْتُلُوْهُ فَاِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ.

﴿ہشام بن زہرہ کے آزاد کردہ غلام ابو سائب بیان کرتے ہیں کہ میں ابو سعید خدری کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں انتظار میں بیٹھ گیا۔ جب انہوں نے نماز پوری کر لی تو میں نے ان کے گھر میں چارپائی کے نیچے کسی چیز کی حرکت کی آواز سنی۔ دیکھا تو ایک سانپ ہے۔ میں اٹھا کہ اس کو مار دوں تو ابو سعید نے اشارہ کیا کہ تشریف رکھو۔ جب سانپ چلا گیا تو ابو سعید نے گھر میں ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ کیا تم اس کمرے کو دیکھتے ہو۔ میں نے کہا ہاں۔ کہنے لگے کہ اس میں ایک نوجوان تھا جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خندق کی جنگ کے لیے نکلا۔ ابھی وہ وہیں تھے کہ نوجوان آنحضرتؐ کے پاس اجازت لینے حاضر ہوا۔ اس نے کہا یا رسول اللہ، مجھے اجازت دیں کہ گھر والوں سے ذرا مل آؤں۔ رسول اللہ ﷺ نے اجازت دے دی اور فرمایا کہ اپنے ہتھیار ساتھ لے جانا کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ بنی قریظہ کے لوگ تم کو نقصان نہ پہنچائیں۔ نوجوان گھر آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی دروازے کے درمیان کھڑی ہے۔ اس نے اسے نیزہ مارنا چاہا کیونکہ اس کو غیرت لاحق ہو گئی تھی تو بیوی نے کہا جلدی نہ کرو، ذرا اندر داخل ہو کر دیکھو کہ گھر میں کیا ہے۔ وہ داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک سانپ بستر پر کنڈلی مارے ہوئے ہے۔ اس نے اپنا نیزہ اس میں جما کر اس کو صحن میں لا کر گاڑ دیا تو سانپ نیزے کی نوک پر تڑپنے لگا۔ ادھر نوجوان گرا اور مر گیا۔ کہا نہیں جا سکتا کہ کس کی موت جلد واقع ہوئی، سانپ کی یا نوجوان کی۔ اس واقعہ

کا رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ مدینہ میں جن ہیں جو اسلام لا چکے ہیں۔ تو جب ان میں سے کسی کو پاؤ تو ان کو تین دن تک کی اجازت دو۔ اس کے بعد اگر تم پر کوئی بات ظاہر ہو جائے تو قتل کر دو کہ وہ شیطان ہے۔

وضاحت:

جہاں تک روایت میں بیان کردہ واقعہ کا تعلق ہے اس میں کوئی چیز وضاحت طلب نہیں۔ البتہ روایت کے آخری حصہ میں جہاں رسول اللہ ﷺ کے اس واقعہ پر تبصرہ کا بیان ہے، کئی باتیں غور طلب ہیں۔

اس میں پہلی غور طلب بات یہ ہے کہ سانپ اگر آپ گھر میں دیکھیں تو تین دن تک وہ آپ کا مہمان ہو گا۔ آپ اس کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔ اس کے بعد اگر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ یہ سانپ جنات میں سے نہیں ہے تب آپ اس کو قتل کر سکتے ہیں۔ شارحین نے ترمذی اور ابوداؤد کی روایت کی روشنی میں اس کا جو طریق کار تجویز کیا ہے اس کے مطابق آپ سانپ کو مخاطب کر کے یہ کہتے رہیں گے کہ آپ کا جو معاہدہ نوح علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام اور فلاں اور فلاں سے ہو چکا ہے اس کے حوالہ سے ہم آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ اس طرح واسطہ دینے کے بعد وہ اگر مکان نہیں چھوڑتے اور چوتھے دن بھی نظر آتے ہیں تو اب آپ کو ان کے قتل کا اختیار حاصل ہو جائے گا۔ اس طریق کار میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا واسطہ دینے کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن حضرت نوح علیہ السلام کا جنات سے تعلق واضح نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی نفس واقعہ کی جو وضاحت نقل ہوئی ہے اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ مدینہ منورہ کے جن اسلام لا چکے تھے۔ اور انہی میں سے ایک جن نے سانپ کا روپ دھار رکھا تھا۔ جب نوجوان نے اس کو نیزہ مار کر قتل کر دیا تو جنات نے قصاص میں نوجوان کو بھی مار ڈالا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نوجوان کو تو سانپ کی اصلیت معلوم نہیں تھی۔ اس نے تو اس کو ایک موذی جانور سمجھ کر مغالطہ میں مار دیا تھا۔ یہ قتل عمد نہ تھا تو مسلمان جنات کو یہ حق کہاں سے حاصل ہو گیا کہ وہ قصاص میں اس کو قتل کر دیں۔ اسلامی شریعت کی رو سے ان کا اقدام تعدی کہا جائے گا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جنات صالحین میں سے بھی ہوتے اور شیاطین میں سے بھی، تو یہ قرآن سے ثابت ہے لیکن قرآن مجید سے قطعی طور پر یہ بھی ثابت ہے کہ وہ خواہ شیاطین میں سے ہوں یا صالحین میں سے،

کسی کو ہمارے اوپر اختیار وسوسہ اندازی سے زیادہ کا نہیں دیا گیا۔ اگر یہ جنات صالحین میں سے تھے تو انہوں نے نوجوان کو قتل کر کے اسلامی شریعت کی خلاف ورزی بھی کی اور ان حدود سے تجاوز بھی کیا جو ان کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ ان کو اس بات کا اختیار ہے کہ جس کو چاہیں اندھا کر دیں، جس کو چاہیں قتل کر دیں اور جس عورت کا چاہیں حمل گرا دیں تب تو شیاطین اور جنات کو وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے جس کی نفی قرآن مجید نے کی ہے۔

اس روایت میں یہ مفروضہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ جس طرح انسانوں کے رسول ہیں اسی طرح جنات کے بھی رسول ہیں۔ یہ بات ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ نبوت کے جو قاعدے ہیں اس مفروضہ سے ان کی نفی ہوتی ہے۔ نبی اور رسول کے لیے ضروری ہے کہ وہ مخاطب قوم کا فرد ہو۔ انہی کی زبان بولتا ہو اور انہی کی روایات اور نظریات کے اندر رہ کر اس کی پرورش ہوئی ہو۔ اسی بنا پر قرآن نے واضح کیا ہے کہ کوئی فرشتہ بھی انسانوں کے لیے نبی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کوئی انسان جنات کے لیے رسول نہیں ہو سکتا۔ یہ اصولی باتیں ہیں اور سنت الٰہی میں ان کو تبدیل نہیں کیا جاتا۔ وہ باتیں جو تمام بنی نوع انسان اور دوسری مخلوق کے درمیان مشترک ہیں جیسے ایک خدا کا تصور اور اس کی عبادت، شرک سے اجتناب وغیرہ تو ان میں اشتراک ہو سکتا ہے۔ لہٰذا آنحضرتؐ کے متعلق یہ ماننا مشکل ہے کہ آپ جنات کے بھی رسول تھے۔ جنات سے آنحضرت کی ملاقات تو ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ انہوں نے قرآن کی تعریف کی لیکن تعریف کرنا الگ چیز ہے اور اس کی شریعت کا تبع ہونا الگ چیز ہے۔ ان کے تقاضے اور مطالبے اور ان کا کھانا پینا الگ ہے۔ ان کے اور ہمارے درمیان کوئی اشتراک نہیں جبکہ یہ روایت سنت اللہ کے خلاف اس اشتراک پر مبنی ہے۔ میرے نزدیک یہ روایت ہمارے ہاں اسرائیلیات کے زیر اثر آئی ہے۔ یہود کے ہاں جنات کا بڑا مقام ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے دور کے متعلق تو یہودی لٹریچر بھرا پڑا ہے جو جنات کے تصور سے بالکل آراستہ ہے۔ دوسری قوموں مثلاً ہندوؤں کے ہاں ناگ پوجا کا خاص مقام ہے۔ ناگ پوجا بڑے اہتمام سے کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے ہاں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ جنات مختلف بھیس میں نمایاں ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں یہ تصور ہے کہ سانپ ان کے مقدس بھگوان کے طور پر آتے ہیں اس وجہ سے خطرے کو ملحوظ رکھ کر وہ ان کی پوجا کرتے ہیں تاکہ نقصان نہ پہنچائیں۔ ہمارے ہاں یہ پورا کا پورا تصور حضرت ابو سعید خدری کے ذریعے سے لا کر رکھ دیا گیا ہے۔ پیچھے جو کعب احبار کی روایت گزری ہے اس میں بھی یہ ہے کہ عراق میں بڑا ہی اخطرناک جن

پڑا ہے۔ ہمارے ہاں یہ مشرکانہ تصور، تسخیر جنات کا عمل اور نقش سلیمانی کا رواج یہود ہی سے آیا ہے۔ اور ہمارے نیک بندوں نے ہماری کتابوں میں گھسا دیا ہے۔ ان چیزوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

مَا يُؤْمَرُ بِهِ مِنَ الْكَلَامِ فِى السَّفَرِ

سفر میں کلام کے بارے میں احکام

☐ حَدَّثَنِى مَالِكٌ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ اِذَا وَضَعَ رِجْلَهُ فِى الْغَرْزِ وَهُوَ يُرِيدُ السَّفَرَ يَقُولُ بِاسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِى السَّفَرِ وَالْخَلِيفَةُ فِى الْاَهْلِ اَللّٰهُمَّ ازْوِلَنَا الْاَرْضَ وَهَوِّنْ عَلَيْنَا السَّفَرَ اَللّٰهُمَّ اِنِّى اَعُوذُبِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَ مِنْ كَآبَةِ الْمُنْقَلَبِ وَ مِنْ سُوءِ الْمَنْظَرِ فِى الْمَالِ وَالْاَهْلِ.

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رکاب میں پاؤں رکھتے اور ارادہ سفر ہوتا تو آپ یہ دعا فرماتے۔ اللہ کے نام سے۔ اے اللہ تو ہی سفر میں ساتھی ہے اور تو ہی اہل اور مال میں پیچھے رہنے والا ہے۔ اے اللہ ہمارے لیے زمین کو تہ فرما اور ہمارے سفر کو آسان کر۔ اے اللہ، میں تیری پناہ مانگتا ہوں سفر کی کلفتوں سے اور برے لوٹنے سے اور اہل و مال میں بد نمائی سے۔﴾

وضاحت :

اس روایت کے الفاظ ہی بتاتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے الفاظ ہیں اور معنویت کے لحاظ سے بہت ارفع ہیں۔ البتہ یہ بات ہے کہ اس کے مختلف ٹکڑے مختلف روایات سے لیے گئے ہیں۔ اس سے ایک خوبی تو یہ پیدا ہو گئی ہے کہ تمام کلمات ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں، لیکن ایک منظم دعا کی شان اس میں نہیں رہ گئی۔ یہ ایک مشہور روایت ہے اس کے باوجود معلوم نہیں کہ کس ذریعہ سے یہ امام صاحب کو پہنچی ہے۔

☐ حَدَّثَنِى مَالِكٌ عَنِ الثِّقَةِ عِنْدَهُ عَنْ يَعْقُوبَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْاَشَجِّ عَنْ بُشْرِ بْنِ سَعِيدٍ عَنْ سَعْدِ ابْنِ اَبِى وَقَّاصٍ عَنْ خَوْلَةَ بِنْتِ حَكِيمٍ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ نَزَلَ مَنْزِلًا فَلْيَقُلْ اَعُوذُبِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ فَاِنَّهُ لَنْ يَضُرَّهُ شَىْءٌ حَتّٰى يَرْتَحِلَ.

﴿خولہ بنت حکیم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی منزل پر اترے اور یہ دعا پڑھ لے کہ میں اللہ تعالیٰ کے کامل کلمات کے ذریعہ سے اس کی مخلوق کے شر سے پناہ مانگتا ہوں، تو اس وقت تک اسے کوئی چیز شر نہیں پہنچائے گی جب تک کہ وہاں سے کوچ نہ کر جائے۔﴾

وضاحت:

اس روایت میں اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ آپ سفر کے دوران جہاں بھی اتریں تو یہ کلمات ادا کریں کہ اے اللہ، میں تیری تمام صفات، نشانیوں اور احکام کے حوالے سے تیری ہر مخلوقات کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔ یہ نہایت عمدہ دعا ہے جس میں تمام آفات و مصائب کا احاطہ ہو جاتا ہے اور ان سے رب کی پناہ مانگی جاتی ہے۔

آپ خواہ کسی فائیو سٹار ہوٹل میں ہی اتریں خطرات ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اور آپ ان سے اللہ کی مدد کے بغیر مامون نہیں ہو سکتے۔ روایت کا آخری حصہ غور طلب ہے۔ دعا کے الفاظ ادا کر لینے سے اس بات کی ضمانت سمجھ میں نہیں آتی کہ جب تک آپ کوچ نہ کریں گے آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ دعا کے بعد آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ امید ہے ایسا ہو گا لیکن اس میں قطعیت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ دعا کی قبولیت مشیت الٰہی کے تحت ہے۔ صحیح وقت پر صحیح دعا کی جائے تو اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرماتے ہیں لیکن قبولیت کا اظہار ضروری نہیں کہ فوراً ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کسی اور مناسب وقت پر ہو۔ یہ بات بھی ہے کہ دعا اس شکل میں قبول نہ ہو جس شکل میں آپ نے چاہا ہو۔ بلکہ اس سے بہتر شکل میں قبول ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دعا قبول نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی قبولیت کو حکمت کے خلاف سمجھتے ہوں۔ جب تک آپ یہ بات نہ مانیں مسئلہ حل نہیں ہو گا اور بڑی مایوسیاں پھیلیں گی۔ میں نے ساری زندگی دعاؤں میں گزاری ہے۔ کتنی دعائیں ہیں جو آج تک قبول نہیں ہوئیں لیکن میں یہی کہتا ہوں کہ اے اللہ، تیرا انعام تو مجھی سے مانگے گا۔ اگر دعا منظور نہیں ہوئی تو بہتر نتیجے سامنے آئے ہیں۔ اس میں برکتیں ہوئی ہیں۔

میرے نزدیک اس روایت میں لن یضرہ شی کا جملہ اس قطعیت کے ساتھ جو آیا ہے تو کسی راوی کی غلط ترجمانی کا نتیجہ ہے۔ اس کی ذمہ داری آنحضرت ﷺ پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ عن الثقة عندہ سے مراد اگر زہری ہیں تو مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے متعلق یہ معلوم ہے کہ اگر طبیعت میں نشاط ہو تو بات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتے ہیں اور اگر کسل ہو تو چھوڑ دیتے ہیں۔

مَاجَاءَ فِي الْوَحْدَةِ فِي السَّفَرِ لِلرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ

مردوں اور عورتوں کے اکیلے سفر کرنے کے بارے میں روایات

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ حَرْمَلَةَ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ الرَّاكِبُ شَيْطَانٌ وَالرَّاكِبَانِ شَيْطَانَانِ وَالثَّلَاثَةُ رَكْبٌ.

﴿عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اکیلا سوار ایک شیطان اور دو سوار دو شیطان ہوتے ہیں اور تین سوار مل کر قافلہ بنتا ہے۔﴾

وضاحت:

بعض لوگوں نے اس روایت کو لغوی معنوں میں لیا ہے جو کہ درست نہیں۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ اکیلا آدمی شیطان کے زیادہ نرغے میں ہوتا ہے۔ اس صورت میں دوسرا جملہ درست نہیں ہوتا کیونکہ اگر دو آدمی ہوں تب وہ شیطان کے دوہرے نرغے میں تو نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ اس صورت میں شیطان کا نرغہ کچھ کم ہو جاتا ہے تب بات بنتی ہے۔ اس لیے معنی کے لحاظ سے جتنی بھی توجیہیں کی گئی ہیں میرا دل ان پر مطمئن نہیں۔ الفاظ کے لحاظ سے میرے نزدیک اگلی روایت آنحضرت ﷺ کے فرمان کی ٹھیک ترجمانی کرتی ہے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ حَرْمَلَةَ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ الشَّيْطَانُ يَهُمُّ بِالْوَاحِدِ وَالِاثْنَيْنِ فَإِذَا كَانُوا ثَلَاثَةً لَمْ يَهُمَّ بِهِمْ.

﴿سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شیطان قصد کرتا ہے اکیلے کا اور دو کا، اور اگر تین ہوں تو پھر ان کا قصد نہیں کرتا۔﴾

وضاحت:

میں اس روایت کو اصل مانتا ہوں۔ یہ بات یاد رکھیے کہ یہ تذکرہ اس سفر کا ہے جب صحراؤں کا پیدل سفر ہوتا تھا یا زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ سواری اونٹ تھی اور ہر قدم مخدوش ہوتا تھا۔ تب ساتھی کی بڑی ضرورت تھی۔ آدمی تنہا سفر کرتا تو اس کے لیے بڑے خطرات تھے، دو ساتھی ہوتے تو قدرے کم خطرہ ہوتا اور تین سے جماعت بن

جاتی تھی۔ جماعت کی شکل میں اللہ تعالیٰ برکت ڈال دیتا ہے۔ کئی بڑے اہم سفر ہیں جن میں آنحضرتؐ نے دو کے ساتھ سفر کیا ہے۔ آپ کے سفر ہجرت میں گائیڈ کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی آپ کے ہمراہ تھے۔ لہٰذا اس روایت کی توجیہ اس طرح کرنی جائے گی کہ بوقت ضرورت خاص مصالح کے پیش نظر تین سے کم کے ساتھ بھی سفر کیا جا سکتا ہے۔

☐ حَدَّثَنِی مَالِکٌ عَنْ سَعِیدِ بْنِ اَبِی سَعِیدٍ الْمَقْبُرِیِّ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَایَحِلُّ لِامْرَاَةٍ تُؤمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ تُسَافِرُ مَسِیرَةَ یَوْمٍ وَلَیْلَةٍ اِلَّا مَعَ ذِی مَحْرَمٍ مِنْهَا.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی ایسی عورت کے لیے، جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والی ہے، یہ جائز نہیں کہ وہ ایک دن اور ایک رات کا سفر کسی محرم کے بغیر کرے۔﴾

وضاحت:

مالکیہ اور شوافع کے نزدیک منظم قافلے کے ساتھ عورت بغیر محرم کے سفر کر سکتی ہے۔ کیونکہ اس میں اس کے لیے خطرات نہیں ہوتے۔ بعض فقہاء کی رائے میں بوڑھی عورتوں کے لیے قید نہیں جبکہ دوسرے ہر عورت کے لیے محرم کی قید لگاتے ہیں۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے، اس کے بوڑھی ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ البتہ آج کل کے زمانے کے لحاظ سے مدت کا تعین بھی کرنا پڑے گا اور فاصلے کا بھی۔ کیونکہ اب ایک دن میں امریکہ پہنچنا ممکن ہو گیا ہے۔ اس بارے میں فقہاء نے جو بحثیں اٹھائی ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ نئے حالات کے لحاظ سے اس معاملہ میں اجتہاد کی ضرورت ہے۔

مَا یُؤمَرُ بِهِ مِنَ الْعَمَلِ فِی السَّفَرِ
سفر میں کیا کرنے کا حکم ہے

☐ حَدَّثَنِی مَالِکٌ عَنْ اَبِی عُبَیْدٍ مَوْلٰی سُلَیْمَانَ بْنِ عَبْدِالْمَلِکِ عَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ

يرفعهُ قالَ انّ اللهَ تباركَ و تعالی رفیقٌ یحبُّ الرِّفقَ و یرضی به و یعینُ علیه مالا یعینُ علی العنفِ فاذا رکبتُم هٰذه الدّوابَ العُجمَ فانزلوها منازلها فانْ کانتِ الارضُ جدبةً فانجوا علیها بنقیها و علیکم بسیرِ اللّیلِ فانّ الارضَ تطوی باللّیلِ مالا تطوی بالنّهارِ و ایّاکم والتّعریسَ علی الطّریقِ فانّها طُرقُ الدّوابِ و مأوی الحیّاتِ.

﴿خالد بن معدان مرفوع روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نرم ہیں، نرمی کو پسند کرتے اور اس سے راضی ہوتے ہیں، اور اس پر ایسی مدد کرتے ہیں جو وہ شدت کی صورت میں نہیں کرتے۔ تو جب تم ان بے زبان جانوروں پر سوار ہوا کرو تو ان کو ان کی منزلوں میں ٹھہراؤ۔ اگر زمین بنجر ہو تو نکل جانے کی کوشش کرو قبل اس کے کہ ان کی چربی گھل جائے۔ اور رات کو سفر کرنے کی کوشش کیا کرو کیونکہ رات میں زمین آسانی سے طے ہوتی ہے جو کہ دن میں نہیں ہوتی۔ اور راستے میں اترنے سے بچو اس لیے کہ وہ سواریوں کا راستہ بھی ہوتا ہے اور سانپوں کا اڈہ بھی۔﴾

وضاحت:

ظاہر ہے یہ نصیحتیں اس زمانے کے اونٹوں کے سفر سے متعلق ہیں اور تجربہ پر مبنی بہت عمدہ ہدایات ہیں۔ اگر یہ راوی کے تجربات ہیں تب بھی ٹھیک ہے۔ اور اگر آنحضرتؐ نے فرمایا ہے تو نور "علیٰ نور" ہے۔ غالباً اسی خیال سے انہوں نے یرفعه کہہ دیا تاکہ لوگ اس کو راوی کے اپنے تجربات پر محمول نہ کریں۔

یہ ہدایت کہ اللہ تعالیٰ کو نرمی پسند ہے۔ وہ بندوں کے ساتھ خود نرمی کا معاملہ کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ بندے بھی یہی صفت اپنائیں، محض اونٹوں کے سفر کے لیے نہیں بلکہ زندگی کے تمام معاملات کے لیے ہے۔ سختی پسند آدمی بالعموم معاملات کو بگاڑ لیتا ہے۔ نرم خوئی سے وہ کام بھی نکل آتے ہیں جو سختی سے نکالنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نرمی پسند آدمی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص مدد حاصل ہوتی ہے جس سے سختی پسند آدمی محروم رہ جاتا ہے۔

جانوروں کو منزلوں پر پڑاؤ کرانے کی ہدایت اس لیے ہے کہ وہاں پانی اور چارا فراہم ہوتا ہے۔ آپ منزل کے بغیر اتریں تو آپ اپنا توشہ دان نکال کر خود تو کھالیں گے لیکن بیچارے جانور بھوکے پیاسے رہیں گے۔ لہٰذا پڑاؤ

کرتے وقت موزوں جگہ کا انتخاب نہایت ضروری ہے۔

عرب میں کئی علاقے بنجر اور صحرائی ہیں اور طویل فاصلوں تک ان میں نہ سبزہ نظر آتا نہ پانی ملتا ہے۔ایسے علاقوں میں تیزی سے سفر کرنے کی ہدایت فرمائی تاکہ جب تک جانور صحت مند اور فربہ ہوں وہ بنجر علاقے سے نکل جائیں۔اس دوران میں ان کی چربی ان کے لیے قوت کا باعث بنے اور وہ سفر کی کلفت برداشت کر سکیں۔

عرب میں رات کو سفر کرنے کی روایت بھی موجود تھی۔ متعدد روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ نبی ﷺ نے رات میں سفر کیے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ دن میں شدید گرمی ہوتی ہے، پیاس زیادہ لگتی ہے اور لو میں سفر سہولت سے نہیں کٹتا۔ صحرائی رات خنک ہوتی ہے اور سفر تیزی سے طے ہوتا ہے۔ شب میں پڑاؤ کرنے کے بارے میں آنحضرتؐ نے ہدایت فرمائی کہ قافلہ چلتے راستے سے ہٹ کر قیام کرے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جانور اپنے جانے پہچانے راستہ پر چلنے کے عادی ہوتے ہیں اور قافلے کا راستے کے اوپر پڑاؤ ان کے لیے مشکل پیدا کر سکتا ہے۔اسی طرح سانپ اور دوسرے خطرناک جانور بھی عموماً عام راستہ ہی اختیار کرتے ہیں۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ سُمَيٍّ مَوْلَى أَبِي بَكْرٍ عَنْ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ السَّفَرُ قِطْعَةٌ مِنَ الْعَذَابِ يَمْنَعُ أَحَدَكُمْ نَوْمَهُ وَ طَعَامَهُ وَ شَرَابَهُ فَإِذَا قَضَى أَحَدُكُمْ نَهْمَتَهُ مِنْ وَجْهِهِ فَلْيُعَجِّلْ إِلَى أَهْلِهِ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے۔وہ تمھیں تمہاری نیند سے اور کھانے پینے سے محروم رکھتا ہے۔ توجب کوئی شخص صحیح طریقے سے اپنی ضرورت پوری کرلے تو جلد گھر واپس لوٹے۔﴾

وضاحت:

یہ بات بھی تجربات پر مبنی اور بڑی معقول ہے۔ سفر چاہے آج کل کا ہو یا اس زمانے کا، سفر و حضر میں کچھ فرق تو ضرور ہوتا ہے۔ آدمی جب بھی گھر سے باہر ہوگا روزانہ کے معمولات میں لازماً خلل واقع ہوگا۔

بعض لوگ اپنی زندگی سفر میں گزارتے اور اسی میں لطف پاتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ لوگ وہ ہوتے ہیں جن کے لیے گھر میں پابندی ہوتی ہے ورنہ کوئی معقول آدمی ایسا نہیں کر سکتا۔

اَلْأَمْرُ بِالرِّفْقِ بِالْمَمْلُوكِ

غلام کے ساتھ نرم رویہ کا حکم

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِلْمَمْلُوكِ طَعَامُهُ وَكِسْوَتُهُ بِالْمَعْرُوفِ وَلَا يُكَلَّفُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا يُطِيقُ.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غلام کے لیے اس کا کھانا اور اس کا کپڑا دستور کے مطابق ہے اور اس پر کسی ایسے کام کا بوجھ نہ ڈالا جائے جو اس کی طاقت سے زیادہ ہو۔﴾

وضاحت :

دستور کے مطابق کا مطلب یہ ہے کہ اس پسندیدہ طریقہ کے مطابق جو معاشرہ میں رائج ہو اور یہ مطلب بھی ہے کہ جو آپ کھائیں اس کو بھی کھلائیں اور جو خود پہنیں اس کو بھی پہنائیں۔ معروف اسلامی قانون کا ماخذ بھی ہے۔ لہٰذا اس کو نظائر کی روشنی میں معین کرنا ہوگا۔ عربوں کے ہاں معروف یہ تھا کہ کھانا پکا کر درمیان میں رکھ دیتے اور اردگرد سب چھوٹے بڑے نوکر اور خود بیٹھ جاتے اور کھانا شروع کر دیتے۔ نوکر کے ساتھ جو سلوک ہے وہی غلام کے ساتھ بھی ہوگا بلکہ وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔ اشتراکیت پسندوں کے لیے یہ روایتیں قابل غور ہیں۔ اس سے بہتر طریقہ مارکس کے جد امجد بھی نہیں بتا سکتے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ يَذْهَبُ إِلَى الْعَوَالِي كُلَّ يَوْمِ سَبْتٍ فَإِذَا وَجَدَ عَبْدًا فِي عَمَلٍ لَا يُطِيقُهُ وَضَعَ عَنْهُ مِنْهُ.

﴿مالک کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ ہر ہفتے کے دن مدینہ کی بالائی بستیوں کی طرف نکل جایا کرتے تھے اور اگر دیکھتے کہ کوئی غلام ایسے کام میں لگایا گیا ہے جو اس کی طاقت سے زیادہ ہے تو اس کو کم کر دیتے۔﴾

وضاحت :

’عوالی‘ سے مراد مدینہ منورہ کے مشرق میں واقع مضافاتی بستیاں ہیں جو نبی ﷺ کے زمانہ میں تو شہر سے

کچھ فاصلے پر تھیں لیکن اب اس کا حصہ بن چکی ہیں۔ حضرت عمرؓ ایک بیدار حکمران تھے۔ مدینہ میں ہر وقت نگرانی ممکن تھی، مضافاتی قریوں کی نگرانی کے لیے بھی وہاں میں جایا کرتے۔ عوالی کے لیے تو انہوں نے ایک دن مخصوص کر رکھا تھا۔ وہ حالات کا جائزہ لیتے۔ اگر کسی غلام سے زیادہ مشقت لی جا رہی ہوتی تو اس میں کمی کا حکم دیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حکومت ایسے معاملات میں دخل دے سکتی ہے۔ کمزوروں کو ظالم مالکوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ جب تک اس طرح کا حاکم نہ ہو معاشرہ کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ آج کل تو اخباروں کی حکمرانی ہے۔ لیڈر لوگ ان کے مشوروں پر چلتے اور ان کے پراپیگنڈے سے اسی طرح گھبراتے ہیں جس طرح اپنی دھمکات سے گھبراتے ہیں۔ ایسے لیڈر معاشرہ کی اصلاح کیا خاک کریں گے!

❏ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَمِّهِ أَبِي سُهَيْلِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ سَمِعَ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ وَهُوَ يَخْطُبُ وَهُوَ يَقُولُ لَا تُكَلِّفُوا الْأَمَةَ غَيْرَ ذَاتِ الصَّنْعَةِ الْكَسْبَ فَإِنَّكُمْ مَتَى كَلَّفْتُمُوهَا ذٰلِكَ كَسَبَتْ بِفَرْجِهَا وَلَا تُكَلِّفُوا الصَّغِيرَ الْكَسْبَ فَإِنَّهُ إِذَا لَمْ يَجِدْ سَرَقَ وَ عِفُّوا إِذَا أَعَفَّكُمُ اللّٰهُ وَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْمَطَاعِمِ بِمَا طَابَ مِنْهَا.

﴿امام مالک کے دادا بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عثمان بن عفان کو خطبے میں یہ فرماتے سنا کہ لوگو، اپنی لونڈیوں پر کمائی کے لیے ایسا بوجھ نہ ڈالو کہ جس کا ان کو ڈھب نہیں۔ اس لیے کہ جب تم اس طرح کا بوجھ ڈالو گے تو وہ اپنی ناموس بیچ کر ہی کمائیں گی۔ بچے کو بھی کمانے پر مجبور نہ کرو اس لیے کہ اگر وہ کما نہ سکا تو چوری کرے گا۔ اور تم ان سے نرمی کرو جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ کی ہے اور تم ان کو وہ کھانا کھلاؤ جو اچھا ہو۔﴾

وضاحت:

یہ بہت حکیمانہ باتیں ہیں۔ لونڈیوں کی کمائی کھانے کے لیے ان کو ایسے کام پر لگانا جس کی اہلیت اور تجربہ وہ نہیں رکھتیں اور پھر مطالبہ کرنا کہ اتنی رقم وہ کما کر لائیں، ایک ایسی حرکت ہے جو معاشرہ میں فساد کا باعث بن سکتی ہے۔ لونڈیاں جب اپنی محنت سے مالک کے مطالبہ کے مطابق کمائی نہیں کر سکیں گی تو کمی کو پورا کرنے کے لیے اپنی ناموس بیچنے کی راہ اختیار کر لیں گی۔ اسی طرح بچوں کا معاملہ ہے۔ ان پر کمائی کی ذمہ داری ڈالنا بڑا ظلم ہے۔ ان کو پڑھا

سکھا کر کمانے کے قابل کرنا چاہیے۔ یہ جائز نہیں کہ آپ ان کی کمائی کھائیں۔ اگر ایسا کرو گے تو ان کے لیے سب سے آسان راستہ تو چوری کرنے کا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے یہ بھی فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم پر فضل کیا ہے تم بھی دوسروں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرو تاکہ اللہ کے فضل کا شکر ادا ہو۔ اسی طرح کمزوروں کو وہ کھانا کھلاؤ جو تم خود پسند کرتے ہو۔

مَاجَاءَ فِي الْمَمْلُوكِ وَهَيْئَتِهِ

غلام اور اس کی ہیئت کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ الْعَبْدُ اِذَا نَصَحَ لِسَيِّدِهِ وَ اَحْسَنَ عِبَادَةَ اللّٰهِ فَلَهُ اَجْرُهُ مَرَّتَيْنِ.

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غلام جب اپنے آقا کی خیر خواہی کرتا ہے اور ٹھیک طریقے سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔﴾

وضاحت:

یعنی ایک اجر غلام کو آقا کی خیر خواہی کا اور دوسرا اللہ تعالیٰ کی عبادت کا ملے گا۔ قانون جو بھی ہو اس پر دیانتداری اور وفاداری سے عمل کرنے میں ہی خیر ہوتی ہے، اس لیے کہ افراد کا کام بغاوت کرنا نہیں۔ یہ معاشرے کا کام ہے کہ سسٹم کو تبدیل کرے۔ غلامی کا طریقہ اسلام کا کوئی جزو نہ تھا بلکہ بین الاقوامی حالات کے تحت مسئلے کا ایک مجبورانہ حل تھا۔ اس نظام کے تحت جو غلام وفاداری سے کام کرتے تو ان کے لیے آنحضرتؐ نے دوہرے اجر کی خبر دی۔ اسلام نے اپنے نظام کے اندر جس حد تک ضروری تھا اصلاح کر دی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ اَمَةً كَانَتْ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ ابْنِ الْخَطَّابِ رَآهَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَقَدْ تَهَيَّاَتْ بِهَيْئَةِ الْحَرَائِرِ فَدَخَلَ عَلٰى ابْنَتِهِ حَفْصَةَ فَقَالَ اَلَمْ اَرَ جَارِيَةَ اَخِيْكِ تَجُوْسُ النَّاسَ وَقَدْ تَهَيَّاَتْ بِهَيْئَةِ الْحَرَائِرِ وَ اَنْكَرَ ذٰلِكَ عُمَرُ.

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک لونڈی تھی۔ اس کو حضرت عمرؓ نے اس حال میں دیکھا کہ وہ شریف زادیوں کے فیشن میں ہے۔ حضرت عمرؓ اپنی بیٹی حضرت حفصہؓ کے پاس گئے اور کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے بھائی کی لونڈی لوگوں کے اندر گھسی پڑتی ہے اور اس نے شریف زادیوں جیسی شکل بنا رکھی ہے۔ اس چیز کو حضرت عمرؓ نے ناگوار مانا۔﴾

وضاحت :

اس میں ناگواری کا پہلو یہ نہیں تھا کہ لونڈی ہو کر اس نے شریف زادیوں کا لباس پہن رکھا ہے بلکہ یہ تھا کہ وہ مردوں کے اندر گھسی پڑتی ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے لباس بھی شریف زادیوں کا اختیار کیا ہے۔ گویا لباس پر اعتراض نہ تھا بلکہ رویے پر تھا جس کے اپنانے کے لیے اس نے لباس بھی بدلا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہیئت حرائر (آزاد عورتوں کی ہیئت) سے حضرت عمرؓ نے یہ مطلب لیا ہو کہ وہ تبرج جاہلیہ یعنی دور جاہلیت کی نمود و نمائش کی شکل اختیار کرتی ہے۔ لیکن قرین قیاس یہی بات ہے کہ مردوں میں گھسنے کا شوق پورا کرنے کے لیے فیشن کرتی ہے۔ مجرد یہ بات کہ کسی لونڈی نے شریف زادیوں کا لباس پہن لیا اعتراض کی بات نہ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی قوم کا دوسری قوم کی نقل کرنا سفلہ پن ہے۔ حالات میں جو تغیر قدرتی طور پر ہوتا ہے وہ قابل اعتراض نہیں۔

مَاجَاءَ فِي الْبَيْعَةِ

بیعت کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ ابْنَ عُمَرَ قَالَ كُنَّا اِذَا بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ يَقُوْلُ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيمَا اسْتَطَعْتُمْ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب ہم رسول اللہ ﷺ سے سمع وطاعت کی بیعت کرتے تھے تو آپ فرماتے کہ اس شرط کے ساتھ کرو کہ اپنی استطاعت کے مطابق۔﴾

وضاحت :

سمع وطاعت سے مراد اس بات کا اقرار ہے کہ ہمیں جو حکم دیا جائے گا ہم اس کو سنیں گے اور اس کو بجا

لائیں گے۔ یہ بیعت صرف صاحب امر کے لیے ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ جو بیعت لیتے وہ صاحب امر ہی کی حیثیت سے لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح آپ نے جہاد کا حکم روز اول سے نہیں دیا اسی طرح یہ بیعت بھی روز اول سے نہیں لی بلکہ مدینہ منورہ میں جب اسلامی ریاست وجود میں آگئی اس وقت آپ نے لوگوں سے سمع و طاعت کی بیعت لینا شروع کیا۔ اب ہمارے ہاں یہ بیعت ختم ہو چکی ہے۔ پیروں کے ہاں جو بیعت رائج ہے وہ سمع و طاعت کی نہیں بلکہ ہدایت کی ہوتی ہے۔

بیعت کا معاملہ بڑا سنگین ہوتا ہے۔ اس کو لفظاً و معناً دونوں طریقوں سے پورا کرنا پڑتا ہے۔ اگر استطاعت کی قید نہ لگائی جائے تو آپ اس کے پابند ہیں کہ جو حکم بھی ملے اس کو پورا کریں۔ اب اگر آپ جھوٹا عذر تراش کریں گے تو عذر تو وہاں جائے گا لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ نہیں بچ سکیں گے۔ ہاں جو صحیح عذر ہو گا وہی قبول ہو گا۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ عَنْ أُمَيْمَةَ بِنْتِ رُقَيْقَةَ أَنَّهَا قَالَتْ أَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فِي نِسْوَةٍ بَايَعْنَهُ عَلَى الْإِسْلَامِ فَقُلْنَ يَا رَسُولَ اللَّهِ نُبَايِعُكَ عَلَى أَنْ لَا نُشْرِكَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا نَسْرِقَ وَلَا نَزْنِيَ وَلَا نَقْتُلَ أَوْلَادَنَا وَلَا نَأْتِيَ بِبُهْتَانٍ نَفْتَرِيهِ بَيْنَ أَيْدِينَا وَ أَرْجُلِنَا وَلَا نَعْصِيَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِيمَا اسْتَطَعْتُنَّ وَ أَطَقْتُنَّ قَالَتْ فَقُلْنَ اللَّهُ وَ رَسُولُهُ أَرْحَمُ بِنَا مِنْ أَنْفُسِنَا هَلُمَّ نُبَايِعْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنِّي لَا أُصَافِحُ النِّسَاءَ إِنَّمَا قَوْلِي لِمِائَةِ امْرَأَةٍ كَقَوْلِي لِامْرَأَةٍ وَاحِدَةٍ أَوْ مِثْلُ قَوْلِي لِامْرَأَةٍ وَاحِدَةٍ.

﴿امیمہ بنت رقیقہ کہتی ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عورتوں کی جماعت کے ساتھ آئیں کہ اسلام پر آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ عورتوں نے کہا کہ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتی ہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گی، چوری نہیں کریں گی، زنا کی مرتکب نہیں ہوں گی، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی، اور اپنے ہاتھ اور پاؤں کے درمیان (یعنی ناموس پر) ایک دوسری پر بہتان نہیں لگائیں گی، اور کسی امر معروف میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جہاں تک تمہاری استطاعت اور طاقت کے اندر ہے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول ہم سے زیادہ ہم پر مہربان ہیں اور کہا کہ آیئے آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں یا رسول اللہ! تو رسول اللہ

ﷺ نے فرمایا کہ میں عورتوں سے ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت نہیں لیتا۔ پھر میری بات سو عورتوں سے ایسی ہے جیسی ایک عورت سے۔

وضاحت:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورہ ممتحنہ کا حکم ان عورتوں کے سامنے تھا کہ جب آپ کے پاس مسلمان عورتیں بیعت کے لیے آئیں تو ان سے فلاں فلاں بات پر بیعت لیں تب ان عورتوں نے کہا کہ حضور ہم ان باتوں پر آپ سے بیعت کرتی ہیں۔ آپ نے ان کو یہ ہدایت کی کہ بیعت کو اپنی استطاعت اور طاقت کے مطابق مشروط کرو۔ وجہ وہی ہے کہ بیعت بڑی اہم چیز ہے۔ اس کے لیے مجمل اور مبہم الفاظ استعمال کرنے میں خطرہ ہے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسے ان شاء اللہ کہا جاتا ہے۔ اس سے معاملہ میں آپ کو مطلق اختیار حاصل نہیں ہو جاتا۔ آپ کوشش کر سکتے ہیں۔ جدوجہد کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اس پر ان عورتوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول ہم پر زیادہ مہربان ہیں کہ انہوں نے یہ قید لگا کر ہمارے اوپر بڑی مہربانی کی اور ہم کو گنجائش دے کر ایک بڑی ذمہ داری سے بچا لیا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً آنحضرتؐ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی خواہش کی۔

ان عورتوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ بیعت صرف ہاتھ میں ہاتھ دینے سے ہی مکمل ہوتی ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، میں عورتوں سے ہاتھ نہیں ملاتا۔ میری بات آپ سب عورتوں کے لیے اسی طرح کافی ہے جس طرح کہ وہ ایک عورت کے لیے کافی ہے۔

بین ایدیھن و ارجلھن کی شرح بہت سے لوگوں نے مختلف کی ہے، لیکن میں نے تفسیر میں بھی یہی لکھا ہے کہ یہ ناموس ہی کے متعلق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ناموس کی جتنی چیزیں ہیں وہ اسی دائرے میں یعنی ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان آجاتی ہیں۔ ان میں کسی قسم کی تہمت لگائی جائے تو وہ اس کے ذیل میں آجائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ واضح زنا ہی نہیں بلکہ اس کے قریب کی حرکتیں جیسی نوعیت کی بھی ہوں ان کے متعلق افترا پردازی اور بہتان نہیں لگائیں گی۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ كَتَبَ اِلَى عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ مَرْوَانَ يُبَايِعُهُ فَكَتَبَ اِلَيْهِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ اَمَّا بَعْدُ لِعَبْدِ اللّٰهِ عَبْدِ الْمَلِكِ

أمِيرِ المُؤمِنِينَ سَلَامٌ عَلَيكَ فَإنّي أحمَدُ إلَيكَ اللّٰهَ الّذِي لَا إلٰهَ إلّا هُوَ وَ أُقِرُّ لَكَ بِالسَّمعِ وَالطَّاعَةِ عَلَى سُنَّةِ اللّٰهِ وَسُنَّةِ رَسُولِهِ فِيمَا استَطَعتُ.

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے عبدالملک بن مروان کے نام بیعت کرنے کے لیے خط لکھا تو وہ یوں لکھا۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ امابعد۔ اللہ کے بندے عبدالملک بن مروان امیر المومنین کی طرف۔ آپ پر اللہ کی سلامتی ہو۔ میں آپ کے آگے اللہ کی حمد کرتا ہوں کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور آپ کے لیے سمع وطاعت کا اقرار کرتا ہوں سنت اللہ اور سنت رسول کے مطابق، اپنی استطاعت کی حد تک"۔﴾

وضاحت :

اس روایت سے ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ سمع وطاعت کی بیعت خط کے ذریعے بھی ہو سکتی ہے اور اس زمانہ میں فون پر بھی اس کا اقرار کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے عبداللہ بن عمرؓ کے اس اثر سے معلوم ہوا کہ ان کا اثر معمولی چیز نہیں۔ احتیاط کی جو حد ممکن ہے وہ کرتے ہیں۔ تو دیکھئے اس خط میں بھی انہوں نے لکھا اللہ کے بندے عبدالملک کے لیے۔ یہ انہی کی شان ہے۔ آج کل تو لوگ ہز ایکسیلنسی وغیرہ لکھتے ہیں۔ البتہ میری رائے میں کئی معاملات میں ان کے تشددات سے بچنا چاہیے۔

مَا يُكرَهُ مِنَ الكَلَامِ

کیا باتیں ہیں جو مکروہ ہیں

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَن عَبدِاللّٰهِ بنِ دِينَارٍ عَن عَبدِ اللّٰهِ بنِ عُمَرَ أنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَن قَالَ لِأخِيهِ كَافِرٌ فَقَد بَاءَ بِهَا أحَدُهُمَا.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اپنے بھائی کو کہا "اے کافر" تو بہر حال ایک کے اوپر وہ لوٹ کے رہے گا۔﴾

وضاحت :

یعنی اگر جس کو کافر کہا ہے وہ ایسا نہیں تو کہنے والا کافر بن جائے گا۔ مطلب یہ کہ یہ تیر بے خطا ہے۔ اگر وہ کافر نہیں تو خود مرو گے اور اگر وہ ہے تو وہ مرا۔ اس کی جتنی دوسری تاویلیں لوگوں نے کی ہیں وہ ٹھیک نہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تکفیر کے فتوے دینے والوں کا کام بے حد خطرناک ہے۔ اگر کافر قرار دیا جانے والا آدمی کافر نہیں تو ان کے فتوے انہی پر لوٹ جائیں گے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ سُهَيْلِ بْنِ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ إِذَا سَمِعْتَ الرَّجُلَ يَقُولُ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ أَهْلَكُهُمْ.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم کسی آدمی کو سنو کہ وہ کہتا ہے کہ لوگ ہلاک ہوں تو سب سے بڑا ہلاک ہونے والا وہ خود ہے۔﴾

وضاحت :

ہم بات بات پر کہتے ہیں کہ لوگ تباہ ہو گئے، خلق تباہ ہو گئی لیکن یہ تاثر اظہار غم کے طور پر ہوتا ہے۔ یہاں ھلک الناس کا جو کلمہ آیا ہے یہ بد دعا کے طریقے پر ہے کہ لوگ تباہ ہو جائیں، جہنم میں جائیں، غارت ہوں۔ ایسی بات ہرگز نہیں کہنی چاہیے۔ اگر اپنے بھائیوں کو دعا نہیں دے سکتے تو بد دعا بھی نہ دیں۔ بلکہ یہاں اس مفہوم میں یہ بات درست ہو گی کہ چاہیے کہ لوگوں کو دعا ہی دیں۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا يَقُلْ أَحَدُكُمْ يَا خَيْبَةَ الدَّهْرِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الدَّهْرُ.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے کہ ہائے زمانہ کی بدبختی اس لیے کہ خدا ہی زمانہ ہے۔﴾

وضاحت :

مطلب یہ ہے کہ بے سمجھے بوجھے زمانہ کو بدبخت کہہ دیا جاتا ہے۔ دنیا میں سارے تصرفات تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں، زمانہ کوئی چیز نہیں۔ تو زمانے کو گالی دینا اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنا ہوا۔ دوسری روایت میں لا تسبوا الدھر

کا لفظ آیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ روایت بالمعنی ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ زمانے کو گالی نہ دو کیونکہ زمانہ خود اللہ ہی ہے۔ اس میں فلسفیوں نے جو باتیں نکالی ہیں وہ ان کی موشگافیاں ہیں۔ لیکن یہ بات بالکل معقول ہے کہ گالی جتنی پڑتی ہے اللہ کو ہی پڑتی ہے۔ کیونکہ زمانہ تو اللہ تعالیٰ کے تصرفات کو ہی کہتے ہیں۔ لہذا زمانے کو مطعون نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کرنا ہی ہو تو اہل زمانہ کو کریں، اس لیے کہ وہ مستحق ملامت ہو سکتے ہیں۔ ان کے متعلق بھی اس طرح کی بات کہنا چاہیے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے خواہ مخواہ اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم سب لوگ زبان درازی میں اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جن سے نبی ﷺ نے روکا ہے اور جو آداب کے خلاف ہیں۔

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ اَنَّ عِيسَى بْنَ مَرْيَمَ لَقِيَ خِنْزِيرًا بِالطَّرِيقِ فَقَالَ لَهُ انْفُذْ بِسَلَامٍ فَقِيلَ لَهُ تَقُولُ هٰذَا لِخِنْزِيرٍ فَقَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اِنِّي اَخَافُ اَنْ اُعَوِّدَ لِسَانِي الْمَنْطِقَ بِالسُّوءِ.

﴿یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم کے راستے میں ایک سؤر آگیا تو انہوں نے کہا کہ خیریت کے ساتھ تشریف لے جاؤ۔ آپ سے کہا گیا کہ آپ خنزیر کو یہ کہہ رہے ہیں تو حضرت عیسیٰ نے کہا کہ میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ اپنی زبان کو بدکلامی کا عادی بناؤں۔﴾

وضاحت :

غور کریں کہ یہ روایت کس پہلو سے حدیث ہے۔ حدیث کی کسی تعریف پر یہ پوری نہیں اترتی۔ یہ بات رائج انجیلوں میں بھی نہیں اور انجیل برنباس میں بھی نہیں۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے کی کوئی روایت رہی ہوگی۔ جو کہیں سے یحییٰ بن سعید کے کان میں پڑ گئی تو انہوں نے اس کو گرہ کر لیا اور امام صاحب نے اپنی کتاب میں جڑ دیا۔ واللہ اعلم کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ کہا بھی یا نہیں۔ ان کے کلام میں جو بلاغت ہوتی ہے وہ روایت کردہ جملہ میں نہیں ہے۔ طنز ضرور ہے کہ آپ خیریت سے نکل جاؤ ہم کچھ نہیں کہتے۔

مَا يُؤْمَرُ بِهِ مِنَ التَّحَفُّظِ فِي الْكَلَامِ

بات کرنے میں احتیاط کے بارے میں حکم

❐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ عَلْقَمَةَ عَنْ اَبِيهِ عَنْ بِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ

الْمُزَنِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللّٰهِ مَا كَانَ يَظُنُّ اَنْ تَبْلُغَ مَا بَلَغَتْ يَكْتُبُ اللّٰهُ لَهُ بِهَا رِضْوَانَهُ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَاهُ وَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللّٰهِ مَا كَانَ يَظُنُّ اَنْ تَبْلُغَ مَا بَلَغَتْ يَكْتُبُ اللّٰهُ لَهُ بِهَا سَخَطَهُ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَاهُ.

﴿بلال بن حارث مزنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بعض اوقات آدمی ایک بات اپنی زبان سے اللہ کی رضا کی نکالتا ہے، اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کہاں تک پہنچے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ قیامت تک، جب وہ اس سے ملے گا، اس کے لیے اپنی خوشنودی لکھ دیتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک آدمی زبان سے خدا کے غضب کا کلمہ نکالتا ہے تو اس کو گمان نہیں ہوتا کہ بات کہاں تک پہنچے گی لیکن اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ قیامت تک کے لیے، جب وہ اس سے ملے گا، اپنا غضب لکھ دیتا ہے۔﴾

وضاحت:

کلمہ تو ایک آدمی کہہ دیتا ہے اور اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔ صحیح بات اگر صحیح وقت پر زبان سے نکلی تو اس کو نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا اجر و ثواب کیا ہے اور اللہ کے ہاں اس کا کیا درجہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ قیامت تک کے لیے اپنی رضا اس شخص کے لیے لکھ دیتا ہے۔ اسی طرح سے اس کا دوسرا رخ بھی ہے کہ زبان سے کوئی کلمہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا نکلا تو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی زد کہاں تک ہے اور وہ اللہ کے غضب کو دعوت دینے والا ہوتا ہے۔ لہٰذا گفتگو میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اس کی توفیق دے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زبان کتنی بڑی طاقت ہے۔ آدمی کی زبان سے ایک فقرہ نکل جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ مذاق کی بات تھی جبکہ وہ چیز اس کی عاقبت کو خراب کرنے والی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ اعلیٰ طریقے سے یہ حقیقت نہیں سمجھائی جا سکتی جتنا اس حدیث میں سمجھا دیا گیا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ اَبِي صَالِحِ السَّمَّانِ اَنَّهُ اَخْبَرَهُ اَنَّ اَبَاهُرَيْرَةَ قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مَا يُلْقِي لَهَا بَالًا يَهْوِي بِهَا فِي جَهَنَّمَ وَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مَا يُلْقِي لَهَا بَالًا يَرْفَعُهُ اللّٰهُ بِهَا فِي الْجَنَّةِ.

﴿ابو صالح سمان نے خبر دی کہ ابو ہریرہؓ نے کہا کہ آدمی بعض دفعہ بات کر بیٹھتا ہے۔ وہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا جبکہ وہ اس کو جہنم میں جا گراتی ہے۔ اور آدمی بسا اوقات ایک بات کر دیتا ہے، وہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا جبکہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے جنت میں اس کے درجات بلند کرتا ہے۔﴾

وضاحت:

یہ پچھلی روایت والا مضمون ہے۔ اس میں روایت کے الفاظ بدل گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنے لفظوں میں بات کی ہے۔ یہ روایت موقوف ہے جب کہ پہلے والی مرفوع ہے۔

مَا يُكْرَهُ مِنَ الْكَلَامِ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ

اللہ کے ذکر کے بغیر کی ہوئی بات کا ناپسندیدہ ہونا

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ زَيْدِ ابْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّهُ قَالَ قَدِمَ رَجُلَانِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَخَطَبَا فَعَجِبَ النَّاسُ لِبَيَانِهِمَا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا أَوْ قَالَ إِنَّ بَعْضَ الْبَيَانِ لَسِحْرٌ.

﴿عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دو آدمی مشرق سے آئے تو انہوں نے اپنی بات اس خوبی سے کی کہ سب لوگ عش عش کر اٹھے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کلام میں جادو ہوتا ہے۔ یا یوں فرمایا کہ بعض کلام جادو ہوتا ہے۔﴾

وضاحت:

عرب کے مشرق میں عراق اور ایران ہیں۔ یہ دونوں شخص انہی علاقوں کے رہے ہوں گے۔ لیکن تھے یہ دونوں بڑے خطیب اور انہوں نے سامعین کو بے حد متاثر کیا۔ بلاشبہ خطابت بڑا فن ہے اور اس میں سحر ہوتا ہے جو سامعین کو مسحور کر لیتا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عِيسَى بْنَ مَرْيَمَ كَانَ يَقُولُ لَا تُكْثِرُوا الْكَلَامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ فَتَقْسُوَ قُلُوبُكُمْ فَإِنَّ الْقَلْبَ الْقَاسِي بَعِيدٌ مِنَ اللّٰهِ وَلٰكِنْ لَا تَعْلَمُونَ وَلَا تَنْظُرُوا فِي

ذُنُوبِ النَّاسِ كَأَنَّكُمْ أَرْبَابٌ وَانْظُرُوا فِي ذُنُوبِكُمْ كَأَنَّكُمْ عَبِيدٌ فَإِنَّمَا النَّاسُ مُبْتَلًى وَ مُعَافًى فَارْحَمُوا أَهْلَ الْبَلَاءِ وَ احْمَدُوا اللَّهَ عَلَى الْعَافِيَةِ.

﴿امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ عیسیٰ بن مریم فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ باتیں نہ کیا کرو ورنہ تمہارے دل سخت ہو جائیں گے، اور سخت دل اللہ سے بہت دور ہوتا ہے، لیکن تم جانتے نہیں۔ اور لوگوں کے گناہوں پر آقاؤں کے طریقے پر نگاہ نہ ڈالو بلکہ اپنے گناہوں پر غلاموں کے طریقے سے نگاہ رکھو۔ ہر شخص ابتلا میں ڈالا جاتا ہے اور معافی بھی ملتی ہے۔ تو جو لوگ ابتلا میں ڈالے جائیں ان پر رحم کرو۔ اور اللہ کا شکر کیا کرو جب عافیت نصیب ہوئی ہو۔﴾

وضاحت:

اگرچہ حضرت عیسیٰ کا یہ قول انجیلوں میں موجود نہیں لیکن بات بالکل ٹھیک ہے کہ زیادہ کلام سے دل سخت ہو جاتا ہے۔ میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہیؒ بھی کہا کرتے تھے کہ زیادہ تقریریں کرنے سے آدمی کا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ جو لوگ زیادہ تقریر کرتے ہیں یہ واقعہ ہے کہ میں نے ان کو بے حد سنگدل پایا۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ كَانَتْ تُرْسِلُ إِلَى بَعْضِ أَهْلِهَا بَعْدَ الْعَتَمَةِ فَتَقُولُ أَلَا تُرِيحُونَ الْكُتَّابَ.

﴿مالکؒ کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنے کچھ عزیزوں کے پاس عشاء کے بعد اپنا آدمی بھیجتیں اور کہتیں: ابھی کراماً کاتبین کو آرام نہیں کرنے دو گے!﴾

وضاحت:

معلوم ہوتا ہے حضرت عائشہؓ کے یہ عزیز عشاء کے بعد باتوں میں مصروف رہتے تھے۔ بلآخر ام المومنین کو یہ پیغام بھیجنا پڑتا کہ یہ بحواس کب تک جاری رہے گی۔ خدا کے بندو، اب تو کراماً کاتبین کو آرام کرنے کا موقع دو۔

ہمارے معاشرہ میں بھی یہ حال ہے کہ ۹ بجے شب کے بعد اصلی زندگی شروع ہوتی ہے۔ رات کو دعوات،

صاحبزادیاں اور شہزادگان اپنے تمام کھلونوں کے ساتھ کھیل میں لگ جاتے یا بازار کا رخ کرتے ہیں کہ ان کے لیے باہر نکلنے کا وقت یہی ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو بستر پر لیٹنے کا وقت بارہ ایک بجے شب ملتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فجر کے وقت ان کے بیدار ہونے کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ اس حیوانی زندگی میں اللہ کی یاد کے لیے کوئی وقت نہیں ہوتا۔

مَا جَاءَ فِي الْغِيبَةِ

غیبت کے بارے میں حکم

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ الْوَلِيدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ صَيَّادٍ اَنَّ الْمُطَّلِبَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ حَنْطَبَ الْمَخْزُومِيَّ اَخْبَرَهُ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ مَا الْغِيبَةُ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ تَذْكُرَ مِنَ الْمَرْءِ مَا يَكْرَهُ اَنْ يَسْمَعَ قَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَ اِنْ كَانَ حَقًّا قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا قُلْتَ بَاطِلًا فَذٰلِكَ الْبُهْتَانُ

﴿مطلب بن عبداللہ مخزومی نے خبر دی کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ غیبت کیا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم کسی شخص کا اس طرح سے ذکر کرو کہ اگر وہ سنے تو برا جانے۔ اس نے پوچھا یا رسول اللہ، اگر بات سچی ہو تو؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم باطل کہو گے تب تو وہ بہتان ہے۔﴾

وضاحت:

مطلب یہ ہے کہ اگر صحیح بات ہو تب غیبت ہے۔ غیبت کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ بات پیٹھ پیچھے ہو رہی ہو، آدمی کے سامنے نہیں۔ گویا پیٹھ پیچھے کسی شخص کی ایسی بات کا ذکر غیبت ہے جس کو وہ سنے تو اس کو بری لگے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اخلاقی جرأت ہے تو اس کے منہ پر کہیں۔ اگر نہیں کر سکتے تو پیٹھ پیچھے اس کا گوشت ہی کھانا ہوا۔ البتہ ایک چیز مستثنیٰ ہے۔ لیڈر لوگ پبلک میں آتے ہیں۔ اپنی زندگی کو نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اپنے مسلک کو ہمارے سامنے رکھتے ہیں اور اتباع کی دعوت دیتے ہیں تو ان کی خرابیاں لوگوں پر واضح کرنی چاہئیں۔ یہ دین کی خدمت ہے۔ لوگوں کو بتانا چاہیے کہ یہ لغو آدمی ہے جو لوگوں کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ یہ بتانا غیبت کی تعریف میں

نہیں آتا۔ اس کی مثالیں نبی ﷺ کے قول و فعل میں ملتی ہیں۔

مَاجَاءَ فِيمَا يُخَافُ مِنَ اللِّسَانِ

زبان کے فتنے سے اندیشے کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَنْ وَقَاهُ اللَّهُ شَرَّ اثْنَيْنِ وَلَجَ الْجَنَّةَ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَلَا تُخْبِرُنَا فَسَكَتَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ثُمَّ عَادَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ مِثْلَ مَقَالَتِهِ الْأُولَى فَقَالَ لَهُ الرَّجُلُ أَلَا تُخْبِرُنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَسَكَتَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِثْلَ ذَلِكَ أَيْضًا فَقَالَ الرَّجُلُ أَلَا تُخْبِرُنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِثْلَ ذَلِكَ أَيْضًا ثُمَّ ذَهَبَ الرَّجُلُ يَقُولُ مِثْلَ مَقَالَتِهِ الْأُولَى فَأَسْكَتَهُ رَجُلٌ إِلَى جَنْبِهِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ مَنْ وَقَاهُ اللَّهُ شَرَّ اثْنَيْنِ وَلَجَ الْجَنَّةَ مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ.

✿ عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کے شر سے محفوظ رکھا وہ جنت میں جائے گا۔ ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ فرمایئے کہ وہ کیا ہیں۔ رسول اللہ ﷺ خاموش رہے۔ پھر آپ نے وہی بات فرمائی جو پہلے فرمائی تھی۔ اس شخص نے پھر کہا کہ حضور کیا آپ ہم کو بتائیں گے نہیں۔ رسول اللہ ﷺ پھر خاموش رہے۔ آپ نے پھر وہی پہلے والی بات دہرائی۔ اس شخص نے عرض کی، یارسول اللہؐ، آپ ہمیں بتائیں گے نہیں؟ رسول اللہؐ نے پھر وہی بات فرمائی۔ وہ شخص بھی اپنی پہلی بات دہرانے لگا تو اس شخص کے قریب کے آدمی نے اس کو خاموش کیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کے شر سے محفوظ رکھا وہ جنت میں جائے گا۔ ایک وہ چیز جو اس کے دو جبڑوں کے درمیان ہے اور دوسری وہ جو اس کے دو

پاؤں کے درمیان ہے۔ وہ جو دو جبڑوں کے درمیان ہے اور وہ جو دو پاؤں کے درمیان ہے۔ وہ جو دو جبڑوں کے درمیان ہے اور وہ جو دو پاؤں کے درمیان ہے۔﴾

وضاحت:

یہ بڑی اہم روایت ہے۔ ایک تو اس سے حضورؐ کا طریقۂ تعلیم معلوم ہوتا ہے اور دوسرے بڑی ہی حکمت کی بات ہے۔ آنحضرتؐ کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ بغیر لوگوں کو پوری طرح متوجہ کیے کوئی اہم بات انڈیل دیں۔ آپ لوگوں کو پوری طرح متوجہ کر کے اور یہ دیکھ کر کہ ان حضرات میں کتنی طلب ہے ارشاد فرمایا کرتے۔ یہ نہیں کہ طلب نہ ہو اور آپ نمونے چلے جائیں جیسا کہ ہم لوگ کرتے ہیں۔ اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ میرے استاذ مولانا فراہی کا طریقہ یہ تھا کہ وہ از خود کوئی بات نہیں بتاتے تھے جب تک پوچھنے والے میں اتنی طلب نہ ہوتی کہ وہ جرح کرتے کرتے ان کو وہاں تک پہنچا دیتا جہاں تک سوال کرتے کرتے پہنچا جا سکتا ہو۔

جبڑوں اور پاؤں کے درمیان کی دو چیزوں سے رسول اللہؐ نے زبان اور شرمگاہ کو مراد لیا اور ان پر پہرہ لگانے والے کو جنت کی بشارت دی۔ واقعہ یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں بہت بڑے فتنے انہی چیزوں کے غلط استعمال سے پھوٹتے ہیں۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ اَبِيهِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ دَخَلَ عَلَى اَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ وَ هُوَ يَجْبِذُ لِسَانَهُ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ مَهْ غَفَرَاللّٰهُ لَكَ فَقَالَ اَبُوبَكْرٍ اِنَّ هٰذَا اَوْرَدَنِي الْمَوَارِدَ.

﴿زید بن اسلم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ اپنی زبان پکڑ کر کھینچ رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا ایسا نہ کریں، اللہ تعالیٰ آپ کو بخشے۔ تو حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ معلوم نہیں اس چیز نے مجھے کن کن گھاٹوں پر پہنچایا۔﴾

وضاحت:

حضرت عمرؓ حضرت ابو بکرؓ کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ یہ اپنی زبان اس لیے مروڑ رہے ہیں کہ کہیں اس سے غلطی ہو گئی ہو گی، تو کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کر دیں گے۔ اب زبان کو سزا دینا موقوف کر دیں۔ حضرت ابو بکرؓ کا

جواب یہ تھا کہ اس زبان کی لغزشوں نے معلوم نہیں کن کن گھاٹیوں میں مجھے گرایا ہے۔ ابھی پیچھے یہ روایت گزری ہے کہ ایک کلمہ زبان سے ایسا نکل جاتا ہے۔ جس کے اجر و ثواب کی حد نہیں ہوتی۔ اور کبھی آدمی کوئی بات ایسی کر دیتا ہے جس کی ہلاکتوں کا اسے اندازہ نہیں ہوتا۔

مَاجَاءَ فِی مُنَاجَاةِ اثْنَیْنِ دُوْنَ وَاحِدٍ

تیسرے ساتھی کو چھوڑ کر دو آدمیوں کے سرگوشی کرنے کے بارے میں روایات

□ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ دِیْنَارٍ قَالَ كُنْتُ اَنَا وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ عِنْدَ دَارِ خَالِدِ بْنِ عُقْبَةَ الَّتِی بِالسُّوْقِ فَجَاءَ رَجُلٌ یُرِیْدُ اَنْ یُنَاجِیَهُ وَ لَیْسَ مَعَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَحَدٌ غَیْرِی وَ غَیْرُ الرَّجُلِ الَّذِی یُرِیْدُ اَنْ یُنَاجِیَهُ فَدَعَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ رَجُلًا آخَرَ حَتّٰی كُنَّا اَرْبَعَةً فَقَالَ لِی وَ لِلرَّجُلِ الَّذِی دَعَاهُ اسْتَاْخِرَا شَیْئًا فَاِنِّی سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ لَا یَتَنَاجَی اثْنَانِ دُوْنَ وَاحِدٍ.

﴿عبداللہ بن دینار سے روایت ہے کہ میں اور عبداللہ بن عمرؓ خالد بن عتبہ کے اس گھر کے پاس تھے جو بازار میں واقع تھا۔ ایک آدمی آیا جو ان سے تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔ عبداللہ بن عمرؓ کے پاس میرے اور اس شخص کے سوا جو بات کرنا چاہتا تھا اور کوئی نہ تھا۔ تو عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دوسرے شخص کو بلایا یہاں تک کہ ہم چار ہو گئے۔ پھر انہوں نے مجھے اور اس شخص کو جسے بلایا تھا کہا تم دونوں ذرا ٹھہرو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ دو آدمی تیسرے کو نظر انداز کر کے آپس میں سرگوشی نہ کریں۔﴾

وضاحت :

اس میں شبہ نہیں کہ اگر تین آدمی ہوں اور دو آدمی تیسرے کو چھوڑ کر آپس میں سرگوشی کرنے لگیں تو اس سے تیسرے آدمی کے دل میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں کہ نہ جانے ان دونوں نے میرے خلاف کیا سازش کی ہے کہ مجھے شامل نہیں کیا۔ یا شاید کوئی ایسی بات ہو گی جس سے یہ لوگ مجھے باخبر نہیں کرنا

چاہتے۔ اس لیے لازماً وہ میرے یا میرے کسی دوست سے متعلق ہو گی۔ ایک مہذب آدمی اس کو کبھی گوارا نہیں کرے گا۔ فوراً وہاں سے رخصت ہو جائے گا اور ممکن ہے ان دونوں پر لعنت بھی کرے۔

اس زمانے میں بعض لوگ اپنی بڑائی جتانے کے لیے ایسی حرکت کرتے ہیں، بشرطیکہ وہ آدمی جس سے سرگوشی کرنی ہو باحیثیت آدمی ہو۔ وہ اس کی طرف بڑھ بڑھ کر کان میں بات کرتے ہیں تاکہ دوسروں پر اثر پڑے کہ یہ بھی کچھ مقام رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں اسمبلیوں میں بعض حضرات وزراء اور سیکرٹریوں کے کانوں میں کچھ کہتے نظر آتے ہیں اور ان کی نظر کیمرے کی طرف بھی ہوتی ہے کہ فوٹو آ رہا ہے کہ نہیں۔ یہ سفلہ پن بھی ہے، خلاف مصلحت بھی ہے اور خلاف اخلاق بھی۔ اس سے افراد کے درمیان بدگمانی اور نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ روایت بہت اعلیٰ نصیحت ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِذَا كَانَ ثَلَاثَةٌ فَلَا يَتَنَاجَى اثْنَانِ دُوْنَ وَاحِدٍ.

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تین آدمی ہوں تو دو آدمی تیسرے کو نظر انداز کر کے سرگوشی نہ کریں۔﴾

وضاحت:

یہ وہی روایت ہے۔ وہاں ایک واقعہ کے ساتھ متعلق ہے اور یہاں حضرت ابن عمرؓ نے صرف حدیث بیان کر دی ہے۔ بخاری اور مسلم میں بھی یہ روایت آئی ہے۔

مَاجَاءَ فِي الصِّدْقِ وَالْكَذِبِ

جھوٹ اور سچ کے بارے میں روایات

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَكْذِبُ امْرَاَتِي يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا خَيْرَ فِي الْكَذِبِ فَقَالَ الرَّجُلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَعِدُهَا وَ اَقُوْلُ لَهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَاجُنَاحَ عَلَيْكَ.

﴿صفوان بن سلیم سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا میں اپنی بیوی سے کوئی بات جھوٹ کہہ سکتا ہوں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں، جھوٹ میں کوئی خیر نہیں۔ اس نے کہا یا رسول اللہ، میں اس سے کوئی وعدہ کر لوں، کوئی بات تسلی کی کر لوں تو کیا یہ جائز ہوگا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس میں کچھ حرج نہیں۔

وضاحت:

خانگی زندگی کو خوشگوار رکھنے کے لیے آدمی کو کئی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں۔ ہر عاقل آدمی مصالحت کی پالیسی اختیار کرتا ہے۔ بسا اوقات اس میں بات بنانی پڑتی ہے یا مغالطہ آمیز بات کرنی پڑتی ہے۔ آدمی نے جب یہ سوال کیا کہ کیا میں بیوی سے جھوٹ بول سکتا ہوں تو آپ نے اس کی صاف صاف ممانعت فرما دی کہ جھوٹ بولنے میں کوئی خیر نہیں۔ پھر اس نے پوچھا کہ میں اس سے کوئی وعدہ یا تسلی کی بات کر سکتا ہوں تو آپ نے اس کی اجازت دے دی۔

معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے پوچھنے والے کے سوال کا یہ مطلب لیا کہ اس کی پہلی بات ماضی سے متعلق ہے اور دوسری مستقبل سے متعلق۔ تو ماضی کے کسی واقعہ کے بیان کرنے میں جھوٹ نہیں بولا جائے گا لیکن مستقبل چونکہ پردہ میں ہوتا ہے، اس توقع پر کہ فلاں کام ہو جائے گا آدمی اس کے بارے میں وعدہ کر سکتا ہے۔ اس میں وعدہ پورا ہونے یا پورا نہ ہونے دونوں کا یکساں احتمال ہوتا ہے۔ پھر مستقبل کے کسی وعدہ میں یہ شرط مضمر ہوتی ہے کہ اگر حالات نے ساتھ دیا تو یوں کروں گا، اگرچہ یہ شرط الفاظ میں ادا نہ ہوتی ہو۔

اس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ بیوی کو جھوٹے چکمے دے کر خوش رکھنا مطلوب ہے۔ البتہ ایسی شکلیں اختیار کی جا سکتی ہیں جو جواز کے اندر ہوں اور ان کی مدد سے آدمی کی گھریلو زندگی خوشگوار رہے۔

روایت میں کذب کا جو لفظ آیا ہے یہ عربی میں وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے مفہوم میں ذو معنی بات یا مغالطہ آمیز بات کرنا بھی شامل ہے اور جو لوگ بیوی بچے والے ہیں ان کو گھریلو ماحول سازگار رکھنے کے لیے ایسی باتیں کرنا پڑتی ہیں۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ ابْنَ مَسْعُودٍ كَانَ يَقُولُ عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي اِلَى الْبِرِّ وَالْبِرُّ يَهْدِي اِلَى الْجَنَّةِ وَ اِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي اِلَى

الفُجُورِ والفُجُورُ يَهْدِی إِلَی النَّارِ الا تری انّہٗ یُقَالُ صَدَقَ وَ بَرَّ وَ کَذَبَ وَ فَجَرَ.

﴿عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے تھے کہ سچائی کو اختیار کرو کیونکہ سچائی خدا کی وفاداری کی راہ پر لے جاتی ہے اور خدا کی وفاداری جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اور جھوٹ سے بچو کیونکہ جھوٹ خدا کی نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے اور خدا کی نافرمانی دوزخ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ مثل بیان کی جاتی ہے "اس نے سچ کہا اور وفاداری کی، اس نے جھوٹ کہا اور نافرمانی کی"۔﴾

وضاحت :

اس روایت کو بخاری نے بھی لیا ہے۔ وہاں یہ موصول کی شکل میں ہے اور یہاں مرسل ہے۔ سند کے لحاظ سے روایت کا جو درجہ بھی ہو فلسفہ دین کے لحاظ سے اس کا درجہ بہت اعلیٰ ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کا کہنا یہ ہے کہ سچائی اختیار کرو کیونکہ سچائی ہمیشہ تمہیں خیر، نیکی، بر، وفاداری کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور بر جنت کی طرف لے جائے گی۔ بر کے صحیح معنی وفاداری کے ہیں۔ نیکی اس کا ناقص ترجمہ ہے۔ قرآن میں برا بوالدیہ اپنے والدین کے وفا شعار اور فرمانبردار بیٹے کے لیے آیا ہے۔ بر اللہ تعالیٰ کی صفت بھی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے سارے وعدے پورے کرے گا۔ حضرت ابن مسعودؓ نے جھوٹ سے بچنے کی تلقین کی۔ اگر آپ جھوٹ نہیں بولتے تو شیطان کا آپ پر کوئی زور نہیں چلے گا۔ اگر آپ عزم کر لیں کہ صداقت اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی رہنمائی کریں گے۔ اس وقت آپ کی زبان سے وہ باتیں نکلیں گی جیسے لقمان حکیم کی زبان سے نکلتی تھیں۔

مزید غور کریں تو معلوم ہوگا کہ نفاق کا پردہ جھوٹ کے سوا اور کوئی نہیں اور نفاق ایمان کی ضد ہے۔ نفاق کے ساتھ کوئی چیز باقی ہی نہیں رہتی تو ایمان کیسے باقی رہے گا۔ جھوٹ عملی بھی ہوتا ہے اور قولی بھی۔ عملی جھوٹ تو یہ ہے کہ آپ نماز پڑھیں تو مجبورانہ یا ریاکاری کے لیے پڑھیں۔ قرآن مجید میں ہے کہ "اذا قاموا الی الصلوة قاموا کسالی" کسل اور بے دلی کے ساتھ نماز ادا کرنا عملی جھوٹ ہے۔ قولی جھوٹ یہ ہے کہ آپ کہیں کچھ لیکن آپ کے دل میں اس کا الٹ ہو۔ منافق کے لیے ایک ہی راستہ ہوتا ہے جس پر وہ اعتماد کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ قولی اور عملی جھوٹ بول دے گا۔ آپ کو بے وقوف بنا دے گا۔ وعدے کی خلاف ورزی کرے گا۔ لیکن اس کی بات کا کوئی وزن

نہ ہوگا۔ سچا آدمی کسی کو اس طریقے کا دھوکا نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہوتا کیونکہ اس نے تو سچی بات کہی ہے۔ وہ اگر کر سکتا ہے تو مغالطہ آمیز بات کر سکتا ہے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بعض نازک مواقع پر ذو معنی بات کر کے اپنی قوم کو چپ کرا دیا۔ لیکن اس کے لیے بڑی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں اس کی نہایت عمدہ مثال ہمارے سب سے بڑے آدمی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زندگی میں ملتی ہے۔ میں جب اس کو یاد کرتا ہوں تو عش عش کر اٹھتا ہوں۔ مدینہ منورہ کو ہجرت کے سفر میں آپ نبی ﷺ کے رفیق تھے۔ کفار مکہ نے حضور کی گرفتاری کے لیے آدمی پھیلا رکھے تھے۔ اسی دوران میں حضرت ابوبکرؓ کو جاننے والا ایک شخص سر پر آپہنچا۔ اس نے انھیں مخاطب کر کے پوچھا من معك هذا (یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟) غور کیجیے کہ ناگہانی طور پر اس سوال کا فوری جواب دینا کتنا مشکل تھا اور نبی ﷺ کی شناخت ہو جانے میں کتنے خطرات در پیش ہو سکتے تھے۔ لیکن نہایت سادگی سے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا رجل یھدینی الطریق (ایک شخص ہے جو مجھے راستہ دکھاتا ہے) یہ کتنی سچی بات تھی۔ صحرائی سفر میں راستہ دکھائے بغیر آدمی سفر کر ہی نہیں سکتا۔ اس حوالے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ممکن ہے آدمی کرائے پر لیا ہو تاکہ راستہ دکھائے۔ دوسری طرف پیغمبر سے بڑھ کر صحیح راستہ دکھانے والا کون ہو سکتا ہے؟ پوچھنے والے کا ذہن پہلی بات کی طرف چلا گیا اور نبی ﷺ کسی ممکن خطرہ سے محفوظ ہو گئے۔ اس طرح کی گفتگو جائے خود سچ پر مبنی ہوتی ہے لیکن کہنے کے انداز سے دوسرا آدمی چپ کرا جاتا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّهُ قِيلَ لِلُقْمَانَ مَا بَلَغَ بِكَ مَا نَرَى يُرِيدُونَ الْفَضْلَ فَقَالَ لُقْمَانُ صِدْقُ الْحَدِيثِ وَ أَدَاءُ الْأَمَانَةِ وَتَرْكُ مَالَا يَعْنِينِي.

﴿امام مالکؒ کی بلاغات میں سے ہے کہ لقمان حکیم سے پوچھا گیا کہ آپ کو جو بلند درجہ ملا ہے آپ اس پر کس طرح سے پہنچے ہیں، تو لقمان نے کہا کہ بات کی صداقت سے، امانت کی ادائیگی سے اور اپنے سے غیر متعلق باتوں سے اجتناب کی بناء پر۔﴾

وضاحت :

یہ تینوں باتیں اپنی جگہ پر اٹل ہیں۔ حضرت لقمان نبی نہیں تھے بلکہ عرب کے حکماء میں سے تھے۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر اپنے بیٹے کو نصیحت کرنے کے ضمن میں ہوا ہے۔ اس میں یہ باتیں نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان

کے بعض واقعات اور اقوال عرب میں مشہور بھی تھے اور لوگ ان کو بیان کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک واقعہ امام مالکؒ نے لیا ہے۔

حضرت لقمان حکمت کے جس بلند مقام تک پہنچے اس کو وہ تین صفات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ سچائی، امانت اور غیر متعلق باتوں سے سروکار نہ رکھنا۔ یہ تینوں نہایت بلند اخلاقی صفات ہیں۔ سچائی اور امانت کا وصف تو قرآن مجید کی رو سے ہر پیغمبر کا لازمی وصف ہوتا ہے۔ اسی طرح جس آدمی کے سامنے کوئی مقصد زندگی ہو اس کے پاس غیر متعلق باتوں میں دلچسپی لینے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔

یہ روایت بھی کسی پہلو سے حدیث کی تعریف میں نہیں آتی۔ امام مالک کے ہاں اس طرح کی بلاغات کی کثرت کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ابتدائی دور میں کسی بھی اچھی بات کو روایات میں جگہ دے دی جاتی تھی۔ خواہ وہ کسی سابق پیغمبر سے منسوب ہو یا اس کی نسبت کسی حکیم شخص یا صحابی کی طرف کی جاتی ہو۔ چونکہ اس طرح کی حکیمانہ باتیں عوام کی زبان پر چڑھ جاتی ہیں اس لیے امام مالک نے ان کو بلاغات کے طور پر لے لیا۔ یعنی ان کے لیے سند کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سند کا جو پہاڑ بنا لیا گیا یہ بعد کی بات ہے۔

☐ **حَدَّثَنِي مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ مَسْعُودٍ كَانَ يَقُولُ لَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَكْذِبُ وَ تُنْكَتُ فِي قَلْبِهِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ حَتّٰى يَسْوَدَّ قَلْبُهُ كُلُّهُ فَيُكْتَبَ عِنْدَاللّٰهِ مِنَ الْكَاذِبِينَ.**

﴿امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے تھے کہ آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے تو ایک ایک سیاہ نکتہ اس کے دل پر پڑتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا دل بالکل سیاہ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ جھوٹوں میں لکھا جاتا ہے۔﴾

وضاحت:

حضرت ابن مسعودؓ کا یہ قول صحیح اور اصول کے مطابق ہے۔ گناہ کرنے کے متعلق جو روایت آئی ہے اس میں یہ ہے کہ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نشان پڑ جاتا ہے جو توبہ و استغفار سے صاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر آدمی پروا نہ کرے اور گناہ کرتا رہے تو پورا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید سے بھی دلوں پر مہر ہو جانے کی حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ دل اس طرح بند ہو جاتا ہے کہ نیکی کی کوئی کرن اس سے گزر نہیں کر پاتی۔ چونکہ

جھوٹ تمام گناہوں کی بنیاد ہے اس لیے گناہ کے بارے میں یہ اطلاق اس پر ہو گا۔ لہذا حضرت ابن مسعودؓ کا یہ قول بالکل ٹھیک ہے۔ اگرچہ روایت کی حقیقت بلاغات کی ہے اور یہ موقوف بھی ہے۔

□ حدثنی مالکٌ عن صفوان بن سلیم انه قال قیل لرسول الله ﷺ ایکون المؤمن جبانا فقال نعم فقیل له ایکون المؤمن بخیلا فقال نعم فقیل له ایکون المؤمن کذابا فقال لا.

﴿حضرت صفوان بن سلیم کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا مومن بزدل ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں، پھر پوچھا گیا کیا مومن بخیل ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر سوال کیا گیا کہ کیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے۔ تو آپ نے فرمایا، نہیں۔﴾

وضاحت:

سند کے لحاظ سے یہ روایت مرسل ہے اور اس لحاظ سے اس کی کوئی اہمیت نہیں لیکن بات اپنی جگہ پر ٹھیک ہے۔ بہت اعلیٰ درجے کا ایمان ہو گا تو آدمی بزدل ہو گا نہ بخیل۔ لیکن یہ کمزوریاں رکھتے ہوئے بھی مومن مختلف درجات کے ہوتے ہیں۔ البتہ نبی ﷺ نے مومن کے کذاب ہونے کی نفی کر دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جھوٹ منافق کا شیوہ ہوتا ہے اور منافق مومن نہیں ہوتا بلکہ وہ بہت ہی گھٹیا قسم کا کافر ہوتا ہے۔ اخلاقی جرات کے فقدان کے باعث وہ مومن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہنم کے سب سے بدترین درجے میں ہو گا۔ پھر اس امت کے افراد کی منصبی ذمہ داری حق کی سچائی کی گواہی دینا ہے۔ اس لیے کوئی صاحب ایمان اس وصف سے خالی نہیں ہو سکتا۔

مَا جَاءَ فِي إِضَاعَةِ الْمَالِ وَذِي الْوَجْهَيْنِ.

مال کے ضائع کرنے اور دوہرا چہرہ رکھنے کے بارے میں

حدثنی مالکٌ عن سهیل بن ابی صالح عن ابیه عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال ان الله تبارک و تعالی یرضی لکم ثلاثا و یسخط لکم ثلاثا یرضی لکم ان

تَعْبُدُوهُ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَ اَنْ تَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَ اَنْ تَنَاصَحُوا مَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ اَمْرَكُمْ وَ يَسْخَطُ لَكُمْ قِيلَ وَقَالَ وَ اِضَاعَةَ الْمَالِ وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے تین باتوں کو پسند اور تین باتوں کو ناپسند کرتا ہے۔ وہ تمہارے لیے یہ پسند کرتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو اور تمہارے معاملات پر اللہ نے جن لوگوں کو مقرر کر دیا ہے ان کی خیر خواہی کرو۔ وہ تمہارے لیے قیل و قال، مال کو ضائع کرنے اور کثرت سوال کو ناپسند کرتا ہے۔﴾

وضاحت :

حبل اللہ سے مراد قرآن مجید ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ اور ہمارے درمیان رسی ہے جو تعلق کا ذریعہ ہے۔ اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کے معنی ہیں کہ حق و باطل میں امتیاز کی یہی کسوٹی ہوگی۔ کسی چیز کے حق یا باطل ہونے میں جب بھی کوئی نزاع پیدا ہوگا تو اسی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ اس کسوٹی پر جو چیز پوری نہ اترے تو نہیں لی جائے گی۔

معاملات پر مامور لوگوں سے مراد حکمران ہیں۔ حکمرانوں کی خیر خواہی کے معنی ہیں کہ آپ ان کو نیک مشورے دیں۔ خوشامد سے انھیں بیوقوف نہ بنائیں اور آسمان پر نہ چڑھائیں، غلط رہنمائی نہ کریں اور ان کی حمایت محض اس لیے نہ کریں کہ ان سے آپ کی کوئی غرض وابستہ ہے۔ یہ چیزیں نصیحت اور خیر خواہی کے بالکل خلاف ہیں۔ جب بھی موقع ملے ان کو صحیح بات بتانی چاہیے۔ لیکن ادب اور وقار ملحوظ رہنا چاہیے۔ ان کو بدنام کرنے اور ذلیل کرنے کے لیے اہل سیاست کے طریقے پر بیان بازی نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیشہ ان کی اصلاح مد نظر رہنی چاہیے اس لیے کہ آپ کی عزت، آبرو، مال اور جان کی حفاظت ان لوگوں کی ذمہ داری ہے۔

قیل و قال سے مراد بکواس، مناظرہ بازی، کٹ حجتی، مین میکھ نکالنا اور فضول قسم کی کرید کرنا ہے۔ مال زندگی کے قیام و بقا کا ذریعہ ہے اس لیے اپنے مال کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ زیادہ سوال کرنے سے مطلب مانگنا نہیں بلکہ غیر متعلق اور اناپ شناپ سوال کرنا ہے۔ اس کی ممانعت قرآن مجید میں بھی آئی ہے۔ سوال وہی کرنا چاہیے جو واقعی پیدا ہو، خواہ مخواہ سوالات پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ یہ طرز عمل دین کو یہودیت کا مجموعہ بنا دیتا ہے۔

☐ وَحَدَّثَنِي مَالِك" عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مِنْ شَرِّ النَّاسِ ذُوالْوَجْهَيْنِ الَّذِي يَاْتِي هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ، وَهٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بدترین خلائق دورخا آدمی ہے جو ایک کے پاس آئے تو ایک شکل میں آئے اور دوسرے کے پاس جائے تو کچھ اور بن کر جائے۔﴾

وضاحت:

آدمی کو بالکل دو ٹوک ہونا چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ساباشراب خور و ساباز اہد نماز گرو۔ آدمی کو اس حد تک صاف گو ہونا چاہیے کہ ہر ذہین آدمی اس کے معاملے میں اندازہ کرے کہ اس کا موقف کیا ہوگا اور وہ کیا طریقہ اختیار کرے گا۔ اگر اس سے کوئی بات کہی جائے تو کیا جواب دے گا۔

مَاجَاءَ فِي عَذَابِ الْعَامَّةِ بِعَمَلِ الْخَاصَّةِ

خاص لوگوں کے گناہوں کے باعث عام عذاب نازل ہونے کے بارے میں روایات

☐ وَحَدَّثَنِي مَالِك" اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ اُمَّ سَلَمَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ قَالَتْ يَا رَسُولَ اللّٰهِ اَنَهْلِكُ وَفِينَا الصَّالِحُونَ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ نَعَمْ اِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ

﴿نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ یارسول اللہ، کیا ہم ہلاک کر دیئے جائیں گے درآں حالیکہ ہمارے درمیان نیک لوگ موجود ہوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہاں، جب خباثت بڑھ جائے۔﴾

وضاحت:

یہ روایت امام مالک کی بلاغات میں سے ہے۔ ابن البر نے کہا ہے کہ یہ حدیث حضرت ام سلمہؓ سے صرف ایک ذریعہ سے معلوم ہے اور وہ بھی قوی نہیں۔ لیکن میرے نزدیک اس کا مضمون قرآن کا مضمون ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالکؒ نے مضمون کو اہمیت دی ہے۔ خبث بڑھ جانے کا مطلب یہ ہے کہ نیک ہوں تو سہی لیکن بہت اقلیت میں ہوں۔ شریروں کا غلبہ ہو۔ جب شریروں کا غلبہ ہو جائے تو قوم عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے۔ انبیاء

اور رسولوں کے زمانے میں تو یہ ہوتا ہے کہ صالحین چھٹ کر رسولوں کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ لیکن اب یہ بات نہیں ہے۔ اس لیے اگر اشرار کی کثرت ہو جائے اور کوئی آفت آجائے تو اس میں نیک بھی اشرار کی طرح پس جائیں گے لیکن وہ اگر انکار منکر کا فرض ادا کرتے رہے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا اجر پائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ برائی کو برائی کہتے رہیں اور اپنی قوت سے اور زبان سے اس کو روکنے کی کوشش کریں۔ فرمایا کہ من رأى منكم منكرا فليغيره بيده و ان لم يستطع فبلسانه و ان لم يستطع فبقلبه و ذالك اضعف الايمان. ادنیٰ درجے کا ایمان یہ ہے کہ آپ ان کی برائی سے اپنے آپ کو بچائیں۔ قلب میں برا سمجھنے کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں۔ لیکن آپ اگر شریروں کے قرب، ان کے تقرب، ان کے عطیات کو اپنے لیے شرف سمجھ کر قبول کریں گے تو وہ ادنیٰ ترین ایمان بھی نہیں ہوگا۔ ہاں آپ اگر اس حرکت سے بچ کر رہیں گے، اگرچہ آپ نے ادنیٰ درجہ ایمان میں انکار منکر کا حق ادا نہیں کیا تب بھی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بچا لے گا۔ یعنی آخرت میں گرفت نہیں ہوگی۔ البتہ آج اگر دنیا میں کوئی آفت آئے گی تو یہ نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ چھانٹ کر الگ کر لیے جائیں گے بلکہ سب پس جائیں گے۔

□ وَحَدَّثَنِي مَالِكٌ" عَنْ اِسْمَاعِيلَ بْنِ اَبِي حَكِيمٍ اَنَّهُ سَمِعَ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيزِ يَقُولُ كَانَ يُقَالُ اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى لَا يُعَذِّبُ الْعَامَّةَ بِذَنْبِ الْخَاصَّةِ وَلٰكِنْ اِذَا عُمِلَ الْمُنْكَرُ جِهَارًا اسْتَحَقُّوا الْعُقُوبَةَ كُلُّهُمْ.

﴿اسمٰعیل بن ابی حکیمؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو یہ کہتے سنا کہ کہا جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کچھ تھوڑے سے لوگوں کے گناہوں کے بدلے میں عام لوگوں کو عذاب نہیں دے گا لیکن اگر منکر پر کھلم کھلا عمل کیا جائے تو سب کے سب عذاب کے مستحق ہوں گے۔﴾

وضاحت:

اس روایت میں یہ بات مضمر ہے کہ اگر منکر کا ارتکاب ہو رہا ہو اور اس کے نکیر کی کوئی آواز بلند نہ ہو تو جن لوگوں کے اندر ادنیٰ درجہ کا ایمان ہوگا ان کے لیے آخرت میں بچنے کی تو امید ہے لیکن اس دنیا میں عذاب سے نہیں بچ سکیں گے۔ قوموں کے بارے میں یہی سنت الٰہی ہے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔

مَاجَاءَ فِی التُّقٰی

خدا ترسی اور خشیت الٰہی کے بارے میں روایات

وَحَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ اِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِی طَلْحَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَ خَرَجْتُ مَعَهُ حَتّٰی دَخَلَ حَائِطًا فَسَمِعْتُهُ وَهُوَ يَقُوْلُ وَ بَيْنِی وَ بَيْنَهُ جِدَارٌ وَهُوَ فِی جَوْفِ الْحَائِطِ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ بَخٍ بَخٍ وَاللّٰهِ لَتَتَّقِيَنَّ اللّٰهَ اَوْ لَيُعَذِّبَنَّكَ قَالَ مَالِكٌ: وَبَلَغَنِی اَنَّ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ كَانَ يَقُوْلُ اَدْرَكْتُ النَّاسَ وَمَا يَعْجَبُوْنَ بِالْقَوْلِ. قَالَ مَالِكٌ: يُرِيْدُ بِذٰلِكَ الْعَمَلَ اِنَّمَا يُنْظَرُ اِلٰی عَمَلِهِ، وَلَا يُنْظَرُ اِلٰی قَوْلِهِ.

﴿حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر بن الخطابؓ سے سنا۔ میں ان کے ساتھ نکلا تھا یہاں تک کہ وہ ایک باغ میں داخل ہو گئے تو اس حال میں کہ میرے اور ان کے درمیان دیوار حائل تھی اور وہ باغ کے بیچ میں تھے، میں نے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ اے عمر بن الخطاب، اے امیر المومنین! کیا کہنے ہیں امیر المومنین کے! اللہ کی قسم، اللہ سے ڈرتے رہو ورنہ وہ تمہیں بہت سخت عذاب دے گا۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ قاسم بن محمد کہا کرتے تھے کہ میں نے جن لوگوں کو پایا ہے وہ بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اس سے ان کی مراد عمل تھا۔ یعنی یہ کہ آدمی کے قول کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی بلکہ اس کے عمل کو اہمیت دی جاتی تھی۔﴾

وضاحت:

بخ تحسین کے لیے آتا ہے لیکن طنز کے موقع پر بھی آسکتا ہے۔ یعنی کیا کہنے امیر المومنین کے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ اپنے آپ سے کہہ رہے تھے۔ یہ خود احتسابی کی بہت اعلیٰ مثال ہے۔ اصل تقویٰ کی علامت یہی ہوتی ہے۔ وہ باغ میں گئے۔ جب علیحدہ ہو کر بیٹھے تب انہوں نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا کہ عمر بن الخطاب

امیر المومنین، ماشاء اللہ، بڑا امیر المومنین، مارا پھرتا ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو گے تو خیر ہے ورنہ وہ تمہیں عذاب دے گا کہ تمہارا کچومر نکال کر رکھ دے گا۔ تم بڑے ہی سخت عذاب میں پڑو گے۔

قاسم بن محمد کا قول امام مالک کی بلاغات میں سے ہے۔ ان کی بلاغات شہادت دیتی ہیں کہ وہ جس بات کو اچھا سمجھتے ہیں اس کو لے لیتے ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ حدیث ہے یا نہیں اور اس کی سند کیا ہے۔ میرے نزدیک ایسا کرنے میں بہت سے خطرات ہیں۔

اَلْقَوْلُ اِذَا سَمِعْتَ الرَّعْدَ

کڑک سننے پر کیا کہنا چاہیے

☐ وحَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ اَنَّهُ كَانَ اِذَا سَمِعَ الرَّعْدَ تَرَكَ الْحَدِيثَ وَقَالَ سُبْحَانَ الَّذِي يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ ثُمَّ يَقُولُ اِنَّ هٰذَا لَوَعِيدٌ لِاَهْلِ الْاَرْضِ شَدِيدٌ.

﴿امام مالک عامر بن عبداللہ بن الزبیرؓ کے بارے میں بتاتے ہیں کہ جب وہ کڑک سنتے تو بات کرنا چھوڑ دیتے اور یہ دعا پڑھتے۔ سُبْحَانَ الَّذِي يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ (پاک ہے وہ ذات کہ بجلی بھی اس کی تسبیح کرتی ہے اس کی حمد کے ساتھ اور ملائکہ بھی اس کی تسبیح کرتے ہیں اس کے ڈر کے ساتھ) پھر کہا کرتے تھے کہ یہ اہل زمین کے لیے بڑی سخت وعید ہے۔﴾

وضاحت:

یہ دعا قرآن مجید کی آیت سے ماخوذ ہے۔ اس کی وضاحت تفسیر تدبر قرآن میں سورہ الرعد کی آیت ۱۳ کے ذیل میں کر دی گئی ہے۔

مَاجَاءَ فِي تَرِكَةِ النَّبِيِّ ﷺ

نبی ﷺ کے ترکہ کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَائِشَةَ اُمِّ الْمُؤْمِنِينَ اَنَّ

أَزْوَاجَ النَّبِيِّ ﷺ حِينَ تُوُفِّيَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَرَدْنَ أَنْ يَبْعَثْنَ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ إِلَى أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ فَيَسْأَلْنَهُ مِيرَاثَهُنَّ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَتْ لَهُنَّ عَائِشَةُ أَلَيْسَ قَدْ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَا نُورَثُ مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ".

﴿ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو ازواج مطہراتؓ نے یہ ارادہ کیا کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ وقت حضرت ابوبکر صدیق کی خدمت میں بھیجیں اور ان سے مطالبہ کریں کہ رسول اللہ ﷺ سے ان کو جو میراث ملنی چاہیے وہ دیں۔ تو حضرت عائشہؓ نے ان سے کہا کہ کیا یہ بات نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہم انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔﴾

وضاحت:

اس حدیث کے سلسلہ روایت میں ابن شہاب زہری موجود ہیں۔ یہ اہل سنت کے بہت بڑے امام ہیں۔ وہ تمام امور جن میں اہل سنت اور شیعہ کے درمیان اختلاف ہے کسی نہ کسی طور پر ابن شہاب سے مروی ہیں۔ مگر اس کے باوجود امام بخاریؒ اور امام مالکؒ نے ان کو سر پر اٹھایا ہے۔ یہ امت کے لیے بہت بڑا حادثہ ہے۔

لَا نُورَثُ، ہمارے وارث نہیں بنتے، کوئی ہماری وراثت نہیں پاتا، جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس روایت کی رو سے وراثت کی کوئی شکل نہیں رہتی۔ لیکن شیعہ اس کی قرأت میں اختلاف کرتے ہیں۔ وہ اس کو لَا نُورِثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةً" پڑھتے ہیں اور اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ جو چیز ہم نے صدقے کے طور پر چھوڑی اس کا کوئی وارث نہیں ہوتا حالانکہ یہ بالکل ہی بے تکی سی بات ہے۔ اگلی روایت میں حدیث کے مفہوم کی اور بھی وضاحت ہو گئی ہے۔ بہر حال یہ ہمارے اور شیعوں کے درمیان ایک بنیادی جھگڑا ہے۔ اس روایت کے حوالہ سے انہوں نے حضرت عائشہؓ پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ انہوں نے اختراع کر کے گویا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور نبی ﷺ کی دیگر ازواج مطہراتؓ کو وراثت سے محروم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ یہ بات صرف نبی ﷺ کے متعلق خاص نہیں بلکہ سب انبیاء کے لیے ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی وراثت کا ذکر سورہ مریم میں آیا ہے تو وہ دین، نیکی، تقویٰ اور نبوت کی وراثت کے متعلق ہے۔ اس لیے کہ ان کو اس بات سے اندیشہ تھا

کہ یہ لوگ خاندان کی روایت کو بگاڑ دیں گے تب انھوں نے بیٹے کے لیے دعا کی تھی۔

□ حَدَّثَنِی مَالِكٌ" عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا يَقْتَسِمُ وَرَثَتِی دَنَانِيرَ مَا تَرَكْتُ بَعْدَ نَفَقَةِ نِسَائِی وَمَؤُنَةِ عَامِلِی فَهُوَ صَدَقَةٌ"

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے وارث درہم و دینار کی وراثت تقسیم نہیں کریں گے۔ میں نے جو کچھ چھوڑا ہے اس میں سے میری بیویوں کے خرچ اور گھر کے کارکن کے مصارف کے بعد جو بچے وہ صدقہ ہے۔﴾

وضاحت:

مؤنۃ' کے معنی کفالت ہے اور 'عامل' سے مراد گھر کے کارکن ہیں۔ غلام ہوں یا خادم یا نوکر۔ اس سے جن لوگوں نے اور لوگ مراد لیے ہیں وہ غلط ہیں۔ فرمایا کہ ازواج مطہراتؓ کے اخراجات اور گھر کے کارکنوں کے مصارف اٹھانے کے بعد جو مال بچے گا وہ سب صدقہ ہے یعنی وہ قوم کی ملکیت یا جدید لفظوں میں سٹیٹ کی ملکیت ہوگا۔ اموال فئے شروع ہی سے حقیقت میں سٹیٹ کی ملکیت تھے اس لیے کہ وہ حکومت کے مجموعی دبدبے سے حاصل ہوئے تھے اور اس سے نبی ﷺ اپنی ضرورت کے مطابق حیثیت صاحب امر اسی طرح لیتے تھے جس طریقہ سے ہر حکومت کا خلیفہ یا صدر ہوتا ہے تو اس کے مصارف کی کفالت حکومت کرتی ہے۔ یہ بات حیثیت صاحب امر یعنی حکومت کے ذمہ دار کی حیثیت سے تھی نہ کہ نبی کی حیثیت سے تھی۔ اس لیے کہ جہاں تک نبوت کا معاملہ تھا اس کے متعلق تو قرآن مجید میں آیا ہے کہ لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (میں تم سے اجر کا طالب نہیں) چونکہ نبوت کے علاوہ آپؐ پر حکومت کی ذمہ داری بھی تھی تو ضروری تھا کہ حکومت ان کے مصارف پورے کرتی۔ کسی شخص کے مصارف پورے کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اہل و عیال اور اس کے متعلقین کی ضروریات بھی پوری کی جائیں۔ آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہراتؓ کی ازواج نبیؐ ہونے کے علاوہ کچھ خصوصیات اور بھی تھیں۔ وہ خصوصیات تقدس کی بنا پر نہیں تھیں، تقدس تو بے شک ان کو حاصل تھا لیکن یہ خصوصیات اس بنیاد پر تھیں کہ ملت اور دین کی مصلحت کی خاطر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے حکم دیا تھا: مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَا اَنْ تَنْكِحُوْا اَزْوَاجَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ اَبَدًا ۔ اِنَّ ذٰلِكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا۔ الاحزاب ۵۳۔ (اور تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم

اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ تم اس کی بیویوں سے کبھی اس کے بعد نکاح کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک بڑی سنگین باتیں ہیں) قطع نظر اس سے کہ نکاح ثانی ان کے شرف کے منافی تھا اس میں خطرے بھی بہت تھے۔ کوئی شخص ان میں سے کسی سے نکاح کر کے معلوم نہیں کیا کیا پراپیگنڈہ کر سکتا تھا۔ اس طرح کی تمام باتوں کے سدباب کے لیے دین کی مصلحت یہی تھی کہ ان کو آئندہ نکاح سے روک دیا جائے۔ لہذا ان کی کفالت کی ذمہ داری حکومت پر تھی جو خلفائے راشدین اور بعد والے خلفاء نے بھی ادا کی۔

اس روایت میں ما ترکت بعد نفقة نسائی میں نساء کا لفظ جو آیا ہے وہ بیویوں کے لیے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خاندان بنی ہاشم یا حضرت فاطمہؓ یا حضرت علیؓ کا اس سے کوئی تعلق نہیں اس لیے کہ وہ نساء میں شامل نہیں۔ البتہ ازواج مطہرات کا کوئی کارکن، غلام یا خادم ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو شامل ہونا چاہیے۔

مَا جَاءَ فِي صِفَةِ جَهَنَّمَ

جہنم کی خصوصیات کے بارے میں روایات

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ نَارُ بَنِي آدَمَ الَّتِي يُوقِدُونَ جُزْءٌ مِنْ سَبْعِينَ جُزْءًا مِنْ نَارِ جَهَنَّمَ. فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنْ كَانَتْ لَكَافِيَةً. قَالَ إِنَّهَا فُضِّلَتْ عَلَيْهَا بِتِسْعَةٍ وَسِتِّينَ جُزْءًا.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ بنی آدم جو آگ جلاتے ہیں جہنم کی آگ کے مقابل میں اس کی حرارت ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ! اگر یہی آگ ہوتی تو جلانے کے لیے وہ بھی کافی تھی تو آپؐ نے فرمایا: اس کو اس کے اوپر انہتر گنا ترجیح دی گئی ہے۔﴾

وضاحت:

یہاں سوال اور جواب میں مطابقت نہیں لیکن بات اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں کی آگ کو اور وہاں کی آگ کو ایک سا نہ سمجھو۔ شارحین بھی یہی لکھتے ہیں کہ یہ بات سمجھانے کے لیے ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ، عَنْ عَمِّهِ أَبِي سُهَيْلِ ابْنِ مَالِكٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ قَالَ: أَتُرَوْنَهَا حَمْرَاءَ كَنَارِكُمْ هَذِهِ لَهِيَ أَسْوَدُ مِنَ الْقَارِ.

﴿حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ آگ تمہاری اس آگ کی طرح سرخ ہوگی۔ وہ تو تار کول سے بھی زیادہ سیاہ ہوگی۔﴾

وضاحت:

یہ حضرت ابو ہریرہ کا قول ہے۔ محدثین کے ہاں یہ طریقہ رہا ہے کہ صحابی نے اگر بات کی ہوگی تو اس طرح کی بات وہ پیغمبر سے سنے بغیر نہیں کہہ سکتا اس لیے وہ ایسی روایت کو مرفوع قرار دیتے ہیں لیکن یہ تجاوز ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے ذہن کی ایک بات کہہ دی۔ اس کو اگر مرفوع کا درجہ دے دیا جائے تو پھر حدیث اور اس میں کیا فرق رہا۔ بہت سی مثالیں ایسی ہیں جن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی بات کو اگر مرفوع کا درجہ دے دیا جائے تو حقیقت بالکل متغیر ہو جاتی ہے۔ ابو ہریرہؓ نے یہ بات اگر نبی ﷺ سے سنی ہوتی تو وہ اسے اپنی بات کی حیثیت سے کہنے کی بجائے نبی ﷺ کی طرف نسبت کر دیتے تو ان کی بات بڑی اہمیت رکھنے والی ہوتی اور ان کی عزت بھی بہت بڑھتی لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اگر انہوں نے نہیں کیا تو خواہ مخواہ ان کے سر مڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔

اَلتَّرْغِيبُ فِي الصَّدَقَةِ

صدقہ کے بارے میں ترغیب

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ، عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ أَبِي الْحُبَابِ سَعْدِ بْنِ يَسَارٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَنْ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ، وَلَا يَقْبَلُ اللَّهُ إِلَّا طَيِّبًا كَانَ إِنَّمَا يَضَعُهَا فِي كَفِّ الرَّحْمَنِ يُرَبِّيهَا كَمَا يُرَبِّي أَحَدُكُمْ فَلُوَّهُ أَوْ فَصِيلَهُ حَتَّى تَكُونَ مِثْلَ الْجَبَلِ.

﴿سعد بن یسارؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی پاک کمائی سے صدقہ کرے، اور اللہ پاک کمائی ہی قبول کرتا ہے، تو گویا وہ خدائے رحمٰن کے ہاتھ میں اس کو رکھتا ہے جو اس کو نشو و نما

دے کر بڑھاتا ہے، جیسا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے بچھڑے کو یا اپنے اونٹ کے بچے کو بڑھاتا ہے، یہاں تک کہ وہ صدقہ پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے۔

وضاحت :

فصیلہ دودھ چھوڑے ہوئے بچے کو کہتے ہیں۔

قرآن مجید میں یوں آیا ہے یمحق اللّٰہ الربٰو و یربی الصدقٰت۔ البقرہ، ۲۷۶

(اللہ سود کو گھٹائے گا اور صدقات کو بڑھائے گا) جو صدقات اللہ کی راہ میں دیے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو بڑھاتا ہے، اور اللہ جتنا چاہے بڑھائے۔ یہاں وضاحت کر دی گئی ہے کہ وہ بڑھا کر پہاڑ کی مانند کر دیتا ہے۔ آپ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے گویا آپ نے اس کو خدائے رحمان کے ہاتھ میں دے دیا کہ وہ اس کو اس طریقے سے بڑھائے جس طریقے سے آپ اپنے بچھڑے کو پالتے ہیں یا اونٹ کے بچے کی پرورش کرتے ہیں تو وہ بڑا ہو جاتا ہے۔

صدقات کی زیادت ہونی چاہیے اور چھوٹی یا بڑی جو چیز بھی دیں تو اس میں خلوص شامل ہونا چاہیے کیونکہ اصل قدر و قیمت تو خلوص کی ہے۔

☐ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ إِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ أَنَّهُ سَمِعَ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُولُ كَانَ أَبُو طَلْحَةَ أَكْثَرَ أَنْصَارِيٍّ بِالْمَدِينَةِ مَالًا مِنْ نَخْلٍ، وَ كَانَ أَحَبُّ أَمْوَالِهِ إِلَيْهِ بَيْرُحَاءَ وَ كَانَتْ مُسْتَقْبِلَةَ الْمَسْجِدِ وَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَدْخُلُهَا وَ يَشْرَبُ مِنْ مَاءٍ فِيهَا طَيِّبٍ. قَالَ أَنَسٌ فَلَمَّا أُنْزِلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ قَامَ أَبُو طَلْحَةَ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى يَقُولُ: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ. وَ إِنَّ أَحَبَّ أَمْوَالِي إِلَيَّ بَيْرُحَاءُ، وَ إِنَّهَا صَدَقَةٌ لِلّٰهِ أَرْجُوا بِرَّهَا وَ ذُخْرَهَا عِنْدَاللّٰهِ فَضَعْهَا يَارَسُولَ اللّٰهِ ﷺ حَيْثُ شِئْتَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بَخٍ ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ وَقَدْ سَمِعْتُ مَا قُلْتَ فِيهِ وَ إِنِّي أَرٰى أَنْ تَجْعَلَهُ فِي الْأَقْرَبِينَ، فَقَالَ أَبُو طَلْحَةَ أَفْعَلُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ فَقَسَمَهَا أَبُو طَلْحَةَ فِي أَقَارِبِهِ وَ بَنِي عَمِّهِ.

﴾اسحق بن عبداللہ بن ابی طلحہ نے انس بن مالکؓ کو فرماتے سنا کو ابو طلحہؓ مدینہ میں کھجوروں کے باغ کے لحاظ سے سب سے زیادہ رئیس انصاری تھے۔ اور ان کا محبوب ترین باغ بیر حاء تھا جو مسجد (یعنی مسجد نبوی) کے بالمقابل تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس میں تشریف لایا کرتے اور اس میں سے شیریں اور ٹھنڈا پانی پیا کرتے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (تم خدا سے وفاداری کے مقام کو نہیں پاسکتے جب تک کہ اپنے محبوب مال میں سے نہ خرچ کرو) تو ابو طلحہ اٹھے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا درجہ حاصل نہیں کرسکتے جب تک کہ تم خرچ نہ کرو اس چیز سے جو تمہیں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ تو میرا سب سے زیادہ محبوب مال باغ بیر حاء ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں صدقہ ہے، اب میں اس کا صلہ اور اجر اللہ کے ہاں چاہتا ہوں۔ یارسول اللہ آپ جہاں چاہیں اس کو صرف کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سبحان اللہ! ماشاء اللہ! بہت اچھا مال ہے۔ یہ بہت نفع بخش باغ ہے۔ میں نے سن لی وہ بات جو تم نے کہی ہے۔ اب میری رائے یہ ہے کہ تم اس کو اپنے اقرباء میں تقسیم کردو۔ ابو طلحہ نے کہا: یارسول اللہ میں ایسے ہی کروں گا۔ تو ابو طلحہ نے اسے اپنے اقرباء اور اپنے چچازاد بھائیوں میں تقسیم کردیا۔﴿

وضاحت:

بخ وہی لفظ ہے جو پیچھے ایک روایت میں حضرت عمرؓ نے اپنے لیے بطور طنز استعمال کیا۔ یہ تین چار شکلوں میں آتا ہے۔ یہاں یہ لفظ تحسین کے لیے آیا ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ قرآن مجید سے کس طرح متاثر ہوتے تھے۔ ان کے مقابلے میں آج ہمیں اپنے رویے پر نظر کرنی چاہیے کہ ہم قرآن مجید کے معاملے میں کس قدر بلید ہو گئے ہیں۔

اس حدیث سے خاص بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص چاہے تو صدقہ کے مصارف میں اپنے اعزہ و اقرباء اور اپنے بنی اعمام کو، جن کی حالت محتاج اصلاح ہو، شامل کرسکتا ہے۔ ان کی بہبود کے لیے صدقہ کے

مال سے ان کی مدد کر سکتا ہے۔ محتاج کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی بالکل ہی تہی دست ہو، وہ روٹی کا محتاج ہو۔ حضرت ابو طلحہؓ نے باغ اپنے جن اقرباء اور بنی اعمام میں تقسیم کیا ان کے متعلق قطعی طور پر معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی محتاج نہیں تھا۔ حضرت حسانؓ بھی ان کے خاندان میں سے تھے۔ اس باغ میں سے ان کو جو حصہ ملا تھا وہ انھوں نے بنو امیہ کے زمانے میں ایک لاکھ درہم میں بیچا تھا۔

قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف میں کوئی فرق نہیں البتہ ان کے وصول کرنے میں فرق ہے۔ اگر آپ زکوٰۃ نہیں دیں گے تو حکومت وصول کرے گی لیکن صدقات کی ادائگی آپ کی صوابدید پر ہے۔

ہمارے فقہاء نے حد مقرر کر رکھی ہے کہ اگر کسی غریب کے پاس اتنی مالیت کا مال ہو تو اس کو زکوٰۃ نہیں دینی چاہیے۔ اس زمانے میں اتنی مالیت سے تو آدمی ایک وقت کی روٹی نہیں کھا سکتا۔ یہ بات غلط ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود لوگوں کی بہبود اور ترقی ہے۔ معاشرہ میں ان کے مقام کو بلند کیا جائے۔ اگر وہ کاروبار کرتے ہیں تو ان کو سہولت حاصل ہو جائے اور کام کرتے ہیں تو اس میں ان کو آسانیاں مل جائیں اور وہ ترقی کر کے اس کو بڑھا لیں۔ اس زمانے میں رفاہی ریاست کا بہت چرچا ہے۔ رفاہی ریاست قائم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ زکوٰۃ کے جتنے بھی احکام ہیں ان کو قرآن مجید کے مطابق ٹھیک کیا جائے۔ زکوٰۃ ہر مال میں ہے۔ اس میں سے متعین صرف مقدار ہے۔ بڑے پیمانے پر جو چیز بھی کاشت ہو گی اس پر زکوٰۃ ہو گی۔ حکومت زکوٰۃ کے اموال سے اجتماعی بہبود اور رفاہیت کے کام کر سکتی ہے۔ زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف میں کوئی فرق نہیں، دونوں کا مصرف ایک ہے۔ یہ یتیموں، غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کی بہبود، ترقی اور اصلاح کے لیے خرچ ہوں گے۔

□ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ أَعْطُوا السَّائِلَ وَ إِنْ جَاءَ عَلَى فَرَسٍ

﴿زید بن اسلم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سائل کو دو اگر چہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔﴾

وضاحت:

یہ روایت موقوف ہے۔ بہر حال اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مانگتا ہے اس کو دیں۔ اس کے بارے میں زیادہ

تحقیق نہیں کرنی چاہیے۔ سائل کے لیے یہ کیا کم ہے کہ اس نے اپنی ناموس اور اپنی آبرو کو آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ جس نے اتنی بڑی قربانی دی ہے اس کی زیادہ کرید نہیں کرنی چاہیے الا آنکہ یہ واضح ہو کہ یوں ہی بھکل بنائے ہوئے ہے یا پیشہ ور ہے۔ ظاہری حالت پر قیاس کر کے انکار کرنا صحیح نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سائل لنگڑا ہو تو سوار ہو کر آیا ہو۔ یا اس کے پاس گھوڑا تو ہے لیکن اس کی ضروریات بلکہ اپنی بھی ضروریات نہیں ہیں اور حالات نے اسے مانگنے پر مجبور کر دیا ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَمْرِو بْنِ مُعَاذٍ الْأَشْهَلِيِّ الْأَنْصَارِيِّ عَنْ جَدَّتِهِ أَنَّهَا قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَا نِسَاءَ الْمُؤْمِنَاتِ لَا تَحْقِرَنَّ إِحْدَاكُنَّ أَنْ تُهْدِيَ لِجَارَتِهَا وَلَوْ كُرَاعَ شَاةٍ مُحْرَقًا.

﴿عمرو بن معاذ الاشہلی الانصاری اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے مومنہ عورتو! تم میں سے کوئی بھی اس بات کو حقیر نہ سمجھے کہ وہ اپنی پڑوسن کے لیے کوئی حقیر سے حقیر ہدیہ بھیجے اگرچہ وہ بکری کی ایک جلی ہوئی کھری ہو۔﴾

وضاحت :

یہ واقعہ ہے کہ ہدیہ محبت بڑھانے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اپنی توفیق کے مطابق جو کچھ بھی میسر ہو اور جب بھی موقع نکلے ہدیہ دینا چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہدیہ شاندار ہو تب دے۔ کوئی چیز جو ذرا بھی ندرت رکھتی ہو، پڑوسی کو ضرور بھیجنی چاہیے۔ آنحضرت ﷺ نے اسی کی تلقین کی ہے اور یہ چیز معاشرت پر بہت مفید اثرات ڈالتی ہے۔

اس حدیث میں نساء المومنات کی ترکیب شاذ ہے۔ میرے نزدیک تو یہ ہے کہ جس طریقہ سے نکرہ موصوف معرفہ بن جاتا ہے اسی طریقہ سے منادی بھی معرفہ کا مقام حاصل کر لیتا ہے اس لیے اس کی صفت معرفہ آ سکتی ہے۔ والعلم عند اللہ۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّ مِسْكِينًا سَأَلَهَا وَهِيَ صَائِمَةٌ وَلَيْسَ فِي بَيْتِهَا إِلَّا رَغِيفٌ. فَقَالَتْ لِمَوْلَاةٍ لَهَا أَعْطِيهِ إِيَّاهُ، فَقَالَتْ لَيْسَ لَكِ مَا

تُفطِرِينَ عليه، فقالتْ أعطيه اياهُ قالتْ ففعلتُ. قالتْ فلمّا أمسَينا أهدَى لنا أهلُ بيتٍ او انسانٌ" ما كانَ يُهدِى لنا شاةً وَ كَفَنَها فدعتني عائشةُ اُمُّ المؤمنينَ، فقالتْ كُلِي مِنْ هذا هذا خيرٌ" من قُرصِكِ.

﴿امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھے نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بات پہنچی کہ ایک مسکین ان کے پاس آیا اور اس نے کچھ سوال کیا اور وہ روزہ سے تھیں۔ گھر میں ایک چپاتی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی آزاد کردہ لونڈی سے کہا کہ یہ اسے دے دو۔ اس نے کہا کہ افطار کرنے کے لیے آپ کے لیے کچھ نہیں رہے گا۔ تو انھوں نے کہا کہ تم دے دو۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے چپاتی سائل کو دے دی۔ جب شام ہوئی تو ہمارے لیے ایک ایسے خاندان والوں نے (یا ایک شخص نے) بکری کا گوشت بھیجا جن کو ہمارے ہاں ہدیہ بھیجنے کی مستقل عادت نہ تھی۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مجھے بلایا اور کہا: لو اس میں سے کھاؤ۔ یہ اس چپاتی سے بہتر ہے جو تم نے دی۔﴾

وضاحت:

'بکری بھیجی' یہ عربیت کا اسلوب ہے کہ کل بول کر جزء مراد ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پوری بکری بھیجی۔ آپ بھی مہمان کی تواضع کے لیے مرغی ذبح کرتے ہیں تو آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے مہمان کو مرغی کھلائی حالانکہ اس میں سے اور لوگوں نے بھی کھایا ہوتا ہے۔

وَ کفنها میں واؤ عطف کا نہیں حال کا ہے۔ وکف کے معنی میں قطرہ قطرہ ٹپکنے کا مفہوم ہے، گویا یہ خاندان مسلسل ہدیہ نہیں بھیجتا تھا۔ بعض لوگوں نے واؤ کو حرف عطف مانا ہے اور کفّن کو ڈھانکنے کے معنی میں لیا ہے یعنی اس پر روٹیاں ڈھانپ رکھی تھیں۔ لوگوں نے اور شرحیں بھی لکھی ہیں بہرحال یہ لفظ مزید تحقیق طلب ہے۔ اس بات کا امکان بھی ہے کہ یہ لفظ غلط ضبط ہو گیا ہو۔

یہ روایت امام مالک کی بلاغات میں سے ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ جب کوئی سائل آئے تو اس کو دینا چاہیے اور اسی طریقہ سے دینا چاہیے جس طریقہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیا۔ تجربہ یہی ہے کہ اگر آپ اس طریقہ سے دیں گے تو انشاءاللہ آپ بھوکے نہیں رہیں گے، اچھا کھائیں گے۔

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ قَالَ بَلَغَنِي أَنَّ مِسْكِينًا اسْتَطْعَمَ عَائِشَةَ أُمَّ الْمُؤْمِنِينَ وَ بَيْنَ يَدَيْهَا عِنَبٌ، فَقَالَتْ لِإِنْسَانٍ خُذْ حَبَّةً فَأَعْطِهِ إِيَّاهَا فَجَعَلَ يَنْظُرُ إِلَيْهَا وَ يَعْجَبُ، فَقَالَتْ عَائِشَةُ أَتَعْجَبُ كَمْ تَرَى فِي هٰذِهِ الْحَبَّةِ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ.

﴿امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی کہ ایک مسکین نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کھانا مانگا۔ ان کے آگے کچھ انگور تھے۔ انہوں نے کسی سے کہا کہ اس میں سے ایک دانہ لے کر اس کو دے دو تو وہ تعجب سے حضرت عائشہؓ کا منہ دیکھنے لگا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ تم تعجب کرتے ہو! اس میں نہ جانے کتنے مثقال ذرہ ہوں گے۔﴾

وضاحت:

عنب" یہاں نکرہ ہے جو تحقیر کے لیے بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تھوڑے سے انگور یا کچھ انگور۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اگر کہتیں تو یہ کہتیں کہ دے دو جتنے بھی ہیں۔ سیدہ عائشہؓ کے کردار سے یہ بعید ہے کہ انہوں نے یہ کہا ہو گا کہ اس میں سے ایک دانہ اٹھا کر دے دو۔ بہر حال یہ امام مالکؒ کی بلاغات میں سے ہے۔ میں اس کی ذمہ داری نہیں لیتا۔

مَا جَاءَ فِي التَّعَفُّفِ عَنِ الْمَسْئَلَةِ

سوال سے احتراز کے بارے میں روایات

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَزِيدَ اللَّيْثِيِّ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّ نَاسًا مِنَ الْأَنْصَارِ سَأَلُوا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَأَعْطَاهُمْ ثُمَّ سَأَلُوهُ فَأَعْطَاهُمْ حَتَّى نَفِدَ مَا عِنْدَهُ ثُمَّ قَالَ مَا يَكُونُ عِنْدِي مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ أَدَّخِرَهُ عَنْكُمْ، وَمَنْ يَسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللَّهُ، وَمَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللَّهُ، وَمَنْ يَتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللَّهُ وَمَا أُعْطِيَ أَحَدٌ" عَطَاءً هُوَ خَيْرٌ" وَ أَوْسَعُ مِنَ الصَّبْرِ.

﴿حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ کچھ انصار آئے۔ رسول اللہ ﷺ سے انہوں نے سوال کیا تو آپؐ نے دیا۔ پھر سوال کیا تو پھر دیا، یہاں تک کہ آپؐ کے پاس جو کچھ تھا ختم ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ بھئی! میرے پاس جو مال ہو گا میں اس کو تم سے اٹھا نہیں رکھوں گا۔ لیکن یاد رکھو کہ جو پاک دامنی اختیار کرنا چاہے گا اللہ تعالیٰ اس کو پاک دامنی بخشے گا۔ اور جو استغنا اختیار کرنا چاہے گا اللہ تعالیٰ اس کو غنی بنادے گا۔ اور جو صبر اختیار کرنا چاہے گا اللہ تعالیٰ اس کو صابر بنادے گا۔ اور یہ یاد رکھو کہ بہترین اور وسیع ترین عطیہ جو خدا کی طرف سے ملتا ہے وہ صبر ہے۔﴾

وضاحت:

یہ روایت ہے تو ابن شہاب کے ذریعے سے مگر نہایت لاجواب روایت ہے۔ فلسفہ دین کے لحاظ سے یہ بہت اہم روایت ہے۔ اس ایک روایت کی بدولت ابن شہاب کو اہمیت حاصل ہو گئی ہے اور ان ہی کے پردے میں وہ اپنی خرافات بھی بھر دیتے ہیں۔

اس روایت میں تمام بنیادی اخلاقیات آگئی ہیں۔ اگر آپ پاک دامن بننا چاہتے ہیں تو امتحان ضرور پیش آئے گا۔ اگر آپ ثابت قدمی سے کوشش کریں گے تو سیدنا یوسف علیہ السلام کی طرح بازی لے جائیں گے۔ اگر آپ ارادہ رکھتے ہیں کہ چاہے کچھ ہو جائے مانگوں گا نہیں تو ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا اور آپ کو غنی کردے گا۔ علی ہذا القیاس کسی امتحان میں اگر آپ نے ارادہ کر لیا کہ میں بہر حال استقامت دکھاؤں گا، گردن نہیں جھکاؤں گا تو اللہ تعالیٰ آپ کے اندر وہ صبر و استقامت پیدا کر دے گا جو آپ کو بہت اونچا آدمی بنادے گا۔ بہر حال کوشش آپ کی طرف سے ہونی چاہیے۔ آخر میں بتادیا کہ سب سے وسیع تر نعمت جو خدا سے مل سکتی ہے وہ صبر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سارا دین دو ستونوں پر قائم ہے، آدھا شکر پر اور آدھا صبر پر۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَهُوَ يَذْكُرُ الصَّدَقَةَ وَالتَّعَفُّفَ عَنِ الْمَسْأَلَةِ الْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى، وَالْيَدُ الْعُلْيَا هِيَ الْمُنْفِقَةُ، وَالسُّفْلَى هِيَ السَّائِلَةُ.

﴿حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے صدقہ پر

ابھارتے اور سوال سے احتراز کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ اوپر والا ہاتھ بہتر ہے نیچے والے ہاتھ سے۔ اوپر والے ہاتھ سے مطلب خرچ کرنے والا اور نیچے والے ہاتھ سے مراد مانگنے والا ہے۔ ﴾

وضاحت :

والید العلیا ھی المنفقۃ والسفلی ھی السائلۃ میرے نزدیک راوی کی طرف سے شرح ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد صرف اوپر والا ٹکڑا یعنی الید العلیا خیر من الید السفلی ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ دینے والے ہاتھ کو لینے والے ہاتھ پر درجے اور مرتبے کے لحاظ سے ترجیح حاصل ہے۔ اس حدیث میں اس بات کی تلقین ہے کہ آدمی کو جب تک برداشت کر سکے، صبر کر سکے، مانگنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اوپر والی حدیث میں یہ بات آچکی ہے کہ جو شخص اپنی خودداری کو بچانا چاہے گا اللہ تعالیٰ اس کی خودداری کو محفوظ رکھے گا۔

☐ حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَیْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ یَسَارٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَرْسَلَ اِلٰی عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ بِعَطَاءٍ فَرَدَّهُ عُمَرُ، فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِمَ رَدَدْتَهُ، فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَیْسَ أَخْبَرْتَنَا اَنَّ خَیْرًا لِاَحَدِنَا اَنْ لَا یَاْخُذَ مِنْ اَحَدٍ شَیْئًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّمَا ذٰلِكَ عَنِ الْمَسْئَلَةِ فَاَمَّا مَا كَانَ عَنْ غَیْرِ مَسْئَلَةٍ فَاِنَّمَا هُوَ رِزْقٌ" یَرْزُقُكَهُ اللّٰهُ، فَقَالَ عُمَرُ اَمَا وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِهٖ لَا اَسْاَلُ اَحَدًا شَیْئًا، وَلَا یَاْتِینِی مِنْ غَیْرِ مَسْئَلَةٍ شَیْءٌ" اِلَّا اَخَذْتُهُ.

﴿ عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس کوئی چیز بھیجی تو حضرت عمرؓ نے لوٹا دی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم نے یہ کیوں لوٹا دی تو انہوں نے کہا کیا آپ نے یہ بات نہیں فرمائی تھی کہ ہمارے لئے بہتر ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص کسی سے کوئی چیز قبول نہ کرے ؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ تو اس شکل کے لیے ہے کہ جب کوئی آدمی سوال کرے، مگر بغیر سوال کیے کوئی چیز ملے تو وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ تمہیں دیتا ہے تو اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم، جس کی مٹھی میں میری جان ہے کہ اب میں کسی سے مانگوں گا تو نہیں، لیکن اگر

کوئی چیز بن مانگے ملے گی تو اس کو قبول کروں گا۔﴾

وضاحت :

اس میں شبہ نہیں کہ بن مانگے جو چیز ملے وہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا رزق ہے البتہ نہ مانگنے میں یہ بات بھی داخل ہے کہ دل میں اس کی تمنا نہیں ہونی چاہیے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کے لیے دل شکنی کرنا مشکل ہو جاتا ہے تو دل شکنی نہیں کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی چیز کو خواہ مخواہ رد نہیں کرنا چاہیے لیکن نہ اس کا طالب ہونا چاہیے نہ خواہشمند۔

☐ حدثنی عن مالك عن ابی الزناد عن الأعرج عن أبی هريرة ان رسول الله ﷺ قال: والذی نفسی بيده لأن يأخذ أحدكم حبله فيحتطب علی ظهره خير" من ان يأتی رجلا أعطاه الله من فضله فيسأله أعطاه أو منعه.

﴿حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خدا کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے کہ یہ بات کہ تم میں سے کوئی رسی اٹھائے اور لکڑیاں جمع کر کے اپنی پیٹھ پر دھو کر لائے بہتر ہے اس بات سے کہ وہ کسی ایسے شخص کے پاس جس کو خدا نے کچھ دیا ہے، آئے اور اس سے مانگے تو وہ چاہے اس کو دے یا نہ دے۔﴾

وضاحت :

یہ صحیح مومنانہ کردار کی تعلیم ہے۔ مانگنے سے حتی الامکان احتراز کرنا چاہیے۔ البتہ وہ سوال اس سے مستثنیٰ ہوگا جو قومی، دینی، اصلاحی اور رفاہی کاموں کے لیے کیا جائے اگرچہ اس میں خطرات بہت ہیں۔ اسلام میں اس قسم کے اداروں کی کفالت کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ عوام کے ہاتھوں میں آکر یہ کام تجارت کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ لیکن جن ممالک میں صحیح قسم کی حکومت رہی ہے وہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اچھے اہل دین لوگوں کو بھی جھولی اٹھا کر دوسروں کے سامنے چندہ مانگنے کے لیے جانا پڑتا ہے۔

☐ حدثنی عن مالك عن زيد بن اسلم عن عطاء بن يسار عن رجل من بنی اسد الله

قَالَ: نَزَلْتُ اَنَا وَ اَهْلِي بِبَقِيعِ الْغَرْقَدِ، فَقَالَ لِي اَهْلِي اذْهَبْ اِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَاسْأَلْهُ لَنَا شَيْئًا نَاْكُلُهُ وَجَعَلُوا يَذْكُرُونَ مِنْ حَاجَتِهِمْ فَذَهَبْتُ اِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَوَجَدْتُ عِنْدَهُ رَجُلًا يَسْأَلُهُ وَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ لَا اَجِدُ مَا اُعْطِيكَ فَتَوَلَّى الرَّجُلُ عَنْهُ وَهُوَ مُغْضِبٌ وَهُوَ يَقُولُ لَعَمْرِي اِنَّكَ لَتُعْطِي مَنْ شِئْتَ. فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّهُ لَيَغْضَبُ عَلَيَّ اَنْ لَا اَجِدَ مَا اُعْطِيهِ مَنْ سَأَلَ مِنْكُمْ وَلَهُ اُوقِيَّةٌ اَوْ عِدْلُهَا فَقَدْ سَأَلَ اِلْحَافًا. قَالَ الْاَسَدِيُّ فَقُلْتُ اللِّقْحَةُ لَنَا خَيْرٌ مِنْ اُوقِيَّةٍ. قَالَ مَالِكٌ: وَالْاُوقِيَّةُ اَرْبَعُونَ دِرْهَمًا فَرَجَعْتُ وَلَمْ اَسْأَلْهُ فَقَدِمَ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ بَعْدَ ذٰلِكَ بِشَعِيرٍ وَزَبِيبٍ فَقَسَمَ لَنَا مِنْهُ حَتّٰى اَغْنَانَا اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ، وَ عَنْ مَالِكٍ عَنِ الْعَلَاءِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّهُ سَمِعَهُ يَقُولُ: مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ وَمَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا وَمَا تَوَاضَعَ عَبْدٌ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ. قَالَ مَالِكٌ: لَا اَدْرِي اَيُرْفَعُ هٰذَا الْحَدِيثُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اَمْ لَا.

﴿عطاء بن یسار بنی اسد کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ میں اور میرے گھر والے بقیع غرقد میں اترے۔ گھر والوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ کے پاس جاؤ اور ان سے سوال کرو کہ ہمیں کچھ کھانے کو دیں، اور وہ اپنی ضرورت بیان کرنے لگے۔ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہاں دیکھا کہ ایک شخص آپ سے کچھ سوال کر رہا ہے اور رسول اللہ ﷺ اس کو فرما رہے ہیں کہ بھئی! میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں۔ وہ شخص وہاں سے مڑا اور غصے میں تھا اور یہ کہہ رہا تھا: خدا کی قسم! آپ تو اس کو دیتے ہیں جس کو چاہتے ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دیکھئے یہ شخص میرے اوپر غصہ اس بات پر ہو رہا ہے کہ میرے پاس اس کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور جس نے تم میں سے سوال کیا جب کہ اس کے پاس ایک اوقیہ یا اس کے برابر مال ہے تو اس کا سوال الحافا قرار پائے گا۔ اسدی شخص کہتا ہے کہ میں نے (دل میں) کہا کہ ہماری دودھ دینے والی اونٹنی تو ایک اوقیہ سے بہتر ہے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ پس میں وہاں سے پلٹ

آیا اور میں نے آنحضرت ﷺ سے کچھ نہیں مانگا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ جو اور منقی آئے تو آپ نے ہمارے لیے بھی اس میں سے بھیجا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں مستغنی کر دیا۔

امام مالکؒ علاء بن عبدالرحمن کے بارے میں بتاتے ہیں کہ انہوں نے ان کو یہ فرماتے سنا کہ کسی مال میں سے صدقہ اس میں کمی نہیں کرتا اور جو شخص عفو و درگزر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی عزت ہی میں اضافہ کرتا ہے۔ اور جو شخص تواضع کی راہ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا درجہ بلند کرتا ہے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ یہ حدیث نبی ﷺ تک مرفوع ہے کہ نہیں۔

وضاحت:

اس حدیث میں عطاء بن یسار بنی اسد کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے اس شخص کا نام نہیں لیا ہے۔ محدثین کے اصول کے مطابق اس روایت میں یہ ضعف کا پہلو ہے۔ اس کو صرف امام نسائی نے لیا ہے اور کسی نے نہیں لیا۔ امام مالکؒ علاء بن عبدالرحمن سے روایت کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ حدیث نبی ﷺ تک مرفوع ہے کہ نہیں۔ گویا امام مالکؒ سندوں کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ بات کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس لیے کہ سندوں میں لپیٹ کر نہ جانے کیا کیا زہر دیا جا سکتا ہے لیکن بات اگر وزن دار ہوتی ہے، اس کو دل قبول کرتا ہے تو یہ خود اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہ کلام بہر حال کسی پاکیزہ منبع سے نکلا ہے۔

بقیع غرقد مسجد نبوی کے قرب میں ایک مقام ہے جس میں قبرستان بھی ہے۔

'الحاف' کے معنی لپٹ کر اور پیچھے پڑ کر سوال کرنے کے ہیں۔ لا یسئلون الناس الحافا (وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے) میں اصل مقصود سوال کرنے کی نفی ہے۔ الحافا کی قید اس کے ساتھ صرف سوال کرنے والوں کی عام حالت کی تصویر اور اس کے گھنونے پن کے اظہار کے لیے لگائی گئی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ آدمی ایک اوقیہ کے برابر مال رکھتے ہوئے اگر سوال کرے گا تو وہ پیچھے پڑ کر مانگنے والے غیر مستحق سائل کے حکم میں ہوگا۔ راوی نے جب یہ سنا تو سوچا کہ میری اونٹنی کی مالیت تو اس سے زیادہ ہے۔ پھر میں کیوں نبی ﷺ سے سوال کروں۔ چنانچہ وہ بغیر اپنا مدعا بیان کیے گھر والوں کے پاس لوٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی ضرورت اس طرح پوری کر دی کہ آنحضرتؐ کے پاس کچھ جو اور منقی تقسیم کے لیے آ گئے تو آپ نے اس مسافر گھرانے کو بھی حصہ بھجوایا۔

امام مالکؒ نے اوقیہ کی مقدار یہ بتائی کہ یہ چالیس درہم کے برابر ہے۔ یہ تعریف المجہول بالمجہول ہے۔ درہم کے نرخ بدلتے رہتے ہیں بلکہ ہر چیز کے نرخ بدلتے رہتے ہیں اس لیے آپ کوئی حساب ٹھیک طرح سے نہیں کر سکتے۔ موجودہ تمدن کے دور میں ضروری ہے کہ اس طریقہ کی تمام چیزوں میں زیادہ سے زیادہ یکسانی پیدا کر دی جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو بہت مفید ہو گا۔

مَا يُكْرَهُ مِنَ الصَّدَقَةِ

صدقہ میں کیا چیز مکروہ ہے

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِآلِ مُحَمَّدٍ إِنَّمَا هِيَ أَوْسَاخُ النَّاسِ

﴿امام مالکؒ سے روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آل محمد کے لیے صدقہ جائز نہیں۔ یہ لوگوں کے جسموں کا میل کچیل ہے۔﴾

وضاحت :

یہ روایت امام مالک کی بلاغات میں سے ہے۔ امام مالک نے اس میں راوی کا نام نہیں لکھا مگر یہ یاد رکھیے کہ یہ روایت پانچ چھ طریقوں سے مرفوع ہے اور ان سب میں ابن شہاب موجود ہے۔ یہ روایت قرآن کے بالکل خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے۔ میرے نزدیک اس کو شیعوں کے امام ابن شہاب نے گھڑا ہے تاکہ آل محمد کی برہمنیت کو قائم کیا جائے۔ پہلے میرا خیال یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات یوں فرمائی ہو گی کہ **لا تحل الصدقة لآل محمد** اور یہ فرمانے کی وجہ یہ رہی ہو گی کہ یہودیوں میں یہ ہوا تھا کہ صدقہ اور زکوٰۃ کی جتنی رقوم ہوتی تھیں وہ یہود کے قبیلہ بنی لاوی کا حق مان لی گئی تھیں۔ قربانی کے جتنے جانور ہوتے تھے ان کے گوشت کا بہترین حصہ ان کا حصہ ہوتا تھا اور خیرات کی تمام رقمیں ان کی ہوتی تھیں۔ دوسرے لوگ ان سے محروم کر دیے گئے۔ میرا خیال یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے اس فتنہ کے سدباب کے لیے فرمایا **لا تحل الصدقة لآل محمد** کہ آل محمدؐ کے لیے صدقہ جائز نہیں۔ اس کے بعد روایت کا جتنا حصہ ہے وہ ابن شہاب کا اسی طرح کا اضافہ ہے جس طرح کا اضافہ انہوں نے پیچھے بیان ہونے والی العین حق (نظر بد ایک حقیقت ہے) کی روایت میں کیا ہے۔ وہاں العین حق کی تاویل تو ہو

سکتی ہے لیکن اس کے بعد نظر بد اتارنے کا جو ٹوٹکا ابن شہاب نے بتایا ہے کہ نظر لگانے والے شخص کو پکڑا جائے وہ اپنے تہمد کے نیچے کا حصہ دھوئے اور دھوون اس شخص پر انڈیل دی جائے جس کو نظر لگی ہو۔ تو یہ ابن شہاب کا اپنا اضافہ ہے۔ لیکن اب میری رائے یہ ہے کہ یہ پوری روایت جھوٹی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر صدقہ اوساخ الناس (لوگوں کا میل کچیل) ہے تو یہ میل کچیل ان لوگوں کے لیے ہے جو مالدار ہیں اور لوگوں کا حق ادا نہیں کرتے۔ محتاج اور نادار اگر پاتے ہیں تو اپنا حق پاتے ہیں۔ یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے کہ یہ حق معلوم یعنی ان کا معین حق ہے۔ قرآن مجید میں یہ بتایا گیا ہے کہ لوگوں کے پاس جو زائد مال ہوتا ہے وہ اصل میں دوسروں کے حقوق ہیں جو امراء کی امانت میں دیے جاتے ہیں اور اس سے ان کا امتحان مقصود ہوتا ہے کہ وہ حقوق ادا کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ اس مال کو ہڑپ کریں تو وہ غلاظت کا ڈھیر ہے جو وہ کھا رہے ہیں۔ مستحقین کے لیے یہ غلاظت کا ڈھیر نہیں بلکہ اللہ کا دیا ہوا مال ہے۔

پھر اس روایت میں آل محمد کو برہمنوں کی طرز کا ایک پورا خاندان بنا دیا گیا اور اس میں تمام بنی ہاشم کو شامل کر دیا گیا۔ تمام بنی ہاشم کے لیے صدقات حرام کر دیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپر بیان کردہ روایت کی رو سے چونکہ الید العلیا (اوپر کا ہاتھ) افضل ہے اور الید السفلیٰ (نیچے کا ہاتھ) مفضول ہے تو آل محمدؐ کے لیے یہ کس طرح جائز ہو تا کہ ان کا ہاتھ نیچے رہے۔ چاہے وہ غریب ہوں یا امیر۔ ان کو تو بہر حال سرپر بٹھانا ہے۔ وہ نیچے کس طریقہ سے اتر سکتے ہیں۔

پھر یہ سوال بھی اہم ہے کہ تمام بنی ہاشم کس طریقہ سے آل محمدؐ میں شامل ہو گئے۔ یہ واقعہ ہے کہ عرب میں اور ہمارے ہاں بھی یہ رواج رہا ہے کہ آدمی کی نسل لڑکی سے نہیں چلتی بلکہ لڑکے سے چلتی ہے۔ بالفرض سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کے متعلق مان لیجئے کہ وہ آل محمدؐ ہیں لیکن بنی ہاشم کے پورے خاندان کو کس طریقہ سے آل محمد ہونے کا شرف حاصل ہو جاتا ہے؟ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت صرف بنی ہاشم کا سر اونچا کرنے کے لیے گھڑی گئی ہے ورنہ اس کی کوئی بنیاد نہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آل محمدؐ میں اگر کچھ لوگ فی الواقع محتاج ہوں اور ان کے پاس زندگی گزارنے کے وسائل موجود نہ ہوں تو کیا ان کو بھوکے مرنے دیا جائے گا اور صدقہ سے ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ اگر اس مدد کے لیے کوئی حیلے تراشے جاتے ہیں تو اس سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی۔ اس صورت میں بھی ان کا

ہاتھ تو نیچے ہی رہے گا۔

☐ • حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِي بَكْرٍ عَنْ اَبِيهِ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ اسْتَعْمَلَ رَجُلًا مِنْ بَنِي عَبْدِ الْاَشْهَلِ عَلَى الصَّدَقَةِ، فَلَمَّا قَدِمَ سَاَلَهُ اِبِلًا مِنَ الصَّدَقَةِ فَغَضِبَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ حَتّٰى عُرِفَ الْغَضَبُ فِي وَجْهِهِ وَ كَانَ مِمَّا يُعْرَفُ بِهِ الْغَضَبُ فِي وَجْهِهِ اَنْ تَحْمَرَّ عَيْنَاهُ ثُمَّ قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَسْاَلُنِي مَالَا يَصْلُحُ لِي وَلَا لَهُ، فَاِنْ مَنَعْتُهُ كَرِهْتُ الْمَنْعَ، وَ اِنْ اَعْطَيْتُهُ اَعْطَيْتُهُ مَالَا يَصْلُحُ لِي وَلَا لَهُ، فَقَالَ الرَّجُلُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ لَا اَسْئَلُكَ مِنْهَا شَيْئًا اَبَدًا.

﴿عبداللہ بن ابو بکرؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی عبدالاشہل کے خاندان میں ایک شخص کو صدقے کی وصولی پر مامور کیا۔ وہ جب واپس آئے تو انہوں نے صدقے کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ مانگا۔ رسول اللہ ﷺ نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا، یہاں تک کہ آپ کے چہرے سے آپ کا غصہ ظاہر ہونے لگا۔ آپ کا غصہ چہرے سے اس وقت ظاہر ہوتا تھا جب آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ یہ شخص مجھ سے وہ چیز مانگتا ہے جو میرے لیے ٹھیک ہے نہ اس کے لیے۔ اگر نہ دوں تو میں نہ دینے کو برا سمجھتا ہوں، اگر دوں تو میں اس کو وہ چیز دوں گا جو میرے لیے ٹھیک ہے نہ اس کے لیے۔ تو اس آدمی نے کہا کہ یا رسول اللہ میں اب اس میں سے کبھی کوئی چیز نہیں مانگوں گا۔﴾

وضاحت :

یہ حدیث بالکل واضح ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مانگنے کی یہ شکل بھی مکروہ ہے۔

☐ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ اَبِيهِ اَنَّهُ قَالَ قَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ الْاَرْقَمِ اَدْلُلْنِي عَلٰى بَعِيرٍ مِنَ الْمَطَايَا اَسْتَحْمِلُ عَلَيْهِ اَمِيرَالْمُؤْمِنِينَ؟ فَقُلْتُ نَعَمْ جَمَلًا مِنَ الصَّدَقَةِ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ ابْنُ الْاَرْقَمِ اَتُحِبُّ اَنَّ رَجُلًا بَادِنًا فِي يَوْمٍ حَارٍّ غَسَلَ لَكَ مَا تَحْتَ اِزَارِهِ وَ رُفْغَيْهِ ثُمَّ اَعْطَاكَهُ فَشَرِبْتَهُ. قَالَ فَغَضِبْتُ وَ قُلْتُ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكَ اَتَقُولُ لِي مِثْلَ هٰذَا فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ

الْاَرْقَمِ اِنَّمَا الصَّدَقَةُ اَوْسَاخُ النَّاسِ يَغْسِلُوْنَهَا عَنْهُمْ.

﴿زید بن اسلم کے والد راوی ہیں کہ عبداللہ بن الارقم نے ان سے کہا کہ مجھے سواری کے اونٹوں کی نشان دہی کرو کہ میں ان میں سے امیر المومنین سے سواری کے لیے مانگوں۔ تو میں نے کہا: اچھا! صدقہ کے اونٹوں میں سے ایک مانگئے۔ تو عبداللہ بن الارقم نے کہا کہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک موٹا فربہ آدمی گرمی کے دن اپنے تہمد کے نیچے کے اور اپنی رانوں کے بیچ کے حصے کو دھوئے، پھر وہ دھوون آپ کو دے اور آپ اس کو پئیں۔ کہتے ہیں میں نے بڑے غصے میں کہا اللہ آپ کو معاف کرے۔ کیا آپ مجھ سے اس طرح کی بات کہہ رہے ہیں؟ تو عبداللہ بن الارقم نے کہا کہ صدقہ لوگوں کی میل کچیل ہے جس کو وہ اپنے سے دھوتے ہیں۔﴾

وضاحت:

یہ بات ٹھیک ہے کہ ایک غیر مستحق صدقے کے مال میں سے مانگے تو وہ اس کے لیے ناجائز ہو گا لیکن یاد رکھیے کہ مستحق کے لیے وہ مال ناپاک نہیں بلکہ یہ اس کا حق ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے۔

مَاجَاءَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ

طلب علم کے بارے میں

☐ حَدَّثَنِيْ عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ لُقْمَانَ الْحَكِيْمَ اَوْصٰى ابْنَهُ. فَقَالَ يَا بُنَيَّ جَالِسِ الْعُلَمَاءَ وَ زَاحِمْهُمْ بِرُكْبَتَيْكَ فَاِنَّ اللّٰهَ يُحْيِي الْقُلُوْبَ بِنُوْرِ الْحِكْمَةِ كَمَا يُحْيِي اللّٰهُ الْاَرْضَ الْمَيْتَةَ بِوَابِلِ السَّمَاءِ.

﴿امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی ہے کہ لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو وصیت کی اور کہا: بیٹے! علماء کی صحبت اختیار کرلو اور ان کے گھٹنے کے ساتھ گھٹنا ملا کر ان کے آگے بیٹھا کرو۔ اللہ تعالیٰ حکمت کے نور سے اسی طرح دلوں کو زندہ کرتا ہے جس طرح وہ مردہ زمین کو آسمانی بارش سے زندہ کرتا ہے۔﴾

وضاحت :

یہ رسول اللہ ﷺ کا قول نہیں بلکہ لقمان حکیم کا قول ہے۔ لقمان عرب کے حکماء میں سے تھے، پیغمبر نہیں تھے۔ ان کی تاریخ بھی مجہول ہے۔ اگر قرآن مجید نے ان کا ذکر نہ کیا ہوتا تو ان کے متعلق ہم اچھی یا بری رائے قائم کرنے کی کسی پوزیشن میں نہیں تھے۔ لقمان حکیم کی بیٹے کو یہ نصیحت قرآن مجید میں بیان نہیں ہوئی ہے۔ امام مالکؒ نے کہیں سے سنی ہے اور حدیث کی کتاب میں اس کو درج کر دیا ہے اور ایسے نہ جانے کتنے اقوال ہیں جو انہوں نے جمع کیے ہیں۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایسے اقوال بھی نقل کیے ہیں جو ہمیں انجیلوں میں نہیں ملے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حکمت کی اچھی باتوں سے خاص دلچسپی تھی۔ نصیحت اپنی جگہ بہت قیمتی ہے۔ علماء کی صحبت میں بیٹھنے سے حکمت کی باتیں سننے کو ملتی ہیں اور آدمی میں اخذ کی صلاحیت ہو تو وہ ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ چیز دل کی زندگی کا باعث ہوتی ہے۔

مَا يُتَّقٰى مِنْ دَعْوَةِ الْمَظْلُوْمِ

مظلوم کی بد دعا سے بچنے کے بارے میں

□ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اسْتَعْمَلَ مَوْلًى لَهُ يُدْعٰى هُنَيًّا عَلَى الْحِمٰى، فَقَالَ يَا هُنَيُّ اضْمُمْ جَنَاحَكَ عَنِ النَّاسِ وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ فَإِنَّ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ مُجَابَةٌ، وَأَدْخِلْ رَبَّ الصُّرَيْمَةِ وَالْغُنَيْمَةِ، وَإِيَّايَ وَنَعَمَ ابْنِ عَفَّانَ وَابْنِ عَوْفٍ فَإِنَّهُمَا إِنْ تَهْلِكْ مَا شِيَتُهُمَا يَرْجِعَانِ إِلَى الْمَدِينَةِ إِلٰى زَرْعٍ وَنَخْلٍ، وَإِنَّ رَبَّ الصُّرَيْمَةِ وَالْغُنَيْمَةِ إِنْ تَهْلِكْ مَا شِيَتُهُ يَأْتِنِي بِبَنِيهِ فَيَقُولُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ أَفَتَارِكُهُمْ أَنَا لَا أَبَالَكَ فَالْمَاءُ وَالْكَلَاءُ أَيْسَرُ عَلَيَّ مِنَ الذَّهَبِ وَالْوَرِقِ وَايْمُ اللّٰهِ إِنَّهُمْ لَيَرَوْنَ أَنْ قَدْ ظَلَمْتُهُمْ إِنَّهَا لَبِلَادُهُمْ وَمِيَاهُهُمْ قَاتَلُوا عَلَيْهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَأَسْلَمُوا عَلَيْهَا فِي الْإِسْلَامِ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ لَا الْمَالُ الَّذِي أَحْمِلُ عَلَيْهِ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ مَا حَمَيْتُ عَلَيْهِمْ مِنْ بِلَادِهِمْ شِبْرًا۔

﴿زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے آزاد کردہ غلام، جس کا نام حُنَیّ تھا، کو سرکاری چراگاہ پر مقرر کیا تو آپ نے فرمایا کہ اے ھُنَیّ، لوگوں کو اپنے بازو سے بچائے رکھیو اور مظلوم کی بددعا سے ڈرتے رہیو کیونکہ مظلوم کی دعا خدا کے ہاں مقبول ہے۔ چھوٹے گلے والوں اور بکریوں کے چھوٹے ریوڑ والوں کو ضرور داخل ہونے دینا البتہ ابن عفان اور ابن عوف کے گلے آئیں تو ان کو روکنا کیونکہ اگر ان کے مواشی ہلاک ہو گئے تو وہ مدینہ میں اپنے کھیتوں اور اپنے کھجور کے باغوں میں آ جائیں گے اور اگر چھوٹے گلے اور چھوٹے ریوڑ والے کا مال ہلاک ہو گیا تو وہ اپنے بچوں کے ساتھ میرے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ اے امیر المومنین! اے امیر المومنین! تو کیا میں ان کو چھوڑ دوں گا؟ خدا کے بندے! سوچو تو سہی۔ پانی اور چارہ مہیا کرنا میرے لیے زیادہ سہل ہے بمقابلہ اس کے کہ میں ان کے اوپر سونا اور چاندی خرچ کروں۔ خدا کی قسم! وہ خیال کریں گے کہ میں نے ان کے اوپر ظلم ڈھایا ہے۔ یاد رکھو کہ یہ ملک ان کا ہے۔ چشمے ان کے ہیں۔ اس کے اوپر جاہلیت کے دور میں انھوں نے جنگیں لڑی ہیں اور اس کے اوپر ہی وہ اسلام لائے ہیں۔ اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے کہ اگر ان جانوروں کی ضرورت نہ ہوتی جن کے اوپر میں لوگوں کو اللہ کے راستے میں سوار کراؤں تو میں ان کی زمین میں سے ایک بالشت برابر بھی چراگاہ نہ بناتا۔﴾

وضاحت:

حمٰی سے مراد وہ سرکاری چراگاہیں ہیں جو حکومت نے جگہ جگہ صدقہ کے جانوروں کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لیے بنا رکھی تھیں۔

صُرَیمۃ سے مطلب اونٹوں کا چھوٹا گلہ اور غُنَیمۃ سے مراد بکریوں کا چھوٹا ریوڑ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہزاروں گھوڑے، اونٹ اور گائے صدقے کے تھے جنھیں ان چراگاہوں میں رکھا گیا تھا اور ان کے اوپر ان کی دیکھ بھال کے لیے آدمی مقرر تھے۔ ایک بار آپ نے اپنے آزاد کردہ غلام کو جسے سرکاری چراگاہ پر مقرر کیا تھا، بلا کر تلقین کی کہ اپنے ہاتھ کو لوگوں پر ظلم کرنے سے روک کر رکھے

کیونکہ مظلوم کی دعا اللہ تعالیٰ کے ہاں فوراً سنی جاتی ہے۔ انہوں نے ہدایت فرمائی کہ چھوٹے گلہ والے یعنی غرباء اگر اپنے گلے لائیں تو ان کو چراگاہوں سے نہ روکا جائے کیونکہ ان ہی نے اپنی زمینوں کے لیے جاہلیت کے زمانے میں جنگیں لڑی ہیں اور ان ہی زمینوں کے اوپر وہ اسلام لائے ہیں تو میں کس طریقے سے ان کے پانی اور ان کے چارے کو روک سکتا ہوں۔ البتہ جو لوگ رئیس ہیں اگر ان کے گلے آئیں تو ان کو تم روک سکتے ہو۔ جنگیں تو ان رئیسوں نے بھی لڑی ہیں مگر ان کے پاس متبادل وسائل کھیت اور باغ کی شکل میں موجود ہیں۔ ان کے لیے مویشیوں کی دیکھ بھال مشکل نہیں۔ اگر ان کا مال ہلاک ہو جائے تو وہ اس نقصان کو برداشت کر لیں گے اور وہ مدینہ میں اپنے کھیتوں اور باغوں میں آ جائیں گے۔

اللہ کے راستے میں سوار کرانے سے مراد وہ اونٹ اور گھوڑے ہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے مجاہدین کو مہیا کیے جاتے تھے۔

اسماء النبی ﷺ

نبی ﷺ کے اسماء

□ حدثنی عن مالك عن ابن شهاب عن محمد بن جبير بن مطعم ان النبی ﷺ قال، لی خمسة اسماء انا محمد، و انا احمد و انا الماحی الذی يمحو الله بی الكفر، و انا الحاشر الذی يحشر الناس علی قدمی و انا العاقب.

﴿محمد بن جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: میرے پانچ نام ہیں۔ میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں اور میں ماحی ہوں کہ میرے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کفر کو مٹائے گا، اور حاشر ہوں کہ لوگ میرے قدموں پر جمع کیے جائیں گے اور میں پیچھے آنے والا ہوں۔﴾

وضاحت:

اس روایت کے متعلق شارحین یہ کہتے ہیں کہ اس میں پانچ کی تعداد تعین کے لیے نہیں بلکہ صرف کثرت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ اسی لیے صوفی حضرات کے نزدیک نبی ﷺ کے کئی سو نام ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے ناموں میں سے محمد اور احمد دو نام قرآن مجید میں آئے ہیں۔ آپ کا نام احمد قدیم

صحیفوں میں چلا آرہا ہے اور قرآن مجید نے اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

جہاں تک ماحی، حاشر اور عاقب کے الفاظ کا تعلق ہے تو یہ اسم یا نام نہیں بلکہ صفات ہیں۔ اسم کسی ذات کو متعین طریقے پر بتاتا ہے اور اس کے ساتھ صفات کا ربط جوڑا جا سکتا ہے اور وہ اسم ان صفات کا موصوف بن سکتا ہے لیکن کسی شخص کی صفت کو اس کا نام قرار دینا صحیح نہیں۔ ورنہ آنحضرت ﷺ کی صفت تو بالمومنین رؤف رحیم بھی ہے۔ اگر صفت کی بنیاد پر حضور اپنا نام بتاتے تو آپ یہ فرماتے کہ میرا نام رؤف بھی ہے اور رحیم بھی ہے اور یہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ اسی طرح قرآن میں خاتم النبیین کی صفت بھی حضور کے لیے آئی ہے۔ آپ اس کو بھی اپنا نام قرار دے سکتے تھے۔ لیکن اس روایت کی رو سے آپ نے چند بے معنی الفاظ کو تو اپنا نام بتا دیا لیکن بامعنی الفاظ کو نہیں بتایا حالانکہ وہ قرآن مجید میں موجود ہیں۔ 'حاشر' کہ جس کے قدموں پر لوگ جمع کیے جائیں گے بالکل من گھڑت بات ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَا اُجِبْتُمْ۔ جس روز تمام رسولوں کو، جن میں آنحضرت ﷺ بھی شامل ہیں اللہ تعالیٰ اکٹھا کرے گا تو ان سے پوچھے گا کہ تم نے کیا دعوت دی تھی اور تمہاری قوم نے کیا جواب دیا تھا۔ تو سب کہیں گے کہ آپ نے جو فرمایا تھا وہ ہم نے کہا، باقی ہماری قوموں نے جو کیا وہ ہمیں نہیں معلوم۔ انہوں نے جو کچھ کیا آپ جانتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ بہترین موقع تھا جہاں اللہ تعالیٰ بتا دیتا کہ میں لوگوں کو رسولوں کے قدموں پر جمع کروں گا۔ لیکن وہاں یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمام انبیاء و رسل کو اکٹھا کرے گا۔ 'عاقب' سے زیادہ موزوں لفظ 'خاتم' تھا کیونکہ قرآن مجید میں آپ کے لیے خاتم النبیین کا لفظ آیا ہے۔ باقی رہ گیا کہ آپ کفر کو مٹانے والے ہیں اس لیے آپ کا نام ماحی ہے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کسی بھی فعل سے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف یا رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہو، اسم نہیں بن سکتا۔ اگر ہر فعل سے اسم بنائے گئیں تو اس میں بہت خطرے ہیں۔ مثلاً نعوذ باللہ، اس طریقے سے آپ اللہ تعالیٰ کا نام 'مُضِلّ' بھی رکھ سکتے ہیں اور 'ماکر' بھی کیونکہ قرآن میں "یُضِلُّ مَنْ یَّشَاءُ وَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ" اور "یَمْکُرُ اللّٰہُ" بھی آیا ہے۔ یہ بہت خطرناک طریقہ ہے اور لوگوں نے یہی غلطی کی بھی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ آپ اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کے نام نہیں رکھ سکتے۔ قرآن مجید میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے اسمائے مبارک کہ محمد اور احمد اللہ تعالیٰ نے خود بتائے ہیں۔ آپ کے یہی دو نام ہیں۔ باقی آپ کی جتنی صفات یا جتنے افعال ہیں ان سے آپ کے نام نہیں بن سکتے۔

یہ روایت ابن شہاب کے ذریعے سے آئی ہے اور بالکل غلط ہے۔

اللھم ارنا الحق حقا و ارزقنا اتباعہ و ارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔ صلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین۔

Acc. No.